دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماھنامہ

جاسوسی ڈائجسٹ

کراچی

نومبر 2020ء

بانی

معراج رسول

صفحات 290
قیمت 100 روپے





مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : لبنیٰ خیال
نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269



مدیر اعلیٰ

قارئین کی کرم فرمائیاں اور کج ادائیاں نامہ و پیام، محبتیں عنایتیں اور شکایتیں



ثریا اعجاز

اپنی ذات کے اندھیروں میں چھپے روپ بہروپ چھلاوے کی تباہ کاریاں



طاہر جاوید مغل

فنکار کے کرداروں کا دوام...... کوچۂ جاناں میں دل فگاروں کا انتقام



تنویر ریاض

قتل کی ایک مکمل واردات جس کا سراغ لگانا مشکل تھا......



حسام بٹ

اس کوچہ گرد کا سفر جس کے مقدر میں وفائے عہد کا کوئی منظر نہ تھا......



امجد جاوید

صحرا کے سرابوں سے ایک دیدہ ور دل فگار نوجوان کی ہنگامہ خیزیاں



جمال دستی

گھٹن زدہ ماحول میں چھپی خون گشتہ حسرتوں اور مجرموں کی روداد

جلد50 • شمارہ 11• نومبر 2020•زرِسالانہ 1500روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 100روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر229 کراچی74200• فون 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



عزیزانِ من......السلامُ علیکم!

سردیوں کی آمد ہے۔ایسے میں گرم بستر میں دراز ہوکر نومبر کے جاسوسی کا مطالعہ ایک خوش گوار تجربہ ہوگا۔کورونا کی عالمی وبا کے سبب ویسے بھی گھر پر رہیں، محفوظ رہیں، ایک ہمہ گیر نعرہ بن چکا ہے۔گھر پر رہنے سے مراد ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا نہیں بلکہ غیر ضروری طور پر بھیڑ بھاڑ یا اجتماعات میں گھسنے سے گریز کرنا ہے۔امریکا میں صدارتی انتخاب... قریب آنے کے ساتھ یکا یک ٹرمپ صاحب کے کورونا میں مبتلا ہونے کا اعلان ہوا۔دس دن یا پندرہ دن کے قرنطینہ کے بجائے وہ چند ہی روز میں صحت یاب ہوکر انتخابی ریلی میں شرکت کے لیے میدان میں آگئے اور اعلان فرمایا کہ ان کی صحت یابی خود ان کی تجویز کی ہوئی دواؤں کی مرہونِ منت ہے۔نہ جانے وہ کون سی جادو اثر ادویہ ہیں جنھیں ایک راز رکھا جارہا ہے۔امریکا میں ٹرمپ کی اس بیماری کو ناقدین کی طرف سے مکاری اور ڈراما قرار دیا جارہا ہے۔لوگ کہتے ہیں کہ اب وہ خم ٹھوک کر اعلان کریں گے کہ انہوں نے پوری دنیا کو تگنی کا ناچ نچانے والی وبا کو دلیرانہ شکست دی ہے، اسی طرح وہ اپنے قریبی حریف کو بھی ہرادیں گے۔اگر ناقدین کے ان شکوک وشبہات میں ذرا سی بھی حقیقت ہے تو ایک تشویشناک بیماری سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی یہ کوشش انتہائی قابلِ مذمت ہے مگر یہ مذمت بے اثر ہی رہے گی۔امریکا بزعمِ خود دنیا کی اکلوتی سپر پاور ہونے کا دعوے دار ہے۔اگر اس کے قومی رہنما اس روش پر چل پڑے ہیں تو دوسری اور تیسری دنیا پر اس کے اثرات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ ہماری دعا ہے کہ ربُّ العالمین نوعِ انسانی کو اس مہلک وبا سے نجات عطا فرمائے جو تادمِ تحریر دس لاکھ سے زائد جانیں نگل چکی ہے۔اس دعا کے ساتھ آیئے اس چمن میں چلتے ہیں جہاں کھلتے شگوفوں کے ساتھ خار بھی موجود ہیں۔

بھکر سے محمد عامر خان کے احکامات ''کورونا وائرس اور غیر یقینی حالات کی وجہ سے جاسوسی کے جان لیوا انتظار کے بعد جب مئی تا جولائی کا شمارہ ہاتھوں میں آیا تو محفلِ یاراں میں اپنا نام بلیک لسٹ میں بھی غیر موجود پا کر ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے لیکن خط لکھیں گے اگرچہ مطلب کچھ نہ ہو، ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے۔لیکن یہ خیال رہے کہ اتنے زیادہ عاشق بھی نہیں کہ آپ ہر دفعہ ہمارے محبت نامے کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیں۔(بے فکر رہیں، ردی کی ٹوکری رکھتے ہی نہیں) مطلب یہ ہے کہ مرنے کا ترے غم میں ارادہ بھی نہیں ہے، ہے عشق، مگر اتنا زیادہ بھی نہیں ہے۔اس معصوم سے (اُف کیا معصومیت ہے) شکوہ شکایت کے بعد سرورق کا جائزہ۔اس مرتبہ ایک بار پھر صنفِ وجاہت کو صنف کرخت (جیسے آپ ہیں ویسا ہی دکھاتے ہیں) کی صورت میں دکھا دیا گیا ہے۔بڑی بڑی مونچھوں والے بھائی جان نازک سی حسینہ جو غصے میں یقیناً نورین مبارک فرام سکھر کی طرح لگیں کو تکنے میں مگن تھے۔ایک پُراسراری عمارت میں جاتی ہوئی سیڑھیاں اور ساتھ میں ایک انسانی کھوپڑی کی موجودگی سرورق کے رنگوں کے بارے میں ہمارا اشتیاق بڑھا گئیں۔حسبِ معمول محفل دوستاں میں وکٹری اسٹینڈ پر ہماری ہی صنف کی سربراہی نظر آئی۔سب دوستوں کے زبردست تبصرے پڑھ کے مزہ آیا۔ان تمام احباب کا شکریہ جنہوں نے مابدولت کے تبصرے کو پسند فرمایا اور ان کا تو زیادہ شکریہ جنہوں نے مرچیں مزید چبا ڈالیں۔مومنہ کشف صاحبہ یہاں ایسی مہان ہستیاں بھی موجود ہیں جن کو ترجمہ شدہ کہانیاں سمجھ نہیں آتیں۔ابھی بچے ہیں میرا مطلب ہے بچیاں ہیں جو سب کو انکل انکل کہہ کر اپنے سفید بالوں کا بھرم رکھتی ہیں۔منحہ رمشا فرام فیصل آباد خوش آمدید کہنے کا بہت شکریہ۔اگرچہ میں بھکر سے ہوں لیکن تعلیمی سلسلے میں چار سال آپ کے فیصل آباد میں قیام رہا ہے۔جی سی یو اور ایگری کلچر یونیورسٹی سے ایم ایس سی اور ایم فل کے سلسلے میں۔ریاست خان، ایمانے زارا شاہ اور باقی سب احباب زبردست۔نورین مبارک صاحبہ آپ نے جس طرح بچے کہہ کر مخاطب فرمایا ہے میرے تصور میں آپ کی لاٹھی ٹیکتی ہوئی کمر خمیدہ بزرگ کی سی شبیہہ آگئی۔مرچیں چبانا کم کریں اور صحت پر توجہ دیں۔امجد رئیس کی ترجمہ شدہ کہانی جڑ کی تلاش اگرچہ پلاٹ پرانا تھا اور کہانی کا اندازہ بھی ہو رہا تھا لیکن جس سنسنی خیز انداز میں کہانی کی بُنت کی گئی، وہ بہت اعلیٰ رہی۔الاؤ اپنے دھیمے انداز میں سلگ رہی ہے۔سچی بات یہ ہے کہ اب اس کہانی میں شروع والا چارم غائب ہوتا جارہا ہے۔اناگیر جاسوسی ڈائجسٹ کی معرکتہ الآرا کہانیوں میں سے ایک بننے کی راہ پر گامزن ہے۔ابھی اس کہانی میں امجد جاوید صاحب نے بہت اسرار چھپا رکھے ہیں۔آئندہ قسط کا شدت سے انتظار ہے۔مختصر کہانیوں میں سوائے انوکھی محبت کے سبھی کہانیاں بوریت سے بھرپور تھیں۔(افسوس کہ آپ کو پسند نہ آسکیں) پلیز پلیز اچھی اچھی غیر ملکی ترجمہ شدہ کہانیاں شامل کریں۔سرورق کے رنگوں میں سے فہمی فردوس کا رنگ سفاک قاتل عنوان کے مطابق درست رہا لیکن پلاٹ فرسودہ تھا جبکہ کہانی کی بُنت پر بھی خاص توجہ نہیں تھی۔دوسرا رنگ تو نہایت پھیکا رہا۔'' (کوشش کریں گے کہ آپ کے ذوق کے مطابق کہانیاں چھاپیں)

آزاد کشمیر میرپور سے بدر السلام کی رُودادِ چمن ''امید ہے کہ سب خیریت سے ہوں گے۔ پہلے سوچا کہ خط اس طرح شروع کریں سدا خوش رہو، سکھی رہو اور آباد رہو مگر پھر خیال آیا کہ مرد حضرات کے لیے کیا لکھیں جن میں ہم خود بھی آتے ہیں، نہیں جی ابھی تو ہیں بچہ ہوں۔ چلیے آپ کو کہانی سناتے ہیں۔ جب سے لاک ڈاؤن شروع ہوا تو جاسوسی بند ہے، اب کیا کریں۔ اسٹال پر بہت چکر لگائے مگر نہ ملنا تھا نہ ملا مگر ایک اچھی بات ہر بار ہم جاسوسی والے پیسوں سے کوئی نہ کوئی کتاب خرید لاتے سو جاسوسی کے طفیل اب ہم 25/20 عدد کتابوں کے مالک ہیں۔ پھر پتا چلا کہ اپنے شہر میں جاسوسی بند بلکہ آس پاس کے شہروں میں بھی بند۔ ایک عزیز کو چھوڑنے اسلام آباد گیا تو سوچا راجا بازار سے ہوتا چلوں کہ جاسوسی مل جائے گا مگر یہ کیا گاڑیاں ہی نہیں جارہیں پیدل مارچ شروع کیا ابھی تھوڑا ہی چلا تھا کہ ایک موٹر سائیکل پاس رکی۔ ہم نے سوچا لٹیرا ہے اور ابھی پستول نکال کر کہے گا، سب کچھ میرے حوالے کردو مگر یہ صاحب کہنے لگے آپ ادھر آگے جارہے ہیں آئیں میں آپ کو چھوڑ دوں۔ کچھ اپنی اہمیت کا احساس ہوا اور ان صاحب کے ساتھ بیٹھ گئے۔ رستے میں ہم نے ان سے پوچھا بھی کہ بھائی جان آپ کا نام کیا ہے جواب ملا شفقت علی۔ ہم نے پھر پوچھا ادھر ہی رہتے ہیں۔ جواب ملا جی ہم نے کہا اصل میں بھائی جان مجھے پوچھنا یہ تھا کہ آپ مجھے اغوا تو... نہیں کروگے، یہ سوال سن کر وہ صاحب اس قدر زور سے ہنسے کہ انہوں نے بائیک روک دی اور تھوڑی دیر ہنسنے کے بعد ہم پھر چل پڑے پھر ہمیں انہوں نے مقام مطلوبہ پر اتار دیا پھر ہم نے بصد شکریہ انہیں کھانے پینے کی دعوت دی انہوں نے پھر کبھی کہہ کر ٹال دیا۔ ہم بک اسٹال پر گئے تو یہ کیا جاسوسی کا کوئی شمارہ نہیں، نہ اپریل کا، نہ مئی تا جولائی کا اور نہ ہی ستمبر کا (اگست کا کسی وسیلے سے مل گیا تھا) بوجھل دل کے ساتھ واپسی کا راستہ ناپا اور اب یہ خط لکھ کر امید ہے کوئی نہ کوئی ہماری حالتِ زار پر رحم کھا کر ہمیں ان شماروں کے لیے اسپانسر کردے گا۔'' (پیوستہ رہ شجر سے، امیدِ بہار رکھ)

وزیر آباد سے محمد احسن زمان کی درویش کی صدا ''ہر مون سون کی طرح اس سال کا مون سون بھی کراچی والوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔ کراچی کی غریب آبادی تو مکمل طور پر پانی کی نذر ہوگئی۔ لیکن اس بار پوش علاقے بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ بین الاقوامی منظر نامے میں ایک بڑی تبدیلی اسرائیل اور متحدہ عرب امارات کے درمیان تعلقات کا استوار ہونا ہے۔ تاریخ کے اس نازک ترین موڑ پر ہمارے خارجہ امور کے کارپردازوں کا امتحان شروع ہوا چاہتا ہے، کشمیر میں بھارتی ظلم و ستم کا بازار ہنوز گرم ہے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا جارہا ہے، اللہ ان کی مشکلات کو ختم کرے۔ اب کچھ بات ہوجائے جاسوسی کی۔ اس بار 24 ستمبر کو ہی نازل ہوگیا تو دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ سرورق تو خوب تھا، مطلب پورے سرورق پر صنفِ نازک کا راج تھا جس کے سر پر خون ٹپکاتی ہتھکڑیاں لٹک رہی تھیں لیکن وہ محترمہ دو جنگجوؤں کا نظارہ کررہی تھی اور ان کے پس منظر میں کوئی صاحب سلاخوں کے پیچھے تھے جن کی طرف کسی کا دھیان ہی نہ تھا، عمدہ ترین۔ (بہت شکریہ) چینی نکتہ چینی کا نام اب بدل دیں ورنہ یہ بھی کھانے والی چینی کی طرح ہماری پہنچ سے باہر ہوجائے گی۔ (یہ صحیح لکھے) کرسیِ صدارت پر ریاست خان کو براجمان دیکھا، بس ٹھیک ہی تھا تبصرہ، نورین صاحبہ کی کاوش عمدہ اور زندگی سے بھرپور تھی۔ منصور کامران اور طلعت مسعود کے تبصرے اچھے رہے لیکن مجھے راحیلہ بھٹی کا تبصرہ بہت اچھا لگا، کمال کردیا تھا محترمہ نے ویلڈن۔ لیکن افسوسناک بات یہ تھی کہ پچھلے دو ماہ سے میرے خطوط نہیں شائع ہوئے، بھرپور طریقے سے لکھے تھے، ہے نا افسوس ناک بات۔ (بعد از اشاعت موصول ہوئے تھے اور یہ تبصرہ بھی ستمبر کے شمارے پر ہے) خونی ہیرے، اُف کمال ہے، حیران ہوں، شاندار۔ یہ سب امجد رئیس کے لیے جن کی کاوش بہت یادگار رہی۔ میتھیو بیلن کے بہروپ نے حیران کردیا، کرال کا کردار بہت جاندار تھا لیکن فتح بالآخر گھوسٹ کا مقدر ٹھہری حالانکہ اس نے بہت محنت کی اور ان سے ایک قدم آگے بھی چلی گئی تھی اور انجام تو بہت ہی کمال کا تھا، ایک بار پھر مبارک باد۔ اجل گرفتہ کا انجام ایسا ہی ہونا چاہیے تھا، چلو کھانے کی چوری تو معمولی چیز ٹھہری کیونکہ پیٹ تو بھر جاتا ہے لیکن آنکھ نہیں بھرتی، ٹیکسی والے کو لوٹنا بہرحال کمینگی تھی اور لالچ کا انجام ہمیشہ دردناک ہی نکلا۔ مغرب کے تہذیب یافتہ معاشرے کی تقلید کرتا ہم سب کو فخر محسوس ہوتا ہے لیکن اسی معاشرے میں ایسی ایسی برائیاں پنپتی ہیں کہ انسان تھرا اٹھتا ہے، شیطان کا اختتام حسبِ توقع تھا، جولیا کی طرح میں بھی مارلن کو ہی قاتل کا دوسرا ساتھی سمجھتا رہا۔ آزادی، عائشہ احمد کی عمدہ پیشکش تھی، یہ وہ اَن کہی داستانیں ہیں جو ہمارے اجداد اس ملک کے حصول کی جدوجہد میں رقم کر گئے لیکن ہم آج بھی حقیقی آزادی کی منزل سے میلوں دور کھڑے ہیں، یقین نہیں آتا تو نوجوان نسل یومِ آزادی والی رات شکرانے کے نفل پڑھنے کے بجائے باجے بجانے اور موٹر سائیکل کا سائیلنسر نکال کر اسے ایک پہیے پر نہ دوڑا رہی ہوتی۔ الاؤ کی کمان جب سے بھٹی صاحب نے سنبھالی ہے ڈاکٹر سیف کے تو رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے ہیں، رومی اور طارق کے ساتھ نے سیف کے انگ انگ میں جیسے بجلیاں بھردی ہیں، اب کہانی میں وہ چیز نہیں رہی جو ابتدا میں تھی (وہ چیز کیا؟) بہرحال جلد ہی ہم بھی اسی رفتار کے عادی ہوجائیں گے۔ تنویر ریاض کی خودنمائی بس ٹھیک ہی تھی۔ طاہر جاوید کی ہنگامی شادی کا مزہ بالکل بھی نہیں آیا، میرے خیال میں...... چلیں رہنے دیں طاہر صاحب ناراض ہوجائیں گے۔ (نہیں، نہیں آپ جسارت کریں) بے گھر پڑھتے ہوئے واقعی میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہورہی تھی، بریک بون جب روب کو اپنی درندگی کا نشانہ بنا رہا تھا تو وہ منظر میری آنکھوں میں گھوم گیا اور میں نے بے اختیار ڈائجسٹ بند کردیا، (اتنے کم ہمت) وحشت ناک، دہشت ناک مناظر سے مجھے نفرت ہے لیکن انجام یہ ہوا کہ جیک ٹوبن کا جی نیکی سے اکتا گیا۔ اناگیرا تنی قلابازیاں کھارہی ہے کہ توبہ ہی بھلی اور ساتھ ہمیں بھی خس و خاشاک کی طرح بہا لے جارہی ہے۔ علی، جو اَب ویر سنگھ کے روپ میں ہے، اسے ویڈیو کلپ میں وہ چیز نظر آگئی جس کی تلاش میں وہ مارا مارا پھر رہا ہے، اس ساری

صورت حال سے لگ رہا ہے کہ علی بھی کسی خفیہ ادارے کا رکن ہے جو ڈاکٹر کامران اور ڈاکٹر فائزہ کی تلاش میں لگا ہے، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ سلیم کرد کی تحریر، ریڈ کارڈ، کافی الجھی ہوئی کہانی تھی، مطلب ایک اَن پڑھ اور اجڈ شخص ایسی عمدہ پلاننگ کرے گا کہ پولیس بھی چکر کھا جائے گی، کمال ہو گیا جناب، سونے پر سہاگا قتل کی تحقیق کون کر رہا ہے ایک پرائیویٹ جاسوس اور وہ بھی پاکستان میں، چلو جی مان لیتے ہیں اب آپ نے اتنی محنت سے لکھا ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ (پاکستان میں اب کیا نہیں ہو رہا ہے؟) انتقام میں انسان اندھا تو ہو ہی جاتا ہے عقلمند ہوتے پہلی بار دیکھا۔ شاکر لطیف کی قاتل وصیت ان لوگوں کی کتھا تھی جو رشتوں کی جگہ دولت کو تولتے ہیں حالانکہ دولت تو ہاتھ کا میل ہے اور پھر انجام بھی ڈاکٹر مائیکل ہی جیسا ہوتا ہے۔ روبینہ رشید کی مظلوم رفاقت قلابازیوں سے بھرپور تھی۔ سارہ، مراد شہزاد کو تلاشتے تلاشتے پہلے فواد کو کھوج بیٹھی اور پھر سلیمان سے جا ٹکرائی اور پھر سلیمان نے کیا خوب رفاقت نبھائی اور آخر میں قانون کا سہارا لے کر مراد کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچانے میں لگ گئی، بہت مزہ آیا۔ غلام قادر پردیس میں مقیم ایک خاندان کی جہدِ مسلسل کی کتھا لے کر آئے تھے، درست ہے کہ وہاں کی زندگی بہت مشکل اور کانٹوں بھری ہے جسے ہم جیسے پھولوں کی سیج سمجھ لیتے ہیں لیکن ذیشان کو شارٹ کٹ میں دولت مل گئی، زندگی مزے میں گزرے گی، حرام تھی یا حلال اس بحث کو فی الحال چھوڑ دیں کیونکہ ذیشان نے ٹیکسی ڈرائیور مانگے ہیں اور میرا ارادہ ہے کہ اپلائی کر ہی دوں، کیا خیال ہے آپ لوگوں کا۔ (بالکل، دیر نہ کریں) تبصرہ تو تمام ہوا لیکن مارچ اور اپریل میرے لیے بہت بھاری ثابت ہوئے، مارچ میں جواں عمر ہم زلف، مرزا احمد سعید اور 2 رمضان کو یعنی اپریل میں امی جان اس جہان فانی سے کوچ کر گئیں، لاک ڈاؤن کے باعث دونوں کی آخری رسومات سے محروم رہا جس کا ہمیشہ قلق رہے گا۔ احباب سے دعاؤں کی درخواست ہے، اس درویش کی بس یہی صدا ہے۔'' (اللہ تعالیٰ مرحومین کی مغفرت فرمائے اور اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل سے نوازے)۔

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی پسند ناپسند ''اس بار سرورق بہتر تھا۔ خطوط کی محفل میں راولپنڈی کی نگاہ حسیب سرفہرست رہیں جو کہ نئی لگتی ہیں۔ میرا مختصر تبصرہ آپ عام طور پر آخر میں رکھتے ہیں بحث سمیٹنے کے لیے کیونکہ ادبی محفلوں میں اور شاعروں میں سینئر کو آخر میں دعوت دی جاتی ہے (آپ کا یہ گلہ دور کر دیں گے۔ عموماً آپ کا خط اس وقت موصول ہوتا ہے جب خطوط کی محفل آخری زینے پر ہوتی ہے) کہانیوں میں سب سے پہلے الاؤ پڑھی۔ کہانی کا ہیرو ڈاکٹر سیف اب تو اپنے مرکزی دشمنوں تک جا پہنچا ہے۔ دیکھیں وہ ان کا خاتمہ کیسے کرتا ہے۔ دوسری قسط وار کہانی انا گیر بے حد سست رفتاری سے جاری ہے۔ علی اور جگو دادا اب پرتاپ جگو کے نرغے میں آ گئے ہیں۔ سرورق کی دونوں کہانیاں چہرہ در چہرہ اور سازِ مرگ جاسوسی کے معیار کی نہ تھیں۔ (ایسا تو نہ کہیں) مغربی کہانیوں میں تنویر ریاض کی کڑوا سچ اور مقامی کہانیوں میں کبیر عباسی کی راہِ نجات اچھی تھیں۔ آخر میں بھائی عرفان راجا اور بابر عباس کا شکریہ جنہیں میرے مختصر تبصرے پسند آئے۔ بی بی بشریٰ افضل کو واپسی مبارک۔ وقت کی دھند میں ایک اور چہرہ پشاور کی طاہرہ گلزار گم ہو گئی ہیں۔''

بورے والا سے عبدالجبار رومی انصاری کی طویل عرصے بعد آمد ''تیکھے نین نقش، گدری آنکھوں والی دوشیزہ دیکھنے کے انداز سے چالاک لگ رہی تھی۔ اپنی حفاظت کے لیے چالاکی اچھی بات ہے مگر ہے تو بے چاری صنفِ نازک اپنے کانوں میں پہنی گیہوں کی بالی کی طرح کہیں نہ کہیں پس بھی جاتی ہے مگر کتنی عجیب بات ہے۔ سرورق پر یہ ہمیشہ تر و تازہ اور دلکشی کی انتہا لیے ہوتی ہے (یہ دلکشی اور سجاوٹ آپ ہی کے لیے ہوتی ہے) اور مرد بے چارہ لاش کی صورت یا زخموں سے چور مٹی میں لت پت ہوتا ہے۔ یہ دنیا ہے ہی محبت و نفرت مجبوری و بے کسی کا امتزاج اور ان سب کا مقابلہ کرنے کے لیے صبر و استقامت اور حوصلہ و برداشت بے حد ضروری ہے۔ ایک عرصے کے بعد ہاتھ آئے جاسوسی ڈائجسٹ میں دیکھتے ہیں دنیا کس کشمکش سے دوچار ہے یقیناً ہمارے دوست احباب ہماری حاضری کو پھر سے ویلکم کہیں گے۔ تبصرے میں بشریٰ افضل لمبی جدائی کے بعد حاضر ہو گئیں۔ پہلی دفعہ کچھ شرارتی پن نظر آیا ہم جولیوں کو آواز دی تو بھی دوڑتی آ گئیں اور مردوں سے سبقت لے گئیں، بہت اچھا لگا۔ نگاہ حسیب کے تبصرے میں تو مجھے اپنا ہی انداز نظر آیا۔ بہت اچھا لکھا تھا، مبارک باد قبول کیجیے۔ خراماں خراماں چلتے ایمانے زارا شاہ نے بھی بھرپور تبصرہ دے مارا۔ نظریں چرا کر بھی اچھی چوٹ کر جاتی ہیں، ویلڈن۔ ریاست خاں کی حسرت بھی قابلِ دید ہے۔ شکر ہے مردوں میں اتنے نخرے نہیں ہیں۔ ورنہ تبصرے سے پہلے جانے کیا کیا کرتے۔ ریاست بھائی لڑکیوں کی ہمت ہے جو میک اپ کر کے بھی تبصرے کو انجام دے لیتی ہیں۔ منصور کامران آپ کے لیے ڈھیروں دعائیں اللہ تعالیٰ آپ کی آنکھوں کی صحت برقرار رکھے۔ آپ کی حاضری کا انتظار رہے گا۔ عرفان راجا کی مختصر مگر تیز رفتار تبصرہ نگاری پسند آئی۔ نٹ کھٹ سی نورین مبارک کرسیِ صدارت کی آرزو لیے شگفتہ شگفتہ چوٹ کرتی خوب تبصرہ کر گئیں، زبان و بیان کی چاشنی بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے نا...... انعم جمیل کی آمدِ بہار سے آنکھیں چار ہوئیں دل باغ باغ ہو گیا۔ تبصرہ بہت اچھا اور زبردست لکھا تھا۔ آپ کی کہانی خوف گزیدہ بھی بہترین رہی۔ روبوٹ چھپکلی نے خوف کا تاثر قائم کیے رکھا۔ بے چاری ایما بھی اسی خوف سے چل بسی اور پھر ان خوف کے محرکات کو ایما کے باپ ولیم نے ویسے ہی خوف سے دوچار کر کے موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ اچھی کہانی تھی۔ مزے مزے کی باتیں کرتی منحہ رمشا کا تبصرہ عمدہ رہا۔ لیجیے سرجی بھی اپنی دلداریوں کے ساتھ حاضر ہیں۔ واہ جی واہ ارے سرجی آپ کو نہیں پتا لڑکیوں سے ان کی عمر نہیں پوچھتے ہیں، ہاہاہا۔ یہ جب جب آئینہ دیکھیں، ان کی عمر گھٹتی جاتی ہے باقی آپ سنائیں کیسے احوال ہیں، عمدہ تبصرہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ انور یوسف کی شمولیت مختصر مگر اچھی رہی۔ احمد بلال امجد جانے پہچانے نام دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ چہرہ در چہرہ ڈھونڈنا بھی قانون کے

محافظوں کا ہی کمال تھا۔ جنید اور ناصر بعد ازاں آصف مغل نے مل کر قاتل عدنان کو ڈھونڈ ہی نکالا۔ سنسنی خیز کہانی بہت اچھی لگی۔ انا گیر میں پرتاپ سنگھ کے قید خانے سے قیدیوں کی واپسی ہوئی اور بچاریوں سمیت محافظوں کو موت سے ہمکنار ہونا پڑا۔ پرتاپ سنگھ کی مکروہ ہنسی لگتا ہی کے لیے پھر کوئی ڈرامائی وحشت لے کر آئے گی۔ اغوا کے بعد قتل ہونے والے بیوی اور بچے کی تصویر دکھاتے خالد بھی بعد ازاں ظالموں کی بھینٹ چڑھ گئے یہاں سے رومی اور سیف بال بال بچے بھٹی صاحب کی الاؤ بھی ایکشن سے بھرپور کہانی اچھی جا رہی ہے۔ شازیہ رشی کو بلیک میل کر کے اپنی مٹھی میں لینا چاہتی تھی مگر اس کی اپنی مٹھی ہمیشہ کے لیے بند ہوگئی اسی طرح رشی نے اقصیٰ کو بھی بھیانک موت سے دوچار کیا۔ زویا اعجاز کی سسپنس سے بھرپور کہانی روپ بہروپ اچھی رہی، آگے چل کے یہ کیا کیا ہنگامہ برپا کرے گی، اگلے ماہ پتا چلے گا۔ سرورق کی دوسری کہانی بھی زبردست رہی۔''

جامشورو سے خالد شیخ طاہری کا عذرِ مصروفیت ''چوبیس تاریخ کی رات نو بجے جاسوسی کا دیدار کر لیا۔ سرورق آنکھوں کو بھلا لگا۔ میں سرورق دیکھ کر رنگوں کا اندازہ کرنے لگتا ہوں۔ اس بار سرورق کو دیکھ کر اندازہ نہیں کر پایا۔ کیونکہ فنکار نئے تھے۔ فہرست پر نظر ڈالی۔ آپا زویا اعجاز کو دیکھ کر دل بلیوں اچھلنے لگا۔ باقی سب اپنی اپنی جگہ پرفیکٹ تھے۔ اپنی محفل میں پہنچا۔ موٹروے والے دلخراش واقعے نے ایک بار پھر افسردہ کر دیا۔ ٹھیک کہا کہ مذہب انفرادی اصلاح کے ساتھ ساتھ معاشرے کی بھی اصلاح کی تلقین کرتا ہے۔ سرِعام سزا کا میں بھی حامی ہوں۔ ایسے مجرموں کو واقعی سرِعام سزا دینی چاہیے۔ نگاہ حسیب کو کرسی صدارت پر براجمان پایا، بہت بہت مبارکباد۔ آپا زویا اعجاز کی پہلے صفحات پر کہانی روپ بہروپ جوبن پر آ کر انتظار کی سولی پر چڑھا گئی۔ عمران دانش کی واپسی اچھی لگی۔ سازش واقعی گھناؤنی تھی۔ عمران ٹو کا خیر مقدم کرتے ہیں مگر مغل صاحب کو چاہیے کہانی تھوڑی طویل لکھا کریں تاکہ قارئین بہتر انداز میں عمران دانش کے احساس سے لطف اندوز ہو سکیں۔ مغل صاحب نے موضوع کا خوب انتخاب کیا۔ پڑھ کر مزہ آ گیا کاشف زبیر مرحوم کا دھیما اور حقیقت سے قریب اسلوب ہی ان کی کامیابی کا راز تھا۔ جب تک الاؤ کی دھیمی دھیمی آنچ رہی، بھلی لگتی رہی، پڑھنے کا لطف آ رہا تھا مگر جیسے ہی الاؤ کی حدت بڑھی ہم تھوڑا پیچھے ہٹ گئے۔ عبدالرب بھٹی صاحب ایک باکمال و باصلاحیت فنکار ہیں۔ ان کے کئی طویل ناول پسندیدگی کی سند پا چکے ہیں۔ ایک زمانہ ان کی صلاحیتوں کا معترف ہے۔ امید ہے ایک بڑی تعداد الاؤ سے محظوظ ہو رہی ہوگی۔ انا گیر نے پہلی قسط سے ہی جکڑ رکھا ہے۔ علی کی پھرتیاں، لحہ بہ لحہ بدلتے حالات و واقعات اپنا رنگ جمائے ہوئے ہیں۔ انا گیر کی چھٹی قسط بھی خوب رہی۔ امجد جاوید صاحب کا قلم تیز۔۔ رفتاری سے دوڑ رہا ہے۔ علی کی صلاحیتیں کھل کر سامنے آ رہی ہیں جو کہانی سے قاری کو جوڑے رکھ رہی ہیں۔ یہ ہی ایک اچھے فنکار کی نشانی ہے۔ کبیر عباسی راہ نجات کے ساتھ چھا گئے۔ حنان کی صلاحیتیں اب کھل رہی ہیں مگر حنان کی تمام تر ذہانت ایک ممتا کے آگے ہار گئی۔ ویلڈن کبیر عباسی۔ خوف گزیدہ کے ساتھ انعم جمیل نے اپنے ہونے کا احساس دلایا۔ انوکھے انتقام نے پسندیدگی کی مہر ثبت کروائی۔ حسام بٹ شپ آز میں شہلا اور ذاکر کے جذبات سے خوب کھیلے۔ اس کھیل نے مزہ دیا۔ حسام بٹ صاحب کی مختصر کہانیوں میں ایک اور بہترین کہانی کا اضافہ۔ حسنین چودھری انصاف کے ساتھ انصاف کرتے اچھے لگے۔ منظر امام ہمیشہ کی طرح خوب رہے۔ کہانی میں اپنا نام دیکھ کر تجسس ہوا، فوراً پڑھی۔ سرورق کے رنگوں میں سب سے پہلے ماہ رخ ارباب کا سازِ مرگ پڑھا۔ اسرار میں ڈوبا یہ رنگ پسند آیا۔ دنیا میں، بلکہ میں کہوں گا ملکِ عزیز میں بھی ایسے قابل لوگ موجود ہیں جو سائنس و طب کی دنیا میں انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔ وسائل کی فراہمی، حکومتی سطح پر سیکیورٹی اور اقدامات ناصر حسین جیسے قابل لوگوں کے جوہر دنیا کے سامنے لا کر ملکِ عزیز کا نام روشن کر سکتے ہیں۔ دوسرا رنگ شروع کیا تو عنوان دیکھ کر پہلی کہانی روپ بہروپ کا خیال آیا۔ لیکن احمد بلال صاحب نے چہرہ در چہرہ ایک بالکل ہی مختلف کہانی لکھی لیکن رنگ میں وہ رنگ بھر نہ سکے جو قاری کو متاثر کر سکے۔ مصروفیات کی وجہ سے رسالہ یہیں تک پڑھا باقی رہ جانے والی کہانیاں پہلی فرصت میں پڑھنے کا ارادہ ہے۔''

میانوالی سے ریاست خان کی تبصرہ نگاری ''ایک تو اتنی آفت مچی ہوئی ہے جاسوسی کا ملنا بھی محال ہو گیا ہے۔ کتنی منتوں مشقتوں کے ساتھ اس کو حاصل کرنا پڑتا ہے، یہ ہم ہی جانتے ہیں۔ اکتوبر کا شمارہ مجھے یکم کو بڑی مشکلوں سے ملا۔ سرورق پر اس بار کچھ زیادہ ہی توجہ دی گئی۔ خوبصورت حسینہ کان میں ڈالی بلیوڈریس میں قیامت ہی ڈھا رہی تھی۔ ساتھ ہی وہی پرانے چہرے قاتلوں کے۔ چیچنی نکتہ چینی نے اس بار جھنجوڑ کے رکھ دیا۔ وحشی انسان جس کو دیکھ کر شیطان بھی ہنستا ہوگا کہ یہی اشرف المخلوقات ہے جس کو سجدہ کرنا تھا۔ سزاؤں کی کمی اور سزائیں نہ ہونے کی وجہ سے یہ درندے اس قدر بے باک ہو گئے ہیں۔ اللہ پاک ہدایت دے انسانوں کو آمین۔ نگاہ حسیب اس بار صدارت کی کرسی پروا کیا بات ہے پہلی باری پر صرف کہانیوں پر ہی تبصرہ تھا جناب کا ایسا کیوں؟ ایمانے صاحبہ کو ستمبر کا سرورق پسند نہیں آیا تو ادارے نے فوراً ایکشن لے لیا۔ دیکھا اتنی تو قدر ہے آپ کی نا۔ منصور کامران سب سے پہلے دل سے شکریہ میرے تبصرے پسند کرنے کا ہمیں بھی آپ کی نٹ کھٹ باتیں بہت مزہ دیتی ہیں اور دوسرا یہ کہ اب جاسوسی کی تاریخ تبدیل ہوگئی ہے اب 25 تاریخ تک مل جائے گا۔ عرفان راجہ آپ کا تبصرہ پڑھ کے تو لگتا ہے کہ ہم خبروں کی سرخیاں پڑھ رہے ہیں، بھئی تھوڑا سا انداز چینج کریں۔ نورین صاحبہ کا تبصرہ پڑھ کے ہنسی آ گئی۔ محترمہ سرورق دھندلا نہیں ہوتا آپ کا شمارہ ایسا ہوگا ہمیں تو جیسا ملا اور ہو سکے تو تھوڑا آہ و بکا کریں ہماری طرح صدارت پر آنے کے لیے ورنہ دیر نہ ہو جائے۔ انعم جمیل تو پہلی انٹری میں چھا گئیں، تبصرہ بھی کر دیا اور کہانی بھی لیکن افسوس کے ساتھ کہ

آپ کی اسٹوری نہیں پڑھ سکا۔ بشریٰ صاحبہ بھی آخر مل گئیں ارے محترمہ ایسا غضب نہ کیا کریں۔ اپنے ہاتھوں کی اتنی تعریف نہ کریں۔ مبارکباد دینے کے لیے شکریہ ہم بھی واقعی گرتے گرتے بچے۔ منحہ صاحبہ بھی جاسوسی میں 2 ماہ کے وقفے کے بعد آتی ہیں نخرے دکھاتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ بابر عباس کو شکایت کہ ان کا تبصرہ کھالیا جاتا ہے بھئی تھوڑا کم چٹ پٹا لکھا کریں نا ادارے کو... پسند آجاتا ہے اور وہ کاٹ لیتے ہیں۔ اتنا بڑا تبصرہ کیا بات ہے محبت ہے آپ کی۔ آخر میں انور یوسف جاسوسی جلد ملنے پر خوشی سے نڈھال بھئی اب جاسوس دس تاریخ کو پہنچے گا آپ کی طرف۔ کہانیاں ہر بار کی طرح اس بار بھی لاجواب تھیں سمجھ نہیں آرہی تھی ... کہ پہلے کس کو پڑھا جائے پھر مغل صاحب سے شروع کرلیا۔ سازش مغل صاحب کی ایک اور عمران دانش۔ لاجواب تحریر عزیزا جی کی اتنی بڑی سازش وہ زلیخا کے پیچھے لگا ہوا تھا کہ اس کا گھر پراسرار بن جائے اور وہاں کوئی نہ رہے ایسے میں قاری حمید جیسے مولوی ہوتے ہیں جو ایسے معاملات میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتے ہیں۔ عمران ٹو اور تابش نے خوبصورتی سے ان کو بے نقاب کیا اور زلیخا کا گھر بچالیا۔ زویا اعجاز کی ابتدائی صفحات پر ایک اور لاجواب تحریر روپ بہروپ...... منظر امام کی مختصر لیکن پُراثر تحریر خالد جو کہ ان پڑھ ہے اس کی صنوبر سے منگنی ہوجاتی ہے، وہ اس کو بہت چاہتا ہے لیکن دونوں کے درمیان پڑھائی کا بہت بڑا فرق تھا لیکن دونوں کے درمیان محبت کی طاقت نے اس فرق کو مٹا دیا، کہانی کا اینڈ لاجواب تھا۔ چہرہ در چہرہ سرورق کی پہلی اسٹوری احمد بلال کو پتا نہیں پہلے پڑھا ہے یا نہیں لیکن یہ کہانی پڑھ کر ہمیشہ یاد رہے گا۔ کمال کی کہانی وڈیرے لوگ جن کو اپنی دولت پر بڑا ناز ہوتا ہے وہ ایسے ہی کسی عام سے شخص سے بلیک میل ہوکر دولت لٹاتے رہتے ہیں۔ جن لوگوں کو وہ خاک بھی نہیں سمجھتے، وہی ان کو دھول چٹا دیتے ہیں۔ رضا نے کہانی میں جاندار کردار نبھایا۔ سارے پولیس والے اگر دل و جان سے اپنی ڈیوٹی سرانجام دیں تو نہ ایسے کیس پیدا ہوں گے نہ کوئی قانون توڑے گا۔ ماہ رخ صاحبہ کی سازِ مرگ آخر میں تھوڑی تھوڑی سمجھ آئی کہانی میں بہت الجھاؤ تھا لیکن تھوڑی سی اور محنت سے نکھار آسکتا ہے۔ نئے لکھنے والے ہیں لیکن کمال کی اسٹوریز لکھ رہے ہیں۔ راہِ نجات کبیر عباسی اتنے پرانے رائٹر تو نہیں ہیں لیکن یہ کہانی انہوں نے بہت زبردست لکھی ہے۔ نسیمہ جس کی تصویر پورے کالج اور سوشل میڈیا پر لیک ہوجاتی ہے، اس کا شوہر اسے طلاق دے دیتا ہے وہ حنان کے گھر آکے رہنے لگ جاتی ہے اور اس سے مدد مانگتی ہے کہ کس نے وہ تصویریں لیک کیں، حنان اسے اس سے نجات دلا دیتا ہے۔"

سکھر سے نورین مبارک کے جوابی حملے "میں تو سرورق پر ایک نظر ڈال کے آگے بڑھ جایا کرتی تھی لیکن اس بار نظریں سرورق پر ٹک کے رہ گئیں۔ ہائے اللہ آرٹسٹ نے مجھے کہاں دیکھ لیا۔ ہو بہو میری تصویر بنا دی۔ اپنی دوست شہلا کو تصویر دکھائی تو اس نے بھی کہا کہ لڑکی کی شکل مجھ سے واقعی ملتی ہے بس میں اس سے زیادہ خوبصورت ہوں۔ خیر یہ تو اس کا حسنِ ذوق ہے۔ سرورق کی حسینہ اس بار واقعی حسینہ کہلانے کے لائق تھی۔ سرورق کے جائزے کے بعد نہ چاہتے ہوئے صفحہ پلٹا تو تبت سنو کے اشتہار پر نظر پڑی۔ یہ کریم تو میری دادی اماں استعمال کرتی تھیں۔ اب بھلا کون استعمال کرتا ہے؟ چینی نکتہ چینی میں نگاہ حسیب آتے ہی چھا گئیں۔ تبصرہ اچھا تھا بس تبصرہ نگاروں کا ذکر کرنا پسند نہیں آیا۔ آہا ایمانے زارا بھی آئی ہیں۔ ان کے تبصرے پڑھ کے تو مجھے تبصرے کرنے کا شوق ہوا تھا مگر جانے کیوں یہ کم کم آئی ہیں اور ایمانے دوستوں سے کی گئی نیکیاں ہمیشہ گلے ہی پڑتی ہیں۔ بس دوست گلے نہ پڑ جائیں، نیکیوں کی خیر ہے۔ ریاست خان میک اپ تو آنٹیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھ جیسی ینگ گرل کی فریش ... اسکن تو میک اپ سے خراب لگنے لگتی ہے۔ منصور انکل نے تو اس بار میرا ذکر کرنا ہی گوارا نہ کیا۔ دس از ناٹ فیئر انکل جی۔ انعم جمیل کی کہانی بھی اور تبصرہ بھی۔ ویسے کتنا مزہ آئے اگر تمام رائٹرز بھی تبصرے لکھیں اور ایک دوسرے کی کہانیوں کا تیا پانچہ کریں اور ہم مزے سے تماشا دیکھیں۔ بشریٰ افضل کی آمد اچھی لگی۔ اگلی بار یہ تبصرہ کریں گی تو امید ہے وہ بھی اچھا لگے گا۔ منحہ رمشا نے ایک ہی تبصرے میں تین تین شمارے نمٹا دیے۔ واہ۔ بابر انکل کا رونا دھونا پڑھ کے بڑی ہنسی آئی۔ آپ نے جواب بھی ٹکا کے دیے۔ ویسے آپ کے برجستہ جوابات محفل کا مزہ دوبالا کردیتے ہیں مگر جانے کیوں آپ کا مزاج کبھی کبھار ہی خوشگوار ہوتا ہے۔ (نہیں جی ہم تو ہمیشہ خوشگوار موڈ میں ہوتے ہیں) کہانیوں میں اس بار الٹا سفر شروع کیا یعنی آخری کہانی سب سے پہلے پڑھی۔ پہلا سین پڑھ کے اندازہ ہوا کہ کہانی سنسنی و ایکشن سے بھرپور ہوگی لیکن پہلے سین کے بعد کہانی کہیں اور ہی جا نکلی۔ تھوڑا ایکشن، تھوڑی پراسراریت، تھوڑا سسپنس مگر جب پہلے سین کا عقدہ کھلا تو توقع کے برخلاف ایکشن بڑھنے کے بجائے کہانی ہی ختم ہوگئی۔ ماہ رخ ارباب لکھتی بہت اچھا ہیں مگر کہانی اکثر ان کی زیادہ مزے کی نہیں ہوتی۔ (تو بتا دیں نا کون سا مسالا رہ جاتا ہے) امجد بلال کی چہرہ در چہرہ میں پولیس والوں کی تفتیش کا انداز بڑا بورنگ رہا۔ بڑی مشکل سے یہ تحریر مکمل کی کہ پیسے لگے تھے ڈائجسٹ پر۔ کبیر عباسی کی راہِ نجات نے شروع میں دماغ کا خوب دہی کیا۔ کچھ الجھن کے ساتھ بوریت بھی ہوئی مگر اختتامی صفحات نے کہانی کا رخ ہی یکسر موڑ کے کہانی کو شاہکار کا درجہ دے دیا۔ واقعی ماں تا کی ایسی دلگداز کہانی شاید کبھی پڑھنے کو نہیں ملی۔ طاہر جاوید مغل کی سازش ان کی پچھلی کہانی ہنگامی شادی کا تسلسل رہی اور تبصروں سے اندازہ ہوا کہ یہ ان کی کسی قسط وار کہانی کے کرداروں پر مشتمل تحریر ہے۔ (جی ہاں تمام کردار للکار سے تعلق رکھتے ہیں) تبھی پچھلی بار کچھ الجھی اور ادھوری سی لگی تھی۔ بہرحال اس بار بھی کہانی تو عام سی تھی مگر مغل صاحب کے انداز نے کہانی کو چار چاند لگا دیے۔

سیف اندازِ بیاں رنگ بدل دیتا ہے
ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں

سرور اکرام کی جھوٹا بھی اچھی تحریر تھی۔ حسام بٹ کی شب آزما بہت زبردست لگی۔ مگر اس بار انہوں نے اردو کے زیادہ مشکل الفاظ استعمال نہیں کیے۔ بھلا وہ کیوں؟ ان الفاظ کا بھی اپنا ہی لطف تھا۔ منظر امام نے محبت کی طاقت سے تعلیم کی اہمیت اجاگر کی اور خوب کی۔ عمران قریشی کی بساط بھی متاثر کن رہی لیکن ایسی تحریر چند ماہ قبل بھی پڑھی تھی جس میں میاں بیوی دونوں ایک دوسرے کو قتل کراتے ہیں اور دونوں ہی قتل ہو جاتے ہیں۔ بہرحال اس کے باوجود پڑھ کے مزہ آیا۔ انعم تجیل کا تبصرہ پڑھا تھا سو کہانی بھی پڑھ ڈالی۔ بڑی عمدہ کہانی لکھی۔ سائنس، فکشن اور تجسس کے انوکھے امتزاج نے بڑا لطف دیا۔ زویا اعجاز کی روپ بہروپ شروع کی مگر کمزور مکالموں کی وجہ سے کچھ خاص مزہ نہ آیا۔“

جاسوسی کے پرانے قاری وقار احمد کی پُر بہار حاضری ”امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ طویل عرصے کے بعد ایک بار پھر محفل میں حاضر ہونے کی جسارت کر رہے ہیں۔ بوجہ ملازمت بیرونِ ملک جانے سے جاسوسی کا مطالعہ تعطل کا شکار ہو گیا تھا۔ کرونا کی وجہ سے جاب ہی ختم ہو گئی تو واپس آنا پڑا۔ اب ہم ہیں اور فراغت...... اس فراغت میں جاسوسی کی یاد آئی اور وہ دور یاد آیا جب کبھی ہم بھی تبصرہ لکھا کرتے تھے۔ اسی دور کی یاد تازہ کرنے دوبارہ حاضر ہیں۔ (خوش آمدید) سرورق انتہائی پُرکشش لگ رہا ہے۔ نیچے لیٹا بندہ شاید حسینہ کے جلوے کی تاب نہ لا کے چل بسا اور دوسرا فرد اسے چادر سے ڈھانپ رہا ہے۔ پولیس والا بھی سوچ میں پڑا ہے کہ اسے قتل کا کیس بناؤں یا جانے دوں۔ محفل میں بشریٰ افضل اور بابر عباس کے نام ہی جانے پہچانے لگے اور ان کے تبصرے دیکھ کے انوکھی خوشی ہوئی۔ ماشاءاللہ سے یہ تین عشروں سے اپنا شوق قائم رکھے ہوئے ہیں۔ نئے لوگوں کے تبصرے بھی خوب رہے۔ خاص طور پر ایمانے زارا اور نورین مبارک کے تبصروں نے دل موہ لیا۔ فہرست میں زویا اعجاز اور کبیر عباسی کے نام دیکھ کے حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی، واہ بھئی، ہمارے دور کے تبصرہ نگار تو رائٹر بن بیٹھے۔ سب سے پہلے راہِ نجات کا مطالعہ شروع کیا۔ شہزادہ کہسار کے جیسے تبصرے ہوتے تھے، ویسا ہی شوخا ان کی کہانی کا ہیرو رہا۔ کہانی میں مزاح تو نارمل درجے کا ہی تھا کہ ایسا مزاح تبصرے میں تو اچھا لگتا تھا مگر کہانی میں کچھ خاص اثر نہ چھوڑ سکا۔ بہرحال کہانی میں تجسس عروج پر رہا اور اختتام نے تو ششدر کر دیا۔ بڑا ہی عمدہ لکھا کبیر عباسی نے۔ زویا اعجاز کی روپ بہروپ کے آغاز نے حیران کر دیا۔ ایک خاتون کے اتنا بولڈ لکھنے کی توقع نہ تھی۔ بہرحال جلد اس جھٹکے سے خود کو سنبھالا اور کہانی پڑھنے میں مگن ہو گئے۔ جاری ہے دیکھ کے ایک اور جھٹکا لگا۔ مکمل تبصرہ تو کہانی کے مکمل ہونے کے بعد ہی ہو سکتا ہے بہرحال ان کی تحریر بھی تجسس سے بھرپور ہے۔ طاہر جاوید مغل کی سازش میں تابش اور عمران کے کرداروں نے مزہ دوبالا کر دیا۔ آہا...... کیا دور ہوتا تھا جب ہم لکار پڑھا کرتے تھے۔ اور عمران کی موت نے کیسے ہمیں کئی دن تک افسردہ رکھا تھا۔ بہت بہت اچھا لگا ان کے بارے میں دوبارہ پڑھ کے۔ ایک تجویز ہے کہ ان کرداروں پر مشتمل سرورق کا رنگ یا طویل کہانی ہو تو بہت مزہ آئے۔ (یہی گزارش کی ہے ان سے) حسام بٹ نے شب آزما میں خوب جھٹکے دیے۔ اچھی لگی ان کی تحریر۔ عمران قریشی کی تحریر بساط میں بھی جھٹکا لگا۔ جب سید صاحب کو کمپاؤنڈر انجکشن لگانے آیا تو یکدم ذہن میں ایک خیال سا کلک ہوا کہ یہ تحریر تو پہلے سے پڑھی ہوئی ہے۔ اور اس کا اختتام بھی یاد آ گیا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ ایم اے راحت نے لکھی تھی۔ منظر امام کی محبت کی طاقت دلچسپ تحریر تھی۔ سرور اکرام کی جھوٹا بھی ٹھیک رہی۔ سرورق کے رنگوں میں پہلا رنگ اوسط درجے کا رہا۔ جبکہ دوسرا رنگ متاثر کرنے میں کامیاب رہا۔ ماہ رخ ارباب بڑی کہنہ مشق مصنفہ معلوم ہوتی ہیں۔ فی الحال اتنا ہی شمارہ پڑھ پایا ہوں۔ براہِ کرم تبصرے کی آخری تاریخ بتا دیں کہ کس تاریخ تک ہم تبصرہ لکھ سکتے ہیں؟ شکریہ۔“ (تبصرے 10 تاریخ تک مل جائیں۔ تشریف آوری کا ازحد شکریہ۔ آئندہ بھی تبصرے کے منتظر رہیں گے)

محمد قدیر کی ای میل ”السلام علیکم! کافی عرصے سے جاسوسی کا خاموش قاری ہوں محفل میں پہلی حاضری ہے۔ چینی نکتہ چینی پر سرسری سی نظر ڈال کر بھاگتے ہوئے کہانیوں کی فہرست میں چلے جاتے تھے اور سوچتے تھے کہ بھیجیں گے تبصرہ کسی دن۔ لیکن وہ دن آتے آتے مزید چار سال لگ گئے، ہے نا حیرانی کی بات۔ چلتے ہیں کہانیوں کی جانب۔ روپ بہروپ زویا اعجاز کی کہانی سے ابتدا کی۔ محبت کی بھیک مانگنے پر اسٹارٹ لینے والی اس کہانی کا اندازہ نہیں تھا کہ اتنی سنسنی خیز ہو گی۔ پہلا قتل ہوا ہے شازیہ کا جو گھناؤنے کردار کی مالک ہے۔ رشی ایک وڈیو حاصل کرنے کے لیے شازیہ کو قتل کرتا ہے پھر اس کے بعد دوسرا قتل اقصیٰ کا ہوتا ہے یہ بھی شازیہ کے نقشِ قدم پر چلتی ایک لڑکی تھی۔ سسپنس سے بھرپور کہانی میں بادی النظر میں تو مقتولین کے ایسے جرائم نہیں کہ انہیں قتل کر دیا جائے لیکن کچھ کڑیاں ضرور ہیں جنہوں نے ماضی میں رشی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہو گا۔ لیکن رشی کی بے انتہا نفرت دیکھ کر جھرجھری سی آ گئی۔ ابھی دو ٹارگٹ اور اس کی نظر میں ہیں جن کو وہ منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے بے چین ہے۔ پہلی قسط شاندار رہی۔ دیکھتے ہیں دوسرے حصے میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ اس کے لیے بے چینی سے اگلے حصے کا انتظار ہے۔ کڑوا سچ تنویر ریاض کی کہانی بھی منفرد رہی۔ ایمانے اپنی ماں کے قاتل کے لیے کافی تگ و دو کی۔ بہن بھائیوں کو ساتھ لے کر چلی اور انصاف حاصل کر ہی لیا۔ خوف گزیدہ انعم جبلیہ کی کہانی واقعی دلچسپ تھی اور شاندار رہی۔ انتقام کی آگ میں جھلستا ایک باپ جس کی بیٹی کو اتفاقیہ طور پر ہو جانے والی غلطی کی اتنی بڑی سزا دی گئی کہ بے چاری کا مستقبل تاریک ہوا اور اس نے خودکشی کر لی۔ ولیم نے بیٹی کی خودکشی کا سبب بننے والوں انتقام لیا اور چڑھتے سورج کو ڈوبتا ستارہ بنا دیا۔ انصاف، حسنین چوہدری کی کہانی بھی ٹھیک ہی تھی آخر میں... مزید سنسنی کی توقع تھی جو پوری نہ ہو سکی اور کچھ خاص اثر نہیں کیا۔ بساط، عمران قریشی، اس میں شطرنج کے دو دوست جو گھریلو حالات کے ستائے ہوئے تھے۔ مشتاق اور اس کی بیوی مالی پریشانی کا شکار ہو کر بیٹھے قاتلوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ ان کا طریقۂ واردات مختلف اور انوکھا سا تھا۔ سید صاحب دوسری شادی کے چکر میں پہلی والی سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مشتاق نے

مخصوص رقم لے کر ان کو راہ نجات تو دلائی لیکن سید صاحب لاعلم رہے کہ یہی ڈیل ان کے لیے بھی ہو چکی تھی۔ مکافاتِ عمل پر لکھی گئی دلچسپ اور بہترین تحریر تھی۔ بھٹی صاحب کی الاؤ بھی آہستہ آہستہ سرک رہی ہے اگلی قسط یقیناً مزید سنسنی خیز ہو گی۔ محبت کی طاقت، منظر امام، علم کے حصول کو وقت کا ضیاع سمجھنے والوں کے لیے بہترین سبق۔ صنوبر نامی لڑکی نے علم کی شمع جلانے کی اچھی کوشش۔ شب آزما، حسام بٹ کی کہانی بھی لاجواب رہی۔ ذاکر بے روزگار تھا پھر اس کو ایک عجیب سا روزگار ملا۔ کرائم رپورٹر کی بیوی نے کرائم میں پی ایچ ڈی کر لی۔ ذاکر جو بیوقوف بنا رہا لیکن کام پورا ہوتے ہی حقیقت جاننے کے لیے بے تاب ہو گیا۔ پہلی محبت از سیرینا راض۔ یہ بھی عمدہ کہانی رہی۔ البرٹ نے تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے جلی ہوئی راکھ سے سابقہ گرل فرینڈ شیلا کے قاتل کو پھنسا دیا اور روایتی طور طریقے سے ہٹ کر پولیس کے بجائے جرم کی شریک کار کو خوفزدہ کر دیا۔ انا گیر نے رفتار پکڑ لی۔ مزید خون کے دریا بہتے نظر آ رہے ہیں۔ جھوٹا م سرور اکرام کی کہانی نے دکھی کر دیا۔ اس کہانی نے احساس دلایا کہ ہر انسان کا اپنا مقام ہے دنیا چاہے جس نظر سے دیکھے لیکن اللہ تعالیٰ جسے عزت دینا چاہے تو اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں...... سازش، طاہر جاوید مغل نے عمران دانش کو زندہ کر دیا۔ پرانے زخم تازہ ہو گئے۔ آخری گولی اور آخری سانس تک لڑنے والا ہیرو واپس آ گیا۔ تابش چاچو بن گیا اور عمران۔ اس کہانی نے شمارے کو تحقیقی معنوں میں چار چاند لگا دیے۔ راہِ نجات کبیر عباسی کی کہانی نے حیران کر دیا نسیمہ کو طلاق ہوئی اس نے حنان کے ساتھ مل کر شاہینہ کو طلاق دلوائی تو میں سمجھا حساب برابر لیکن آگے مزید سنسنی خیز کہانی منتظر تھی۔ ماں ماں ہی ہوتی ہے اس نے ایک برا فیصلہ کر کے اولاد کے لیے اچھی زندگی کی کوشش کی۔ یہ کہانی بھی لاجواب رہی۔ حنان 007 بن رہا تھا لیکن ماموں بن گیا۔ ہاہاہا چہرہ در چہرہ سرورق کے رنگوں میں سے پہلا رنگ ابھار رہا۔ احمد بلال نے قانون اور مجرموں کی آنکھ مچولی پر ایکشن سے بھرپور کہانی لکھی۔ چاہ کر بھی اس کہانی کے لیے بریک نہ لے سکا۔ دوسرا رنگ مارخ ارباب کا تھا نام تو پسند آیا ہی کہانی کا لیکن کہانی بھی دھانسو قسم کی لکھی۔ ارتضی، ربیعہ، ازبک یہ سارے ہی جی دار نکلے۔ ایکشن تھرل اور سسپنس سے بھرپور رنگ رہا۔ مارخ ارباب کا قلم بھی زوردار کہانیاں اگل رہا اور آگے بھی یہی امید ہے۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ ... سابقہ شماروں سے بہترین رہا۔ اب ان شاء اللہ حاضری لگتی رہے گی۔"

جامشورو سے پرویز لانگاہ کا خلاص نامہ "پاکستان واپس آنے کے بعد زندگی بڑی عجیب ہو گئی ہے اور ساری ترتیب خلاص ہو چکی۔ رہی سہی امیدوں پہ کورونا نے پانی ڈال کر سب خلاص کر ڈالا ہے۔ ایسے میں جاسوسی اچانک ہی ملا اور بے غم کے علاوہ سارے غم خلاص کر ڈالے۔ ٹائٹل کی حسینہ نظروں سے سب کچھ درہم برہم کرتے ہوئے دل کو خلاص کر رہی تھی اس لیے میں نے بھی محفل میں بوریت کو خلاص کرنے کے لیے شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہاؤ ہو کی صدارت پر نگاہ حسیب نظروں ہی نظروں میں کہانیوں کو خلاص کرتی رہیں لیکن دیگر ہاؤ ہو کرنے والوں پر نگاہِ کرم ہی نہ کی؟ میری بھوا یمانے نے اردو ڈکشنری گھول کر پینے کے بعد تبصرہ شاید خلاص کیا تھا اس لیے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی کے ٹانکے بھی لگاتی رہی۔ شاباش لڑکی تم ایک دن میرا سر فخر سے ضرور بلند کرو گی اور ماؤنٹ ایورسٹ سے بھی اونچا مقام خلاص کرو گی۔ ریاست خان نے چینی نکتہ چینی تو اچھی کی لیکن کہانیوں پہ تبصرہ خلاص کرتے ہوئے مختصر ہی رہے۔ منصور کامران چاچا جی آنکھوں کا آپریشن کرانے کے چکر میں خلاص ہونے کا ارادہ کر رہے تھے۔ اللہ سے دعا ہے کہ آپ کا آپریشن کامیاب ہوتا کہ آپ کو جاسوسی ڈائجسٹ کی کہانیاں پڑھتے ہوئے تکلیف نہ ہو۔ نورین مبارک سب کو انکل آنٹی بنا کر منی بیگم کے عہدے پر خلاص کر گئیں۔ بٹیا رانی تم سے نا ہو پائے گا۔ ہماری بھوا یمانے ایک ہی پیس ہے۔ انعم جمیل نے نکتہ چینی کے ساتھ ساتھ کہانیوں میں بھی حصہ ڈالا تو اس ڈبل انٹری خلاص کرنے پر میری طرف سے بھی ڈبل ڈبل مبارکبادیاں۔ یہ بشریٰ افضل کو کس کونے کھدرے سے خلاص کر کے نکالا؟ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، امید ہے کہ اب چکر لگاتی رہیں گی۔ منحہ رمشا نے دو دو ماہ کے رسالوں کو تبصرے میں خلاص کیا۔ واہ بھئی واہ! یہ آئیڈیا میرے دماغ میں کیوں نہیں آیا؟ شاید درہم برہم نے سب خلاص کر ڈالا ہے۔ بابر عباس بابا جی نے اپنی عمر کا تقاضا پورا کرتے ہوئے سب کو خلاص کیا۔ اشکے بھئی اشکے۔ سب سے پہلے تو جانِ محفل جانِ للکار، عمران کی کہانی سازش پڑھی۔ دل خوش کر دیا لیکن تشنگی سی رہ گئی۔ عمران دانش کا کریکٹر بڑا جالم ہووت ہے اور اتنے تھوڑے سے صفحوں والی کہانی میں ہم کا مجا نہ آوت ہے تو آپ سے ہاتھ جوڑ کر گجارش کرت ہوں کہ ایسا کہانی ابتدائی صفحات یا رنگوں میں پیش ہو جاوت تو ہمرا بھی دل خوش جاوت۔ رنگوں میں ماہ رخ ارباب نے کیا خوب رنگ خلاص کیے مزہ ہی آ گیا۔ احمد بلال نے بھی اچھا لکھا لیکن کہانی پر گرفت نہ رکھ پائے اور سارہ مزہ خلاص کر ڈالا۔ انعم جمیل نے پہلی کہانی میں ہی جاسوسی ماحول ڈال کر سارے اندیشوں کو خلاص کر ڈالا۔ بہترین لکھا، ان کو مزید لکھنا چاہیے۔ منظر امام اور سرور اکرام نے بھی مزے کرائے اور سارے غم خلاص کر ڈالے۔ حسام بٹ نے بھی سسپنس ڈال کر دماغ کو خلاص کر ڈالا۔ شب آزما بہترین کہانی رہی۔ کبیر عباسی پائین نے بھی ماں کی ممتا کے ہاتھوں حنان کی عقل کو خلاص کروا دیا۔ الاؤ اور انا گیر مارے باندھے پڑھتا ہوں ورنہ سچی بات یہی ہے کہ ان قسط وار کہانیوں نے جاسوسی کا سارا شوق ہی خلاص کر ڈالا ہے۔ برائے مہربانی مغل صاحب کو واپس قسط وار پر لگائیں تاکہ وہ للکار اور انگارے جیسی دھانسو کہانی لکھ کر قارئین کی سب شکایتیں خلاص کر ڈالیں۔ آخر میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ خلاص درہم برہم کر کے نیا برانڈ لانچ کروں یا ان کو چلاتا رہوں۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

راحیل علی، کراچی۔ سونیا جمشید، کوٹری۔ راحت علی، کراچی۔ شمیم اختر، حیدر آباد۔ نوید رشید، پشاور۔ شہناز اقبال کراچی۔

روپ بہروپ

زویا اعجاز

دوستی کے ذریعے ہی محبت اور عداوت پیدا ہوتی ہے اور پھر نئے نصاب اور نئی داستاں جنم لیتی ہے... طبیعت کا تضاد عجیب و غریب کیفیات کو اجاگر کرتا ہے... کبھی الجھاؤ... کبھی عقل و ہوش سے یکسر آزاد... انگ انگ میں ترنگ... ہر واقعے میں واردات کا رنگ، آواز و انداز... لمس اور احساس جداگانہ ہوتا ہے... شکستہ بام اور دریچوں میں قیام پذیر ایسی ہستی کی داستانِ تحیر... جس کا عکس ہر بار مختلف ہوتا تھا... شخصیت کی دہری پرتوں میں مقید... اس کا کردار، مزاج اور سایہ... کبھی ستارہ... کبھی تہمت تھا... ہر دن اس کے لیے ایک امتحان تھا... ملال و رنج... خوف و خطر... ذہنی انتشار مسلسل اس کے ہم رکاب تھے... جذباتی لغزشیں اور انتقامی جنون نے اسے ہر میدان کا ماہر کھلاڑی بنا دیا تھا...

اپنی ذات کے اندھیروں میں چھپے روپ بہروپ چھلاوے کی تباہ کاریاں.....

رشی [illegible] کے اس کھیل میں اگلی اننگز کھیلنے کے لیے بہت پُرجوش تھا۔

ایک بہترین [illegible] سے اپنی زندگی کے مجرموں اور پریشانیوں کو کلین بولڈ کرنے کا احساس اس قدر دل فریب تھا کہ دل بار ہا یہ تجربہ دہرانے کے لیے مچل اٹھتا۔ اب محض دو بہترین گیندیں پھینک کر وہ اس میچ میں بہ آسانی فتح حاصل کر سکتا تھا۔ [illegible] کی دماغی رو بھی انہی دو 'وکٹس' کی طرف منتقل رہتی تھی۔

اس وقت بھی بظاہر وہ [illegible] کھول کر پڑھائی میں مگن دکھائی دے رہا تھا لیکن ذہن [illegible] رہے تھے۔

[illegible] وکٹ [illegible] کرنے کے لیے اس کی [illegible] خامیوں پر کام کیا جاتا ہے۔ مجھے بھی اس کے روزمرہ امور اور فطرت سے مکمل واقف ہونا پڑے گا۔ [illegible] اختیار کرنا پڑے، اس لڑکے کی ریکی بہت ضروری ہو چکی ہے۔" اس نے کتاب کے دو چشمی الفاظ میں بال پوائنٹ سے رنگ بھرے۔

کتاب کے صفحات کو اس طرح رنگین کرنا اس کی دیرینہ عادت تھی۔ اس مشغلے کے دوران نئی حکمتِ عملی وضع کرتے ہوئے بال پوائنٹ کی سیاہی ختم



ہوئی تو ہاتھ خودکارانداز میں دوسرا پین نکالنے کے لیے جیب کی طرف بڑھ گیا۔ وہ عادتاً ایک پین جیب میں ضرور رکھتا تھا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے دوران وہ پین کی منتقلی کرنا کبھی نہیں بھولتا تھا۔ اس روز اقصیٰ کے گھر سے آنے کے بعد لباس تاحال تبدیل ہی نہیں کیا تھا۔ مختلف جیبیں ٹٹولتے ہوئے وہ پین کی غیر موجودگی سے اُلجھ کر رہ گیا۔

''کیا مصیبت ہے یار؟ میرا دماغ حاضر ہی نہیں رہتا۔ کدھر رکھ کے بھول گیا ہوں اسے؟'' وہ جھنجلایا۔ خصوصی ساخت کا وہ قلم ایک 'تحفہ' تھا جو اسے بہت پسند تھا۔

اس لمحے موبائل کی متواتر بجتی گھنٹی اسے اپنی جانب متوجہ نہ کرتی تو اس نئے اضطراب کی خلش اسے کچھ دیر یونہی بے چین رکھتی۔ یہ گھنٹی واٹس ایپ کے ایک مخصوص گروپ کے لیے سیٹ کی ہوئی تھی۔ اس نے موبائل کھول کر پیغامات کا جائزہ لیا اور یکدم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ یہ گروپ دراصل اس کے چند ہم جماعت ساتھیوں کا تھا۔ سب سے پہلے پیغام میں حمزہ نامی لڑکے نے ایک تصویر کے ساتھ عنوان دیا تھا۔

''دوسروں کو اپنی اداؤں سے قتل کرنے والی میم شازیہ کا پُراسرار قتل۔''

اس پیغام کے بعد دیگر لڑکوں نے حیرت، خوف، سنسنی اور دہشت پر مبنی اسمائیلیز بھیجنے کی ریس لگائی تھی۔

''اِٹس سوسیڈ! کب ہوا یہ حادثہ؟'' مناہل نے آنسو بہانے کی اسمائلی بھیج کر لکھا۔

''پولیس تفتیش کر رہی ہے لیکن ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا۔'' حمزہ نے جواب دیا۔

''لیکن یہ سب ہوا کیسے؟ میم شازیہ کی کسی کے ساتھ کوئی دشمنی تھی کیا؟ میں نے تو سنا تھا کہ وہ ایسے لانگ ویک اینڈز پر اپنے گھر چلی جایا کرتی تھیں۔'' لائبہ نامی ایک لڑکی نے بھی ڈھیروں آنسوؤں کے ساتھ لکھ کر بھیجا۔

رشی کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ ان سب کے تاثرات اچھی طرح جانچنے کے بعد ہی کوئی جواب دینا چاہتا تھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ ان کی موت 'مرنے' سے ہوئی ہے۔'' مزمل نامی لڑکے نے ایک عظیم انکشاف کیا۔

''نہیں باس! ایسا نہیں ہے۔ مجھے کنفرم اطلاع ملی ہے کہ میم شازیہ کی موت مرنے سے نہیں بلکہ جان جانے سے ہوئی ہے۔'' فواد کے اس انداز سے رشی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ شازیہ کی فطرت اور کردار کے باعث کوئی بھی لڑکا اس کے قتل پر سنجیدہ نہیں تھا۔ شازیہ کے لیے سبھی کے جذبات بہت منفی تھے۔

''شٹ اَپ یو ایڈیٹس!'' مناہل نے انہیں ڈپٹا۔ ''حمزہ! تم بتاؤ کہ ڈیڈ باڈی سب سے پہلے کسے ملی تھی؟''

''ان کی روم میٹ کو۔ وہ کسی ہوٹل میں ورکر تھی۔ اپنے آبائی علاقے سے واپس آئی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی بوائے فرینڈ بھی تھا۔ اب اتفاق سمجھو کہ وہ شخص پولیس اہلکار تھا۔ ان دونوں نے ہی ڈیڈ باڈی سب سے پہلے دیکھی تھی۔'' حمزہ کے گول مول سے انداز پر رشی کے لیے قہقہہ ضبط کرنا مشکل ہونے لگا۔

''ہائے بے چارے! میم نے مرتے مرتے بھی ان کی 'ڈیٹ' خراب کر دی۔'' عبید نامی لڑکے نے لوفرانہ جواب دیا۔ دیگر لڑکے بھی اس کے ہم نوا بن کر اس صورتِ حال کا ریکارڈ لگانے لگے۔

''کچھ شرم ہوتی ہے...... کچھ حیا ہوتی ہے...... تم میں سے کسی کو پتا بھی ہے کہ وہ کیا ہوتی ہے؟'' رشی نے مسکراتے ہوئے لکھا۔ ''اس گروپ میں گرلز بھی ہیں۔ کم از کم ان کے سامنے تو ایسی حسین گفتگو نہ کرو۔''

''مرنے والی کی برائی کرنے کا کیا فائدہ؟ تم سب ان کے ایصالِ ثواب کے لیے ایک بار دعا کر دو۔'' حمزہ نے گفتگو کا رخ تبدیل کیا۔ گروپ کا ماحول تھوڑی دیر کے لیے سنجیدہ ہو گیا۔

آف لائن ہو جانے کے باوجود رشی کئی لمحوں تک شازیہ کی تصویر زوم کر کے دیکھتا اپنی اذیت یاد کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر موت کی سختی اور کرب رشی کے دل کو ایک عجیب سکون دے رہی تھی۔ دس منٹ بعد اسکرین پر مناہل کا نام اور نمبر جگمگانے لگا۔

''گروپ میں آؤ رشی! مجھے سب کے ساتھ ایک اہم بات کرنی ہے۔'' اس نے عجلت میں کہا۔

''جو سب کے ساتھ ہو وہ اہم کیسے ہوگئی؟'' رشی سنجیدہ ہو گیا۔ اسے مناہل کی ان سب کے ساتھ گفتگو پسند ہی نہیں تھی۔

''وہ دراصل میں چاہ رہی تھی کہ ہمیں میم کے گھر تعزیت کے لیے جانا چاہیے۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نہ اس کے گھر کسی سے تعزیت کرنے کی اور نہ ہی گروپ میں کسی کے سامنے ایسی بات کرنے کی۔'' وہ برہم ہوا۔

''کیوں؟ اس میں حرج ہی کیا ہے آخر؟'' مناہل نے

مُرا منایا۔

”تمہیں ابھی بھی اس عورت کے کیلیبر کا اندازہ نہیں ہوا؟ کالج کا کوئی ایک لڑکا بتادو جو اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہو۔ تم ان کے سامنے اس کی حمایت کروگی تو تمہیں بھی اسی کیٹگری میں سمجھنے لگیں گے اور میں ایسا ہرگز نہیں چاہتا۔“

”میں کالج کے اسی ایک لڑکے سے بات کررہی ہوں جو میم شازیہ کو ہی نہیں بلکہ ہر عورت کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔“ مناہل نے دوبدو جواب دیا۔ رشی کچھ لمحوں کے لیے گنگ رہ گیا۔

”پتا نہیں مجھے ایسا کیوں لگتا ہے تم بدل گئے ہو۔ تم وہ رشی رہے ہی نہیں جسے میں جانتی تھی۔“

”میں اس وقت کسی تبدیلی کے متعلق بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں نے جو کہا ہے اسے اپنے ذہن میں بٹھالو۔ شازیہ یا کسی بھی حوالے سے ان لڑکوں کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ مزید سنجیدہ ہوا۔

”میم سے اب وہ صرف شازیہ ہوگئی ہیں۔ پھر کہتے ہو کہ کسی تبدیلی پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔“ مناہل افسردگی سے ہنسی۔

”تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔“ رشی نے تلخی سے کہا۔ مناہل نے کچھ ثانیوں تک خاموش رہنے کے بعد رابطہ منقطع کردیا۔

رشی نے فون ایک جانب پٹخا اور اپنا سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اسے اپنے رویے میں اس تبدیلی کی وجہ سمجھ ہی نہیں آرہی تھی۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی مانو۔ میں ایسا تو نہیں ہوا کرتا تھا۔ اچھے خاصے حساس، بامروت اور پُرخلوص شخص سے میں یہ کس جون میں آگیا ہوں؟ ایک پل میں کچھ ہوتا ہوں۔ دوسرے ہی پل میں ایسے ہائپر ہوجاتا ہوں۔“ وہ بےچینی سے اپنی پیشانی مسلنے لگا۔

”یہ سب کرامات اس ایک ویڈیو کی ہیں۔ میری اچھی خاصی زندگی کی واٹ لگادی ہے اس ویڈیو نے۔ میرے مجرم جب تک زندہ ہیں میں کبھی بھی نارمل رہ ہی نہیں سکتا۔“ اس نے اپنا ایماندارانہ تجزیہ کیا۔

”دو مجرم تو اپنے انجام تک پہنچ چکے ہیں۔ اب صرف دو ہی باقی رہ گئے ہیں۔ یہ دو بھی کیوں زندہ ہیں؟ انہیں بھی جلد از جلد اس دھرتی کو اپنے بوجھ سے آزاد کرنا ہوگا۔ میں اس کشمکش میں نہیں جی سکوں گا۔ مجھے آزادی کا لطف لینا ہے۔ کھل کر سانس لینا ہے۔ جب تک منیب اور جمال ٹھکانے نہیں لگ جاتے، میں اسی طرح ہلکان رہوں گا۔ اسی طرح مناہل سے جھگڑتا رہوں گا۔“ سوچوں کے پے درپے وار سے نڈھال ہوکر اس نے کتاب بند کی اور آنکھوں پر ہاتھ رکھے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ نیند کی وادی میں اترنے سے قبل اس نے اگلے چند دنوں میں ہی اپنے تینوں ننھے دوستوں سے ملنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

☆☆☆

منیب اپنے اکلوتے کمرے میں رکھے ٹی وی سیٹ کے چینل کھنگال رہا تھا۔

اس کی آنکھوں میں بےبسی اور چہرے پر جھنجلاہٹ واضح محسوس کی جاسکتی تھی۔ کچھ دیر چینل بدلنے کے بعد اس نے ریموٹ ایک جانب پٹخ دیا۔ اقصیٰ کی موت کو تین روز بیت چکے تھے۔ معمولاتِ زندگی میں آنے والا خلا تو ساری زندگی ہی ناقابلِ عبور رہنا تھا۔ منیب کی کیفیت بھی سنبھل نہیں پارہی تھی۔ اسے دوپہر سے ہی ہلکی حرارت محسوس ہو رہی تھی۔ جسم میں درد اور تھکاوٹ کا بھی عجیب عالم تھا لیکن کوئی بھی کیفیت ان احساسات کو مات نہیں دے پاتی تھی جو کمرے میں آنے کے بعد اس پر حاوی ہونے لگتے تھے۔

اسے اقصیٰ کا بےلباس وجود، پیشانی پر کندہ الفاظ اور موت کی اذیت سے مسخ چہرہ یاد آتا تو شریانوں کا تمام تر خون کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگتا۔ اقصیٰ کے تصور کے ساتھ ہی کسی مرد کا نادیدہ ہیولا بھی اس کا منہ چڑاتا اور منیب کے دل میں نفرت کا الاؤ دہکنے لگتا۔

”یااللہ! میں کیا کروں؟ مجھے اس اذیت سے نجات دلادے۔ میرا مجرم میرے سامنے لے آنا۔“ اس نے تڑپ کر دعا کی۔

حرارت اب بخار میں تبدیل ہورہی تھی۔ اس پر مستزاد شدید بھوک ناقابلِ برداشت ہوچکی تھی۔ منیب کو نقاہت سے غنودگی محسوس ہونے لگی۔ کچھ لمحوں بعد دروازے پر کھٹ پٹ کی آواز نے اسے اپنی جانب متوجہ کرلیا۔ منیب کے اندازے کے عین مطابق جمال کی واپسی ہوئی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں نان حلیم اور دوسرے میں ڈھیروں آلو کے شاپر تھے۔ منیب نقاہت کے باوجود ایک جھٹکے سے اٹھا اور اس کے ہاتھ سے کھانا جھپٹ لیا۔

”اور تھوڑی دیر نہ آتے تو... میری بھوک سے جان نکل جانی تھی۔“ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا اور عجلت میں باورچی خانے کی طرف بڑھ گیا۔

کھانا برتنوں میں منتقل کرتے ہوئے وہ مقدار کے

حوالے سے اُلجھ گیا تھا۔ دو نان اور ایک پلیٹ حلیم ان دونوں کے لیے لازماً کم پڑ جاتی۔ وہ کھانا لیے کمرے میں واپس آیا تو جمال بستر پر لیٹ چکا تھا۔

''کیا بات ہے؟ طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟'' منیب نے پوچھا۔

''ہاں! معدے میں تھوڑا مسئلہ ہے۔ ابھی آتے ہوئے ڈاکٹر کو چیک کروا کے آیا ہوں۔''

''کیا بتایا ہے اس نے؟'' منیب نے نان کا بڑا سا لقمہ حلیم میں ڈبو کر منہ میں منتقل کیا۔

''کچھ نہیں! بس یہی کہا ہے کہ بازاری کھانے ختم کر دوں۔ زیادہ نان بھی معدے کے لیے بھاری ہو جاتے ہیں۔ دوسرا بازاری سالن میں مرچیں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ بھی سیدھا معدے پر ہی اثر کرتی ہیں۔'' جمال نے اداکاری کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اقصیٰ ماڑا موٹا جس طرح کا بھی پکاتی تھی کم از کم مسالے اور پکوائی تو صاف ستھری ہوتی تھی۔ اب تو بس تیز مرچیں، کچے پکے جلے ہوئے نان اور خمیری روٹیوں پر ہی گزارا کرنا پڑتا ہے۔''

''بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔ اس کا ایک رستہ میں نے نکال لیا ہے۔'' منیب کے جواب پر جمال کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ وہ زیتون کا ذکر کرنے کے لیے مناسب الفاظ سوچنے لگا لیکن اس کی اگلی بات نے جمال کو سر پیٹنے پر مجبور کر دیا۔

''میں کل سے جلدی گھر آجایا کروں گا۔ انٹرنیٹ پر ہر چیز کا طریقہ موجود ہے۔ میں وہیں سے ریسپی دیکھ کر دالیں، سبزی یا جو بھی سالن ہو بنا لیا کروں گا۔ باقی رہا مسئلہ روٹی کا۔ تو نان یا خمیری کھانے کے بجائے تندور کی سادہ روٹی لے آیا کریں گے۔ سالن پر ہاتھ سیدھا ہو جائے تو روٹیوں کا بندوبست بھی کر لیں گے۔ وہ بھی پکانی آ ہی جائیں گی۔'' وہ سادگی سے کہتے ہوئے بڑے بڑے لقمے منہ میں ڈال رہا تھا۔

''یہ کام زنانیوں کے ہوتے ہیں۔ انہیں ہی جچتے ہیں۔'' جمال نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''زنانی ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ آپ بھی سارا دن باہر رہتے ہیں۔ عورتوں کو مردوں جیسے کام کرتے دیکھتے ہی ہوں گے۔ جب عورت مرد کی ذمے داریاں اٹھا سکتی ہے تو مرد بھی ذرا سی ہمت اور دل بڑا کر کے یہ کام سنبھال ہی سکتا ہے۔''

''تو پہلے ہی سارا دن سواریوں کے ساتھ کھپائی کرتا ہے۔ کیسے کرے گا یہ سب؟'' جمال نے ایک اور کوشش کی۔

''کر لوں گا میں کچھ نہ کچھ۔ آپ ٹینشن نہ لیں۔'' وہ پُراعتماد تھا۔ اس کی بے نیازی اور دوٹوک انداز دیکھ کر جمال اس معاملے میں مزید کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

''کھانا ختم کر لو تو کل کے لیے آلو کاٹ کر پانی میں بھگو دینا۔ صبح گورنمنٹ اسکول کے سامنے چپس لگانی ہے۔'' منیب یہ نیا فرمان سن کر بدمزہ تو ہوا لیکن اپنی ذمّے داریوں اور حالیہ فیصلے کے احساس نے اسے کچھ بھی کہنے سے باز ہی رکھا۔

☆☆☆

تیسرے روز کالج سے فراغت ملتے ہی رشی اپنے تینوں نئے دوستوں سے ملنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

اس نے حسبِ سابق بائیک ساتھ نہیں لی تھی۔ وہ اپنی ایسی کوئی بھی شناخت سامنے نہیں لانا چاہتا تھا۔ ایسی ہی حکمتِ عملی کے تحت اس نے گلی میں ملاقات سے بھی گریز کیا تھا۔ بصورت دیگر وہ محلے داروں کی نظروں میں آجاتا۔ رشی کو یاد تھا کہ آخری روز عبداللہ نے باتوں باتوں میں ذکر کیا تھا کہ وہ سرکاری اسکول کے باہر ایک تکونی گراؤنڈ میں کرکٹ کھیلا کرتے ہیں۔ رشی نے وہیں جانے کا ارادہ کیا اور سہ پہر تین بجے کے قریب گراؤنڈ پہنچ گیا۔ اس کے اندازے کے عین مطابق وہ تینوں مزید دو لڑکوں کے ساتھ وہیں موجود تھے۔ ان نئے لڑکوں کو رشی نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ یقینی طور پر اسکول کے علاقے سے ہی تھے۔ اس کے گراؤنڈ میں داخل ہوتے ہی عبداللہ کی کھیلی گئی شاٹ سے گیند تیزی سے اس کی طرف آئی۔ رشی نے لپک کر گیند کو دبوچ لیا۔ حارث اور سبحان 'ہاؤزیٹ' چلّاتے ہوئے یکدم ساکت ہو گئے۔

''اوئے پائین جی! خیر ہووے بیٹا!'' حارث نے اپنی مخصوص تان لگائی۔ عبداللہ نے بلّا اوپر اٹھایا اور دونوں ہاتھوں سے لہراتے ہوئے اس کی جانب چلا آیا۔

''بہارو پھول برساؤ...... ہمارا رشی باس آیا ہے...... ہمارا رشی باس آیا ہے۔'' وہ اس کے گرد چکر لگانے لگا۔ سبحان اور حارث نے اپنی جگہ پر ہی کھڑے رہ کر دھمال کے سے انداز میں رقص شروع کر دیا۔

''یہ ٹیلنٹ بھی چھپا ہے تم لوگوں میں۔ مجھے تو آج اندازہ ہوا ہے۔'' رشی ہنسنے لگا۔ حارث نے دیگر دو لڑکوں کی جانب دیکھا اور ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بہ آواز بلند بولا۔

''تخلیہ! یہاں سے گو وینٹ گون ہو جاؤ۔ اب یہ وقت صرف ہمارے پائین کے نام ہوگا۔''

''شیخوپورہ سے کب واپس آئے بھائی جی آپ؟'' سبحان نے بھی اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ رشی پُرجوش انداز میں ان سب سے بغلگیر ہوگیا۔

''کل رات ہی آیا تھا۔ اِدھر سے اچانک ہی گزر رہا تو تم لوگ کھیلتے نظر آگئے۔''

''آپ کھیلو گے ہمارے ساتھ؟'' سبحان نے پُرشوق انداز میں پوچھا۔

رشی نے ان کا دل رکھنے کے لیے ہامی بھرلی۔ اگلے ایک گھنٹے میں وہ ان کے ساتھ گرمجوشی سے کھیلتا اپنے ذہنی تناؤ میں واضح کمی محسوس کرتا رہا۔ اس نے جان بوجھ کر ان کے کیچ گرائے، مس فیلڈنگ کی، لائن اور لینتھ سے ہٹ کر باؤلنگ کروائی۔ اس طرزِعمل سے لڑکے مزید گرویدہ ہوگئے۔

''چھوڑو یار! میرے بس میں نہیں ہے یہ فرنگی کھیل۔'' اس نے عبداللہ کی کروائی گئی چوتھی گیند سے 'بیٹ' ہوکر کہا۔

''آپ تو بالکل ہی اناڑی ہیں پائین! ورنہ آج کل تو بچہ بچہ ایکسپرٹ ہے اس گیم میں۔'' حارث کو تاسف ہوا۔

''اپنے چڑی پہلوان! بتایا تو تھا تمہیں۔ میرے محلے میں سارے نان مسلم رہتے ہیں۔ اللہ جنت بخشے میری دادی ان معاملوں میں بڑی سخت تھیں۔ گھر سے باہر کھیلنے ہی نہیں دیا کرتی تھیں۔'' رشی نے ایک اور جھوٹ تراشا جس پر فوری اعتبار بھی کرلیا گیا۔

''آپ یہاں آجایا کریں۔ ہم سکھا دیں گے۔'' سبحان نے جھٹ پیشکش کی۔

''ڈن ہوگیا!'' رشی نے جوش سے کہا۔ ''اور سناؤ! کیسی رہی ڈیکوریشن؟ باقی سب کا رسپانس کیسا تھا؟'' اس نے سرسری انداز اختیار کرلیا۔

''اے ون رہی پائین! کئی لوگوں نے اسپیشل سیلفیاں بنوائیں، ویڈیو کلپ اور ٹک ٹاک بنائیں۔ شام کو میڈیا کے بندے بھی آئے تھے۔ وہ تو قلفی نے مزہ کرکرا کر دیا ورنہ ہم نے تو مختلف چینلز کو اپنی ڈیکوریشن کی ویڈیوز بھیج دینی تھیں۔'' حارث نے منہ بنایا۔

''کیوں؟ اس کو کیا ہوا؟'' رشی نے بے نیازی سے پوچھا۔

''مرڈر ہوگیا تھا اُس کا۔ قاتل نے کوئی بہت ہی پرانی دشمنی چکائی ہے اُس سے۔''

''اوتہاڈی خیر! کون تھا کلر؟ پولیس کیا کہتی ہے؟'' رشی نے حیرت کی اداکاری کی۔

''پولیس کو تو بلوایا ہی نہیں باس۔ کانوں کان بھنک نہیں ہونے دی گئی کسی کو۔ راتوں رات دفنا دیا بس۔'' عبداللہ نے رازداری سے بتایا۔

''اب ایسا بھی کیا اندھیر مچا تھا؟ پولیس کیس تھا یہ سیدھا سیدھا...... ایف آئی آر تو کٹوانی بنتی تھی۔''

''آپ کو اندر کی بات بتاؤں پائین! میں نے اپنے پاپا کو مما سے کہتے ہوئے سنا تھا کہ محلے کے نوے فیصد لوگ اپنی گردن پھنستے دیکھ کر ڈرے ہوئے تھے۔ ان میں اپنا کونسلر بھی شامل تھا۔ اس کا بیٹا اور وہ دونوں ہی......'' حارث اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔

''ہم...... چلو خیر! یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ میرے تمہارے جیسے کیا کر سکتے ہیں؟ بھائی کیا کرتا ہے ویسے اُس کا؟''

''اس نمونے نے کیا کرنا ہے بھائی جی؟ آن لائن ٹیکسی چلاتا ہے اور باقی وقت جمال کے چپس بنوانے میں لگا رہتا ہے آج کل۔'' سبحان نے بتایا۔

''چپس کی بھی کچھ نہ پوچھیں باس!'' عبداللہ نے مزید معلومات فراہم کیں۔ ''آلو ٹیڑھے میڑھے کٹے ہوتے ہیں، چھلکے صحیح اترے ہی نہیں ہوتے۔ کسٹمرز اب اس سے کچھ لیتے ہی نہیں۔''

''میرے پاپا نے تو ایک دو بار اپنے گھر سے سالن دینے کی آفر بھی کی تھی لیکن اسی نمونے نے انکار کردیا۔ کہتا ہے ہم بھکاری نہیں ہیں۔ خود ہی بندوبست کرلیں گے۔'' حارث کی بات سے رشی کو اندازہ ہوگیا کہ منیب رات نو بجے کے بعد گھر آجایا کرتا ہوگا۔

اس نے فوری طور پر ذہنی جمع تفریق کا آغاز کردیا تھا۔ اس کشمکش میں اسے سبحان کے وہ ٹھوکے اور اشارے نظر ہی نہ آئے جو وہ حارث اور عبداللہ کو کررہا تھا۔ عبداللہ اس کی بات کی تہ میں پہنچ گیا اور فوری طور پر بولا۔

''باس! اپنا نمبر ہی دان کردیں۔ کبھی کام ہی آجاتا ہے۔'' اس کی فرمائش نے رشی کو چونکا دیا تاہم اس نے کسی ردوکد کے بغیر نمبر دے دیا۔

''آپ کی امانت بھی موجود ہے میرے پاس پائین! اگلی دفعہ آپ سے ملاقات ہوئی تو لیتا آؤں گا۔'' حارث کو یکدم یاد آیا۔ رشی کی تمام حسیات چوکنا ہوگئیں۔

''ایک پین تھا اور اس کے ساتھ ہی کالج کی کوئی پھٹی

ہوئی سلپ تھی۔ شاید اس روز سیڑھی سے اترتے ہوئے گر گئی تھی۔''

''ارے یار! وہ تمہارے پاس ہے۔ میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلکان ہو گیا تھا۔'' رشی کو اپنے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اترتا محسوس ہونے لگا۔ یہ تینوں لڑکے اس کے لیے حقیقی گڈ لک چارم ثابت ہو رہے تھے۔

''آپ رائل کالج میں پڑھتے ہیں کیا؟ مجھے سلپ دیکھ کر علم ہوا۔ کیسا کالج ہے وہ؟ میں بھی سوچ رہا ہوں کہ اگلے سال وہیں ایڈمیشن لے لوں۔'' حارث نے مشورہ طلب کیا۔

''وہ کالج تم جیسے بچوں کے لیے نہیں ہے چڑی پہلوان!'' رشی سنجیدگی سے بولا۔ ''کبھی بھولے سے بھی وہاں ایڈمیشن لینے کا نہ سوچنا۔ میٹرک میں محنت ہی اتنی کرو کہ اچھے سے اچھا کالج خود تمہیں ایڈمیشن دینے پر مجبور ہو جائے۔''

''لیکن ہم نے تو بڑی تعریفیں سنی ہیں اس کالج کی۔'' عبداللہ حیران ہوا۔

''یہ تعریفیں ایسے لڑکوں سے ہی سنی ہوں گی جنہیں پڑھائی لکھائی سے زیادہ موج مستی عزیز ہوتی ہے۔ میں تو اپنے فنانشل حالات کی وجہ سے وہاں پھنس گیا ہوں۔ اسٹڈیز کا یہ حال ہے کہ پیپرز سر پر ہیں اور میری تیاری لکھ بھی نہیں۔'' رشی نے ایمانداری سے بتایا۔

''تو آپ کوئی اکیڈمی جوائن کر لیں ناں!'' عبداللہ نے فوراً اصلاح دی۔ ''ہمارے ایریا میں اسکالرز اکیڈمی ہے نا وہیں سے پتا کر لیں۔ بہت اچھی پڑھائی ہے وہاں کی۔''

''ہاں! میں بھی کچھ ایسا ہی کرنے کا سوچ رہا ہوں۔'' عبداللہ کی یہ تجویز اس کے دل کو لگی۔

''کل کھیلنے آئیں گے نا آپ ہمارے ساتھ؟'' سبحان نے پوچھا۔

''نہیں! ذرا ایگزامز سے فارغ ہو لوں پھر ریگولر کھیلا کروں گا۔ ابھی اتوار کے اتوار آ جایا کروں گا۔'' رشی نے درمیانی راہ نکالی۔ ''سلپ اور پین کل یہیں لے آنا۔ میں لے لوں گا تم سے۔'' اس نے یاد دہانی کروائی۔ لاعلمی میں دو ثبوت چھوڑ کر اس نے اپنے لیے بہت بڑی مصیبت کھڑی کر لی تھی۔ اس نے دل میں کئی بار شکرانہ بجا لاتے ہوئے منیب سے ملاقات کا لائحہ عمل بھی ترتیب دے لیا۔ وہ اپنے 'ٹارگٹس' اب جلد سے جلد حاصل کر لینا چاہتا تھا۔

☆☆☆

وہ سب ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔

ان کے چہروں پر طاری بے بسی، ملال اور تھکاوٹ سے واضح طور پر معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کسی طویل اور بے نتیجہ بحث کے بعد تھک ہار کر ہی خاموش ہوئے ہیں۔ ملال، بے بسی اور اُلجھن کے جذبات نے وجود مزید شکستہ کر رکھے تھے۔ ان سب میں ایک وجود ایسا بھی تھا جس کے چہرے پر ان سبھی کیفیات کے علاوہ ایک انوکھا سا خوف طاری تھا۔

''یہ سب مجھ سے نہیں ہوگا۔'' اس نے یہ جملہ کوئی بیسویں دفعہ ادا کیا تھا۔

''تو پھر کون کرے گا یہ بھی بتا دو۔'' ایک فرد نے جھنجلا کر کہا۔ گزشتہ ایک گھنٹے سے اسے قائل کرنے کی کوشش میں ناکامی پر یہی کیفیات غالب آ سکتی تھیں۔

''کیا کوئی اور رستہ نہیں نکل سکتا؟'' اس نے اضطراب سے ہاتھ مسلے۔

''تمہیں ایک بات سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی ہے؟ ہم میں سے کوئی اس قابل نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو تمہیں زحمت ہی کیوں دی جاتی؟''

''حالانکہ دیکھا جائے تو اس کام میں سب سے زیادہ فائدہ اسی کا ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ یہ کام تو اسے اپنا فرض سمجھ کر کرنا چاہیے۔ اور یہ اتنے نخرے دکھا رہا ہے۔'' وہاں پر موجود تیسرے فرد نے طنز کیا۔

''ٹھیک ہے۔ اگر تیری مرضی نہیں ہے تو ہم زبردستی تو نہیں کر سکتے۔'' پہلے فرد نے غصہ جتایا۔

''لیکن اگر کسی کو علم ہو گیا تو؟'' اس نے سراسیمگی سے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''کسی کو کچھ پتا نہیں لگے گا۔ مجھ پر بھروسا رکھ۔'' اس کا غصہ ٹھنڈا ہونے لگا۔

''مم...... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

''ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ بڑا ہاتھ ایسے ہی مارا جاتا ہے۔ ہماری سبھی مشکلوں کا حل تیرے اسی 'کام' میں ہے۔ مان جا! تیری مہربانی۔''

''کسی نے مجھے پہچان لیا تو؟'' اس بار وہ نیم رضامند نظر آیا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک دفعہ یہ کام ہو جائے تو پھر اس شہر میں رہے گا ہی کون؟ ہم کہیں اور ٹھکانا کر لیں گے۔ اللہ پاک کی زمین بہت بڑی ہے۔''

''ٹھیک ہے! میں تیار ہوں۔'' اس نے شکست تسلیم کر لی۔ باقی دونوں افراد کے چہرے کھل اٹھے۔



''بس ابھی ایک فون کرنے کی دیر ہے۔ سارے انتظامات ہو جائیں گے۔ یہ کام دو دن میں ہی ہو جانا چاہیے۔'' اس فرد کی خوشی دیدنی تھی۔ ہارے ہوئے کھلاڑی نے افسردگی سے اس کی جانب دیکھا۔ اسے تو یہ توقع تھی کہ اس کے فیصلے پر منہ ماتھا چوم کر مشکور ہو جائے گا لیکن مقابل کا ردِعمل بہت مایوس کن تھا۔ تیسرا فرد بھی بے نیازی سے اپنے موبائل فون میں مصروف ہو گیا۔

اس نے مایوسی سے ہونٹ بھینچے اور اپنے نئے 'کام' کے لیے خود کو ذہنی طور پر مزید تیار کرنے لگا۔ کام مشکل سہی لیکن اس کا 'انعام' بلاشبہ بہت سے مسائل حل کر سکتا تھا۔

☆☆☆

منیب اس وقت شہر کی ایک معروف شاہراہ پر موجود تھا۔ اس کے ساتھ دو خواتین اور ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ یہ شخص کچھ عرصہ پہلے اسے ایک رائیڈ کے دوران ہی ملا تھا۔ منیب کے اخلاق اور شائستگی سے متاثر ہو کر اس نے ذاتی نمبر لے لیا تاکہ کہیں بھی آمدورفت کے سلسلے میں اسے براہِ راست طلب کر لیا کرے۔ منیب نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔ وہ ایسی 'آف دی ریکارڈ' سواریاں اٹھا لیا کرتا تھا۔ گاڑی چلانے سے قبل اس کی نظر ایک لڑکے پر پڑی۔ وہ کالج یونیفارم میں ملبوس کسی سواری کے انتظار میں دکھائی دے رہا تھا۔

''آجاؤ! کہاں جانا ہے؟'' منیب نے اس سے پوچھا۔

''کینٹ لے چلو۔'' رشی اسے بغور دیکھتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اسے اپنی خوش بختی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کا ہر کام قدرت کی جانب سے ہی آسان ہوتا جا رہا تھا۔ منیب سے ایسی ون ٹو ون ملاقات کا خیال کئی بار ذہن میں آیا تھا اور آج کیسے اہتمام سے پورا بھی ہو گیا۔ بائیک کی خرابی جو کچھ دیر پہلے باعثِ زحمت لگ رہی تھی اب اسی بائیک پر پیار آ رہا تھا۔

''یہ گاڑی آپ کی اپنی ہے کیا؟'' رشی نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

''نہیں! میری نہیں ہے۔'' منیب نے مختصراً جواب دیا۔

''ویسے کتنی بچت ہو جاتی ہے اس کام میں؟'' رشی نے ایک اور سوال کیا۔

''اچھی خاصی ہو جاتی ہے۔ آپ انٹرسٹڈ ہیں کیا اس کام میں؟'' منیب کو بلاوجہ سوال کرنے والی اور دورانِ سفر باہمی گفتگو میں گھریلو حالات ظاہر کر دینے والی سواریاں بہت بُری لگتی تھیں۔ ایسے لوگ جانے کیوں بھول جاتے تھے کہ گاڑی میں موجود وہ ڈرائیور بھی ان کے حالات و پریشانیوں سے آگاہ ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ آن لائن ڈرائیونگ میں ہونے والی بچت اور 'حساب کتاب' کے بارے میں معلومات لینا بھی لوگوں کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

''نہیں! مجھے تو ابھی کافی اسٹڈیز کرنی ہے۔ میرا مائنڈ گورنمنٹ جاب کرنے کا ہے۔'' رشی نے گردن اکڑائی۔

''آل رائٹ سر! بیسٹ وشز۔'' منیب نے پیشہ وارانہ خوش خلقی کے تحت کہا۔

''عام طور پر کتنی رائیڈز لے لیتے ہو ایک دن میں؟ میں نے تو سنا ہے کہ جب تک مخصوص کوٹا پورا نہ ہو آدھی رات تک بھی سڑکیں ناپنی پڑتی ہیں۔'' رشی کا یہ سوال بھی نوے فیصد سواریوں جیسا ہی تھا۔

''چھوڑیئے نا سر! جب آپ اس کام میں انٹرسٹڈ ہی نہیں تو اتنی انویسٹی گیشن سے کیا کریں گے؟'' منیب نے اخلاقی دائرے میں رہتے ہوئے اسے 'شٹ اَپ کال' دی۔ رشی کے ہونٹ بھنچ گئے۔ منیب اتنا بھی سیدھا اور بے نیاز نہیں تھا جیسا اس نے تصور کر رکھا تھا۔ وہ اس سے کچھ اور بھی سوال کرنا چاہتا تھا لیکن منیب کے موبائل پر کسی نے اگلی 'رائیڈ' کے لیے رابطہ کر لیا۔ اسی گفتگو میں رشی کی منزل آ گئی۔ منیب نے بے نیازی سے کرایہ وصول کیا اور اگلی سواری اٹھانے کے لیے روانہ ہو گیا۔ اسے رشی کی آنکھوں سے جھلکتے طیش، نفرت اور قاتلانہ چمک بالکل بھی محسوس نہیں

ہوئی تھی۔

☆☆☆

جمال اپنی ریڑھی لیے ایک وسیع عمارت کے باہر موجود تھا۔

بڑی سڑک کے بائیں جانب واقع یہ عمارت علاقے کی سب سے نامور 'اسکالرز اکیڈمی' تھی۔ یہاں صبح کے اوقات میں مشہور چین آف اسکولز کی ایک شاخ تھی جو شام کے وقت اکیڈمی کا روپ دھار لیتی۔ عمارت کے باہر سائیکلوں اور موٹر سائیکلوں کا جمعہ بازار لگا تھا۔ یہ جگہ جمال کا مستقل اسٹاپ تھی۔ قلفیوں کے سیزن میں بھی وہ یہاں اچھی خاصی کمائی کرلیا کرتا تھا۔ اس نے موبائل پر وقت کا اندازہ کیا۔ چھٹی ہونے میں ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔ اس نے اللہ کا نام لے کر کڑاہی کے نیچے سلنڈر سے منسلک چولھا جلایا اور چپس تیار ہونے کے لیے رکھ دیے۔ اسے توقع تھی کہ آج بارش اور موسم میں خنکی کے باعث آمدنی اچھی ہو گی۔

جمال کی توقعات بالکل درست ثابت ہوئیں۔ نوجوان طلبہ موسم کی ترنگ میں تھے۔ موسم، کرکٹ، سیاست، پڑھائی، اساتذہ، انتظامیہ، ایگزامز، ٹیسٹ سیشن، لڑکیوں کے فون نمبرز، متوقع ملاقاتیں، شرطیں، خدشات اور اس عمر کے ہزار ہا روایتی تفکرات پر گفتگو کرتے نوجوانوں نے اس کے وارے نیارے کروا دیے۔ اگلے ایک گھنٹے میں وہ اچھی خاصی رقم کما چکا تھا۔

دس بجے تک اس کا سامان نوے فیصد تک فروخت ہوگیا۔ اب اِکا دُکا راہگیر ہی اس سے بیس، پچیس روپے والی مالیت کے چپس خرید رہے تھے۔ جمال کافی تھک گیا تھا۔ اس نے ریڑھی آگے بڑھانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اسے ایک چادر میں لپٹی زیتون اپنی جانب آتی دکھائی دی۔ جمال نے چونک کر آس پاس دکانداروں پر نگاہ دوڑائی اور کسی کو بھی اپنی جانب متوجہ نہ پا کر اپنی غیر اختیاری خوفزدہ حرکت پر خود ہی ہنس پڑا۔

''کدھر غائب ہے تو تین دن سے؟'' جمال نے زیتون کے سامنے آتے ہی شکوہ کیا۔ ''نمبر ملاؤ تو بند جاتا ہے۔ گھر آؤ تو دروازے پر کھڑی موٹر سائیکل سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ تیرا وہ نشئی خصم اندر ہی موجود ہے۔ یہ سب ہو کیا رہا ہے آخر؟''

''غیرت جاگ گئی ہے اس حرام خور کی۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''تو نے اس سے طلاق کی بات کی یا نہیں؟''

''اس سے پہلے ہی ایک بہت بڑا مسئلہ کھڑا ہو گیا سرکار۔'' زیتون پریشانی سے بولی۔ ''مجھے کچھ روز سے شک تھا کہ ہماری محبت کی نشانی وجود میں آچکی ہے۔ میں نے گھر میں ٹیسٹ بھی کرلیا۔ اب میری ہی مت ماری گئی تھی کہ وہ اسٹریپ پھینک نہ سکی۔ مجھے الھڑ لڑکیوں کی طرح شوق چڑھ آیا تھا کہ وہ اسٹریپ آپ کو بھی دکھاؤں۔ میری بدقسمتی کہ وہ اس منحوس کے ہاتھ لگ گئی۔ باؤلا ہو گیا وہ تو۔ کہتا ہے طلاق دے گا، نہ ہی مجھے اپنے ساتھ بسائے گا۔ جانوروں کی طرح اس قدر پیٹا کہ ہماری محبت کی وہ نشانی ختم ہوگئی۔'' زیتون نے بلکتے ہوئے اپنے چہرے سے چادر سرکا دی۔ اس کی آنکھوں، ہونٹوں اور ناک کے آس پاس شدید ورم تھا۔

''مارا ہے اُس نے تجھے؟ اس...... کی یہ مجال۔ اسے اس قتل کی میں وہ سزا دوں گا کہ ساری زندگی یاد رکھے گا۔'' جمال بھڑک اٹھا۔ شدتِ غضب سے اس کا چہرہ سیاہ ہو گیا۔

''میں آج بہت بڑا خطرہ مول لے کر نکلی ہوں گھر سے۔ اس نے تو میرا موبائل تک توڑ پھوڑ دیا ہے۔ گھر سے باہر قدم رکھنا حرام کر رکھا ہے۔ آج اسے چائے میں نیند کی دو گولیاں دے کر آئی ہوں۔''

''تو پھر اب کیا کرنا ہے؟ تُو تو بڑے یقین سے کہا کرتی تھی کہ ایک منٹ میں طلاق مل جائے گی تجھے۔'' جمال غرایا۔

''اب میرے پاس خلع لینے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں بچا۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وکیل کے پاس جانے یا کیس کرنے کے لیے پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔'' زیتون نہایت بے بس نظر آ رہی تھی۔ ''آپ کے پاس تھوڑے پیسے ہوں تو مجھے دے دیں۔ کسی طرح وکیل سے تو ملوں۔ میں اب اس جانور کے ساتھ ایک پل نہیں رہنا چاہتی۔ مجھے اپنے قدموں کی داسی بنا لینا۔ گھر کے کسی کونے میں تھوڑی سی جگہ دے دینا۔ مجھے اب رہنا ہی نہیں اُس کے ساتھ۔'' زیتون رونے لگی۔

''آہستہ بول! ہم اس وقت سڑک کے بیچوں بیچ کھڑے ہیں۔'' جمال نے اپنے مزاج سے مجبور ہو کر کہا۔ ''یہ پیسے رکھ لے کچھ۔ صبح سے اتنی ہی کمائی ہوئی ہے۔ باقی میں تجھے منیب سے کسی طرح لے کر دے دوں گا۔''

''بڑی مہربانی سرکار!'' زیتون اریشہ خطمی ہونے لگی۔

''مہربانی صرف زبانی کلامی ہی نہیں بولی جاتی۔ عمل کر کے دکھانا پڑتا ہے۔ تجھے اس خبیث کو پہلے اچھی طرح

رسوا کرنا ہوگا۔'' جمال کی پیشانی پر ایک رگ ابھر آئی۔ وہ اس وقت اپنے اصل روپ میں نظر آرہا تھا۔ سرد مہر، سفاک، بے حس اور منتقم مزاج۔

''کیا کروں میں سرکار؟ میں تو بس آپ کے حکم کی غلام ہوں۔'' زیتون کا لہجہ شہد ٹپکا رہا تھا۔

''خلع لینے کی وجہ یہ دائر کروانا کہ تیرا خصم اپنی ہی بیٹی پر بُری نظر رکھتا ہے۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ایسا کیسے ہوسکتا ہے بھلا؟ وہ اس کا سگا باپ ہے۔'' زیتون کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''اس میں کون سی انوکھی بات ہے کوئی؟ آج کل تو ویسے ہی وقت بڑا نازک ہے۔ کسی سگے رشتہ کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ ٹی وی نہیں دیکھتی تو؟ ایسی وارداتیں ہر گھر میں ہونے لگی ہیں۔ عدالت میں یہ سب کہے گی تو تیرا ہی کیس مضبوط ہوگا اور اس قاتل کو بھی اپنے کیے کی سزا مل جائے گی۔ میری اولاد کا قتل کیا ہے اس نے۔ سزا تو اسے بھگتنی ہو گی۔'' جمال، اقصیٰ کے بعد ایک اور اولاد سے محروم ہو کر آپے سے باہر ہو چکا تھا۔

''میں اتنا بڑا جھوٹ کیسے بولوں گی؟ وہ اس کا سگا باپ ہے۔'' زیتون کا رنگ فق ہونے لگا۔

''ٹھیک ہے! تیری مرضی۔ نہیں کرنا ایسا تو رہتی رہ اسی بیماریوں کی پوٹ کے ساتھ۔ میں تیری طرف تھوکنے بھی نہ آؤں گا۔'' جمال نے دوٹوک جواب دیا اور زیتون کو نظرانداز کر کے ریڑھی آگے بڑھا دی۔ اسے رتی بھر بھی اندازہ نہ ہوسکا کہ اپنے داخلے کے لیے معلومات حاصل کرنے آئے رشی نے یہ گفتگو حرف بہ حرف سنی ہے۔

رشی یہاں دس منٹ قبل ہی آیا تھا۔ اس کے ذہن پر حارث سے کالج سلپ اور اپنا پین لینے کا سخت دباؤ تھا۔ اس کے علاوہ عبداللہ کی دی گئی معلومات کے مطابق وہ اکیڈمی کی دفتری انتظامیہ سے فیس اور دیگر معاملات طے کرنا چاہتا تھا۔ جمال کو ایک عورت کے ساتھ کھڑے دیکھ کر اس کا وجدان کسی انکشاف کا اعلان کرنے لگا۔ وہ پارکنگ کے ایک ستون کی آڑ لیے کھڑا ہوگیا۔ اس کے اندازے کے عین مطابق عورت کی جمال کے پاس موجودگی بے سبب نہیں تھی۔

زیتون کی زبان سے سننے والے انکشافات نے اسے مشتعل کر دیا تھا۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑے اس شخص کی بے حسی اور مردہ ضمیری کی کوئی انتہا بھی تھی کیا؟ اس کی باتیں، انداز، سفاکیت اور منتقم مزاجی دیکھ کر کوئی اندازہ بھی نہ کر پاتا کہ وہ چند روز قبل ہی اپنی جوان اولاد کو عبرتناک انداز میں سپردِ خاک کر کے آیا ہے۔ رشی کے چہرے کے عضلات پھڑکنے لگے۔ اس وقت اسے اپنا گمشدہ پین، سلپ، بچوں سے ملاقات، منیب کی ریکی سب کچھ بھول گیا تھا۔ ذہن کے ہر گوشے میں سرخ آندھی کے جھکڑ تھے۔ وہ خاموشی سے جمال کے پیچھے چل دیا۔ اگلے پانچ منٹ میں جمال ایک دکان کا شٹر کھول کر اپنی ریڑھی کھڑی کرنے کی تیاری میں نظر آنے لگا۔ اس نے شٹر کا تین چوتھائی حصہ گرا دیا تھا۔

رشی نے اپنے بازو اور گردن کو دائیں بائیں جنبش دے کر فشارِ خون متوازن کرنا چاہا لیکن اس لمحہ کوئی بھی ترکیب کارگر ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے وجود میں حدت موت کا سرد لمس محسوس کر کے ہی متوازن ہوسکتی تھی۔ وہ ایک قاتل لمحہ تھا۔ رشی نے محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور جھک کر شٹر سے اندر چلا گیا۔ جمال ریڑھی دیوار کے ساتھ لگائے سامان سمیٹنے میں مصروف تھا۔ اس کی پشت رشی کی جانب تھی۔

جمال کو ختم کرنے کی کوئی بھی واضح حکمتِ عملی رشی کے ذہن میں نہیں تھی۔ وہ محض اپنے طاقتور وجدان کے زیر اثر فوری فیصلہ کرنے پر مجبور ہوا تھا۔ اچانک رشی کی نظر زمین پر پڑی نائیلون کی رسیوں کے ٹکڑوں پر پڑی۔ یہ رسیاں دکان کے دوسرے ساجھے دار پھل فروش کی پیٹیوں سے اتری ہوئی تھیں۔ رشی کے جسم میں برق سی کوند گئی۔ اس نے جھپٹ کر ایک طویل ٹکڑا اٹھایا اور آہٹ پیدا کیے بغیر جمال کی گردن عقب سے دبوچ لی۔

جمال نے جبلی کوشش کے تحت اپنے دونوں ہاتھوں سے رسی تھام لی۔ وہ اس افتاد کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

''چھوڑ...... مجھے...... کک...... کون۔'' وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکا۔

''کتنی زندگیاں برباد کرے گا تو اور کتنی زندگیاں؟'' رشی نے اس کے کان میں پھنکار کر کہا۔

جمال کی مزاحمت شدید ہونے لگی۔ رشی نے صورتِ حال کے پیش نظر اسے پیٹ کے بل زمین پر گرایا اور اس کی پیٹھ پر گھٹنا موڑ کر بیٹھ گیا۔ جمال کا سانس اکھڑنے لگا۔

''تیرے ذہن میں اس وقت لازماً یہی سوچ چل رہی ہوگی کہ میں کون ہوں؟ تجھے کن گناہوں یا غلطیوں کی سزا مل رہی ہے۔ ان سوالوں کے جواب تو تجھے نہیں ملیں

[illegible] ساری پلاننگ ملیامیٹ کر دی ہے۔ میں [illegible] اس لونڈ[illegible] کو مارنا چاہتا تھا لیکن تو نے اپنی [illegible]ی ڈال دی مجھے۔''

جمال نے اپنی پوری قوت سے رسّی چھڑانے کی کوشش کی لیکن رشی کی دیوانگی کا سامنا آسان نہ تھا۔ وہ اذیت کے عالم میں اپنی ٹانگیں اور گھٹنے فرش پر رگڑنے لگا۔

''قسم کھائی تھی میں نے کہ تیرے خاندان کو عبرت کا نشان بناؤں گا۔ ایسی موت ماروں گا کہ خود موت بھی خوفزدہ ہو جائے گی۔'' رشی نے دانستہ طور پر رسی ڈھیلی کی۔ جمال کا نیلگوں چہرہ اسے سرشار کر رہا تھا۔

''نہیں! یہ تو بڑی روایتی سی موت ہو جائے گی۔ چل! تیرے اس آخری سفر کو تھوڑا اور یادگار بناتے ہیں۔ ذرا دنیا کو بھی تو پتا لگے کہ یہاں کوئی قتل ہوا تھا۔'' رشی دیوانگی سے ہنسا۔

جمال کی گردن پر گھٹنا جما کر اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے اور گدی سے دبوچ کر تیل سے لتھڑی کڑاہی کے پاس لے آیا۔ جمال شدت سے اس کی گرفت میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ رشی نے کھولتے ہوئے تیل میں اس کا چہرہ ڈبویا اور بالوں سے جھٹکے دینے لگا۔ جمال وحشیانہ انداز میں مچل کر رہ گیا لیکن رشی کے سر میں سمایا سودا اسے کوئی راہِ فرار دے ہی نہیں رہا تھا۔

''تیری حرافہ بیٹی نے مجھے بالکل آخری لمحات میں پہچان لیا تھا۔ تجھے بھی اپنی شناخت کروا کے ہی مارنا چاہتا تھا لیکن تیری حرامزدگیاں تجھے اس مقام تک لے آئیں۔ اس جرم کی بھی سزا بھگتنی ہوگی۔ بڑی کراری سزا بھگتنی ہوگی۔'' جنونیت میں غراتے ہوئے رشی کو اندازہ ہی نہیں ہوا کہ جمال کی روح بدن کا قفس توڑ کر اڑان بھر چکی ہے۔

اس نے جمال کے مردہ وجود کو زمین پر دھکیلا اور اسے بے لباس کر کے ریڑھی پر رکھی تیز دھار چھری تھام لی۔ غیر متوازن تنفس درست کرتے ہوئے وہ گھٹنوں کے بل جھکا اور جمال کے بدن کو تختۂ مشق بنانے لگا۔ اس کے جسم سے کئی اعضا کاٹنے کے بعد تیل کی کڑاہی میں پھینکے اور سلنڈر سے منسلک چولھا ہلکی آنچ پر جلا دیا۔ یکایک اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح چمکا۔ اس نے چھری کو قلم کی طرح تھاما اور جمال کے سینے پر ایک مختصر سا فقرہ کندہ کر دیا۔

اس کام سے فراغت پاتے ہی رشی نے جمال کے لباس سے شٹر کو لگائے گئے تالے کی چابیاں نکال لیں۔ موبائل فون کی اس بار کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس کے باوجود رشی نے نہ جانے کس جذبے کے تحت گھنٹی بند کر دینے کے بعد زیتون کے نمبر کا بھی ہر جگہ سے صفایا کر دیا۔ وہ لاش کی برآمدگی کے بعد پولیس کی توجہ اس خاتون کی طرف منتقل نہیں کروانا چاہتا تھا۔ ریڑھی پر ہی رکھے ایک کپڑے سے اپنے فنگر پرنٹس اچھی طرح صاف کر کے وہ محتاط نظروں سے باہر کا جائزہ لینے لگا۔ بیرونی جانب ہنوز خاموشی تھی۔ رشی نے باہر نکل کر شٹر گرایا اور تالا لگا کر چابیاں چند گز کے فاصلے پر موجود گٹر میں گرا دیں۔ موسم کی خنکی اور بارش کے باعث گلی میں کوئی ذی نفس نظر نہیں آ رہا تھا۔ دکان سے چند قدم آگے آتے ہی وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ منیب قدرے فاصلے پر مگن سے انداز میں اپنے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں روٹیوں والا ایک شاپر تھا۔ منیب کے چہرے سے تھکاوٹ جھلک رہی تھی۔ رشی کسی خدشہ کے تحت دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ منیب نے گھر کا دروازہ کھولنے سے قبل دکان کے شٹر کی جانب دیکھا اور اسے بند پا کر گھر میں داخل ہو گیا۔ رشی کی نفرت سے بھری آنکھیں اس کے تعاقب میں تھیں۔

''ٹھونس لے جتنا کھانا ٹھونسنا ہے تجھے۔ گھر کے عیش و آرام کے مزے بھی جتنے اٹھا سکتا ہے، اٹھا لے۔ تیرا انجام سب سے منفرد اور یادگار بناؤں گا۔ تجھے ایسی موت دوں گا کہ کبھی کسی نے سوچی بھی نہ ہوگی۔ بہت نزدیک ہے تیری موت...... بہت ہی نزدیک۔ گھر میں گھس کر ماروں گا تجھے...... دن دہاڑے تیرا کام تمام کروں گا اور دیکھوں گا کون مجھے پکڑ سکتا ہے؟'' رشی کا چہرہ نہایت خوفناک تاثر دے رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ گردن کی پشت پر رکھ کر تین مرتبہ سر کو دائیں بائیں جھلایا اور اپنی منزل کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

منیب باورچی خانے میں کھانا نکالتے ہوئے شدید تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔

اسے دو روز سے حرارت بھی تھی لیکن دوا لانے کی فرصت ہی نہیں مل رہی تھی۔ آج طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو گاڑی اصل مالک کے حوالے کر کے نزدیکی میڈیکل اسٹور سے دردکش ادویات لے لیں۔ کھانا برتنوں میں ڈالتے ہوئے وہ کوفت بھری نظروں سے سبزی کی خالی ٹوکری دیکھنے لگا۔

''کہا بھی تھا انہیں کہ سبزی وغیرہ لا کر رکھ دیا کرنا۔

میں نیٹ سے ریسیپی دیکھ کر بنالوں گا۔ کھانا تو دور کی بات، چپس کے لیے آلو تک لاکر نہیں رکھے۔ حد ہوتی ہے غیر ذمے داری کی بھی۔'' وہ بڑبڑانے لگا۔

دو روٹیاں اور ایک کٹوری میں سالن نکال کر علیٰحدہ کرتے ہوئے اب اسے کمرے میں واپس جانے کا تصور ہولا رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی کسی نادیدہ مرد کا ہیولا اور اقصیٰ کی بے لباس لاش، خون میں ابال پیدا کرنے لگتی تھی۔ اس نے گہری سانس بھرتے ہوئے کمرے سے نظریں چرائیں اور برآمدے میں رکھی کرسی پر ہی بیٹھ گیا۔

کھانا زہر مار کر کے اس نے رنگ برنگی گولیاں پھانکیں اور کمبل منہ تک تان لیا۔ ذہن کے کسی گوشے میں جمال کی تاخیر پر تشویش بھی خلش بن کر سمائی ہوئی تھی تاہم دوا کے زیرِ اثر وہ کچھ ہی دیر میں غنودگی سے نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

منیب کی آنکھ اگلی صبح چھ بجے کھلی۔ وہ پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ رات کی لی ہوئی دوا اور بھرپور نیند نے بخار کا نام و نشان ختم کر دیا تھا۔ اب وہ خود کو کافی تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ جمال کو بستر پر موجود نہ پاکر اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اتنی سویرے تو وہ کبھی بھی کام کے لیے نہیں نکلا کرتا تھا۔ منیب نے اس کا نمبر ملا لیا۔ دوسری جانب گھنٹی بج رہی تھی۔ پندرہ منٹ میں درجنوں دفعہ کال کرنے کے بعد بھی جمال نے فون اٹھا کے ہی نہ دیا۔ منیب اُلجھتا ہوا اٹھا اور کسی خیال کے تحت باورچی خانے میں چلا گیا۔ رات کے برتن اور کھانا جوں کا توں دھرا تھا۔

''کدھر رہ گئے ہیں یہ رات کو؟ گھر آئے ہی نہیں؟'' اس نے ایک بار پھر فون پر نمبر ملایا۔ نتیجہ بے سود۔

منیب کو اب جمال پر شدید غصہ آنے لگا۔ اس کا ڈیوٹی پر جانے کا وقت ہو رہا تھا۔ کمرے کی روشنی گل کر کے اس نے رات ہی کا کھانا گرم کر کے کھایا اور بیرونی دروازہ مقفل کر کے گاڑی مالک سے لینے چل دیا۔ صبح کے اس کوفت بھرے آغاز نے اس کا مزاج مکدّر کر دیا تھا۔

☆☆☆

''رشی! اٹھ جاؤ بیٹا۔ کیا بھنگ پی کر سو رہے ہو؟'' سدرہ نے چوتھی مرتبہ بیڈروم میں آکر اسے جگایا۔

''اٹھ گیا ہوں موم ڈیئر! بس بستر سے نکلنے کا دل ہی نہیں کر رہا۔'' وہ کسلمندی سے بولا۔ سدرہ بڑی محبت سے اس کے سرہانے بیٹھ کر بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ رشی نے ماں کے زانو پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

''مجھے ایسا کیوں لگتا ہے بیٹا کہ تمہاری ذات میں کوئی جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ کسی پریشانی کا شکار رہتے ہو۔'' ماں کے قیافے پر رشی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

''ایسا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ بس پڑھائی کا ہی دباؤ ہے کچھ۔'' اس نے ماں کو آفاقی تسلی دی۔

''پڑھائی لکھائی سے تم پہلے تو کبھی نہیں تھکتے تھے۔ اب ایسا کیا ہو گیا ہے؟'' سدرہ کے چہرے سے واضح نظر آرہا تھا کہ وہ اس کے عذر سے مطمئن نہیں ہوئیں۔

''سسٹم سے بہت مایوس ہوں میں۔'' وہ افسردگی سے بولا۔ ''کالج میں پڑھائی نہ ہونے کے برابر ہے۔ کل ایک اکیڈمی میں داخلے کا پتا کرنے گیا تو انہوں نے بھی منہ پھاڑ کر فیس اور دیگر اخراجات مانگ لیے۔''

''اتنا نیگیٹو مت سوچو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' سدرہ نے دلاسا دیا تاہم ان کے لہجے کا کھوکھلا پن دونوں ہی سے پوشیدہ نہیں تھا۔

''نیگیٹو نہیں پریکٹیکل بن کے سوچ رہا ہوں۔ میں کوئی جینئس اسٹوڈنٹ نہیں ہوں۔ دن رات پڑھ کے بھی کبھی نائنٹی پرسنٹ نمبر نہیں لے سکتا۔ اسکالرشپ پر پڑھنا میرے لیے ناممکن ٹارگٹ ہے۔ مارکس اور اپنی فنانشل حالت دیکھ کر ایسے ہی کسی کالج میں ایڈمیشن مل سکتا ہے۔ کالج میں بھی سب گئے گزرے ہی ہیں۔ صرف ٹائم پاس کرنے آتے ہیں وہ۔ مینجمنٹ بھی خاموشی سے وقت گزاری کرنے کی پالیسی پر چلتی ہے۔ انہیں صرف فیسوں سے مطلب ہے۔ پانچ، چھ سال اسی طرح کے کالج اور یونیورسٹی میں پڑھ کے نوکری تلاش کرنے کا خیال میری ہمت ختم کر دیتا ہے۔ کیا کروں میں؟'' رشی نے آج واضح طور پر والدہ سے اپنی ایک کشمکش بانٹ لینے کا فیصلہ کر لیا۔

''یہ سب نہیں کرنا تو پھر کیا کرو گے؟ میٹرک پاس کو کون نوکری دے گا؟'' سدرہ کے لہجے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بھی اس نقطے پر سوچ بچار کرتی رہی ہیں۔

''ایک مہینہ قبل جب ویڈیو کال پر پاپا کو ایکسیڈنٹ کے بعد پٹیوں میں لپٹا دیکھا تھا تو زندگی میں پہلی بار بہت رویا تھا۔'' رشی نے ایک اور انکشاف کیا۔ سدرہ کی آنکھوں میں بھی پردیس میں بیٹھے شوہر کی یاد سے آنسو بھر آئے۔

''روئیے مت پلیز!'' اس نے والدہ کی اشک شوئی کی۔ ''اس روز پہلی بار میرے دل میں خیال آیا تھا کہ پاپا نے ساری زندگی ہمارے لیے بہت محنت کی ہے۔ اب مجھے ہی ان کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ اس وقت آپ دونوں کو

ایک دوسرے کے ساتھ کی زیادہ ضرورت ہے موم! میں کوئی ٹیکنیکل ڈپلوما لے کر پاپا ہی کے ریفرنس سے باہر سیٹ ہوسکتا ہوں۔ آپ دونوں نے میرے لیے بہت قربانیاں دی ہیں۔ اب میرے بھی کچھ فرائض ہیں۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولا۔

''لیکن تمہاری پڑھائی.....'' سدرہ متامل تھی۔ ''تمہارے پاپا کبھی بھی نہیں مانیں گے۔''

''آپ منائیں گی تو کبھی انکار بھی نہیں کریں گے۔ رہی پڑھائی کی بات۔ تو آئی پرامس! میں باہر رہ کر بھی پڑھ لوں گا۔ لیکن سوری موم ڈیئر! اب یہاں رہ کر پڑھائی نہیں ہوسکتی۔''

''بہت مشکل کام بتا رہے ہو رشی! لیکن خیر میں بات کر کے دیکھوں گی۔'' وہ اس کے وعدے پر قدرے پُرسکون ہوگئی تھیں۔ ''اب بتاؤ ناشتا کیا کرو گے؟'' انہوں نے بیٹے کے بال سنوارے۔

''کاکروچ کے پائے اور مغز کے ساتھ گرما گرم کُلچہ ہو جائے تو مزہ آجائے گا۔'' اس نے ندیدے پن سے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ سدرہ کا دل متلا اٹھا۔ ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر رشی قہقہے لگا کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

''انڈا اور پراٹھا بنا دیتی ہوں۔ فریش ہو کر آجاؤ جلدی سے۔'' وہ اس کی مزید کسی شرارت سے بچنے کے لیے اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئیں۔

رشی ایک بھرپور انگڑائی لے کر اٹھا اور سرشار سے انداز میں حوائج ضروریات اور پھر ناشتے سے فراغت پا کر کالج روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

کالج کی عمارت آج رشی کو بہت نکھری ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

درودیوار، ساز وسامان اور آرائش وزیبائش جوں کی توں تھی لیکن رشی آج انہیں ایک نئی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ کلاس روم میں جانے سے قبل اس کی نظر دائیں طرف موجود ریسیپشن کی جانب اٹھی۔ شازیہ کی جگہ انتظامیہ نے ایک نئی میک اَپ اور فیشن زدہ حسینہ لا بٹھائی تھی۔ رشی کو اس کے سامنے حمزہ گفتگو کرتا دکھائی دے رہا تھا۔

''گڈ مارننگ میم! ہاؤ آر یو؟'' وہ اس کے چست لباس اور قمیص کے کشادہ گلے پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

''مارننگ بوائے! فائن تھینک یو!'' سیمی نامی اس لڑکی نے ایک ادا سے اپنے بال جھٹکے۔

''آئی ہوپ یہاں آپ کا وقت بہت اچھا گزر رہا ہو گا۔'' حمزہ نے لگاوٹ جتائی۔

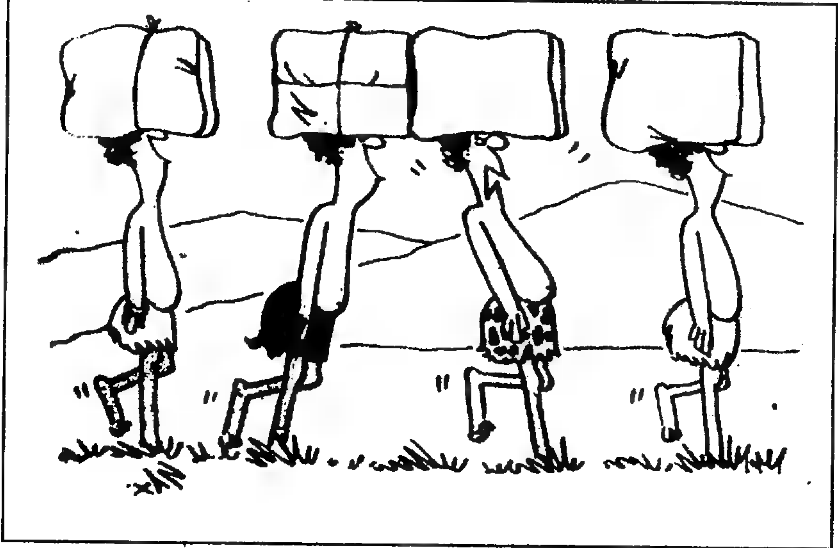
''یس! بہت آئیڈیل ماحول ہے اور اسٹوڈنٹس بھی بہت کوآپریٹو ہیں۔'' سیمی نے حمزہ کی نظروں کا 'پیغام' بھانپ لیا تھا۔

یہ مناظر دیکھ کر رشی کے چہرے پر تمسخرانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اس نادان حسینہ کو بتا ہی نہیں سکتا تھا کہ حمزہ سمیت کالج کے اکثر لڑکے واٹس ایپ چیٹنگ گروپس میں اسی کے بارے میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ وہ اس کے نئے فیشن کے مطابق 'کرمپی بالوں' کی وجہ سے اس کا شجرۂ نسب افریقی اور ویسٹ انڈین کھلاڑیوں سے منسوب کرنے لگتے تھے۔ شازیہ کی یہ جانشین اس سے دو قدم آگے ہی محسوس ہو رہی تھی۔ ان مناظر اور ذہنی کیفیت نے اس کا مزاج بالکل ہی مکدّر کر دیا۔ اس کا دل کلاس میں جانے کے لیے بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔

آج گزشتہ ہفتے ہونے والے ٹیسٹ کی رپورٹ بھی دی جانی تھی۔ رشی یہ رپورٹ دیکھے بغیر بھی جانتا تھا کہ نتیجہ کس قدر 'عزت افزا...' ہوگا۔ اس نے کلاس میں جانے کے بجائے عقبی جانب گراؤنڈ کا رخ کر لیا۔ ہلکی نرم دھوپ بدن کو سکون دے رہی تھی۔ اس نے بیگ سر تلے رکھا اور ایک بینچ پر نیم دراز ہو کر مناہل کو اپنی وہاں موجودگی کی اطلاع کر دی۔ مناہل سے دو روز پہلے ہی تعلقات معمول پر آئے تھے۔ اس بار رشی کی ناراضگی کے پیشِ نظر وہ خود ہی نرم پڑ گئی تھی۔

اطلاعی پیغام روانہ کر دینے کے بعد وہ آنکھیں موند کر گزشتہ رات ہونے والے قتل کے متعلق سوچنے لگا۔ اس کے تصور میں جنال کی اعضا سے محروم لاش کے مناظر لہرانے لگے۔ دل میں لاش کی برآمدگی اور جنازے کی صورتِ حال کے متعلق جاننے کی خواہش بیدار ہو رہی تھی لیکن اب وہ کوئی غیر ضروری خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ گزشتہ بار منیب نے قبرستان میں اس کی موجودگی بھانپ لی تھی۔ اس لیے کسی قسم کی فلمی بہادری دکھانے کا مطلب اپنے بنے بنائے کھیل کی بربادی کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا؟

''پوسٹ میچ کمنٹری حارث اور عبداللہ سے سن لوں گا۔ وہاں جا کر وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ اگلے ٹارگٹ کے متعلق کوئی ہوم ورک کر لیا جائے۔'' اس نے منیب کے متعلق معلومات ذہن میں دہرانی شروع کر دیں۔ اس کا دایاں پاؤں مسلسل متحرک رہا تھا۔



اس عالم میں وقت بیتنے کا بالکل اندازہ نہ ہوا۔ ہوش تو اس وقت آیا جب کسی نے ایک فائل اس کے پیٹ پر پٹخی۔ رشی نے جھنجلا کر آنکھیں کھولیں۔ اس کے سامنے مناہل کڑے تیور لیے کھڑی تھی۔

''یہ کیا حرکت ہے یار؟'' وہ بدمزہ ہوا۔

''یہی تو میں پوچھنے آئی ہوں کہ یہ کیا حرکت ہے؟'' مناہل نے بھی اسی انداز میں کہتے ہوئے فائل کی طرف اشارہ کیا۔

''لگتا ہے ٹاپ کیا ہے میں نے۔ اسی لیے تم اتنی جیلس ہو رہی ہو۔'' وہ محظوظ ہوتے ہوئے اٹھا۔

''جی ہاں! ٹاپ تو کیا ہے آپ نے لیکن اوپر سے نہیں نیچے سے۔'' وہ طلبہ کی مخصوص اصطلاح استعمال کرتے ہوئے بولی۔

''کم آن یار! ایک ویکلی ٹیسٹ سیشن ہی تو تھا۔ کیوں اتنا ہائپر ہو رہی ہو؟'' رشی نے بے نیازی سے کہا۔

''بہت بدل گئے ہو تم رشی۔ بہت ہی زیادہ بدل گئے ہو۔ مجھے تو یقین ہی نہیں ہوتا کہ تم وہی رشی ہو جو ایک ایک نمبر کے لیے ٹیچرز کو زچ کیا کرتا تھا کہ وہ بھی کیوں کاٹا گیا ہے۔''

''وہ میرا آؤٹ ڈیٹڈ ورژن تھا ڈیئر! اب میں نے اپنے سبھی سافٹ ویئرز اَپ گریڈ کر لیے ہیں۔'' اس نے بے تاثر انداز میں کہا۔

''تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟ تمہیں اپنی عزت کا ذرا بھی خیال نہیں رہا؟'' مناہل رنجیدگی سے بولی۔

''یہ سب کچھ میں اپنی 'عزت' کے لیے ہی تو کر رہا ہوں۔ مجھے آج بھی 'عزت' ہی سب سے زیادہ عزیز ہے۔'' رشی کے جبڑے بھنچ گئے۔

''نہیں ہے ایسا! تبھی تو اتنے سکون سے یہاں بیٹھے ہو۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ زوہیب کے ٹاپ کرنے پر مجھے کس شرمندگی ہو رہی تھی۔ نور مجھے کس طرح جتلاتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔'' مناہل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

رشی محویت سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ کس قدر معصوم اور بے ضرر سی فکریں تھیں اس کی۔ کتنی پُرسکون زندگی تھی اس کی۔

''کاش! ایسی بے نیازی، سکون اور مطمئن زندگی مجھے بھی حاصل ہو جائے۔ میں ان عام انسانوں کی طرح کیوں نہیں جی سکتا؟'' رشی کے اندر ایک طاقتور لہر اٹھی۔

''نہیں! میں ایسے جی بھی کیسے سکتا ہوں؟ یہ تو خوش نصیب لوگ ہیں۔ ان کی زندگیوں میں کوئی شرمناک غلطی یا ویڈیو نہیں ہے۔ یہ میری طرح بدقسمت اور مردم گزیدہ نہیں ہیں۔'' اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔

''اب کس مراقبے میں چلے گئے ہو؟ میرا آج کا دن غارت کر دیا تم نے۔ کتنا کچھ سوچ رکھا تھا آج کے لیے۔ تھینکس ٹو یو کہ اسٹارٹ ہی اس قدر برباد کر دیا۔'' مناہل

کے اگلے شکوے پر اس کے ذہن کو جھٹکا لگا۔
''تم خود ہی تیز گام انجن کی طرح دھواں اُڑاتی چلی آئی ہو یہاں۔ ورنہ مجھے تو تمہیں سرپرائز دینا تھا ایک۔'' رشی نے فوراً بات سنبھالی۔ وہ مناہل کی سالگرہ بھول جانے کا اعتراف کر کے ایک نئی مصیبت مول نہیں لے سکتا تھا۔
''سچ کہہ رہے ہو تم؟'' وہ مشکوک ہوئی۔
''بالکل سچ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں آج تمہارا انتظار یہاں کیوں کر رہا ہوتا؟'' اس نے مزید بات بنائی۔
''ہاؤ سوئٹ! تو پھر بتاؤ کہاں ٹریٹ دے رہے ہو مجھے؟'' وہ جوش سے بولی۔
''یہ تمہاری چوائس ہوگی۔ تم جہاں کہو گی میں تمہیں وہیں لے جاؤں گا۔ تم جس چیز پر ہاتھ رکھو آج وہ میری طرف سے تمہارا گفٹ ہوگا۔'' رشی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ مناہل اس کے انداز اور الفت پر مسرور ہوگئی۔
''ٹھیک ہے! ٹریٹ کے ساتھ تمہیں اس خراب رزلٹ کی پینالٹی بھی دینی ہوگی۔ بولو! منظور ہے؟''
''بالکل منظور ہے۔'' رشی نے مضبوطی سے کہا۔
''تو چلو پھر! ایک نیا ریسٹوران کھلا ہے 'پیشنز' وہاں چل کر اچھا سا کھانا کھلاؤ۔ پھر کسی پارک میں چلیں گے۔'' مناہل نے حسبِ توقع سارا منصوبہ خود ہی ترتیب دے دیا۔ رشی نے مسکراتے ہوئے سرِ تسلیم خم کر دیا۔
''بس ٹھیک ہے! آف ہوتے ہی چلتے ہیں۔ ریسٹوران دوپہر ایک بجے سے پہلے بند ہی ہوتا ہے۔'' مناہل نے گھڑی پر وقت کا اندازہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کے صرف دو ہی لیکچرز باقی رہ گئے تھے۔
مناہل ہی کے اصرار پر رشی بھی کلاس روم میں جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ ایک گھنٹا کسی نہ کسی طرح گزارتے ہی اس نے بائیک نکالی اور کالج کی بغلی سڑک پر مناہل کا انتظار کرنے لگا جسے اپنے وین ڈرائیور کو فرینڈز کے ساتھ جانے کا کہہ کر اس کے پاس آنا تھا۔ کالج سے ریسٹوران کا فاصلہ پندرہ منٹ کا تھا۔ مناہل رستے بھر اسے موجودہ 'جامد' مزاج سے نکلنے اور پڑھائی کے متعلق سنجیدہ ہونے کی تلقین کرتی رہی۔
'پیشنز' کی داخلی زیبائش بہت دلکش تھی۔ مرکزی دروازے سے دائیں جانب ریسپشن موجود تھا۔ ان کے وہاں پہنچنے سے قبل ہی ایک خوش پوش ویٹر ان کے پاس چلا آیا۔
''ویلکم ڈیئر میم اینڈ سر! ہاؤ کین آئی ہیلپ یو؟ ہم سنگل ٹیبل، کیبن اور سنگل رومز بھی آفر کرتے ہیں۔'' وہ ان کے کالج یونیفارمز کو سرسری نگاہ سے دیکھ کر خوش اخلاقی سے بولا۔
''ہمیں اپنی برتھ ڈے سیلی بریٹ کرنی ہے۔ میرا خیال ہے کہ کیبن ہی ٹھیک رہے گا۔'' مناہل نے اردگرد ہجوم دیکھتے ہوئے فیصلہ کیا۔
''شیور میم! آپ آیئے میرے ساتھ۔'' وہ انہیں ریسیپشن سے بغلی راہداری میں لے گیا۔
کیبن نفیس لکڑی سے بنائے گئے تھے۔ اندرونی جانب مدھم خوابناک روشنی پھیلی تھی۔ وسط میں گلاس ٹاپ میز اور دو کرسیوں کے علاوہ ایک جانب سہ نشستی طوالت جتنا چرمی دیوان بھی موجود تھا۔
''کیک میں کون سا فلیور لینا پسند کریں گی میم؟'' ویٹر نے شائستگی سے پوچھا۔
''چاکلیٹ فلیور آف کورس۔ اور اس پر 'ہیپی برتھ ڈے پرنسز مناہل' میرون کلر سے لکھیے گا۔ کیک لانے کے آدھے گھنٹے بعد ہم کھانا آرڈر کریں گے۔ رائٹ؟'' مناہل نے فوری جواب دیا۔
''ویری ویل میم!'' ویٹر نے پیشہ وارانہ مسکراہٹ سے کہا اور پھرتی سے دونوں کرسیاں باہر نکال کر انہیں بیٹھنے کا کہتے ہوئے کیبن سے چلا گیا۔
''کافی اچھا ارینجمنٹ ہے یہاں تو!'' رشی نے مدھم رومانوی موسیقی کا ماخذ تلاش کرتے ہوئے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔
''ہاں! کالج میں اکثریت یہاں کا وزٹ کر چکی ہے۔ میرے تو کان پک گئے تھے سن سن کر۔'' مناہل بچوں کے سے جوش میں مبتلا تھی۔
رشی اپنی کہنی میز پر ٹکائے اس کے چہرے پر بکھرے رنگ دیکھنے لگا۔ یہاں کا ماحول، موسیقی اور آرائش مزاج پر خواہ مخواہ رومانیت طاری کر رہی تھی۔
''اگلے ٹیسٹ سیشن میں تم کو کم از کم ایٹی پرسنٹ مارکس لینے ہیں۔ سمجھے؟'' مناہل نے ایک بار پھر حق جتایا۔
''کم آن یار! اِٹس پارٹی ٹائم۔ مجھے اسٹڈیز کا نام لے کر بور مت کرو۔'' رشی نے منہ بنایا۔
''تو پھر کیا بات کروں؟'' اس نے ابرو اچکائے۔
''صرف اپنی اور میری...... مجھے اتنا ڈانٹتی ہو...... ناراض ہوتی ہو...... لیکن کبھی یہ کیوں نہیں بتاتیں کہ میرے بات نہ کرنے پر کتنا اداس ہوتی ہو؟ کتنی بار فون اٹھا کر

اسکرین پر میرے میسیجز دیکھتی ہو؟ پھر کوئی میسج نہ پا کر دوبارہ خفگی سے موبائل پٹخ دیتی ہو۔'' رشی کا لہجہ سرگوشی میں ڈھل گیا۔

''تت...... تمہیں کیسے پتا کہ میں ایسا کرتی ہوں؟'' مناہل نے نظریں چرا لیں۔ وہ رشی کی آنکھوں میں چھلکتے جذبوں کی تاب نہ لا پا رہی تھی۔

رشی کے کچھ بھی کہنے سے پہلے ہی مناہل کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے کال اٹھائی اور دیر سے آنے پر والدہ کے سوالات کو نہایت خوب صورتی سے ٹال کر انہیں مطمئن کر دیا۔ رشی اس کے ذہانت بھرے جوابات پر دبی مسکراہٹ سے اسے دیکھتا رہا۔

''بہت بڑی فلم ہو تم۔'' فون بند کرنے کے بعد وہ کھل کر ہنسا۔

''ہاں! اور وہ بھی ساڑھے تین گھنٹے کی۔'' مناہل بھی ہنسنے لگی۔

اسی اثنا میں کیبن کے دروازے پر دستک ہوئی اور ویٹر خوبصورت سا کیک لیے چلا آیا۔

''کھانا ٹھیک آدھے گھنٹے بعد! اب کوئی ہمیں ڈسٹرب نہ کرے۔ اوکے!'' رشی نے حکم دیا۔

''آل رائٹ سر!'' ویٹر کا انداز سپاٹ تھا۔ اس کے جاتے ہی مناہل نے دھڑا دھڑ کیک کی تصویریں لینی شروع کر دیں۔

''چلو نا رشی! اب کیک کاٹتے ہیں۔ بہت بھوک لگی ہے۔'' اس نے ایک ہاتھ سے چھری تھامتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے میز پر موبائل سیٹ کر دیا۔ رشی ٹک ٹاک بننے کے یہ لوازمات دیکھ کر جھنجلا گیا۔

''ایک تو مجھے اس وبا کی سمجھ نہیں آتی۔ اپنا ہر خوبصورت لمحہ یہاں نمائش میں لگا دینا ضروری ہوتا ہے کیا؟''

''اس میں حرج ہی کیا ہے؟'' وہ دُلار سے بولی۔

''ڈونٹ ٹیل می! تم یہ سب اپنے سوشل میڈیا اکاؤنٹس پر اَپ لوڈ کرنے کا سوچ رہی ہو تو میرا یہاں رکنا ہی فضول ہے۔ میں ان خرافات میں نہیں پڑ سکتا۔'' وہ غصے میں آیا۔ مناہل کے چہرے پر لکھی تحریر سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ رشی کا اندازہ بالکل درست تھا۔

''سب ہی کرتے ہیں ایسا۔ میں کر دوں گی تو کیا طوفان آجائے گا؟'' اس نے کمزور سے لہجے میں دلیل دی۔

''تم ایک بات کا ابھی فیصلہ کر لو مناہل! تمہارے لیے میں اہم ہوں یا یہ بچکانا طور طریقے؟''

''آف کورس! تم اہم ہو لیکن یہ سب بھی اچھا لگتا ہے۔'' وہ منمنائی۔

''ٹھیک ہے! تم یہ سب کرتی رہو۔ میں چلتا ہوں پھر یہاں سے۔'' رشی کی انا کو ٹھیس لگی۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

مناہل نے بے بسی سے ہونٹ چباتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر روک لیا اور سوالیہ نظروں کی تسکین کے لیے موبائل میز سے اٹھا کر بند کر دیا۔

''چلو آؤ! کیک کاٹتے ہیں۔'' وہ اسے نرمی سے کھینچ کر اپنے قریب لائی اور نفیس کرسٹل سے بنی چھری اسے پکڑا دی۔

رشی کی انا کو ایک عجیب سی تسکین مل رہی تھی۔ مناہل نے خود ہی سالگرہ کا روایتی گیت گاتے ہوئے کیک کا ایک ٹکڑا کاٹا اور رشی کی جانب بڑھا دیا۔ جواباً اس نے بھی ایک ٹکڑا مناہل کو کھلا دیا۔ مناہل کی انگلیوں اور ہونٹوں کے اس معمولی ترین لمس نے اسے ایک ہی پل میں جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

''لعنت ہو تم پر شازیہ! تم نے مجھے یہ کس عذاب میں مبتلا کر دیا ہے؟'' وہ کراہ اٹھا۔

''کیا ہوا رشی؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' مناہل نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اور سرخ ہوتی رنگت پا کر پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے بخار کا اندازہ کرنے لگی۔

اس کی یہ حرکت رشی کو مزید کرب میں مبتلا کر گئی۔ اس نے بے بسی سے مناہل کا ہاتھ پیچھے دھکیل دیا۔ اس کے چہرے پر کبیدگی چھا گئی۔

''تم شاید میرے ساتھ یہاں آنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ غلطی کر دی میں نے اپنی برتھ ڈے ٹریٹ مانگ کے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''ایسا نہیں ہے یار! تم غلط سمجھ رہی ہو۔'' رشی اس صورت حال پر مزید جھنجلا گیا۔

''تم مجھے بتا کیوں نہیں دیتے رشی کہ آخر تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ تم کیوں کچھ عرصے سے ایب نارمل بی ہیو کر رہے ہو؟ تمہیں جو بھی الجھن ہے مجھ سے شیئر کیوں نہیں کر لیتے۔ ہو سکتا ہے اس مسئلے کا حل میرے پاس ہی موجود ہو۔'' مناہل کی اس بات نے اسے ٹھٹکا دیا۔ وہ اس کی آنکھوں اور چہرے کا بغور جائزہ لینے لگا جہاں کچھ حوصلہ افزا تاثرات موجود تھے۔

آگہی کے اس لمحے میں رشی کے ذہن میں یکدم ہی یہ

سوچ پیدا ہوئی کہ مناہل نے اس کی تمام اُلجھنیں اپنی ذات سے منسوب کرلی ہیں۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور الفاظ مجتمع کرتے ہوئے بولا۔

''میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں مانو! دوستی کے اس سفر میں اتنا آگے نکل آیا ہوں کہ اب صرف تمہارا ہی خیال دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے۔''

''تو اس میں اتنا ایب نارمل ہوجانے کی کیا بات تھی ایڈیٹ؟ تم نے مجھ سے یہ سب پہلے کیوں نہیں کہا؟'' وہ اٹھلائی۔

''ڈرتا تھا بس...... تمہاری اور میری کلاس ڈفرینس۔'' رشی اسے اپنی پڑھائی چھوڑ دینے کے نئے فیصلے سے آگاہ کرنے پر کشمکش محسوس کرنے لگا۔

''اوکم آن یار! اس چھوٹی سی لائف میں ڈر ڈر کر جینے کی ضرورت نہیں مجھے۔ یہ میری لائف ہے اور مجھے پتا ہے کہ کس سے کیا ریلیشن رکھنا ہے۔ آئی لو یو تو ایڈیٹ!'' مناہل نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

رشی بے اختیار اس کی جانب بڑھا اور نرمی سے اپنی گرفت میں لے لیا۔ تنہائی، اقرار، الفت، موسیقی اور مقابل کی ڈھکی چھپی آمادگی نے اس کے ہوش و حواس سلب کرلیے۔ مناہل کے انداز میں بھی خود سپردگی نمایاں تھی۔

''تمہاری محبت پر صرف میرا حق ہے رشی! میرے علاوہ کسی اور کی جانب دیکھا بھی تو تمہاری جان نکال لوں گی۔'' مناہل نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''نکال دینا۔ اُف بھی نہیں کروں گا۔'' رشی نے اپنی گرفت مضبوط کی۔

''وعدہ کرو کہ اپنی کوئی پریشانی مجھ سے نہیں چھپاؤ گے؟'' اس نے اپنی بانہیں رشی کی گردن میں حمائل کردیں۔

''بالکل نہیں چھپاؤں گا۔ آج سے میری لائف کی کمانڈ تمہارے ہاتھ میں۔ تم بھی وعدہ کرو کہ میرے سوا کسی سے بات بھی نہیں کروگی۔ کسی دوسری چیز کو اہمیت نہیں دو گی۔'' اس نے ایک جذباتی پیش قدمی کی۔

''پرامس۔ ایسا ہی ہوگا'' مناہل نے اس کی پیش قدمی پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ اسے اندازہ ہی نہ ہوسکا کہ جذبات کے اس طوفان میں بہہ کر وہ کس لمحہ کیبن میں رکھے چرمی دیوان پر ایک دوسرے کو اپنی محبت اور سچائی کا یقین دلانے لگے۔

ان کی شوریدہ سری کا اختتام کیبن کے دروازے پر دستک سے ہوا۔ رشی یکدم تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مناہل نے نظریں چُراتے ہوئے اپنا لباس درست کیا اور دوسری بار دستک کے جواب میں بولی۔

''یس کم اِن!''

''لنچ کے لیے کیا آرڈر دیں گے سر؟'' ویٹر نے اس کا حلیہ سرسری طور پر دیکھ کر شائستگی سے پوچھا۔ رشی کو وہ معمولی نظر بھی کسی چابک کی طرح لگی۔

اس کا ذہن تند آندھیوں کی زد میں تھا۔ اسے اپنے وجود سے شدید کراہت محسوس ہورہی تھی۔ اس نے مناہل کو شازیہ اور اقصیٰ کی طرح کیسے 'ٹریٹ' کرنا شروع کردیا تھا۔ محبت کو بھلا یوں بھی کوئی داغ دار کرتا ہے۔ وہ ایک انقلابی لمحہ تھا۔ اپنی ذات سے نفرت اور بیگانگی کی یہ لہر اس قدر شدید تھی کی ویٹر سے مخاطب ہوتے ہوئے اسے خود اپنی آواز پہچاننا بھی مشکل ہوگیا تھا۔

''بل لے آیئے! مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔''

''رائٹ سر!'' ویٹر سر جھکائے باہر نکل گیا۔

''مجھ سے ابھی کوئی سوال نہ کرنا مناہل! اگر تمہارے دل میں میرے لیے تھوڑی سی بھی جگہ ہے تو ابھی یہاں سے نکل چلو۔'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''اوکے الیٹس گو۔'' خلافِ توقع وہ بحث کیے بغیر ہی مان گئی۔

''میں تمہیں کوئی آن لائن ٹیکسی منگوا دیتا ہوں۔ گھر پہنچتے ہی انفارم کردینا۔'' پیشنز سے نکلتے ہی اس نے مناہل کو مخاطب کیا۔

''نو تھینکس! موبائل فون میرے پاس ہے اور آن لائن سروس کے ساتھ انٹرنیٹ ڈیٹا بھی موجود ہے۔ چلی جاؤں گی خود ہی۔ تم سے اب اسی وقت بات ہوگی جب تمہارا دماغ ٹھکانے آجائے گا۔ گڈ بائے!'' اس نے رُکھائی سے کہہ کر منہ موڑ لیا۔ رشی نے بھی اذیت اور جھنجلاہٹ میں وہاں سے چلے جانے میں ہی بہتری سمجھی۔

☆☆☆

منیب رات دس بجے گھر آیا تو کھانے کا سامان ہمراہ ہی تھا۔ باورچی خانے میں گزشتہ رات کے برتن اور فریج میں کھانا جوں کا توں پڑا دیکھ کر اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''حد ہوتی ہے غیر ذمّے داری کی بھی۔ لگتا ہے باہر کے کھانے پھر سے شروع کر رکھے ہیں۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے اپنا فون نکال کر جمال کا نمبر ملا دیا لیکن

رابطہ ندارد۔

''آلیس ذرا یہ گھر۔ ٹیوننگ کرنی پڑے گی ان کی اچھی خاصی۔ اس طرح تو کام نہیں چلنا۔'' منیب نے غصے سے سر جھٹکا اور انٹرنیٹ سے گوبھی گوشت پکانے کی ریسیپی نکال کر کھانا بنانے کی تیاری کرنے لگا۔

وہ سبزی اور گوشت کی مقدار اس قدر لایا تھا کہ اگلے دو روز تک سالن بنانے کی ضرورت ہی پیش نہ آسکے۔ سبزی کاٹتے ہوئے انگلیوں پر لگنے والے زخم اور گوشت دھونے کا مشکل مرحلہ خاموشی سے برداشت کیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ کھانا اختتامی مراحل میں پہنچا تو دروازے پر زوردار دستک ہونے لگی۔

''منیب! اوئے منیب!'' عجلت میں بار بار بجائی جانے والی گھنٹی اور دروازہ دھڑدھڑانے کے ساتھ ان بلند آوازوں نے اسے چونکا دیا۔

''اب یہ کون مصیبت بن کر چلا آیا ہے؟'' اس نے بے بس نظروں سے ہنڈیا کی طرف دیکھا۔ شدید بھوک کی وجہ سے ویسے ہی معدے میں ہونے والی اینٹھن نے بیزار کر رکھا تھا۔

''کدھر سویا پڑا ہے منیب؟ باہر آ جلدی۔'' یہ آواز ارباز کی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو وہاں نصف درجن سے زائد افراد دیکھ کر چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

''پیو کدھر ہے تیرا؟'' اختر نے نرمی سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

''پتا نہیں! کل صبح سے اب تک میں انہیں نہیں ملا۔ شاید کہیں سامان وغیرہ لینے نکلے ہوں گے۔'' وہ اُلجھ کر بولا۔

''واہ میرے بھولے سائیں! کل سے تیرا باپ غائب ہے اور تجھے کوئی ہوش ہی نہیں۔'' ارباز نے طنز کیا۔

''نہ یار! اس وقت ایسی باتیں نہیں۔'' اختر نے ارباز کو ٹوکا۔ اس کی یہ ہمدردی اور نرمی منیب کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

''اٹھ [illegible]! تیرے باپ کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔'' ارباز نے دل دہلا دینے والا انکشاف کیا۔

''لاش اس کی ریڑھیوں والی دکان میں پڑی ہے۔'' بابر کے اس انکشاف نے منیب کے وجود کی بنیادیں ہلا دیں۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے ان سب کا چہرہ دیکھتا رہا۔

''لاش...... ایک اور لاش...... اقصیٰ کے بعد اب یہ بھی لاش...... موت کی مہک......'' اس کے ذہن میں دھماکے ہونے لگے۔

''میرا خیال ہے کہ اب ہمیں پولیس کو مطلع کر دینا چاہیے۔ ایک کے بعد ایک قتل ان کی کسی پرانی دشمنی کا چکر ہی لگتا ہے۔'' بابر کی رائے سے وہ سبھی نیم رضامند نظر آئے۔

''تو ٹھیک ہے پھر! ڈیڈ باڈی بھی پولیس ہی اٹھالے گی۔ ہمارے فنگر پرنٹس کہیں کیس کی کوئی شہادت کمزور نہ کر دیں۔'' اختر نے اپنا موبائل فون نکالتے ہوئے پولیس کا ہنگامی نمبر ملا دیا۔

''پرانی دشمنی...... ڈیڈ باڈی...... پولیس...... شہادت......'' منیب کے ذہن میں یہ آوازیں کسی ایسی کیسٹ ریل کی طرح سست رفتاری اور بھاری بھرکم انداز میں چل رہی تھیں جسے ملنے والی پاور سپلائی نہایت کمزور ہو گئی ہو۔

''کون ہو تم؟ ایک بار میرے سامنے آ جاؤ۔ یہ دشمنی اگر میرے خاندان سے تھی تو نشانہ میں بھی ہوں گا تمہارا۔ نشانہ بنانے ہی سہی ایک بار میرے سامنے آ جاؤ۔ میں موت کی یہ مہک تمہیں بھی ضرور محسوس کرواؤں گا۔''

نیم غنودہ ذہن میں یہ سب سوچیں اور اختر کی پولیس کو مطلع کرنے کی آوازیں اب بھی کسی پھنسی ہوئی کیسٹ ریل کی طرح ہی چل رہی تھیں۔

''کون ہو تم؟ ایک بار آؤ سامنے...... ایک بار آ جاؤ بس۔''

☆☆☆

منیب کی سوچوں پر قابض وہ انجانا قاتل 'زشی' اپنے مزاج کی تبدیلیوں سے لڑ رہا تھا۔

آج دوپہر مناہل کے ساتھ پینشنز میں جو واقعات رونما ہوئے تھے، اس کے بعد وہ خود سے نظریں ملانے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ ذہن میں رہ رہ کر ایک ہی سوچ ابھر رہی تھی جو اسے خود کو کوسنے پر مجبور کرتی۔

''کیا میں اس قدر کمزور ہو گیا ہوں؟ اتنا ہی گر گیا ہوں کہ کسی بھی لڑکی کا لمس پا کر حیوانیت کے جامے میں آ جاؤں گا۔ شازیہ نے یہ مجھے کس آگ میں دھکیل دیا ہے۔ اس کی تپش سے میں خود کو کیسے نجات دلواؤں؟'' وہ اپنے بال نوچتا ہوا بے بسی کی انتہا پر تھا۔

ہزار خواہش کے باوجود وہ مناہل سے رابطہ کر پایا تھا، نہ ہی اس کے 'بالواسطہ پیغامات' دیکھنے کی ہمت ہو سکی تھی۔ فون کی گھنٹی سن کر ہی دل اچھل کر حلق میں آ جاتا۔ کچھ دیر

بعد سدرہ اس کے پاس چلی آئیں۔

''تمہارے پاپا کا فون آیا تھا آج۔'' انہوں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''آپ نے وہ بات کی ان سے یا نہیں؟'' وہ ہیجانی لہجے میں بولا۔ اسے اپنی ان تبدیلیوں کو متوازن کرنے کے لیے کچھ عرصے منظرِ عام سے غائب ہونا بہترین حل نظر آرہا تھا۔

''نہیں! اس سے پہلے انہوں نے ایک خوش خبری سنا دی۔ وہ ہمیں عمرے کے لیے وہاں بلوا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس فیصلے کی بابت وہیں جا کر بات کرلیں تو بہتر ہوگا۔'' سدرہ نے رسان سے کہا۔

''عمرے کے لیے...... ویٹس گریٹ۔ ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ پاپا کو فیس ٹو فیس ہی کنوینس کیا جاسکے گا۔'' وہ پُرجوش ہوا۔

''ویزا اور پاسپورٹ کے لیے اب تمہیں ہی بھاگ دوڑ کرنی ہوگی۔''

''ڈونٹ وری ٹینشن نہ لیں موم ڈیئر! میں سب کچھ کر لوں گا۔'' اس نے غیر ارادی طور پر حارث کی بات دہرا دی۔

سدرہ مطمئن ہو کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ رشی کو اپنے وجود سے کوئی بوجھ ہٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ درِ خدا سے بلاوا اس کے لیے کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ فرحت، سکون اور اطمینان کی لہروں سے زیادہ یہ احساس آنکھوں میں نمی پیدا کر رہا تھا کہ اپنے بداعمال کے باوجود پروردگار کی نظروں میں اس کا ابھی کچھ تو مقام باقی تھا۔ تبھی تو اس کا 'بلاوا' آگیا تھا۔

خیالات کا یہ تسلسل فون کی گھنٹی بجنے سے ٹوٹا۔ دوسری جانب کسی اجنبی نمبر سے پیغام موجود تھا۔

''کیا حال ہے باس؟ کدھر غائب ہو گئے ہیں؟''

رشی نے اندازِ تخاطب سے فوراً پہچان لیا کہ وہ عبداللہ ہے۔

''بس اسٹڈیز نے تھوڑا بزی کر رکھا ہے پارٹنر! تم سناؤ۔ واٹس اپ؟''

''ہونا کیا ہے باس؟ ہماری طرف تو ایک دھماکا ہو گیا ہے۔ وہ جمال قلفیوں والا نہیں تھا۔ اس کا کسی نے مرڈر کر دیا ہے۔'' عبداللہ کے اس انکشاف پر وہ جھٹکے سے سیدھا ہو بیٹھا۔

''مطلب لاش دریافت ہو گئی ہے۔ گڈ!'' ایک مسرور سوچ ذہن میں ابھری جس کے زیرِ اثر اس نے فوراً جواب لکھا۔

''کیا؟...... کب؟...... کیسے؟...... کس نے کیا یہ؟''

''آپ تو 'کاف' کا پورا خاندان ہی لے آئے باس!'' عبداللہ نے بتیسیوں پر مشتمل کئی اسمائلیز بھیجیں۔

''تم نے نیوز ہی ایسی سنا دی ہے یار! ہوا کیسے یہ سب؟ کال کروں میں تمہیں؟''

''ارے نہیں باس! ماما کے اس موبائل میں اسپیکر کا بہت مسئلہ ہے۔ کال کر کے بیزار ہونے سے بہتر ہے کہ میسج پر ہی بات کرلی جائے۔'' اس نے منہ چڑاتی اسمائلی بھیجی۔

''لاش ملی کہاں سے؟''

''وہ جو کونے میں ڑنگ والے شٹروں کی دکان نہیں تھی؟ ڈیڈ باڈی اُدھر ہی کہیں پڑی تھی کل سے۔ دکان کے اندر سے خون بہہ کر باہر سڑک تک آیا تو محلے والوں کو اندازہ ہوا کہ اندر کوئی گڑ بڑ ہوئی ہے۔ اس سے پہلے کچھ جلنے کی بُو بھی آرہی تھی لیکن کسی کو آئیڈیا ہی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کیا چکر ہے؟''

''تو کس چیز کی بُو تھی وہ؟ مجھے یاد آیا کہ اپنے نانی نے بتایا تھا وہ دکان پارٹنرشپ پر ہے۔ دوسرے پارٹنر نے اسے کھولا ہی نہیں کیا؟'' رشی نے محظوظ ہوتے ہوئے سوال کیا۔

''اس کے باڈی پارٹس کاٹ کر تیل میں پھینکے ہوئے تھے کسی نے۔ وہ جل جل کر کوئلہ بن چکے تھے۔ دکان کا دوسرا پارٹنر یہاں ہے ہی نہیں۔ اس کا جوان بھانجا اور داماد ایکسیڈنٹ میں مارا گیا ہے۔ اسی چکر میں ساری فیملی ملتان گئی ہوئی ہے ورنہ کل رات ہی پتا چل جاتا۔''

''اوہ اچھا! تم لوگ تو وہیں ہوگے پھر سبھی۔''

''نہیں نا باس! اپنا چڑی پہلوان اور نانی تو ماموں کی شادی پر ننھیال رہنے گئے ہوئے ہیں۔ رہا میں؟ تو مجھے پاپا نے باہر آنے سے منع کیا ہے۔ اُڑتی اُڑتی سنی ہے کہ ڈیڈ باڈی کی حالت بہت شرمناک ہے۔'' عبداللہ کا تاسف جان کر رشی قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''ویسے اس بار وہ پولیس کو بھی بلوا رہے ہیں۔ ایک ہی ہفتے میں دو قتل کوئی معمولی بات تو ہے نہیں۔'' اس نے اگلا انکشاف کیا۔

''بلوانا بھی چاہیے۔ اچھا یار! مجھے اَپ ڈیٹ کرتے رہنا۔ میں اب ذرا پڑھ لوں تھوڑا بہت۔ کل پیپر ہے میرا۔'' رشی نے عذر تراشا۔

''ٹھیک ہے باس! میں بریکنگ نیوز دیتا رہوں گا۔ ایگزامز کے لیے آل دی بیسٹ۔'' عبداللہ نے مسکراتی

اسمائلی کے ساتھ الوداعی پیغام بھیجا۔

رشی نے ایک زوردار انگڑائی لی۔ لاش کی بازیابی سے منسلک خبریں اسے اس قدر سرشار کرنے لگی تھیں کہ اس نے اپنے گزشتہ فیصلے کے برعکس جائے وقوعہ پر ایک 'راؤنڈ' لگانے کا فیصلہ کرلیا۔

☆☆☆

'ماچس کی ڈبیا' نما اس گھر کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ مختصر صحن اور برآمدے میں لوگوں کا جم غفیر موجود تھا۔

رشی نے اپنی جیکٹ کے کالر اٹھائے اور سر پر لی ٹوپی مزید نیچے کھسکاتے ہوئے بااعتماد قدموں سے چلتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ گھر کے واحد کمرے میں اس وقت دو پولیس اہلکار منیب سے تفتیش میں مصروف تھے۔ رشی کے اردگرد موجود افراد دبی سرگوشیوں میں گفتگو کرتے ہوئے مختلف اندازے لگا رہے تھے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر اس تناؤ زدہ ماحول میں بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

محکمۂ پولیس کو لاتعداد طنزیہ ناموں سے پکارنے اور عزت وقدر نہ ہونے کے باوجود ان کے 'وجود' اور 'وردی' کی اتنی دہشت تو بہرحال عوامی نفسیات پر طاری رہتی تھی کہ وہ ان کے سامنے 'بیبے' بنے رہنے میں ہی عافیت سمجھتے۔ رشی نے فی الحال ان کی سرگوشیوں پر توجہ دینے کے بجائے اپنی سماعت کمرے سے آتی آوازوں کی جانب مبذول کرلی۔

''نہ کا کانہ! یہ بات میں مر کر بھی نہیں مان سکتا کہ تیری یا تیرے خاندان کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں رہی۔ اتنا بڑا قدم کوئی شوقیہ طور پر نہیں اٹھالیتا۔ لاش کے سینے پر یہ تک لکھ ڈالا کہ میں بڑا اوڈا 'حرامی' ہوں۔'' عہدے کے اعتبار سے انسپکٹر نظر آنے والے اہلکار نے کہا۔ اس کا انداز دھیما لیکن دوٹوک تھا۔

''یہ سوال آپ مجھ سے کئی بار پوچھ چکے ہو آفیسر اور ہر بار میں نے یہی بتایا ہے کہ ہماری کبھی کسی سے کوئی دشمنی نہیں رہی۔ مجھے نہیں علم کہ قتل کا مقصد کیا تھا۔'' منیب زچ ہو کر بولا۔

''تیری بہن کا بھی قتل ہوا تھا۔ اس کی لاش بھی راتوں رات دفنا دی گئی۔ تب اطلاع کیوں نہیں دی؟''

''یہ فیصلہ کرنے والا بھی آپ ہی کی کسٹڈی میں موجود ہے۔ انہی سے پوچھ لیجیے اور جب وہ اپنے فیصلے کی وجہ بتادیں تو ساتھ ہی یہ بھی پوچھ لینا کہ انہیں اس حال میں کون پہنچا کر گیا ہے۔'' منیب کے اس بیزار جواب پر رشی اپنی مسکراہٹ ضبط نہ کرسکا۔

''بولے گی پُتر! لاش بھی بولے گی۔ پوسٹ مارٹم سے سب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی...... ہوجائے گا۔ اگر ضرورت پڑی تو تیری بہن کی قبر کشائی کا بندوبست بھی کروا لیں گے۔''

''ٹھیک ہے نو پرابلم! میں تو اُس وقت بھی یہ معاملہ قانون کے سپرد کرنا چاہتا تھا۔ اس بات کے گواہ بھی باہر کھڑے ہیں۔ کسی سے بھی پوچھ لیں۔''

منیب کی اس بات پر باہر موجود اکثریت کے چہرے فق ہوگئے۔ پولیس تفتیش میں شامل ہونے کا تصور ہی ان سب کی ٹانگیں کپکپانے کے لیے کافی تھا۔ رشی ان کی بے چین 'باڈی لینگویج' دیکھ کر بھانپ گیا کہ یہاں اکثریت کسی نہ کسی بہانے کھسک جائے گی اور ہوا بھی یہی۔ صحن میں کھڑے تماشائی سب سے پہلے غائب ہوئے تھے۔ رشی کو اصل حیرت اس وقت ہوئی جب اس نے کمرے کے دروازے کے بالکل پاس کھڑے ارباز کو بھی موبائل فون کان سے لگا کر دروازے سے ایک جانب ہوتے دیکھا۔ رشی بےیقین نظروں سے اسے تکتا رہا۔ اس کی باریک بینی بھانپ گئی تھی کہ ارباز کو نہ تو کوئی فون آیا تھا اور نہ ہی اس نے کہیں کوئی کال ملائی تھی۔ وہ محض ایک بھرم ظاہر کررہا تھا۔

رشی کی نظروں میں اس کا تاثر بہت بُری طرح مجروح ہوا۔ ارباز کا بظاہر دبنگ، بےباک، غصیلا اور بچوں کو مکمل طور پر اپنے قابو میں رکھنے والا 'روپ' حقیقی نہ تھا۔ اس کا 'بہروپ' اصل کے بالکل متضاد تھا۔ موقع شناس، بزدل، بےحس یا شاید منافق۔ رشی کے ذخیرۂ لغت میں اس سے زیادہ الفاظ ہی نہیں تھے۔

''کیا اصل ہے کیا نقل؟ روپ اصل ہے کہ بہروپ؟ اس بہروپ کے عقب میں بھی کوئی روپ ہے کیا؟'' وہ حسب سابق انہی سوالوں میں الجھ گیا۔ ارباز کے ساتھ اختر اور چند دیگر لوگ بھی فق چہرے لیے خاموشی سے غائب ہوتے گئے۔

''سر جی! یہ لڑکا بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ پولیس کو کال کرنا چاہتا تھا لیکن باپ اور کچھ محلے داروں کے دباؤ نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا۔'' رشی کی سماعت میں بابر کی آواز پڑی۔ وہ چونک کر کمرے کے پاس چلا گیا۔

''اپنا کوئی بائیو شائیو بتائیں گے پہلے؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''بابر نام ہے جی میرا۔ یہیں دو گھر چھوڑ کر

رہتا ہوں۔ اس روز جب بچی کی ڈیڈ باڈی ملی، میں یہیں موجود تھا اور پتا نہیں کس ذہنی رو میں ایک تصویر بھی لے لی۔''

''اب یہ نہ کہنا کہ دیکھ کر ڈیلیٹ کر دی تھی۔'' دوسرے اہلکار نے طنز کیا۔

''کر تو دی تھی سر جی! لیکن موبائل سے 'ڈیلیٹڈ آئٹمز' کلیئر نہیں کیے تھے۔ وہاں اب تک موجود ہو گی۔'' بابر نے اعتماد سے جواب دیا اور انسپکٹر کے مطالبے پر موبائل سے تصویر نکال کر اس کے سامنے کر دی۔ ان کے چہروں پر بھی شدید حیرت، تپش اور غصہ جھلکنے لگا۔

''یہ سیدھا سیدھا پولیس کیس تھا۔ بہت غلطی کی تیرے باپ نے جو ڈیڈ باڈی راتوں رات دفنا دی۔ خیر! میں یہ ایف آئی آر بھی کاٹنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ قاتل بہت جلد قانون کی گرفت میں ہوگا۔'' انسپکٹر کے دعوے پر رشی کا اعتماد لحہ بھر کے لیے ڈگمگا گیا۔ اس کے دل میں یکا یک ہی تشویش کی لہر اٹھی تھی۔

''شیور آفیسر! میں اس وقت کا انتظار کروں گا۔ میرا تعاون ہر طرح سے آپ کے ساتھ ہے۔'' رشی نے منیب کو بھی بااعتماد انداز میں کہتے سنا۔

''وہ وقت آنے سے پہلے ہی تیرا وقت پورا ہو جائے گا بیٹا!'' اس نے اپنا عزم دہرایا۔ ''تیرا کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو چکا ہے۔ تجھے بھی اسی گھر میں گھس کر نہ مارا تو ایک باپ کی اولاد نہیں میں۔'' واپسی کی راہ میں رشی کے ذہن پر اپنا آخری مجرم ٹھکانے لگانے کی کھلبلی سوار تھی۔ اس نے یہاں دوبارہ آمد کا بہانہ بھی سوچ لیا تھا۔

☆☆☆

یہ جمال کے قتل سے دو روز بعد کی بات تھی۔

شام کافی گہری ہو چکی تھی۔ دروازے پر بجنے والی گھنٹی نے منیب کو چونکا دیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی جھاڑو مخصوص جگہ پر رکھی اور چھوٹے سے بیلچہ پر سمیٹا گیا کچرا کوڑے دان میں پھینک دیا۔ صحن میں لگے واش بیسن پر ہاتھ دھونے کے دوران میں گھنٹی دوبارہ بج چکی تھی۔

''آ رہا ہوں بھئی! ذرا سانس بھی لے لو۔'' وہ بیزاری سے کہتا باہر چلا گیا۔

''یہ لیں! پاپا نے چاول بھجوائے ہیں آپ کے لیے۔ برتن ابھی خالی کر دیں مجھے۔'' دروازے پر بابر کا بیٹا احمد کھڑا تھا۔ منیب اس کے نام اور ولدیت سے زیادہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔

''ذرا جلدی کر دیں انکل! میں گھر میں ایک بڑا زبردست کرکٹ میچ چھوڑ کر آیا ہوں۔ احمد نے اس کی محویت سے اکتا کر کہا۔ منیب نے خاموشی سے برتن خالی کر کے اسے تھما دیے۔

پوسٹ مارٹم کے بعد جمال کی تدفین کا آج دوسرا روز تھا۔ پولیس کی دلچسپی کے باوجود قاتل کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ تاہم اہلِ محلہ کا رویّہ کافی تبدیل ہو گیا تھا۔ تدفین کے مراحل سے لے کر اب تک کسی نہ کسی گھر سے اس کے کھانے کے لیے کچھ آ جاتا۔ زیادہ تر برتن بچوں کے ہاتھ ہی بھجوائے جاتے تھے۔ منیب نے اپنی ذہنی و جسمانی کیفیت کے پیشِ نظر اس بار انکار کرنے سے گریز ہی کیا ہوا تھا لیکن اب وہ خود کو کافی زیرِ بار محسوس کرنے لگا تھا۔ اس نے آئندہ کھانے کی ذمّے داری خود ہی اٹھانے کا ارادہ کر کے اپنی ڈیوٹی پر بھی دوبارہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جانے والوں کی خلش تو کبھی پوری ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اب زندگی کے یہ کام تو یونہی ساتھ چلتے رہنے تھے۔ کھانا ختم کر کے اس نے پلیٹیں دھوئیں اور اگلے دن کے لیے گھر میں رکھے چند آلوؤں کو کسی کام میں لانے کی ترکیب انٹرنیٹ سے تلاش کرنے لگا۔ اسی اثنا میں گھنٹی دوبارہ بج اٹھی۔ منیب کی بیزاری پھر عود آئی۔ اس نے جھنجلاتے ہوئے دروازہ کھولا اور سامنے ایک اجنبی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

''السلام علیکم! آئی ہوپ میں نے آپ کو ڈسٹرب نہیں کیا۔'' اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ مقابل کے نرم اور شائستہ الفاظ نے منیب پر خاطر خواہ اثر کیا۔

''وعلیکم السلام! نہیں جی ڈسٹربنس کیسی۔'' منیب نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اجنبی کی گرفت کافی سخت اور پُرجوش تھی۔ چند لمحوں تک وہ اس کا ہاتھ دبائے گرمجوشی سے ہلاتا رہا۔

''معاف کیجیے گا! میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔'' منیب نے کہا۔

''پہچانیں گے بھی کیسے؟ ہم آج پہلی مرتبہ ہی تو مل رہے ہیں۔'' رشی کو اطمینان ہو گیا کہ توقع کے عین مطابق وہ اپنی سیکڑوں سواریوں میں اسے یاد نہیں رکھ پایا تھا۔ ''میرا نام طاہر ہے۔''

''جی فرمائیے! کیسے آنا ہوا؟'' منیب نے اگلا سوال داغا۔

''سب باتیں یہیں گیٹ پر کرتے رہو گے یار؟ اندر

آنے کو نہیں کہو گے کیا؟ بے فکر رہو میں کسی ڈکیتی یا لوٹ مار کے ارادے سے نہیں آیا۔'' رشی نے مسکرا کر کہا۔ منیب خفت سے پیچھے ہٹا اور اسے اندر آنے کا رستہ دے دیا۔ کمرے میں لے جانے کے بجائے وہ برآمدے میں رکھی کرسیوں پر ہی بیٹھ گئے۔

''مجھے آپ کے والد کی موت کا دلی افسوس ہے۔ میرا ان سے اسکالرز اکیڈمی سے باہر اکثر آمنا سامنا رہتا تھا۔ آپ یوں کہہ لیں کہ میں ان کا ریگولر کسٹمر تھا۔'' رشی نے بات کا آغاز کیا۔ منیب خاموشی سے اس کا پُرسہ قبول کرتا رہا۔

''اصل میں یہاں ایک اور مقصد کے لیے بھی آیا تھا۔ جمال صاحب کی ریڑھیاں اگر آپ فروخت کرنے میں دلچسپی رکھتے ہوں تو مجھے ضرور بتایئے گا۔''

''آپ کو کیا کرنا ہے ان کا؟ آپ تو اچھے خاصے گھرانے سے معلوم ہو رہے ہیں۔'' منیب نے اس کے عمدہ لباس، جوتوں اور وجود سے پھوٹتی باڈی اسپرے کی خوشبو بھانپ کر کہا۔

''آپ کا اندازہ کافی حد تک درست ہے لیکن یہ ریڑھیاں مجھے اپنے لیے نہیں بلکہ ہمارے علاقے کے ایک مستحق شخص کی مدد کے لیے چاہیے تھیں۔ کچھ روز پہلے پولیس والوں سے جھگڑے میں وہ اپنی ریڑھی سے محروم ہو بیٹھا ہے۔'' رشی نے عذر تراشا۔ اس کی انگلیوں میں اینٹھن بڑھتی جا رہی تھی۔

''میں نے اس بارے میں ابھی سوچا نہیں۔ مارکیٹ ریٹ لگوا کے آپ کو انفارم کر دوں گا۔ اپنا کانٹیکٹ نمبر دیتے جایئے مجھے۔'' منیب نے جواب دیا۔ رشی کے اعصاب تن گئے۔ وہ جلد از جلد اس منٹنے کا خاتمہ کر دینا چاہتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ اپنے اس ارادے پر عمل بھی کر دیتا لیکن اسی وقت دروازے کی گھنٹی نے اسے کوئی بھی قدم اٹھانے سے روک دیا۔

''ایکسکیوز می! میں ابھی آیا۔'' منیب اٹھ کھڑا ہوا۔ رشی کا وجود سنسنا گیا۔ وہ کسی بھی بیرونی فرد کی نظر میں آنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس نے کرسی گھسیٹ کر پیچھے کر لی۔ اب وہ باورچی خانے کی دیوار کے عقب میں کسی کو بھی دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔

''ایک چھوٹا سا کام پڑ گیا ہے آپ سے! کر دیں تو مہربانی ہوگی۔'' یہ زنانہ آواز سن کر رشی چوکنا ہو گیا۔

''اگر میرے بس میں ہوا تو ضرور آپ کی مدد کروں گا۔'' منیب نے شائستگی سے جواب دیا۔ اس کے سامنے محلے ہی کی ایک خاتون کھڑی تھی۔

''میرے شوہر کو اچانک اپنڈکس کا درد اٹھ گیا ہے۔ ان کی طبیعت بے حد خراب ہے۔ آپ انہیں ہماری گاڑی پر اسپتال لے جائیں تو مہربانی ہوگی۔ گھر میں اس وقت اور کوئی بھی نہیں ہے۔ مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی اور آن لائن ٹیکسی ابھی دس سے بارہ منٹ کی مسافت ظاہر کر رہی ہے۔'' خاتون نے تفصیل سے بتایا۔

''ٹھیک ہے! آپ چلیے۔ میں ایک مہمان کو سی آف کر کے دو منٹ میں آپ کے گھر آتا ہوں۔'' منیب کی آواز نے رشی کو مضطرب کر دیا۔ اس کا سارا منصوبہ چوپٹ ہوتا نظر آ رہا تھا۔ اس آخری قتل کے لیے سوچے گئے اہتمام دو منٹ کی مہلت میں پورے ہو ہی نہیں سکتے تھے۔

''او کے! لیکن جلدی پلیز۔'' نو وارد بھی عجلت میں تھی۔ رشی اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''آئی ایم سوری! مجھے ذرا ایک ایمرجنسی ہے۔'' منیب نے برآمدے میں آ کر اسے مخاطب کیا۔

''اٹس او کے....! آپ اپنا کام نمٹا لیں۔ میں ملاقات کے لیے دوبارہ آ جاؤں گا۔ اور اپنا کانٹیکٹ نمبر بھی دے دیجیے۔'' رشی نے اپنا نمبر دینے سے گریز کرتے ہوئے پہلے اسی کا طلب کر لیا۔ منیب نے نمبر لکھوایا اور کمرے کے دروازے کی بائیں جانب عقب میں موجود رشی کا دل شدت سے مچلنے لگا کہ وہ منیب کا گلا گھونٹ کر ایک ہی جھٹکے میں عدم کا پروانہ تھما دے لیکن اس طرح وہ مزہ بالکل نہ آتا جو اس نے شازیہ، اقصیٰ اور جمال کی موت سے کشید کیا تھا۔

''کوئی بات نہیں پُتر! جی لے ایک دو دن اور...... تیرا انجام بھی یادگار ہی بناؤں گا۔ نہایت یادگار۔'' رشی الوداعی کلمات کے بعد مرکزی دروازے سے باہر نکل گیا۔

اسے مکمل اطمینان تھا کہ اس کی یہاں آمد اور منیب سے ملاقات کا کوئی گواہ موجود نہیں ہے۔ وہ دانستہ طور پر اس وقت ملنے آیا تھا جب اس کے تینوں دوست اپنی اپنی پڑھائی کے سلسلے میں مگن ہوتے۔ وہ مسرور انداز میں سیٹی پر کوئی دُھن بجاتے واپس لوٹا تو اس کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی یہ امکان موجود نہ تھا کہ اس کی یہاں آمد نہ صرف 'کسی' نے دیکھی تھی بلکہ اپنے موبائل میں ویڈیو کی صورت میں محفوظ بھی کر لی تھی۔ اس وقت تو بے خبری اس کے لیے بہت غنیمت تھی کہ ایک ویڈیو بنانے کے بالواسطہ یا بلاواسطہ

مجرم ابھی ٹھکانے نہ لگے تھے کہ ایک اور ویڈیو کسی خطرناک بارودی سرنگ کی طرح تخلیق ہوگئی تھی۔ وہ بے خبر تھا اسی لیے بے فکر تھا۔

☆☆☆

''رشی بیٹا! کدھر غائب تھے تم؟ تمہارے پاپا کال کر رہے تھے۔'' سدرہ نے اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔

''کسی کام سے گیا تھا موم ڈیئر! نیٹ ڈیٹا آف تھا۔ پتا ہی نہیں لگا ان کی کال کا۔ خیر تھی نا ویسے؟''

''ہاں! ویزا کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ میں نے کہا کہ ابھی تک تو ہم کہیں نہیں گئے۔'' سدرہ نے کھانا نکالتے ہوئے بتایا۔

''بس ایک دو دن میں لے جاؤں گا۔ آج ہی لے جاتا لیکن کچھ ضروری کام نمٹانے تھے۔'' اس نے منیب کا تصور ذہن سے جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''بس جیسے یہ قرض اترتا ہے میں آپ کو آفس لے جاؤں گا۔''

''بات تو تمہاری ٹھیک ہی ہے۔ اللہ کے در پر حاضری دینی ہو تو ہر قرض چکا کر۔ ہر ذمّے داری نمٹا کر اور دلوں سے سب کینہ، کدورتیں، ناراضگیاں ختم کر کے ہی جانا چاہیے۔ ورنہ دل میں کفر رکھ کر ایسی مقدس جگہ پر جانے کا فائدہ ہی کیا؟''

سدرہ کی اس بات نے اسے نئی فکر میں مبتلا کر دیا۔ آخری قرض چکانے کا وقت تو آ ہی گیا تھا۔ وہ کسی بھی وقت منیب کو ٹھکانے لگا کر اپنے دل پر دھرا آخری بوجھ بھی اتار لیتا لیکن 'کسی' کی ناراضگی کو کیسے ختم کرتا؟ مناہل اس دفعہ بہت شدت سے ناراض ہوئی تھی۔ وہ اس کی خفگی کا بوجھ لیے کیسے یہاں سے جا سکتا تھا؟ اخلاقی طور پر بھی وہ اپنے اس نئے فیصلے کے متعلق اعتماد میں لینے کا پابند محسوس کرتا تھا۔ لمحاتی سوچ بچار کے بعد اس نے مناہل سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سے رابطہ بھی آسان ثابت نہ ہوا۔ انیسویں کوشش کے بعد فون اٹھایا گیا تھا۔

''یس! ہواِز دیئر؟'' دوسری جانب بیگانگی اور رُکھائی عروج پر تھی۔

''تمہارا مجرم۔'' رشی نے ہونٹ کچلتے ہوئے کہا۔

''کیا چاہتے ہو اب؟'' وہ بیزاری سے بولی۔

''مجرم سزا یا معافی کے سوا اور کیا چاہ سکتا ہے؟'' وہ ملائمت سے بولا۔

''اس طرح کے فلمی ڈائیلاگز سنا کر تم معافی کے حق دار نہیں ٹھہر سکتے۔'' اس نے بپھر کر جواب دیا۔

''میں جانتا ہوں۔ مجھے اپنی بات کلیئر کرنے کا ایک......'' رشی نے سنبھل کر کہا۔ وہ مناہل کی سالگرہ کے روز اپنے بہک جانے کی معذرت کرنا چاہتا تھا لیکن مناہل قطع کلامی کرتے ہوئے بے لچک انداز میں کہنے لگی۔

''تم مرد پتھر دل اور سفاک ہی ہوتے ہو۔ تمہیں لڑکی کے نازک جذبات کی پروا کہاں ہوتی ہے؟''

''مجھے احساس ہے...... بالکل ہے...... میں اسی لیے تو۔''

''نہیں ہے احساس......اگر ایسا ہوتا تو اُس روز میری توہین کر کے رومانس کو یوں نہ چھوڑتے۔ تم نے تو مجھے یوں دھتکار دیا جیسے میں کوئی خارش زدہ جانور ہوں۔ میں کتنی چاہت اور جذبے سے تمہارے قریب آئی تھی لیکن تم...... تم تو نہ جانے خود کو کیا سمجھتے ہو؟''

اس کے الفاظ اور منطق سن کر رشی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ایسے ردِّعمل کا تصور تو اس نے کیا ہی نہیں تھا۔

''میری بات تو سنو یار!'' اس نے نئے سرے سے کوشش کرنی چاہی۔

''نہیں! مجھے کوئی ایکسکیوز نہیں سننا! انسلٹ کی ہے تم نے میری۔ برتھ ڈے تو خراب کی ہی...... میرے رومانس کا بھی ذرا خیال نہیں کیا۔ اس طرح بدکے مجھ سے کہ جیسے میں کوئی اچھوت ہوں۔ گو ٹو ہیل! جسٹ گو ٹو ہیل!'' اس نے چیختے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔ رشی کتنی ہی دیر سناٹے میں گھرا بیٹھا رہا۔

''یہ کون سا روپ تھا مناہل کا؟ میں تو اُس روز 'اوور' ہو جانے کے لیے معافی مانگنا چاہتا تھا لیکن وہ اپنے ذہن میں کیا کچھ بھرے بیٹھی ہے۔'' وہ ششدر تھا۔

وہ ایک بھرپور آگہی کا لمحہ تھا۔ مناہل کے اس رویّے کے متعلق سوچتے عورت ذات کی شخصیت کا تضاد پوری شدت سے اس پر آشکار ہوا تھا۔ رشی کی وہ پیش قدمی یقیناً مناہل کو بہت اچھی لگی تھی۔ غالباً وہ بھی کسی ایسے ہی خوبصورت اظہار اور رومانوی لمحات گزارنے کی خواہشمند تھی۔ اگر اسے رتی بھر بھی اعتراض ہوتا تو وہ اسے سختی سے روک دیتی۔ ہاں! وہ بالکل ایسا کر سکتی تھی لیکن اس نے جوابی گرم جوشی اختیار کی تھی۔ ان لمحات کی حدود کا فیصلہ بھی یقیناً مناہل ہی طے کرتی۔

رشی کو اس پل اپنا آپ نہایت احمق محسوس ہونے لگا۔ اسی پل اس پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ موجودہ وقت میں جسمانی

پیش قدمی کو رومانس کا نام دے کر اپنے لیے جائز قرار دے لیا گیا ہے۔ رومانس کے نام پر تعلقات کی کوئی بھی حد یا دیگر لفظوں میں بے حد تعلقات سے غیر اخلاقی پہلو کا تصور ہی حذف کر دیا گیا تھا۔ رشی کے لیے مرد و زن کے تعلقات کی یہ نہج غیر اخلاقی اور باعثِ گناہ تھی لیکن اس کی زندگی سے وابستہ دیگر لوگوں کے لیے یہ صرف 'رومانس' اور مزاج و وقت کا تقاضا تھا۔

''یہ کیا گورکھ دھندا ہے؟ ہر شخص، رشتہ اور فلسفۂ حیات کے پیچھے بہروپ ہی کیوں ہوتا ہے؟ روپ اصل ہے کہ بہروپ؟ کیسے سمجھے گا کوئی؟ کیا پہیلی ہے یہ عورت بھی؟ نہیں! شاید میں اب بھی غلط ہی سمجھ رہا ہوں۔ میری سوچ اور نظریہ اس دنیا سے متصادم ہے۔ یہ ساری دنیا ٹھیک ہے اور میں غلط ہوں یا پھر وہ سبھی غلط ہیں اور میں اپنی جگہ درست ہوں۔ یا خدا! میں کیا کروں؟ روپ بہروپ کا یہ سلسلہ کبھی ختم بھی ہوگا کہ نہیں؟ کوئی تو ایسا ہو جس کا بہروپ، روپ سے مختلف نہ ہو۔ کوئی تو ایسا ہو۔'' اس نے اپنا سر ہتھیلیوں پر گرا لیا۔

اعصاب پُرسکون اور ذہن یکسو کرنے کے لیے اس نے اَن گنت گلاس پانی پیے اور مناہل کو ایک ٹیکسٹ میسج بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔

''میں اپنی غلطی پر شرمندہ ہوں۔ تمہارا مجرم ہوں۔ جو بھی چاہو سزا دے لو لیکن آخری بار صفائی کا موقع دے دو۔ کل شام میں نیشنل پارک میں تمہارا انتظار کروں گا۔'' اس نے پیغام بھیج کر موبائل ایک جانب رکھ دیا۔ اب اسے جواب کا انتظار تھا، نہ ہی کوئی بے چینی۔ اتنا تو اندازہ ہو گیا تھا کہ مناہل خوب نخرے دکھانے کے بعد ہی کوئی جواب دے گی۔ اسے صنفِ مخالف کی نفسیات اس حد تک تو سمجھ آنے ہی لگی تھی کہ ان کے انکار میں اقرار اور گریز میں مقابل کی پیش قدمی کی چاہ چھپی ہوتی تھی۔ رشی نے بھی تعلقات سے رومانس کے ساتھ لطف اندوز ہونے کی ذہن سازی شروع کر دی۔ اب اسے کل مناہل سے ملاقات کے بعد اپنے رشتے کی حدود و قیود کا بھی حتمی اندازہ لگانا تھا۔

اگلے روز مناہل سے تو کیا ملاقات ہونی تھی۔ اس کی بہترین ہم جولی تقدیر نے ایک اور سرپرائز تیار کر رکھا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز موسم بہت سہانا تھا۔

صبح ہونے والی ہلکی بارش کے بعد فضا میں بڑی دل فریب خنکی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ موسم یقیناً دلوں کے تار اور روح میں موسیقیت چھیڑنے کا سبب بن سکتا تھا لیکن منیب کے ساتھ معاملہ برعکس تھا۔ وہ موسم کی اس خوبصورتی سے لطف اندوز ہونے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ جمال کی لاش کا نظارہ کرنے کے بعد سے اسے اپنے دماغ پر ایک غبار نما گولا چڑھا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ محلے داروں کے عنایت کردہ سالن اس کے معدے پر مزید گراں ثابت ہوئے۔ گزشتہ رات قے اور دست نے ایسی سازباز کی کہ شدید نقاہت کو جنم دے کر بھی اس کی جان نہ چھوڑی۔ اس موقع پر پرہیزی کھانا کس سے کہہ کر بنواتا؟ فریج میں پرانا سالن کھا کر ہی گزارہ کرنا پڑا۔ نتیجتاً مرض نے نیا بگاڑ اختیار کر لیا۔ رات دو بجے کے بعد طبیعت اس قدر بگڑی کہ اسے ہنگامی حالت میں ایمبولینس منگوا کر اسپتال جانا پڑا۔ اس کے اپنے وجود میں تو چار قدم چلنے کی بھی ہمت نہ تھی۔

اسپتال میں گلوکوز اور چند دواؤں کی ڈرپس نے اس پر اچھا اثر ڈالا۔ انہی ڈرپس کے زیرِ اثر تھوڑی دیر نیند پوری ہونے کے بعد وہ صبح دس بجے تک خاصا بہتر محسوس کرنے لگا۔ ڈسچارج کرتے وقت ڈاکٹر کی جانب سے آرام اور پرہیزی کھانے کی کافی ہدایات تھیں۔ منیب تلخی اور افسردگی سے مسکرا کر رہ گیا۔ اس کی قسمت میں آرام اور پرہیز نام کی کوئی بھی شے باقی نہ بچی تھی۔ واپس آتے ہوئے اس نے ایک دکان سے بسکٹ، فروٹ کیک اور جوس کے ڈبے اور دوسری جگہ سے تازہ پھل خرید لیے۔ اگلے کچھ روز تک اسے انہی چیزوں پر گزارا کرنا تھا۔

شام تک اس کی طبیعت کافی تازہ دم ہو گئی لیکن تنہا گھر میں وحشت کا احساس اب بھی ناقابلِ برداشت تھا۔ مغرب کے تھوڑی ہی دیر بعد بابر اس کے پاس چلا آیا۔ اس کے گھر دوسرے شہر سے بہن کے بچے آئے ہوئے تھے جو آج نیشنل پارک جانا چاہتے تھے لیکن گزشتہ رات سیڑھیوں سے گر کر پاؤں پر چوٹ لگوانے والے بابر کے لیے ڈرائیونگ ناممکن تھی۔ وہ منیب کو اپنی گاڑی لے جانے کے لیے راضی کرنا چاہتا تھا۔ منیب نے اپنے ماحول کی تبدیلی کے لیے ہامی بھر لی۔

نیشنل پارک کا ماحول بہت شاندار تھا۔ پارک کے باہر گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کی طویل قطاروں سے واضح تھا کہ شہریوں کی بڑی تعداد موسم کی دل فریبی سے لطف اندوز ہونے آئی ہے۔

''تم چاہو تو دو گھنٹے بعد آ جانا ہمیں لینے۔'' بابر کی والدہ نے اسے مخاطب کیا۔

''میں آپ کا یہیں انتظار کرلوں گا آنٹی جی!'' منیب نے دھیمے لہجہ میں جواب دیا۔

''ایز یو وِش بیٹا! ہمیں دو سے تین گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔''

''ٹیک یور ٹائم۔ میں یہیں ملوں گا آپ کو۔'' منیب گاڑی کی نشست سے پشت لگا کر قدرے نیم دراز ہو گیا۔ اسے گھر واپس جا کر دوبارہ یہاں آنے کا مرحلہ سوچ کر ہی تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ نشست سے نیم دراز وہ کتنی ہی دیر قرب و جوار کی رونق اور لوگوں کے چمکتے چہرے دیکھتا رہا۔ دفعتاً اس کی نظر ایک مانوس چہرے پر پڑی۔ منیب کے ذہن میں یکدم پچھلی ملاقات تازہ ہو گئی۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اسے پکار لیا۔

''تم طاہر ہی ہو نا؟'' اس کی آواز پر رشی بے ساختہ چونک گیا۔

''ہاں! میں ایک دو روز میں تمہاری طرف ہی آنے کا سوچ رہا تھا۔'' رشی مسکرایا۔ وہ بھی منیب کو یوں اپنے سامنے دیکھ کر حیرت کے جھٹکے سے سنبھل گیا تھا۔ ''مارکیٹ ریٹ لگوا لیا ہے کیا سامان کا؟''

''نہیں! کچھ بزی تھا بس۔ ایک دو روز تک یہ کام بھی ختم کرلوں گا۔''

''اوکے! میں انتظار کرلوں گا پھر۔ کس کے ساتھ آئے ہو یہاں؟ رشی نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ منیب کو سامنے دیکھ کر اس کے بدن میں مخصوص اینٹھن بیدار ہونے لگی تھی۔

''سمجھ لو کہ رائیڈ لے کر آیا ہوں۔ ان کی واپسی تک یہیں رہوں گا۔ ساتھ لے کر ہی واپس جاؤں گا۔'' منیب کو خود بھی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اپنے مزاج کے برعکس ایک اجنبی سے کس طرح اتنی گفتگو کر رہا ہے۔ شاید یہ احساسِ تنہائی ہی تھا جو اب اسے لوگوں سے بات چیت کرنے یا ان کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کرتا تھا۔

''تو یہاں اکیلے بیٹھ کر وقت کیوں ضائع کر رہے ہو؟ اندر آجاؤ۔ خاصی رونق ہے آج تو۔'' رشی نے اکسایا۔

''نہیں! ایسی جگہوں سے میرا دل بہت گھبراتا ہے۔ تم کس کے ساتھ آئے ہو؟ فیملی یا فرینڈز کا کوئی گروپ؟'' منیب نے برسبیل تذکرہ پوچھا۔

''انتظار کر رہا ہوں کسی کا۔ مجھے پہلے سات بجے یہاں بلوا کر دوبارہ میسج کر دیا کہ ایک ڈیڑھ گھنٹا لیٹ ہو جائے گی۔'' رشی کے جواب پر منیب نے محض مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔ وہ کسی کے بھی ذاتی معاملات میں دخل اندازی کرنے یا اپنی رائے ٹھونسنے کا عادی نہیں تھا۔

''آجاؤ اندر میرے ساتھ! تمہاری رائیڈ کے فارغ ہونے تک تھوڑا گھوم پھر ہی لو۔ وقت اچھا گزر جائے گا۔'' رشی کی تجویز نے اسے مخمصے میں مبتلا کر دیا۔

''اوکے! چلتا ہوں۔'' منیب نے ہامی بھری اور گاڑی اچھی طرح لاک کرنے کے بعد اس کے ساتھ اندر بڑھ گیا۔

پارک کا اندرونی ماحول بہت دلکش تھا۔ خنکی اور سبزہ مزاج پر خوشگوار اثرات مرتب کر رہے تھے۔ منیب کو اپنی کسلمندی اور بیزاری دور ہوتی محسوس ہونے لگی۔ وہ ایک ٹریک پر رشی کے ساتھ گفتگو کرتا آگے بڑھتا گیا۔ پارک میں موجود بچوں، عورتوں اور مردوں کے لباس و انداز پر برجستہ فقرے سن کر منیب کے لیے ہنسی ضبط کرنا دشوار ہونے لگا۔ اس کی بعض باتوں کے جواب میں وہ قہقہے لگانے پر مجبور ہو گیا۔

''تمہارے ساتھ کوئی بھی شخص بور نہیں ہو سکتا۔ یو آر سو فنی۔'' منیب کی آنکھوں میں پانی آگیا تھا۔ رشی اس تبصرے پر سر جھٹک کر رہ گیا۔ وہ اسے بتا ہی نہیں سکتا تھا کہ اس ہنسی اور مذاق کے عقب میں اس نے انتظار کی کوفت، منال کے گریز کی اذیت، سب سے بڑھ کر منیب کی صحبت سے محسوس ہونے والا طیش اور اینٹھن پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ اپنے ان جذبات کے علاوہ رشی کو اپنے اردگرد لوگوں کی تمسخرانہ نظریں اور حقارت دیکھ کر منیب کو کھڑے کھڑے بھسم کر دینے کی خواہش پر ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''آئس کریم کھاؤ گے طاہر؟'' رشی کو منیب کے اس فقرے نے اپنے خیالات سے چونکایا۔ وہ پُرشوق نظروں سے اپنے سامنے کون آئس کریم کی مشین دیکھ رہا تھا جہاں چاکلیٹ اور ونیلا فلیور کے ساتھ چاکلیٹ چپس اور رنگ برنگی بنٹیوں کے ساتھ گارنش کی جارہی تھی۔

''ہاں! لیکن میں کپ لوں گا۔'' رشی کے منہ میں بھی چاکلیٹ کی گارنش دیکھ کر پانی بھر آیا۔

منیب نے فوری آگے بڑھ کر اپنے لیے کون اور رشی کے لیے 'لارج سائز' کپ تیار کروایا اور اس سے مخاطب ہو کر بولا۔

''لو بھئی! مزے کرو۔''

رشی نے کپ تھاما ہی تھا کہ فضا پہلے تیز گڑگڑاہٹ اور پھر مختلف چیخوں سے گونج اٹھی۔ دونوں نے چونک کر ان

آوازوں کے ماخذ کی جانب دیکھا اور دونوں ہی کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ان سے قدرے فاصلے پر اس پارک کا سب سے مشہور جھولا تھا۔ عوامی طبقوں میں یہ جھولا خاصا مقبول تھا۔ اس کے بلندی پر جانے اور پھر نیچے آنے تک چیخ و پکار کا سلسلہ شروع .... ہو جایا کرتا۔ اکثر افراد چکراتے حواس کی وجہ سے نیچے اتر کرتے کرتے پائے جاتے تو کئی ہیجان اور ہڑبڑاہٹ میں عجیب وغریب آوازیں اور نعرے بلند کیا کرتے۔

''بیٹھے ہو کبھی اس جھولے پر؟'' رشی نے آئس کریم کا بڑا سا چمچ منہ میں رکھا۔

''نہیں! لیکن ان پاگلوں کی حرکتوں کے بارے میں کافی سن رکھا ہے۔'' منیب کی نظریں ان نوجوان لڑکیوں پر تھیں جو آنکھیں بند کیے چیخ رہی تھیں۔

''روکو...... پلیز اسے روکو...... اوئی اللہ! میں مرگئی ہے...... میں مرگئی ہے......''

''ویسے میں سوچتا ہوں کہ اگر کبھی میں یہاں بیٹھا تو کیا ایسے ہی چیخ و پکار کروں گا۔'' منیب اس بڑھتے ہوئے شور سے لحظہ بہ لحظہ محظوظ ہو رہا تھا۔

''تو چلو پھر! ٹیسٹ کر لیتے ہیں۔ دیکھ لیتے ہیں کس میں کتنا اسٹیمنا ہے۔'' رشی کی تجویز پر منیب کا آئس کریم منہ کی طرف لے جاتا ہاتھ فضا میں ہی تھم گیا۔ اس کے بدن میں یک لخت ہی بے عنوان سنسنی پیدا ہوئی تھی۔

''ٹھیک ہے! میں ریڈی ہوں۔'' اس کے اقرار پر رشی کی آنکھوں میں ایک سفاک چمک پیدا ہوگئی۔ اس شخص کو اپنے سامنے موجود پا کر رشی کے لیے ضبط ناممکن ہو چلا تھا۔ مناہل کی طرف سے رابطے میں تاخیر مزید دماغ کھولا رہی تھی۔

''آ جاؤ پھر! ٹکٹ لیتے ہیں۔ اس دفعہ تو رش بھی کم ہی لگ رہا ہے نیچے۔'' منیب نے ٹکٹ گھر کے سامنے قطار دیکھتے ہوئے کہا۔ رشی معنی خیزی سے اسے دیکھتا ہوا ساتھ چلتا رہا۔ منیب نے دو ٹکٹس کے پیسے تھمائے اور کون کا خالی حصہ ایک جانب پھینکتے ہوئے رشی سے مخاطب ہو کر بولا۔

''جھولے کی باہر والی سیٹ پر میں بیٹھوں گا۔ تم اندر والی سنبھال لینا۔''

''مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ تم ایک بار چلو تو سہی۔'' رشی کی آنکھوں میں سرد مہری غالب آ رہی تھی۔

اگلے دس منٹ میں چیخ و پکار اور گڑگڑاہٹ کا طوفان بالکل شانت ہو چکا تھا۔ رشی کے موبائل پر گھنٹی بجی۔ اس نے تڑپ کر موبائل غیر مقفل کیا اور مناہل کی طرف سے آیا ہوا پیغام پڑھنے لگا۔

''آئی ایم سوری۔ میں خود کو وہاں آنے کے لیے تیار نہیں کر پا رہی۔ تم نے مجھے بہت بُری طرح مایوس کیا ہے۔ میں اینڈ تک بھی انتظار کرتی رہی کہ تم مجھے کہو گے کہ میرا برتھ ڈے گفٹ اور سیلیبریشن کا ہرا پھر وہیں سے جوڑ کر ایک بھرپور رومانٹک وقت گزار لیتے ہیں۔ میں انتظار ہی کرتی رہی کہ تم مجھے اس ادھورے رومانس اور میری انسلٹ کی، پینلٹی، دو گے۔ لیکن تم نے ایک پبلک پارک میں بلا لیا مجھے۔ سیکڑوں لوگوں کے سامنے ہم بات ہی کیا کریں گے بھلا؟ چھوڑو رشی! یہ پیار محبت کا کھیل تمہارے بس کی بات ہی نہیں۔ گڈ بائے۔''

مناہل کا یہ میسج ... پڑھ کر رشی کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اسے اس گورکھ دھندے کی سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی۔ وہ مناہل کے ساتھ جذباتی لمحات گزارتے ہوئے اسی خلش میں مبتلا ہوا تھا کہ وہ اپنی محبت کو داغدار نہ کر دے، شازیہ اور اقصیٰ نے محبت کے نام پر جنس کا کھیل رچا کر رشی کے ذہن میں بہت پیچیدہ گرہ پیدا کر دی تھی۔ اسی لیے وہ سمجھ ہی نہ پایا کہ مناہل کو شاید ایسی محبت درکار ہی نہ تھی۔ ایک لمحے کے لیے اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس نے اپنے جذبات ایک بالکل مختلف اور متضاد سوچ کی لڑکی سے منسلک کر لیے ہیں۔ اس کی ہستی کا مان بہت بُری طرح ٹوٹ کر بکھرا تھا۔ اسے اپنا وجود کسی کھلونے کے مانند لگ رہا تھا جس سے جب جی چاہے کھیل کر ایک جانب پھینک دیا جاتا۔ بے بسی، طیش اور انتقام سے اس کا دماغ اُبلنے لگا۔

''اب آ بھی جاؤ یار!'' منیب نے اوپر سے آواز لگائی۔ رشی اپنے بدن کی اینٹھن پر قابو پاتے ہوئے اس کے پاس جا پہنچا۔

''لگتا ہے بھابی جی کو ابھی مزید دیر لگ جائے گی۔ اسی لیے تمہارا موڈ آف ہو گیا ہے۔'' منیب کے ہلکے پھلکے انداز پر وہ مزید تپ گیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ منیب کا منہ نوچ کر پوچھے کہ مناہل تمہاری بھابی اور میں تمہارا بھائی کیسے ہو گیا؟ تم تو میرے دشمن ہو۔ ایسے دشمن جس نے انجانے میں مجھے نفرت، انتقام اور بے حسی کی اندھی وادی میں دھکیل دیا ہے لیکن ایسا کچھ بھی کہنے کے لیے یہ موقع بہرحال مناسب نہیں تھا۔

''ویسے مجھے پتا نہیں کیوں لگتا ہے کہ میں تمہیں پہلے سے جانتا ہوں۔'' منیب نے یکدم کہا۔ رشی کے اعصاب

سنسنا گئے۔ اسی لمحے جھولے سے تیز گڑگڑاہٹ بلند ہوئی۔ بالکل عقب میں طویل نشست پر بیٹھے لڑکوں نے دانستہ طور پر بلند آواز میں چیخ و پکار شروع کر دی۔

''اچھا! ایسا کیوں لگتا ہے تمہیں؟'' رشی نے پوچھا۔ گڑگڑاہٹ اور تیز ہو گئی تھی۔

''یہ تو علم نہیں۔ لیکن جب تم پہلی بار میرے گھر آئے تھے اس وقت بھی ایسا ہی محسوس ہوا تھا کہ میں تمہیں پہلے سے ہی جانتا ہوں۔'' منیب کی آواز گڑگڑاہٹ کی وجہ سے غیر اختیاری طور پر بلند ہوئی۔ جھولے نے اب آہستہ آہستہ حرکت بھی شروع کر دی تھی۔

''اچھا! تو پھر یاد نہیں آیا کہ کیسے جانتے ہو اور کہاں مل چکے ہو مجھے؟'' رشی نے اپنے سامنے آہنی ڈنڈے کو زور سے جکڑ لیا۔ جھولا ہلکی رفتار سے اوپر کی طرف اٹھا تھا۔

''ابھی پارکنگ سے لے کر یہاں آنے تک یہی سوچتا رہا ہوں لیکن واقعی کچھ یاد نہیں آ رہا۔'' منیب نے بھی آہنی ڈنڈا تھاما۔ جھولے نے تھوڑی رفتار مزید پکڑ لی تھی۔

''عجیب بات ہے ویسے! اقصیٰ کے ذہن میں بھی یہی سوال پیدا ہوتا تھا۔ ہر دفعہ یہی پوچھا کرتی تھی مجھ سے۔ بڑا شوق تھا اُسے میری آنکھوں کے پیچھے چھپی دنیا دریافت کرنے کا۔ بے چاری کو اس کے سوال کا جواب مل بھی گیا تھا لیکن بالکل آخری لمحوں میں۔ یقین ہی نہیں کر پا رہی تھی کہ وہ 'میں' تھا۔'' رشی نے اطمینان سے جواب دیا۔ جھولا تیز رفتاری سے اوپر کی جانب اٹھا۔ اگلی نشستوں پر موجود لڑکیوں کی سُریلی چیخوں نے گڑگڑاہٹ سے 'ریس' لگالی۔

''یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم؟ اقصیٰ...... اقصیٰ کو کیسے ملے تم؟'' منیب اچھل پڑا۔

''بکواس نہیں کر رہا۔ حقیقت بتا رہا ہوں۔ اس سرخ جرسی اور سیاہ ٹائٹس میں ایمان لوٹ لیا تھا اس حرافہ نے میرا۔'' رشی نے اسے مزید سلگایا۔ ''وہ تو پہچان گئی تھی مجھے لیکن جمال کی طرف سے حسرت ہی رہی۔ یادگار سزا کے باوجود بے چارہ اپنے قاتل کی شناخت جانے بغیر ہی پرلوک سدھار گیا۔'' چیخ و پکار اور گڑگڑاہٹ کے باعث رشی نے منیب کے کان کے قریب ہوتے ہوئے اپنا زہر انڈیلا۔

منیب کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ جس شخص سے ملنے اور سامنا کرنے کے لیے وہ دن رات تڑپا تھا، آج مل ہی گیا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور رشی کا گریبان تھام لیا۔

''تجھے تیری موت کھینچ کر لائی ہے میرے سامنے۔ قسم کھائی تھی میں نے کہ تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''تیری اس قسم سے پہلے ایک قسم میں نے بھی کھائی تھی کہ اپنے گناہ گاروں کو چن چن کر ماروں گا۔ تین تو لڑھک گئے۔ آج تو بھی نہیں بچے گا۔'' رشی نے ترچھی ہتھیلی اس کی کلائی اور ہاتھ پر مار کر اپنا گریبان چھڑایا۔ منیب نشست سے اٹھنے کے بعد لڑکھڑا رہا تھا۔ جھولا بھی اس لمحے تیزی سے نیچے آیا تھا۔ رشی جارحانہ انداز میں اٹھا اور اسے کمر کے بل آہنی ڈھانچے پر لٹالیا۔

''مجھے مار کر تم خود کیسے بچو گے؟ یہ میرا گھر یا وہ کرائے کی دکان نہیں بلکہ ایک پبلک پارک ہے۔ یہاں تمہارا ٹینٹوا دبانے کے لیے ایک نہیں سیکڑوں افراد موجود ہیں۔'' منیب نے اسے زور لگا کر دھکیلنا چاہا۔ رشی نے استہزائیہ نظروں سے اردگرد دیکھا۔ پچھلی نشستوں میں بارہ، تیرہ سالہ بچے اور اگلی جانب چند لڑکیاں موجود تھیں۔ وہ سبھی آنکھیں بند کیے کانوں پر ہاتھ رکھے چیخنے میں مصروف تھے۔

''مجھے پروا نہیں۔ مولا قسم! اب مجھے کسی کی کوئی پروا نہیں۔ میری زندگی جتنی برباد ہونی تھی، ہو چکی۔ اگر ابھی پکڑا بھی جاؤں تو کم از کم یہ اطمینان ضرور ہوگا کہ میرے مجرموں نے بھی اپنے کیے کی سزا بھگت لی تھی۔ اگر بچ جاؤں تو اپنی زندگی کا ہر ایک لمحہ والدین کے نام کر کے انہیں یہاں سے بہت دور لے جاؤں گا۔'' اس نے منیب کی گردن پر زور بڑھا دیا۔

''کون ہو تم؟ کیا بگاڑا تھا آخر ہم سب نے تمہارا؟'' منیب نے بھی بھرپور جوابی زور لگایا لیکن رشی کا ہیجان اس پر ہر طرح سے غالب تھا۔

جھولے کی رفتار تیز اور رخ اوپری جانب ہوتے ہی رشی نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے جھولے میں بیٹھے افراد کے بجائے نیچے باری کے انتظار میں کھڑے لوگوں سے زیادہ خطرہ تھا۔ ان میں سے چند ایک ان کی طرف متوجہ بھی ہو چکے تھے۔

''نمٹ لوں گا سب سے۔ آج آر یا پار۔'' رشی بڑبڑایا۔ اس نے منیب کو اپنی جانب کھینچا اور بھرپور قوت سے اس کی ٹانگیں دبوچ کر اسے نیچے اچھال دیا۔

منیب کی آنکھیں حیرت اور دہشت سے پھٹی رہ گئیں۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے بیس فٹ نیچے دکھائی دیتے پختہ فرش کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ان بند آنکھوں کے پیچھے رشی کا سفاک اور سرد مہر انداز عود آیا اور اس کے ساتھ ہی شناخت کا آخری مرحلہ بھی مکمل ہو گیا۔ گرد آلود ٹائلوں پر کمر کے بل گرتے اسے اپنی گردن، کندھوں،

کمر، کولہوں اور سر میں ناقابلِ برداشت اذیت کے ساتھ سرخ سیال بہنے کا احساس ہوا۔ دھندلی بصارت میں اسے اوپری جانب رشی کی آخری جھلک نظر آئی جو مسکراتے ہوئے اس کی جانب ہوائی بوسہ اچھال کر پچھلی طرف غائب ہو گیا تھا۔

''اوئے رکواؤ اس جھولے کو...... فوراً رکواؤ۔'' ڈوبتی ساعت میں چند آوازیں پڑیں۔ اس کے حواس اپنے آس پاس لوگوں کو اکٹھا ہوتے محسوس کر رہے تھے۔

''ارے! یہ تو وہی 'جنانا' ہے ناں جو ادھر آئس کریم لینے بھی آیا تھا۔'' منیب کے کانوں میں پڑنے والے یہ آخری الفاظ ہر چوٹ، اذیت اور بہتے لہو سے زیادہ تکلیف دہ تھے۔ اس نے بے بسی سے آنکھیں موند لیں۔ اس کے بعد ہر منظر پر تاریکی چھا گئی۔

☆☆☆

نیشنل پارک میں ہوئے اس واقعے کو آج دوسرا روز تھا۔

گزشتہ رات حادثے کی ایف آئی آر اسی علاقے کے تھانے میں درج کروائی گئی تھی۔ اس تھانے کا عملہ، رویہ اور اندازِ تفتیش ایس ایچ او 'علی مراد رانا' کی بدولت روایتی کلچر سے کافی مختلف تھا۔ علی مراد تقریباً پچاس برس کا تھا۔ ورزشی جسم، ذہین آنکھیں، شاطر دماغ اور چست و چالاک۔ اس نے متعلقہ کیس سامنے آتے ہی ایک اہلکار کو اس پارک میں موجود ملازمین سے تفتیش اور دوسرے اہلکار کو مبینہ نوجوان کے رہائشی علاقے میں بھیج کر ضروری معلومات حاصل کرنے کی ذمے داری سونپ دی۔

رہائشی علاقے کا پتا منیب کے شناختی کارڈ پر درج تھا۔ شناختی کارڈ کا اجراء بھی ابھی چند ماہ پہلے ہی ہوا تھا۔ اس کیس میں سب کچھ بہت ہموار انداز میں رواں تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد یحییٰ نامی کانسٹیبل اس کے سامنے بیٹھا محلے سے ملنے والی رپورٹ دے رہا تھا۔

''میں نے محلے داروں سے کافی پوچھ گچھ کی ہے سر! لڑکے کی فیملی میں دو ہی افراد تھے۔ جمال اور اقصیٰ۔''

''تھے کیا مطلب؟ اب کہاں ہیں؟ انہیں ساتھ کیوں نہیں لائے؟ کم از کم جمال کو ہی لے آتے۔''

''دونوں ہی کچھ روز پہلے قتل ہو چکے ہیں سر! اور قاتل نے ان سے خاصی ڈاڈھی دشمنی نکالی ہے۔'' یحییٰ نے ایک اور تھانے کی ایف آئی آر کا پی اس کے سامنے رکھتے ہوئے بتایا۔ علی مراد کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''اسٹرینج...... ایک ہی فیملی کے ساتھ تین حادثے۔''

''یس سر! علاقے کے لوگوں کی رائے بھی اتنی اچھی نہیں ہے۔ اس لڑکے کو تو سب کہتے ہی 'جنانا' ہیں۔ اکثریت اس کا ذکر کرتے ہوئے یہی نام لیتی ہے اور پھر خود ہی شرمندہ ہو کر بات پلٹ دی جاتی ہے۔''

''کمال ہے! دیکھنے میں تو اچھا خاصا ہینڈسم اور گریس فل لگتا ہے۔'' علی مراد حیران تھا۔

''لگنے کا کیا ہے سر جی؟ اب میں تو وہی رپورٹ دے رہا ہوں نا جو عوامی اکثریت نے مجھے بتایا ہے۔''

''ایک منٹ! مجھے یہ بتاؤ کہ وہ مرد ہی تھا یا واقعی مردانہ پیکنگ میں 'دوسرا مال' تھا۔'' علی مراد نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''نہیں سر جی! اصل اور سو فیصد مرد ہے...... لیکن اتنا کنفرم ہے کہ اس کی بات چیت اور انداز میں ہلکا سا زنانہ پن جھلکتا تھا۔ اب آپ کو ہماری پبلک کا پتا تو ہے۔ کسی کی بھی غیر معمولی حرکت یا ایسے کسی بھی عیب کو ساری زندگی کا طعنہ بنا لیا کرتے ہیں۔'' یحییٰ نے غیر ارادی طور پر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ اسے بچپن سے ہی سیاہ رنگت کی وجہ سے ''کالا شاہ کاکو، بابا بلیک شیپ'' یا ''کالو ودھرنا'' کہا جاتا تھا۔

''ہاں بھئی! جانتا ہوں۔ بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔'' علی مراد نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے اعتراف کیا۔ اس کے نام 'رانا' پر ایک خلقت اسے 'رانا ٹنگا' کہتی تو کبھی قریبی دوست اسے دیکھتے ہی ہمسایہ ملک کا ایک گانا بہ آواز بلند گانے لگتے۔

''ایک ویڈیو بھی ملی ہے سر جی! میں تو دیکھ کر الجھ گیا ہوں۔ آپ بھی دیکھیے ذرا۔'' یحییٰ نے موبائل اسے تھمایا۔

علی مراد گہری نظروں سے موبائل اسکرین کا جائزہ لینے لگا۔ بمشکل پینتیس سیکنڈز کی اس ویڈیو نے اسے چونکا دیا تھا۔

''کس نے بنائی ہے یہ؟'' اس نے پوچھا۔

''منیب کے گھر کے سامنے والی قطار میں ایک گھر سے کسی لڑکی نے اپنے ٹیرس سے بنائی ہے۔ لڑکی تو خاصی بااعتماد، پڑھی لکھی اور قانون پسند شہری ہے لیکن چونکہ لڑکی ذات ہے اس لیے والدین یہاں بھیجنے میں ڈر رہے تھے۔ میں نے وہیں ان کے گھر جا کر تفتیش کر لی تھی۔ بتا رہی تھی کہ وہ ربیع الاول کے مقدس موقع پر کی گئی سجاوٹ کا بعد میں ہونے والا حال سوشل میڈیا پر عوام کے سامنے لانا چاہتی

تھی۔ محبت وعقیدت سے بنائی گئی لڑیاں اور فانوس بعد میں بچے خود ہی کھینچ کر توڑ دیتے ہیں۔ لڑیاں اور جھنڈیاں سڑک پر رُل رہی ہوتی ہیں۔ اسی چکر میں منیب کے گھر کا یہ منظر بھی قید ہو گیا۔''

یحییٰ کے اس تفصیلی جواب پر ایک بار پھر ویڈیو نکال کر دیکھنے لگا۔ اسی اثنا، میں دوسرے اہلکار نے بازیابی کی اجازت طلب کر لی۔ اس کے چہرے کا جوش بھی یہی بتا رہا تھا کہ وہ بہت اہم خبر لایا ہے۔

''رپورٹ تو بعد میں سنیے گا سر! پہلے یہ ویڈیوز دیکھیں۔ پارک میں لگے سی سی ٹی وی کیمروں سے ملی ہیں۔ حادثے کے وقت اور اس سے ذرا دیر پہلے کی ساری ریکارڈنگ موجود ہے اِس میں۔''

''لاؤ اِدھر جلدی!'' علی مراد نے موبائل فون جھپٹا۔

چار منٹ دس سیکنڈ کے اس ویڈیو کلپ کے دوران اس کا چہرہ مختلف رنگ بدل رہا تھا۔ حیرت، الجھن، ناسمجھی، بصری واہمہ کے بعد جو آخری تاثر اس کے چہرے پر ابھرا وہ ہنسی کا تھا۔

اس نے دونوں موبائل فون میز پر رکھ دیے۔ دائیں شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے آنکھوں کے اندرونی گوشے دباتے ہوئے وہ بے ساختہ ہنس رہا تھا۔ یحییٰ اور جواد ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

''ہائے میرے ربا! اتنا آسان کیس تو میں نے اپنے پورے کیریئر میں کبھی نہیں دیکھا۔ کمال ہے بھئی!'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔ پھر یکدم کچھ یاد آنے پر دونوں اہلکاروں کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

''بہت سال پہلے میں نے ہمسایہ ملک کی ایک فلم دیکھی تھی۔ نام تو مجھے یاد نہیں لیکن اسٹوری بڑی ہی فنی تھی۔ اس میں ہیرو اپنے اور بڑے بھائی کا رشتہ لینے کے لیے کسی بوڑھے چچا کا روپ دھار لیتا ہے۔ بعد میں اس گھر کے چوکیدار کو اس پر شک ہو جاتا ہے۔ وہ گھر میں ہر ایک سے کہتا پھرتا ہے کہ صاحب جی! جو چاچا ہے وہ بھتیجا ہے...... جو بھتیجا ہے وہی چاچا ہے...... اور چاچا تو کوئی ہے ہی نہیں۔''

علی مراد نے اپنے دونوں اہلکاروں کے تاثرات دیکھنے کے لیے لحاتی توقف کیا اور ڈرامائی انداز میں بولا۔

''اس کیس میں جو شکار ہے وہی شکاری ہے...... جو شکاری ہے وہی شکار ہے...... اور شکاری تو کوئی ہے ہی نہیں...... یہ لڑکا کسی نفسیاتی بیماری کا شکار تھا۔ یہ دیکھو! پہلی ویڈیو میں وہ اپنے گھر سے باہر آیا ہے۔ کسی گیسٹ کو ریسیو کیا ہے اور اندر لے گیا ہے۔ لیکن گیسٹ ہے کدھر؟ کہیں بھی نہیں...... اب دوسری ویڈیو دیکھو! وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا دکھائی دے رہا ہے۔ جھولے میں بیٹھتے ہی وہ ایسی حرکتیں کرنے لگا ہے جیسے اس کے ساتھ کوئی اور بھی موجود ہے لیکن حقیقت تمہارے سامنے موجود ہے۔ اس نے ایسی ہی کشمکش میں خود کو خود ہی نیچے گرایا ہے۔'' علی مراد نے ایک ہی پل میں تفصیلی تجزیہ کر ڈالا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سر! پارک میں موجود آئس کریم والے نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ وہ دو آئس کریمز خریدتے وقت بھی اسی طرح برتاؤ کر رہا تھا جیسے اس کے ساتھ کوئی قریبی دوست بھی موجود ہے۔ ایک تو اس کا زنانہ رویّہ اور پھر دوسرے ان حرکات نے اسے مشکوک بنا دیا۔ ٹکٹ کلکٹر نے بھی یہی بات بتائی ہے۔ باقی اس کا موبائل فون ہمیں جائے وقوعہ پر کہیں ملا ہی نہیں۔'' جواد نے اپنی حاصل کردہ رپورٹ کا خلاصہ بتایا۔

''وہی بات آ گئی نا! جو شکار ہے وہی شکاری ہے...... اور جو شکاری ہے وہی شکار ہے...... اور شکاری تو کوئی ہے ہی نہیں۔'' علی مراد ایک بار پھر ہنسا۔

''چلو خیر! اس تفتیش کی گاڑی یہیں روک لو...... اسپتال والوں سے اس کے دماغی معائنے کی بات کے علاوہ یہ بھی کنفرم کرو کہ اس کا علاج کروا کون رہا ہے؟ ایسا کون والی وارث پیدا ہو گیا ہے اس کا؟ پھر اس کے بعد ہی میں اپنی گاڑی آگے بڑھاؤں گا۔ مجھے لگتا ہے کہ اپنی اس 'سائیکو پرابلم' کے تحت گھر والوں کو بھی نہ مار دیا ہو۔'' علی مراد کا دماغ جیٹ طیارے کی رفتار سے چل رہا تھا۔

''آپ کی بات نائنٹی نائن پرسنٹ ٹھیک بھی ہو سکتی ہے سر! لیکن اقصیٰ کے قاتل نے اسے قتل سے پہلے زیادتی کا نشانہ بھی بنایا تھا۔ کوئی بھی بھائی اپنی بہن کے ساتھ ایسا کبھی نہیں کرے گا۔'' یحییٰ نے یاد دہانی کروائی۔

''ہمم۔ پوائنٹ ٹو بی نوٹڈ!'' علی مراد نے قلم اپنے ہاتھ میں گھمایا۔ اس کی پیشانی پر سوچ کے گہرے بل تھے۔ تیز رفتاری سے چلتے ذہن میں ایک اور خیال بجلی کے کوندے کے مانند لپکا۔

''تم لوگ اسپتال والوں سے تفتیش کرو۔ میں اس لڑکے کے محلے کا خود وزٹ کر کے آتا ہوں۔ اس ایریا کے بچوں کو چیک کروں گا۔ ایف آئی آر رپورٹ کے مطابق اقصیٰ کا قتل بارہ ربیع الاول کے روز ہوا تھا۔ اس روز اور اس سے پہلے گلیوں اور بازاروں میں یہی 'بچہ پارٹی' ایکٹو رہتی

کمر، کولہوں اور سر میں ناقابلِ برداشت اذیت کے ساتھ سرخ سیال بہنے کا احساس ہوا۔ دھندلی بصارت میں اسے اوپری جانب رشی کی آخری جھلک نظر آئی جو مسکراتے ہوئے اس کی جانب ہوائی بوسہ اچھال کر پچھلی طرف غائب ہو گیا تھا۔

''اوئے رکواؤ اس جھولے کو...... فوراً رکواؤ۔'' ڈوبتی سماعت میں چند آوازیں پڑیں۔ اس کے حواس اپنے آس پاس لوگوں کو اکٹھا ہوتے محسوس کر رہے تھے۔

''ارے! یہ تو وہی 'جنانا' ہے ناں جو ادھر آئس کریم لینے بھی آیا تھا۔'' منیب کے کانوں میں پڑنے والے یہ آخری الفاظ ہر چوٹ، اذیت اور بہتے لہو سے زیادہ تکلیف دہ تھے۔ اس نے بے بسی سے آنکھیں موند لیں۔ اس کے بعد ہر منظر پر تاریکی چھا گئی۔

☆☆☆

نیشنل پارک میں ہوئے اس واقعے کو آج دوسرا روز تھا۔

گزشتہ رات حادثے کی ایف آئی آر اسی علاقے کے تھانے میں درج کروائی گئی تھی۔ اس تھانے کا عملہ، رویہ اور اندازِ تفتیش ایس ایچ او 'علی مراد رانا' کی بدولت روایتی کلچر سے کافی مختلف تھا۔ علی مراد تقریباً پچاس برس کا تھا۔ ورزشی جسم، ذہین آنکھیں، شاطر دماغ اور چست و چالاک۔ اس نے متعلقہ کیس سامنے آتے ہی ایک اہلکار کو اس پارک میں موجود ملازمین سے تفتیش اور دوسرے اہلکار کو مبینہ نوجوان کے رہائشی علاقے میں بھیج کر ضروری معلومات حاصل کرنے کی ذمّے داری سونپ دی۔

رہائشی علاقے کا پتا منیب کے شناختی کارڈ پر درج تھا۔ شناختی کارڈ کا اجراء بھی ابھی چند ماہ پہلے ہی ہوا تھا۔ اس کیس میں سب کچھ بہت ہموار انداز میں رواں تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد یحییٰ نامی کانسٹیبل اس کے سامنے بیٹھا محلے سے ملنے والی رپورٹ دے رہا تھا۔

''میں نے محلے داروں سے کافی پوچھ گچھ کی ہے سر! لڑکے کی فیملی میں دو ہی افراد تھے۔ جمال اور اقصیٰ۔''

''تھے کیا مطلب؟ اب کہاں ہیں؟ انہیں ساتھ کیوں نہیں لائے؟ کم از کم جمال کو ہی لے آتے۔''

''دونوں ہی کچھ روز پہلے قتل ہو چکے ہیں سر! اور قاتل نے ان سے خاصی ڈاڈھی دشمنی نکالی ہے۔'' یحییٰ نے ایک اور تھانے کی ایف آئی آر کاپی اس کے سامنے رکھتے ہوئے بتایا۔ علی مراد کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''اسٹرینج...... ایک ہی فیملی کے ساتھ تین حادثے۔''

''یس سر! علاقے کے لوگوں کی رائے بھی اتنی اچھی نہیں ہے۔ اس لڑکے کو تو سب کہتے ہی 'جنانا' ہیں۔ اکثریت اس کا ذکر کرتے ہوئے یہی نام لیتی ہے اور پھر خود ہی شرمندہ ہو کر بات پلٹ دی جاتی ہے۔''

''کمال ہے! دیکھنے میں تو اچھا خاصا ہینڈسم اور گریس فل لگتا ہے۔'' علی مراد حیران تھا۔

''لگنے کا کیا ہے سر جی؟ اب میں تو وہی رپورٹ دے رہا ہوں نا جو عوامی اکثریت نے مجھے بتایا ہے۔''

''ایک منٹ! مجھے یہ بتاؤ کہ وہ مرد ہی تھا یا واقعی مردانہ پیکنگ میں 'دوسرا مال' تھا۔'' علی مراد نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''نہیں سر جی! اصل اور سو فیصد مرد ہے...... لیکن اتنا کنفرم ہے کہ اس کی بات چیت اور انداز میں ہلکا سا زنانہ پن جھلکتا تھا۔ اب آپ کو ہماری پبلک کا پتا تو ہے۔ کسی کی بھی غیر معمولی حرکت یا ایسے کسی بھی عیب کو ساری زندگی کا طعنہ بنا لیا کرتے ہیں۔'' یحییٰ نے غیر ارادی طور پر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ اسے بچپن سے ہی سیاہ رنگت کی وجہ سے ''کالا شاہ کاکو، بابا بلیک شیپ'' یا ''کالو ودھرنا'' کہا جاتا تھا۔

''ہاں بھئی! جانتا ہوں۔ بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔'' علی مراد نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے اعتراف کیا۔ اس کے نام 'رانا' پر ایک خلقت اسے 'رانا ٹنگا' کہتی تو کبھی قریبی دوست اسے دیکھتے ہی ہمسایہ ملک کا ایک گانا بہ آواز بلند گانے لگتے۔

''ایک ویڈیو بھی ملی ہے سر جی! میں تو دیکھ کر الجھ گیا ہوں۔ آپ بھی دیکھیے ذرا۔'' یحییٰ نے موبائل اسے تھمایا۔

علی مراد گہری نظروں سے موبائل اسکرین کا جائزہ لینے لگا۔ بمشکل پینتیس سیکنڈز کی اس ویڈیو نے اسے چونکا دیا تھا۔

''کس نے بنائی ہے یہ؟'' اس نے پوچھا۔

''منیب کے گھر کے سامنے والی قطار میں ایک گھر سے کسی لڑکی نے اپنے ٹیرس سے بنائی ہے۔ لڑکی تو خاصی بااعتماد، پڑھی لکھی اور قانون پسند شہری ہے لیکن چونکہ لڑکی ذات ہے اس لیے والدین یہاں بھیجنے میں ڈر رہے تھے۔ میں نے وہیں ان کے گھر جا کر تفتیش کر لی تھی۔ بتا رہی تھی کہ وہ ربیع الاول کے مقدس موقع پر کی گئی سجاوٹ کا بعد میں ہونے والا حال سوشل میڈیا پر عوام کے سامنے لانا چاہتی

تھی۔ محبت و عقیدت سے بنائی گئی لڑیاں اور فانوس بعد میں بچے خود ہی کھینچ کر توڑ دیتے ہیں۔ لڑیاں اور جھنڈیاں سڑک پر رُل رہی ہوتی ہیں۔ اسی چکر میں منیب کے گھر کا یہ منظر بھی قید ہو گیا۔''

یحییٰ کے اس تفصیلی جواب پر ایک بار پھر ویڈیو نکال کر دیکھنے لگا۔ اسی اثنا میں دوسرے اہلکار نے بازیابی کی اجازت طلب کر لی۔ اس کے چہرے کا جوش بھی یہی بتا رہا تھا کہ وہ بہت اہم خبر لایا ہے۔

''رپورٹ تو بعد میں سنیے گا سر! پہلے یہ ویڈیوز دیکھیں۔ پارک میں لگے سی سی ٹی وی کیمروں سے ملی ہیں۔ حادثے کے وقت اور اس سے ذرا دیر پہلے کی ساری ریکارڈنگ موجود ہے اِس میں۔''

''لاؤ اِدھر جلدی!'' علی مراد نے موبائل فون جھپٹا۔

چار منٹ دس سیکنڈ کے اس ویڈیو کلپ کے دوران اس کا چہرہ مختلف رنگ بدل رہا تھا۔ حیرت، الجھن، ناسمجھی، بصری واہمہ کے بعد جو آخری تاثر اس کے چہرے پر ابھرا وہ ہنسی کا تھا۔

اس نے دونوں موبائل فون میز پر رکھ دیے۔ دائیں شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے آنکھوں کے اندرونی گوشے دباتے ہوئے وہ بے ساختہ ہنس رہا تھا۔ یحییٰ اور جواد ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

''ہائے میرے ربا! اتنا آسان کیس تو میں نے اپنے پورے کیریئر میں کبھی نہیں دیکھا۔ کمال ہے بھئی!'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔ پھر یکدم کچھ یاد آنے پر دونوں اہلکاروں کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

''بہت سال پہلے میں نے ہمسایہ ملک کی ایک فلم دیکھی تھی۔ نام تو مجھے یاد نہیں لیکن اسٹوری بڑی ہی فنی تھی۔ اس میں ہیرو اپنے اور بڑے بھائی کا رشتہ لینے کے لیے کسی بوڑھے چچا کا روپ دھار لیتا ہے۔ بعد میں اس گھر کے چوکیدار کو اس پر شک ہو جاتا ہے۔ وہ گھر میں ہر ایک سے کہتا پھرتا ہے کہ صاحب جی! جو چاچا ہے وہ بھتیجا ہے...... جو بھتیجا ہے وہی چاچا ہے...... اور چاچا تو کوئی ہے ہی نہیں۔''

علی مراد نے اپنے دونوں اہلکاروں کے تاثرات دیکھنے کے لیے لحاتی توقف کیا اور ڈرامائی انداز میں بولا۔

''اس کیس میں جو شکار ہے وہی شکاری ہے...... جو شکاری ہے وہی شکار ہے...... اور شکاری تو کوئی ہے ہی نہیں...... یہ لڑکا کسی نفسیاتی بیماری کا شکار تھا۔ یہ دیکھو! پہلی ویڈیو میں وہ اپنے گھر سے باہر آیا ہے۔ کسی گیسٹ کو ریسیو کیا ہے اور اندر لے گیا ہے۔ لیکن گیسٹ ہے کدھر؟ کہیں بھی نہیں...... اب دوسری ویڈیو دیکھو! وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا دکھائی دے رہا ہے۔ جھولے میں بیٹھتے ہی وہ ایسی حرکتیں کرنے لگا ہے جیسے اس کے ساتھ کوئی اور بھی موجود ہے لیکن حقیقت تمہارے سامنے موجود ہے۔ اس نے ایسی ہی کشمکش میں خود کو خود ہی نیچے گرایا ہے۔'' علی مراد نے ایک ہی پل میں تفصیلی تجزیہ کر ڈالا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سر! پارک میں موجود آئس کریم والے نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ وہ دو آئس کریمز خریدتے وقت بھی اسی طرح برتاؤ کر رہا تھا جیسے اس کے ساتھ کوئی قریبی دوست بھی موجود ہے۔ ایک تو اس کا زنانہ رویہ اور پھر دوسرے ان حرکات نے اسے مشکوک بنا دیا۔ ٹکٹ کلکٹر نے بھی یہی بات بتائی ہے۔ باقی اس کا موبائل فون ہمیں جائے وقوعہ پر کہیں ملا ہی نہیں۔'' جواد نے اپنی حاصل کردہ رپورٹ کا خلاصہ بتایا۔

''وہی بات آ گئی نا! جو شکار ہے وہی شکاری ہے...... اور جو شکاری ہے وہی شکار ہے...... اور شکاری تو کوئی ہے ہی نہیں۔'' علی مراد ایک بار پھر ہنسا۔

''چلو خیر! اس تفتیش کی گاڑی یہیں روک لو...... اسپتال والوں سے اس کے دماغی معائنے کی بات کے علاوہ یہ بھی کنفرم کرو کہ اس کا علاج کروا کون رہا ہے؟ ایسا کون والی وارث پیدا ہو گیا ہے اس کا؟ پھر اس کے بعد ہی میں اپنی گاڑی آگے بڑھاؤں گا۔ مجھے لگتا ہے کہ اپنی اس 'سائیکو پرابلم' کے تحت گھر والوں کو بھی نہ مار دیا ہو۔'' علی مراد کا دماغ جیٹ طیارے کی رفتار سے چل رہا تھا۔

''آپ کی بات نائنٹی نائن پرسنٹ ٹھیک بھی ہو سکتی ہے سر! لیکن اقصیٰ کے قاتل نے اسے قتل سے پہلے زیادتی کا نشانہ بھی بنایا تھا۔ کوئی بھی بھائی اپنی بہن کے ساتھ ایسا کبھی نہیں کرے گا۔'' یحییٰ نے یاد دہانی کروائی۔

''ہمم۔ پوائنٹ ٹو بی نوٹڈ!'' علی مراد نے قلم اپنے ہاتھ میں گھمایا۔ اس کی پیشانی پر سوچ کے گہرے بل تھے۔ تیز رفتاری سے چلتے ذہن میں ایک اور خیال بجلی کے کوندے کے مانند لپکا۔

''تم لوگ اسپتال والوں سے تفتیش کرو۔ میں اس لڑکے کے محلے کا خود وزٹ کر کے آتا ہوں۔ اس ایریا کے بچوں کو چیک کروں گا۔ ایف آئی آر رپورٹ کے مطابق اقصیٰ کا قتل بارہ ربیع الاول کے روز ہوا تھا۔ اس روز اور اس سے پہلے گلیوں اور بازاروں میں بھی 'بچہ پارٹی' ایکٹو رہتی

تھی۔ انہیں ضرور کچھ نہ کچھ پتا ہوگا۔ کسی نے کچھ تو غیر معمولی پن دیکھا ہی ہوگا۔''

''رائٹ سر!'' جواد اور یحییٰ سیلیوٹ جھاڑ کر باہر نکل گئے۔

''ایسے کیس مہینے میں دو چار دفعہ مل جایا کریں تو وارے نیارے ہی ہو جائیں۔ ایسا حلوہ کیس...... بھئی واہ!'' علی مراد نے اپنی کرسی کی پشت سے قدرے نیم دراز ہو کر خود کلامی کی۔ چند دفتری امور نمٹا کر منیب کے محلے میں جانا چاہتا تھا لیکن کچھ دیر بعد ہی موصول ہونے والی ایک فون کال نے اس کا دماغ کھولا کر رکھ دیا۔ 'اوپر' سے ملنے والے احکامات کے تحت اس کیس کو فوری طور پر داخلِ دفتر کرنا تھا۔

علی مراد رانا مایوسی اور شکستگی میں مبتلا ہو گیا تاہم یہ بھی ایک عجیب ہی حقیقت تھی کہ ایسی کیفیات میں ہی اس کا دماغ زیادہ تیزی سے چلتا تھا۔ اس نے یحییٰ اور جواد کو تفتیش سے روک کر اس معاملے سے 'از خود' نمٹنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

علی مراد رانا اس وقت ماچس کی ڈبیا نما اس گھر میں موجود تھا۔

اس کی عقابی نظریں بڑی تیزی سے چاروں طرف گردش کر رہی تھیں۔ گھر کی حالت اور صفائی ستھرائی کا عالم دیکھ کر پہلی نظر میں ہی علم ہو جاتا تھا کہ مکینوں کو گھر داری سے کبھی کوئی شغف نہیں رہا۔ اس نے گھر کے اکلوتے کمرے اور مختصر برآمدے کے ہر ایک کونے کا باریک بینی سے جائزہ لیا لیکن کوئی مشکوک چیز برآمد نہ ہو سکی۔ علی مراد قدرے مایوس تو ہوا لیکن وہ ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے علاقے کے کونسلر کو اپنے پاس طلب کر لیا۔ اس سے ہونے والی بات چیت سے اندازہ ہوا کہ گزشتہ دنوں محلے میں حارث، سجان اور عبداللہ نامی لڑکے سجاوٹ وغیرہ کے لیے زیادہ مصروف رہے ہیں۔ علی مراد نے نرمی سے ان تینوں لڑکوں کو بھی بلوانے کا حکم دیا تو خلافِ توقع ایک اور شخص وہاں چلا آیا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے فیاض صاحب؟ کبھی ایک تھانے کی پولیس چکر لگاتی ہے تو کبھی دوسرے تھانے کے بندے عجیب و غریب فرمائشیں کرنے چلے آتے ہیں۔ ہم تو اچھے عذاب میں پھنسے ہوئے ہیں۔'' اضطراب کے عالم میں فیاض سے لے دے کرتا وہ شخص ارباز تھا۔ علی مراد ایک ہی نظر میں اس کا 'لیول' بھانپ گیا۔

''آرام نال بھئی! آرام نال۔ بلوایا میں نے ہے تو ڈائریکٹ مجھ سے بات کرو۔ زیادہ اینگری ینگ مین بننے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''میں تو بس یہ کہہ رہا ہوں کہ بچوں کو اس معاملے میں انوالو کرنے کی کیا تک بنتی ہے۔ وہ بچے ہیں۔ کیا اثر پڑے گا ان کے ذہنوں پر؟'' وہ زچ تھا۔

''بچہ آج کل کے وقت میں کون ہے بھئی؟'' علی مراد جارح مزاجی پر اتر آیا۔ ''میں تو کہتا ہوں کہ ہر کوئی بس بچا کھچا ہے۔ سب کو سبھی معاملات کی خبر ہوتی ہے۔ ہر کوئی ہم سے زیادہ سیانا ہے اور باقی رہی بات پولیس کے سامنے آنے کی۔ تو چن سجناں! تم لوگوں نے ہمیں سمجھ کیا رکھا ہے؟ تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے کہ ہم بندے کھاتے ہیں یا منہ سے آگ نکالتے ہیں۔ عجیب منطق ہے بھئی۔ اب چپ کر کے بلواؤ ان لڑکوں کو! تمہارے سامنے ہی ہر بات ہو گی ہماری۔'' اس کے دوٹوک انداز پر ارباز مزید کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اگلے دس منٹ میں تینوں بچے اس کے سامنے موجود تھے۔ ان کے چہروں پر خوف اور گھبراہٹ کا راج تھا۔

''ماشاء اللہ! ایک بات تو ماننی پڑے گی۔ بچے بہت ڈیسنٹ اور بنے بنائے ہیرو ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے سچائی سے کہا۔ بچوں کے تاثرات لمحہ بھر میں ہی بہتری کی جانب مائل ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ فیاض، ارباز اور اختر کو بھی کافی حیرانی ہوئی تھی۔ ایک پولیس اہلکار کا ایسا روپ انہوں نے بھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''بیٹھ جاؤ بھئی! کھلوتے پنڈوں آئے ہو کیا؟'' اس نے ہلکے پھلکے انداز میں ایک اور مقامی محاورہ بول کر چوٹ کی۔ تینوں جھٹ سے بیڈ پر بیٹھ گئے۔

''میں نے سنا ہے بڑا زبردست کام کیا تھا تم لوگوں نے۔ اس پوری سڑک پر صرف تم لوگوں کی سجاوٹ ہی دیکھنے لائق تھی۔''

''ہاں جی! ہم نے محنت ہی بہت کی تھی۔'' حارث نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

''اکیلے ہی سب کرتے رہے؟ کسی اور نے کوئی ہاتھ پیر نہیں ہلائے کیا؟''

''ہماری بنتی ہی نہیں کسی سے...... یہاں کے لونڈے بس......'' ارباز نے جواب دینا چاہا۔ علی مراد نے گھور کر اس کی جانب دیکھا اور ہاتھ اٹھا کر کچھ بھی کہنے سے منع کر دیا۔

''ہم تینوں کی یہاں کسی اور سے دوستی ہی نہیں۔''

عبداللہ نے بھی محتاط انداز اپنایا۔ علی مراد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ بچے اپنی عمر کے حساب سے بہت ذہین تھے۔

''یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ آج کل تو دوستیاں گانٹھنے اور تعلق بنانے میں اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ اپنے کام سے کام رکھا جائے۔'' وہ انہیں ہر طرح سے اعتماد میں لے رہا تھا۔

''اچھا! ویسے ایک بات تو بتاؤ؟ بارہ ربیع الاول کی صبح کسی مشکوک بندے کی آمدورفت تو نہیں دیکھی تم نے اس گھر کے پاس؟''

''نہیں سر جی! ہم تو اٹھے ہی کافی لیٹ تھے اس دن۔'' سبحان نے سادگی سے بتایا۔

''اور ویسے بھی اس روز گلی محلوں میں اتنا آنا جانا لگا ہوا تھا کہ دھیان ہی نہیں گیا اس طرف۔'' عبداللہ نے ایک اور حقیقت بتائی۔ علی مراد کے ہونٹ بھنچ گئے۔ اس کا تجربہ واضح طور پر بتا رہا تھا کہ لڑکے سو فیصد سچ کہہ رہے ہیں لیکن وہ اپنی اس مخصوص حس کا کیا کرتا جو چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھی کہ اس کیس کے متعلق کوئی اہم انکشاف یہیں سے ملے گا۔

''اچھا! ذرا اپنی ڈیکوریشن کی تصویریں تو دکھاؤ۔ کوئی ویڈیو شیڈیو تو بنائی ہی ہوگی؟'' اس نے بلاارادہ ایک سوال کیا۔

''ہمارے پاس موبائل فون ہی نہیں ہے سر جی!'' حارث نے بتایا۔ عبداللہ کے چہرے پر البتہ تذبذب چھایا ہوا تھا۔

''تمہارے پاس ہے نا موبائل؟'' علی مراد نے زور دے کر پوچھا۔

''نہیں! بس کبھی کبھی پاپا کا استعمال کر لیتا ہوں۔''

''یعنی تم نے تصویریں وغیرہ لی تھیں کوئی؟''

''جی! ایک دفعہ کھانا کھانے گھر آیا تھا تو یونہی ذرا سی پکس لی تھیں بس۔ ویڈیو بنانے لگا تھا لیکن پاپا کے موبائل میں اسپیس نہیں تھی۔ دس، پندرہ سیکنڈ پر ہی چھوڑ دی۔'' عبداللہ نے بتایا۔

''اچھا! دکھاؤ ذرا مجھے۔'' اس نے کسی طاقتور وجدانی لہر کے تحت کہا۔ ایسا کہتے ہوئے اس کے ذہن میں مسلسل ایک مزاحمتی لہر پیدا ہو رہی تھی کہ واردات سے ڈیڑھ، دو روز قبل کی تصویروں یا کسی ویڈیو سے بھلا اسے کیا حاصل ہو جانا تھا لیکن اپنی ہزار ہا دفعہ کی آزمائی ہوئی اس 'پولیسیانہ حس' کا کیا کرتا جو اسے یہ کام کرنے پر اکسا رہی تھی۔

عبداللہ نے کن انکھیوں سے باپ کی طرف دیکھا۔ اختر نے بے چینی سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ اختر نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے فون اسے تھما دیا۔ علی مراد ان نصف درجن تصویروں اور مختصر سی ویڈیو کا جائزہ لینے لگا۔ یہ ساری فوٹوگرافی عبداللہ نے اپنے ٹیرس پر موبائل فون آڑھا رکھ کر کی ہوئی تھی۔ نامکمل تیاریوں کی یہ تصاویر بچوں کی محنت اور جذبے کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ علی مراد ہر ایک تصویر باریک بینی سے دیکھتا رہا۔ بظاہر کہیں کچھ بھی غیر معمولی نہیں تھا۔ ہر فرد کسی نہ کسی کام میں مشغول دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے بعد ویڈیو کی باری آئی تو وہ چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ اس میں سیڑھی پر کھڑے دیوار میں کیل ٹھونکتے ایک لڑکے کی پشت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بالکل اسی گھر کے سامنے موجود تھا۔ اس کے ہلتے لبوں اور جسمانی حرکات میں ایک عجیب اضطراب تھا۔ علی مراد کے دماغ میں زوردار 'الارم' بجنے لگا۔ اسے کچھ غیر فطری محسوس ہو رہا تھا۔

''یہ کون ہے؟ آپ کا کوئی محلے دار ہے کیا؟ آپ نے تو کہا تھا کہ تینوں کی ایک دوسرے کے سوا کسی سے کوئی دوستی نہیں۔ مجھے اس سے ملنا ہے ابھی۔''

''یہ تو اپنے رشی پائین ہیں۔ یہاں نہیں رہتے۔ کافی دنوں سے ہماری بھی ملاقات نہیں ہوئی اُن سے۔''

''یہاں نہیں رہتا تو اس ویڈیو میں کیا کر رہا ہے؟ تم لوگ کیسے واقف ہو اس سے؟ کتنی بار سمجھا رکھا ہے کہ اجنبیوں سے فری نہیں ہونا۔'' ارباز بچوں پر بھڑک اٹھا۔ علی مراد اسے ٹوکنے ہی والا تھا کہ ایک اور خیال نے اس کا وجود سنسنا دیا۔ اس نے آٹھویں سیکنڈ پر ویڈیو روک کر اس کا اسکرین شاٹ لیا اور تصویر کو زوم کر کے دیکھنے لگا۔ رنگت کا سانولا پن، قدرے چوڑی ناک اور بالوں کا ہلکا سنہرا پن کچھ مصنوعی تاثر دے رہا تھا۔

''ابے یار! ویڈیو تو ڈھنگ سے بنا لیتا۔ ٹیرس پر کھڑے ہو کر ترچھی فوٹوگرافیاں کون کرتا ہے؟'' علی مراد نے اپنی ران پر ہاتھ مارا۔

''بس وہ اچانک ہی موڈ بن گیا تھا سر جی! پاپا چھت پر اپنے کبوتروں میں بزی تھے۔ ان کا موبائل پاس ایک کرسی پر رکھا تھا تو میں نے پکڑ کر جلدی میں یہ سب......'' وہ بات کرتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

''چلو! اب تو جو ہوا سو ہوا۔ ذرا اپنے اس رشی پائین کا حدود اربعہ تو بتاؤ مجھے؟'' اس نے تینوں کو کھوجتی نظروں

سے دیکھتے ہوئے کہا۔ عبداللہ نے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف ایک نگاہ دوڑائی اور سادگی سے کہنے لگا۔

''رشی باس ایک بہت مختلف انسان تھے۔ سادہ دل...... اچھے...... سچے...... مددگار...... وہ پہلی بار ہم سے......'' عبداللہ دھیرے دھیرے اسے بتانے لگا۔

☆☆☆

منیب اسپتال کے ایک خصوصی کمرے میں بستر نشین تھا۔

سفید براق چادر پر لیٹے اس کا چہرہ بھی اسی قدر ہی سفید دکھائی دے رہا تھا۔ بے تحاشا خون بہہ جانے کے باعث رنگت میں زردی بھی نمایاں تھی۔ پلاسٹر میں جکڑی دونوں ٹانگیں مخصوص انداز سے اوپر لٹکائی گئی تھیں۔ منیب کو پورے جسم میں چھوٹے بڑے 'اٹھارہ' فریکچر آئے تھے۔ سفید پٹیوں سے لپٹا اس کا وجود دیکھنے والے کو ایک بار تو جھرجھرا کر رکھ دیتا تھا۔ یہ سب چوٹیں تو رہیں ایک طرف۔ ان سبھی سے زیادہ ہولناک چوٹ اسے دماغ کے عقبی حصے اور گردن میں لگی تھی۔ اس چوٹ سے وہ جزوی طور پر مفلوج ہو چکا تھا۔ وہ دیکھ اور سن تو سکتا تھا لیکن زبان کسی بھی قسم کا جواب دینے اور حواس کوئی بھی ردِعمل دینے کا اختیار فی الحال کھو چکے تھے۔ اسے ڈاکٹرز کی باہمی گفتگو، رائے اور تجزیوں کے علاوہ اپنا اکلوتا ملاقاتی اور اس کا افسردہ چہرہ بھی نظر آتا تھا۔ یہ وہی ملاقاتی تھا جس نے اسے اس نجی اسپتال میں منتقل کروا کے کیس خارج کروا دینے کے لیے بھی ڈوریاں ہلائی تھیں۔ اس وقت وہ اکلوتا ملاقاتی اسپتال کے کاریڈور میں بیٹھا کسی سوچ میں مگن تھا۔ وارڈ میں ڈاکٹرز کے راؤنڈ کی وجہ سے وہ پانچ منٹ پہلے ہی یہاں آ کر بیٹھا تھا۔

''میں نے ذہن کے بہت گھوڑے دوڑائے تھے۔ جب گھوڑوں سے کام نہ چلا تو گدھے، خچر، بیل، ہاتھی، گینڈے بھی دوڑا لیے۔ ہر ممکن بندے کا نام بھی سوچ لیا لیکن تیرا نام تو ایک دفعہ بھی ذہن میں نہیں آیا کہ یہاں تجھ سے ملاقات ہو جائے گی۔'' اسے اپنے دائیں جانب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس طرف دیکھے بغیر بھی اسے علم تھا کہ وہ علی مراد رانا ہے۔

''آؤ رانا جی! کیسے مزاج ہیں؟ وردی کدھر اتار آئے ہو؟'' اس نے سفید شلوار قمیص دیکھ کر پوچھا۔

''ٹھیک تھا۔ اور ایک نیا کیس حل ہو جانے پر خوش بھی بہت تھا لیکن تو نے میری خوشی سلامت ہی نہیں رہنے دی۔ کمال ہے! میرے ذہن میں تیرا خیال کیوں نہیں آیا؟ بڈھا ہو گیا ہوں میں...... بڈھا ہو گیا ہوں......'' علی مراد نے تاسف سے اپنے رخسار پیٹے۔

''اچھا چلو مجھ کو رانا جی معاف کرنا...... غلطی مارے سے ہو گئی۔'' مقابل نے شرارت سے کہا۔ وہ اپنے حلقے میں 'ایول جینئس' کے نام سے مشہور علی مراد رانا کی دلی کیفیت بخوبی سمجھ رہا تھا۔

''تو دیکھ بھئی قاسم کا کا جی! میرے اس بڑھاپے کی لاج رکھ لے اور بغیر چوں چرا کیے بتا دے کہ اس منڈے سے تیرا کیا رشتہ ہے؟ مجھے علم ہوا ہے کہ اسے یہاں لانے میں تیرا ہی ہاتھ ہے۔ گولیاں بھی خیر بڑی پکی کھیلی تھیں تو نے۔ کیس بند کروانے پر اپنا نام بھی سامنے نہیں آنے دیا۔ کافی گہرا رشتہ لگتا ہے مجھے تو۔'' علی مراد اس کے پاس ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ قاسم کا کا سے اس کی دیرینہ 'واقفیت' تھی۔

''رشتہ تو کوئی نہیں رانا جی! ہاں بس ایک تعلق ہے۔ بڑا پرانا تعلق۔'' کا کا نے گہری سانس لی۔

''ماضی کے سرٹیفائیڈ جواری، غنڈا گردی میں ماہر اور اب حالیہ ایم پی اے کی ناک کے بال قاسم کا کا کے چہرے پر یہ اداسی تو ظاہر کر رہی ہے کہ تعلق کافی 'ڈاڈھا' رہا ہے۔'' علی مراد نے طنز کیا۔

''جواری اور غنڈے کے ساتھ شرابی کبابی بھی شامل کر لے رانا! ورنہ اپنی ذات پر شرم محسوس ہونے لگے گی۔'' قاسم کا کا نے حساب چکتا کیا۔

''اب یہ بتا کہ تعلق منیب سے تھا یا رشی سے؟'' اس نے اطمینان سے سوال داغا۔ کا کا کے چہرے پر حیرت نے ڈیرے جمائے لیکن اگلے ہی لمحے وہ خود پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا۔

''جب مجھے علم ہوا تھا کہ یہ کیس تیرے تھانے میں رجسٹرڈ ہوا ہے تو مجھے اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ اب بہت سے گڑے مردے اکھڑنے کا وقت آ گیا ہے۔'' اس نے ایک توقف کیا اور پھر سلسلہ کلام کا آغاز کرتے ہوئے بولا۔

''کوئی بھی بات مزید جاننے سے پہلے مجھے صرف اتنا بتا دے کہ تجھے رشی کا کیسے اندازہ ہوا؟ کس نے بتایا ہے اس کے بارے؟''

''میں خود گیا تھا اس کے محلے میں تفتیش کے لیے۔ وہاں تین لڑکے اس کے بڑے مرید نکل آئے۔ بڑی محبت سے ذکر کرتے ہیں وہ اس کا۔'' علی مراد کے انکشاف پر قاسم

کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

''یہ جیون جوگا ایسا ہی تھا۔ کسی کے بھی دل میں گھر کر لیا کرتا تھا۔ جب کوئی اسے اپنا سمجھتا تھا تو اس کے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہو جاتا۔ اسے رشی میں نے ہی تو بنایا تھا۔ میں نے ہی یہ راہ دکھائی تھی اسے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ ایسا دن بھی دیکھنا پڑ جائے گا۔'' قاسم نے تاسف سے دائیں بائیں سر جھٹکا۔

''دیکھ بھئی کاکے! مجھے دھوم...... تنا...... نا...... دھوم...... تنا...... نا...... والے سیریلز کی طرح ٹوٹے ٹوٹے کرکے یہ کہانی نہ سنا۔ سیدھی طرح بتا دے کہ یہ منڈا کون ہے؟ تیرا اس سے کیا تعلق ہے؟ بدلے میں میرا تجھ سے وعدہ ہے کہ میں کبھی بھولے سے بھی یہ کیس اوپن نہیں کروں گا۔ چل اب شروع سے شروع ہو جا!'' علی مراد نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ قاسم کاکا نے اپنی دسیوں انگلیاں چٹخائیں اور منتشر ذہن میں بکھرے خیالات مجتمع کرنے لگا۔

☆☆☆

''سنو! مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔

''ہاں کہو! سن رہی ہوں۔''

''ڈرتا ہوں کہیں تم مجھ سے ناراض نہ ہو جاؤ۔''

''اتنے بزدل لگتے تو نہیں تم۔'' فوری جواب ملا۔

''یہ معاملہ ہی ایسا ہے کہ مجھ جیسا شیر دل انسان بھی ڈر محسوس کرنے لگا ہے۔'' قاسم نے صاف گوئی سے بتایا۔

''ٹھیک ہے! مت بتاؤ۔ جیسے تمہاری مرضی۔'' وہ بھی بے نیاز تھی۔

''سنو!''

''اب کیا ہے بھئی؟'' اس نے بیزاری سے کہا۔

''محبت ہوگئی ہے مجھے تم سے!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''محبت؟ وہ کس چڑیا کا نام ہے بھلا؟ ابھی دو روز پہلے تو میں چڑیا گھر دیکھ کر آئی ہوں۔ مجھے تو وہاں ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔'' اس کے انداز میں تمسخر نمایاں تھا۔

''ایسا کہہ کر میرے جذبوں کی توہین تو نہ کرو۔'' وہ بلبلا اٹھا۔

''جس چیز سے میں واقف ہی نہیں، اس کی توہین کیا کرنی؟ اب انسان اپنی لاعلمی کا اظہار بھی نہ کرے کیا؟''

''محبت اس کائنات کا سب سے دلکش اور خوبصورت جذبہ ہے۔'' اس نے اپنے تئیں ایک انکشاف کیا۔

''لیکن میں تو ایسا نہیں سمجھتی۔''

''تو پھر مجھے بتاؤ نا کہ تم کیا سمجھتی ہو؟'' وہ بے تابی سے بولا۔

''کائنات کا سب سے بڑا، خوبصورت اور نفیس جذبہ محبت نہیں ہوتا۔'' اس نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

''تو پھر...... پھر کیا ہوتا ہے؟'' وہ اپنا دل ڈوبتا محسوس کرنے لگا۔

''عزت...... صرف اور صرف عزت۔''

اس کی زبان سے نکلنے والے یہ الفاظ کوئی تیز دھار خنجر تھے۔ ایک سند یافتہ شرابی، کبابی اور قانون شکن شخص ایسی ہستی کو اپنی 'عزت' کا یقین کیسے دلاتا؟ صوفے پر بیٹھے ہوئے اس نے سر جھکایا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پیوست کیے اپنا کیس لڑنے کے لیے مزید دلائل تلاش کرنے لگا۔ ایک 'مجرم' پر یہ کیسا وقت آن پڑا تھا۔ اسے ایسی عورت کو اپنی محبت کا یقین دلانا تھا جس کی طلب صرف اور صرف عزت تھی۔ مجرم کے پاس محبت، شہرت، طاقت، دولت، ہمت اور غیرت سمیت سبھی 'ت' ہوتے ہیں لیکن عزت کا 'ت' سب سے پہلے ہی اس سے قطع تعلق کیا کرتا ہے۔

اس نے اپنے اعصاب پُرسکون کیے اور مقابل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنے لگا۔

''دیکھو! میری بات ذرا غور سے سنو۔''

''ہاں کہو! کچھ نیا ہو منہ کھولنے کے لیے تو کہنا ورنہ اپنی راہ لو۔'' وہ بیزاری سے بولی۔

''مجھ سے شادی کرو گی ریشم؟'' قاسم نے واضح لفظوں میں پوچھا۔

''آخاہ...... شادی...... ایک جواری شرابی، کبابی سے شادی کرلوں لیکن کیوں قاسم عرف کاکا صاحب؟''

''کیونکہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ تمہیں اتنی معمولی سی بات سمجھ کیوں نہیں آرہی ہے؟'' اس دفعہ وہ تلخی سے بولا تھا۔ سامنے بیٹھی وہ عورت اس کے جذبات مسلسل نظر انداز کرکے طنز و تشنیع کر رہی تھی۔ ایسے میں غصہ نہ آتا تو اور کیا ہوتا؟

''کتنے مہینوں یا سال کے لیے کرنا چاہتے ہو مجھ سے شادی؟'' ریشم کے اس سوال نے بھی اسے تپا دیا۔

''میں زندگی بھر کے لیے تمہارا ہاتھ تھامنا چاہتا ہوں۔'' قاسم نے ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔ ریشم کے لبوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ اس کا دل جلا رہی تھی۔ اسی لمحے

اندرونی کمرے سے کراہوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔
''ماں جی نے پھر بستر خراب کر دیا ہوگا۔تم جاؤ! مجھے ابھی تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔'' وہ اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
کوئی اور وقت ہوتا تو قاسم اس کی کوئی بات نہ سنتا لیکن اس لمحہ مسئلہ بیمار اور بستر نشین والدہ کا تھا۔ وہ اپنی کسی ہٹ دھرمی سے ریشم کے دل میں کوئی گرہ نہیں بٹھانا چاہتا تھا اس لیے خاموشی بہتر سمجھتے ہوئے گھر چلا آیا۔
قاسم کاکا کی ساری زندگی جرائم میں ہی گزری تھی۔ پندرہ، سولہ سال کی عمر تک والدین سر پر نہ رہے تو سڑکیں اور گلیاں ناپتے ہوئے وہ آوارہ مزاج دوستوں کی صحبت میں بیٹھنے لگ گیا جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ کم عمری سے سگریٹ اور شراب بھی اس کے ہمنوا بن گئے۔ غنڈا گردی میں اسے خصوصی کمال حاصل تھا۔ بے جگر، نڈر اور خطروں میں دیوانہ وار کود جانا اسے بہت مرغوب تھا۔ عمر کی 'دسنتیں' بہاریں دیکھ لینے کے باوجود اس نے شادی نہیں کی تھی۔ بلکہ کرنی کیا تھی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ زندگی اور بستر پر صنفِ نازک کا آنا جانا ایک معمول تھا۔ اچھی خاصی ہموار زندگی میں ایک روز ریشم کی دید نے طوفان برپا کر دیا۔ اس روز وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ گاڑی میں کہیں جا رہا تھا۔

''ابے یار! کیا آئٹم ہے یہ! بڑی تعریفیں سن رکھی ہیں اس کی۔'' سگنل پر گاڑی رکی تو عقبی نشست پر بیٹھے ایک دوست نے کہا۔ قاسم نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا اور بائیں جانب ایک بہت بڑے تھیٹر کے باہر قدِآدم پوسٹر دیکھ کر چونک گیا۔ مختلف اداکاروں اور اداکاراؤں کے درمیان وہ لڑکی بہت ہیجان انگیز 'پوز' بنائے کھڑی تھی۔
''ڈانسنگ کوئین اب آپ کے شہر میں۔ سپرہٹ ڈراما 'صنم تیری قسم' کی کامیاب نمائش جاری ہے۔'' پوسٹر پر لکھی عبارت نے باقی ساتھیوں کا دل للچا دیا۔ انہوں نے قاسم کو بھی ٹکٹ خرید کر ڈراما دیکھنے پر راضی کر لیا۔
منہ مانگے دام دے کر وی آئی پی قطاروں کی ٹکٹس خرید لی گئیں اور بصد شوق 'آرٹ' کی خدمت کرتا وہ ڈراما دیکھا گیا جس میں 'کہانی' نام کی کوئی چیز سرے سے ہی ناپید تھی۔ مکالموں کی جگہ تک بندی، مزاح کے نام پر پھکڑپن، ذاتیات اور گھریلو خواتین پر نازیبا ترین کلمات کس کر ڈراما کے نام پر ایک عجیب ملغوبا بنایا گیا تھا۔ اسٹیج پر ریشم کی انٹری ابتدائی پندرہ منٹ کے بعد ہوئی تھی۔ وہ سیاہ ستاروں پر مشتمل چست خالی دار لباس میں بھڑکیلا میک اپ کیے ہوئے تھی۔ اس کی آمد پر خصوصی موسیقی بجائی گئی۔ وہ دو منٹ تک اسٹیج کے دونوں اطراف میں گھوم کر اپنے جلوے بکھیرتی رہی۔ موسیقی کے ختم ہوتے ہی وہاں کھڑے مرد اداکار نے نہایت لچر مذاق کر کے مکالموں کا آغاز کیا۔ جواباً ریشم نے بھی اس مذاق کا سلسلہ اس اداکار کی گھریلو محترم خواتین سے جوڑ کر تماشائیوں کو تالیاں پیٹنے اور سیٹیاں بجانے پر مجبور کر دیا۔ اس کی بےباکی نے قاسم کے کانوں کی لوئیں تپا دیں۔ وہ اس کے اعتماد اور اداکاری سے کافی متاثر ہوا تھا۔ چنیدہ مکالمات کی ادائیگی کے بعد وہ اسٹیج سیٹ پر بنا پردہ اٹھا کر پچھلی جانب غائب ہوئی تو شائقین کی جانب سے ایک دفعہ پھر اسے بلوانے کی فرمائش کی جانے لگی۔
پندرہ منٹ بعد ریشم ایک بار پھر اسٹیج پر نمودار ہوگئی۔ اس بار اس نے سرخ بھڑکیلا اور چست ترین لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے آتے ہی طوفان بدتمیزی برپا ہوگیا۔ وہ بےنیازی اور اعتماد سے ایک مشہور فلمی گانے پر رقص کرنے لگی۔ رقص بھی کیا تھا جسمانی شاعری کا ایک انتہائی لغو سلسلہ تھا۔ قاسم کی نظریں ایک لمحے کے لیے بھی اس کے قیامت خیز سراپا سے ہٹنے کے لیے تیار ہی نہ تھیں۔ اس کے عقب میں نصف درجن لڑکے بھی ایک ہی طرز کا لباس پہنے کورس میں رقص کر رہے تھے۔ ریشم کے ڈانس پر ہال بھر میں بیٹھے افراد جھوم رہے تھے۔ گانے کا اختتام ہوتے ہی وہاں 'ونس مور' کا شور برپا ہوگیا۔ ریشم گہرے سانس لیتی قاتلہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ایک ادا سے ناظرین کی جانب ہوائی بوسے اچھالے اور پردے کے عقب میں غائب ہو گئی۔ اس کے بعد ذومعنی مکالموں اور فحش گوئی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔
اس ڈرامے کے اختتام سے پندرہ منٹ قبل ریشم نے ایک بار پھر سنہری لباس میں نئے گانے پر رقص کیا۔ اس گانے کے لغویات کی حدود تک بےباک بول ہی کم نہ تھے کہ ہیجانی رقص نے وہاں آگ ہی لگا دی۔ ہال میں بیٹھا ہر ایک فرد دیوانگی میں مبتلا دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں چودہ، پندرہ سالہ لڑکوں سے لے کر ستر، پچھتر سالہ بوڑھے بھی شامل تھے۔ ان سبھی پر ریشم کا سحر طاری تھا۔
ڈراما ختم ہوتے ہی اسٹیج کے پردے گرا دیے گئے۔ ہال میں لغو تبصروں، ادھوری دلی تمناؤں اور ریشم کے متعلق مستقبل کے بدعزائم کا اظہار کرتے وہ لوگ دھیرے

دھیرے دھیرے باہر نکلنے لگے۔ قاسم ان میں سے کئی افراد سے واقف تھا۔ بیرونی دنیا میں وہ خاصے معزز شمار ہوتے تھے۔ ان میں سے کوئی ڈاکٹر تھا تو کوئی وکیل، کوئی کالج کا لیکچرار تھا تو کوئی یونیورسٹی کا پروفیسر۔ سروں پر گول جالی دار ٹوپیاں جمائے اور ہاتھوں میں تسبیح تھامے علاقے کی بڑی اور مشہور دکانوں کے مالکان کو بھی وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ ہاں اگر کچھ نہیں جانتا تھا تو یہ بات کہ ریشم نے اس کے اعصاب اور ذہن پر مکمل قبضہ کرلیا تھا۔

ستّر کی دہائی میں پیدا ہونے والا قاسم کا کرتا بھی کیا؟ وہ اس وقت میں پرورش پا کر جوان ہوا تھا جب ڈرامے، فلمیں اور گانے کسی خوراک کے مانند زندگی کا لازمی حصہ ہوا کرتے تھے۔ اس نے اپنے اردگرد فلموں اور گانوں کا ایک ایسا ماحول دیکھ رکھا تھا جب فلمی گانوں کی آفاقی شاعری، دلکش موسیقی اور سُریلی آوازیں سن کر انسان کو 'محبت' سے ہی خواہ مخواہ 'محبت' ہوجایا کرتی تھی۔ وہ بھی ایسی ہی 'پرانی سوچ' کا شخص تھا اور اسے اپنی عمر کے اڑتیسویں سال ایک متنازعہ عورت بلاوجہ ہی اچھی لگنے لگی تھی۔ اتنی اچھی کہ وہ اس کے ڈرامے کا ہر شو روزانہ دیکھنے کے لیے جانے لگا۔

'صنم تیری قسم' کی بلاک بسٹر کامیابی کے کچھ ہی عرصے بعد 'لیلیٰ' کا آغاز ہوگیا۔ اس ڈرامے میں ریشم نے قدرے سیاہ فام رقاصہ کا روپ اختیار کیا ہوا تھا۔ اس کی آبنوسی رنگت، دلکش اداؤں اور 'بیلے رقص' نے تو گویا میلہ ہی لوٹ لیا۔ یہ رقص دیکھ کر کوئی بھی مرد اپنے ہوش وحواس کھو سکتا تھا۔ نتیجتاً ڈرامے کی 'ڈیمانڈ' اور پھر مکالموں کے دوران ریشم کو طلب کرنے کے لیے فحش گوئی کا استعمال حد سے تجاوز کرنے لگا۔ اپنے اردگرد بیٹھے لوگوں کی یہ لغو گوئی قاسم کا دماغ سنسنا کر رکھ دیتی۔ غصہ اعصاب چٹخانے لگتا تو وہ عملی سوچ کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو یہ سمجھاتا کہ وہاں بیٹھے سبھی افراد نے 'پیسے' دے کر یہ سب کچھ دیکھنے اور تبصرے کرنے کا حق حاصل کیا ہے۔ جب انتظامیہ اور متعلقہ اداکارہ کو کوئی مسئلہ نہیں تھا تو اسے معترض ہونے کا بھی کوئی حق حاصل نہیں تھا۔

'لیلیٰ' کی کامیابی یا بالفاظ دیگر 'بے ہودہ گوئی' ایک ماہ تک جاری رہی۔ رفتہ رفتہ طوفان بدتمیزی اس قدر بڑھا کہ معاملات یکدم ہی بے قابو ہوگئے۔ کسی 'قانون پسند شہری' نے اپنے تعلقات کا استعمال کرتے ہوئے اخبارات اور برقی میڈیا میں خاصا طوفان کھڑا کروادیا۔ 'جدید بازارِ حسن' کے ایسے ٹھکانے ناقابلِ یقین انداز میں عوامی سطح پر مقبول ہوئے تھے لہٰذا اب کائنات کی ازلی مساوی قوتوں کے زیرِاثر 'پکڑ دھکڑ' کا مرحلہ بھی تو شروع ہونا ہی تھا۔ قانون ساز اداروں کی پہلی مداخلت لیلیٰ ہی کے اک شو میں ہوئی۔ اس وقت ماحول بالکل گرما گرم تھا۔ نعرے اور سفلی خواہشات پر مبنی تبصروں سے گونجتی فضا اس وقت مرتعش ہوئی جب ہال کے عقبی دروازے زوردار آواز سے کھلے اور بھاری بوٹوں کی آوازیں گونجتی ہوئی قریب تر آنے لگیں۔ ہال میں بیٹھے ان سیکڑوں افراد کو جیسے کسی بچھو نے کاٹ لیا۔ ایسے کسی بھی ٹھکانے پر پولیس کے چھاپے کا مطلب کوئی بچہ بھی سمجھ سکتا تھا۔ ماحول پل بھر میں ہی تبدیل ہوکر رہ گیا۔ مزید خرابی اس وقت پیدا ہوئی جب اسٹیج پر ایک اداکار نے جانے کون سی ترنگ میں پولیس اہلکاروں کو تیسرے درجے سے بھی بدتر 'جگت' لگادی۔ یہ اداکار گزشتہ بیس برس سے اسٹیج ڈراموں سے وابستہ اور عوامی حلقوں میں خاصا مقبول بھی تھا لیکن اس روز یہ غلطی اس کے لیے بہت بڑا 'گناہ' بن گئی۔ اس چھاپا مار ٹیم کے سربراہ نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر زوردار طمانچہ رسید کردیا۔ ہال میں موت کا سناٹا طاری ہوگیا۔

''پکڑلو ان...... کے تخموں کو...... اندر کرو سب کے سب کو...... ان کا یہ کمینہ خانہ آج کے بعد دوبارہ کھلا تو ایک ایک کو لائن میں کھڑا کرکے گولی سے اُڑادوں گا۔'' اس کی دہاڑ معاملے کی سنگینی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔

تھپڑ کھا کر زمین پر گرا ہوا وہ ادھیڑ عمر اداکار پھٹی پھٹی نظروں سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی یہ تذلیل کوئی بھیانک خواب محسوس ہورہی تھی۔ اس نے اسٹیج ڈراموں کا وہ دور بھی دیکھ رکھا تھا جب یہ آرٹ کی حقیقی خدمت کیا کرتے تھے۔ بازارِ حسن کی رقاصائیں یہاں لاکر پیسا کمانے پر مائل انتظامیہ سے نظریاتی اختلاف کے باوجود وہ پیٹ کا جہنم سرد رکھنے کے لیے یہاں اداکاری کرنے پر مجبور تھا اور آج یہ مجبوری سرِعام رسوا ہوگئی تھی۔ ہال میں بیٹھے افراد پولیس اہلکاروں کا مزاج بھانپ کر ادھر اُدھر کھسکنے پر مجبور ہوگئے لیکن بے سود۔ اس روز کسی کی بھی خلاصی ممکن نہ تھی۔ اعلیٰ قانونی انتظامیہ کی جانب سے خاصے سخت احکامات جاری کیے گئے تھے۔ قاسم کے لیے ایسی چھوٹی موٹی گرفتاریاں ایک معمول تھیں۔ وہ چند گھنٹے بعد ہی اپنے 'تعلقات' کی ڈوریاں ہلا کر آزاد ہوگیا۔ آزادی سے قبل اس نے اتنی معلومات حاصل کرلی تھیں کہ ریشم کو بھی کسی

'باتھ' عقیدت مند نے وہاں سے نکلوالیا تھا۔ باقی کسی کے متعلق جاننے کا اسے کوئی شوق تھا نہ ہی ضرورت۔

حوالات سے آنے کے بعد وہ اپنی زندگی میں مصروف ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک دو ہفتوں کی 'ڈراما بازیوں' کے بعد حالات دوبارہ اپنی ڈگر پر لوٹ آئیں گے۔ تھیٹر کی رونقیں ایک بار پھر ویسے ہی بحال ہو جائیں گی لیکن اس بار ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ موجودہ شہری حکومت اس 'فتنے' کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے مرنے مارنے کی حد تک سنجیدہ تھی۔ حکومت کو میڈیا پر برپا شور کی بھی کوئی پروا نہ تھی جو اس طمانچے کے بعد سینئر اداکار کے اسپتال پہنچ جانے اور شدید علالت پر آہ و پکار کر رہی تھی۔ چھ ماہ بعد بھی جب انتظامیہ کی سختی میں کوئی لچک پیدا ہوتی نظر نہ آئی تو قاسم کی بے چینی میں اضافہ ہونے لگا۔ اسے ریشم کی بے طرح یاد آتی تھی۔ وہ اسے اپنے سامنے دیکھنا چاہتا تھا۔ جذبات کی شوریدہ سری اس قدر بڑھ گئی کہ اس سے گفتگو کرنے کے لیے دل مچلتا۔ قاسم نے ایک بار پھر تعلقات کی ڈوریاں ہلائیں اور ریشم کی رہائش گاہ کا پتا حاصل کر کے اس سے ملنے جا پہنچا۔ پہلی ملاقات کا ہر ایک لمحہ آج بھی اس کے ذہن پر روزِ اول کی طرح نقش تھا۔ وہ بکھرے بال، متورم آنکھیں اور نیند میں جھومتی دروازہ کھولنے آئی تھی۔

''میں نے کوئی سرف یا دودھ کے پیکٹ نہیں لینے بھائی! جاؤ کسی اور کا دروازہ کھٹکھٹاؤ جا کر۔'' وہ منہ پھاڑ کر جمائی لیتی ہوئی بولی۔ قاسم اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے اس کا میک اپ سے پاک چہرہ دیکھنے لگا۔

''میں کوئی سرف یا دودھ بیچنے نہیں آیا۔ تم سے ملنے آیا ہوں ریشم! بہت مس کر رہا تھا میں تمہیں۔'' وہ پُرشوق انداز میں بولا۔ اس کے کوئی بھی جواب دینے سے پہلے محلے کا ایک بچہ دوڑتا ہوا آیا اور ہانپتے ہوئے کہنے لگا۔

''آنٹی...... وہ ادھر آپ کی امی ہمارے گھر میں میلاد پر آئی تھیں ناں۔ تو سیڑھیوں سے پھسل کر گر گئی ہیں۔ انہیں بڑی چوٹ آئی ہے۔ جلدی سے آکر دیکھیں انہیں۔ اسپتال لے جانا پڑے گا سر بھی پھٹ گیا ہے۔''

''وے مرن جو گیا! آنٹی ہو گی تیری ماں۔ زبان کو لگام دے اپنی۔'' ریشم نے ہاتھ نچایا اور پھر سر جھٹکتے ہوئے بولی۔

''منع بھی کرتی ہوں ماں جی کو کہ یہ ہر دوسرے تیسرے گھر میں میلادوں، شادیوں اور فوتگیوں میں جا کر میرے لیے مسائل نہ بڑھایا کریں۔ سننے والے دن تو یہ پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں ناں۔''

''آنٹی اب میں گھر جا کر انہیں کیا کہوں؟'' لڑکا جھنجلایا۔

''وے دفع ہو مرن جو گیا۔'' ریشم غصے سے چلائی۔

قاسم نے بمشکل ہنسی دبائی اور لڑکے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

''چلو میرے ساتھ! گاڑی میں انہیں کسی اسپتال لے جاتا ہوں میں۔'' اس نے ریشم کو نظر انداز کیا اور لڑکے کے ساتھ ہی آگے بڑھ گیا۔

ریشم کی والدہ کو پاؤں میں بھی خاصی موچ آئی تھی۔ سر کی چوٹ پر چھ ٹانکے لگوانے کے بعد اسپتال سے واپس آئے تو ریشم اپنا غصہ سرد کرنے میں خاصی کامیاب ہو چکی تھی۔ اس نے قدرے معقول انداز میں قاسم کا شکریہ ادا کیا۔ اسی دوران ایک کم عمر لڑکا دو گلاسوں میں بوتل ڈالے اس کے پاس چلا آیا۔ معصوم صورت، سرخ و سفید رنگت اور ملائم بالوں میں وہ بالکل ریشم کا ہی پرتو محسوس ہو رہا تھا۔

''تم کیوں لے آئے بوتل؟ وہ ہڈحرام شمیم کدھر ہے؟''

''وہ آج کام پر نہیں آئی باجی!'' منیب نے بتایا۔ اس کے انداز و الفاظ نے قاسم کو حیران کر دیا۔

''اس کی کیا ضرورت تھی یار؟ خواہ مخواہ تکلف کیا تم نے۔'' قاسم نے بات کو طول دینے کی غرض سے کہا، اسے منیب کا طرزِ تخاطب اپنا سمعی و بصری واہمہ محسوس ہوا تھا۔

''تکلف کی کیا بات ہے جی؟ باہر گرمی بھی تو بہت ہے۔ اگر اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیجیے گا۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر کر دوں گا۔'' منیب نے سابقہ انداز میں جواب دیا۔ قاسم کا دل تاسف سے گھر گیا۔ اچھا خاصا خوش شکل اور مہذب سالڑکا بات چیت میں زنانہ پن اختیار کیے ہوئے تھا۔ ریشم کی نظریں بھائی کو نہار رہی تھیں۔

''چلو اب جا کر اپنی بکس کھول لو اور کام مکمل کرو۔'' اس نے حکم جاری کیا۔

''ٹھیک ہے باجی! گلاس خالی ہو جائیں تو مجھے آواز دے دینا۔ خود نہ چلی جانا کچن میں۔ پہلے ہی اتنا تھکی ہوئی ہو۔'' منیب نے ہاتھ لہرا کر کہا اور اندرونی جانب بڑھ گیا۔

''میرا شہزادہ ویر!'' ریشم اس کی بلائیں لینے لگی۔

''تم اسے ٹوکتی کیوں نہیں؟'' قاسم نے بے اختیار کہا۔

''کس بات پر؟ اتنا تو پیارا بھائی ہے میرا۔'' اس نے

منہ بنایا۔

''اس کی بول چال، اٹھک بیٹھک میں زنانہ پن ہے ریشم! اسے پیار سے ٹوکو گی تو سمجھ ہی جائے گا وہ۔'' قاسم نے خلوص سے کہا۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ بے دھیانی اور غیر ارادی طور پر کہی ہوئی یہ بات کس طرح اس کے گلے پڑ جائے گی۔ ریشم کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ اس نے قاسم کا تازہ ترین 'احسان' بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے بے نقط سنا دیں۔ وہ منیب کے بارے میں ضرورت سے زیادہ حساس اور زود رنج تھی۔ قاسم اس صورتِ حال پر بوکھلا کر رہ گیا۔ اسے ریشم سے زیادہ اپنی عقل پر غصہ آرہا تھا کہ اس طرح پہلی ہی ملاقات میں کسی کی ذاتیات میں دخل اندازی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ خاموشی سے اٹھ کر واپس چلا آیا۔

اس روز کے بعد وہ وقتاً فوقتاً اس کے گھر کا چکر لگا لیا کرتا۔ ریشم ایک درمیانے درجے کی رہائشی کالونی میں رہتی تھی۔ کچھ عرصہ قبل اسٹیج ڈراموں سے حاصل ہونے والی بے تحاشا کمائی میں رکاوٹ آئی تو مہنگے علاقے کی رہائش گاہ چھوڑنی پڑی۔ اس علاقے میں کوئی کسی کے معاملے میں دخل اندازی نہیں کرتا تھا لیکن یہاں معاملہ برعکس تھا۔ اہلِ محلہ اس کے پیشے سے آگاہ ہوئے تو چند ایک کے سوا سبھی نے ناک میں دم کر دیا۔ اس صورتِ حال میں وہ نہایت بدمزاج اور چڑچڑی ہوتی جا رہی تھی۔ قاسم کی ریشم سے تو ملاقات نہ ہو پاتی البتہ اس کی والدہ سے گپ شپ رہنے لگی۔ اسی دوران اسے علم ہوا کہ ریشم کا تعلق بازارِ حسن سے تھا۔ وہ چند سال قبل ہی اسٹیج ڈراموں سے منسلک ہوئی تھی۔

''مجھے پتا تھا کہ آپ لوگ وہیں سے ہیں ماں جی!'' قاسم نے بے نیازی سے کہا۔ اسے اس بات سے حقیقتاً کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

''لیکن تجھے یہ علم نہیں ہوگا کہ ریشم کی اصل عمر کیا ہے؟'' رشدہ نے رازدارانہ انداز اپنایا۔

''زیادہ سے زیادہ پچیس کی ہوگی۔''

''کھا گیا دھوکا تو بھی؟'' رشدہ ہنسی۔ ''وہ پینتیس سال کی ہو چکی ہے اور یہ جو منیب ہے ناں! یہ میرا نہیں اسی کا بیٹا ہے۔'' ان انکشافات پر وہ حیران رہ گیا۔ فوری ردِعمل کے طور پر اس کے ذہن میں یہ سوال بھی ابھرا کہ رشدہ اسے یہ سب کچھ کیوں بتا رہی ہے۔ رشدہ نے بھی اس کا ذہن پڑھ لیا اور کہنے لگی۔

''دیکھ پتر! طوائف اگر کم شکل بھی ہو تو کام چل جاتا ہے لیکن طوائف جذباتی ہو تو بڑی خواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ میری بیٹی میں طوائف کو برباد کرنے والی سب سے بڑی خامی ہی موجود ہے۔ وہ بڑی جلدی جذباتی ہو جاتی ہے۔ منیب کو اپنا بھائی کہہ کر بڑا کیا ہوا ہے۔ اب اگر سچ بتائے تو اس جیون جوگے کا ذہن تو اور تباہ ہو جائے گا۔''

''منیب ایسا کیوں ہے ماں جی؟'' قاسم نے اس بار محتاط انداز اپنایا۔

''بازارِ حسن کے لڑکوں کی زندگی بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے پُتر! وہاں لڑکوں کی پیدائش منحوس سمجھی جاتی ہے۔ ہمیں لڑکے نہیں لڑکیاں پیدا کرنے کی بھوک ہوتی ہے۔ لڑکوں کو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ وہ ایسے ہی رل کھل کے پل جاتے ہیں۔ کئی ذرا سا بڑے ہوتے ہی وہ گلیاں چھوڑ جاتے ہیں تو کئی خودکشی کر لیتے ہیں۔ ان میں سے ایک آدھا منیب جیسا بھی نکل آتا ہے۔ وہ جب دیکھتا ہے کہ کوٹھے پر لڑکیوں کی قدر زیادہ ہے تو وہ بھی ویسا ہی انداز اور بول چال اپنا لیتا ہے۔ منیب نے بھی یہی کیا۔ ریشم پیسہ کمانے میں اتنی مصروف رہی کہ اس کی ان عادتوں کی طرف دھیان ہی نہ دے سکی اور اس کی عادتیں اچھی خاصی پک گئیں۔ تجھے یہ سب اس لیے بتا رہی ہوں کہ میں نے تیری آنکھوں میں اپنی بیٹی کے لیے بڑے نرم جذبات دیکھے ہیں۔ مرد کی نگاہ پہچان لیتی ہوں میں۔ مجھے پتا ہے تو اسے بڑا خوش رکھے گا۔ وہ احمق اپنے لیے کبھی درست فیصلہ نہیں کر سکے گی۔ اس کی پہلی کوشش یہی ہوگی کہ منیب کو اپنا بھائی بتا کر ہی زندگی گزارتی رہے۔ اگر کبھی گھر بھی بسائے تو اسی جھوٹ کی بنیاد پر بسائے گی۔ کم بخت یہ نہیں سمجھ رہی کہ اب عمر کے اس حصے میں پہنچ گئی ہے کہ کوئی اہم فیصلہ کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ نجی محفلوں میں کب تک ڈانس کر کے کمایا کرے گی۔ اگر شادی بیاہ میں دیر کی تو دوبارہ اولاد ہونی مشکل سے مشکل ہوتی جائے گی۔ منیب کو اولاد کہہ نہیں سکے گی تو زندگی میں ایک نیا جہنم تیار ہو جائے گا۔ تجھے ایک مشورہ دوں؟ اسے اپنے جذبات کے بارے میں بتا دے۔ آگے میں اسے خود سمجھا بجھا لوں گی۔'' اس بوڑھی عورت کی جہاندیدگی اور احساس پر قاسم کو پیار آنے لگا۔ اس نے ریشم سے 'اظہارِ محبت' کا فیصلہ کر لیا اور پہلے ہی راؤنڈ میں منہ کی کھانی پڑی۔ ریشم نے دوٹوک الفاظ میں محبت کے بجائے 'عزت' کی طلب بتا کر معاملہ اور گمبھیر بنا دیا تھا۔

☆☆☆

قاسم کاکا نے ریشم کے انکار کے باوجود ہمت نہ

ہاری۔ اسے یقین تھا کہ وہ ریشم کو بہت جلد قائل کر لے گا۔ رشدہ کی طرف سے بھی مدد کی پوری امید تھی۔ اس کا یہ یقین اور منصوبہ بندی اس وقت ملیامیٹ ہوئی جب رشدہ صرف چند روز بخار میں مبتلا رہ کر انتقال کر گئی۔ قاسم نے تجہیز و تکفین کے سبھی مراحل اکیلے سنبھالے رکھے۔ وہ دلی طور پر ریشم کو اپنی ذمّے داری سمجھتا تھا۔ اس کی بدقسمتی پیچھا چھوڑنے کے لیے تیار ہی نہ تھی۔ رشدہ کی وفات کے چوتھے روز قاسم کو جُوا کروانے اور اپنے اڈے پر سرِعام شراب فروخت کرنے کی پاداش میں حوالات کی سیر کرنا پڑی، اس بار معاملہ کافی سنگین تھا۔ کچھ پچھلے جرائم کا کھاتا بھی کھل گیا اور وہ دو ہفتوں کے لیے منظرِ عام سے غائب ہو گیا۔

پولیس سے چھٹکارا ملتے ہی وہ پہلی فرصت میں ریشم کے گھر روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچتے ہی اسے علم ہوا کہ وہ ایک ہفتہ قبل ہی کسی اور جگہ منتقل ہو گئی ہے۔ محلے میں کسی کو بھی اس کی نئی رہائش گاہ کا پتا معلوم نہیں تھا۔ سوچ بچار کے بعد قاسم منیب کے اسکول چلا گیا۔ اس کی توقع کے مطابق ایک ماہ بعد ہونے والے سالانہ امتحانات کی وجہ سے منیب فی الحال اسی اسکول میں زیرِ تعلیم تھا۔ قاسم کو اسی سے علم ہوا کہ ریشم نے جمال نامی کسی شخص سے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔

”کیا؟ پاگل ہو گئی ہے وہ؟ اتنی اچانک کوئی فیصلہ کیسے کر سکتی ہے وہ؟“ قاسم چلّا اٹھا۔ منیب کے پاس خاموشی کے سوا کوئی جواب نہیں تھا۔

”تم ملے ہو اُس شخص سے؟ کیسا ہے وہ؟ کیا کرتا ہے؟ کہاں رہتا ہے؟“ اس نے منیب سے پوچھا۔

”جی انکل! وہ دو دفعہ آیا تھا ہمارے گھر۔ بوتلیں میں ہی لے کر گیا تھا گلاس میں۔ اس نے مجھے بہت پیار بھی کیا۔ کہنے لگا کہ بہت اچھا بچہ ہے یہ تو۔ باجی بڑا خوش ہوئیں۔ اس انکل نے مجھے چاکلیٹ بھی دیں۔ جب میں گلاس لینے گیا تو باجی کسی بات پر اس کا شکریہ ادا کر رہی تھیں، انہیں ایک ڈانس پارٹی سے آتے ہوئے پچھلے محلے کے لڑکوں نے اغوا کر لیا تھا نا! تو اسی انکل نے کسی طرح انہیں چھڑوایا تھا۔“ منیب معصومیت سے انکشاف کرتا چلا گیا۔ قاسم اس افتاد پر پریشان ہو گیا۔ اس نے فوری طور پر ریشم سے ملاقات کا فیصلہ کر لیا۔

”یہ میں کیا سن رہا ہوں؟“ قاسم نے اس کے سامنے آتے ہی بے یقینی سے پوچھا۔

”ایسا کیا سن لیا تم نے؟“ ریشم کی یہ بے نیازی اسے ہمیشہ ہی محبوب رہی تھی لیکن آج کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”تم نے یہ کیا فیصلہ کیا ہے؟“

”وہی جو مجھے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔“ اس کی مسکراہٹ دل جلا رہی تھی۔

”تو پھر بہت پہلے نہ کرنے کی وجہ؟“

”ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے نا! بس اس کام کا بھی وقت ہو گا۔“ اس کی بُردباری کسی دانشور کو بھی مات دے رہی تھی۔

”اس فیصلے کے حق میں کم از کم ایک وجہ بتا دو۔“

”وجہ تمہیں بہت پہلے سے ہی معلوم ہے۔“

”موری کی اینٹ چوبارے میں نہیں لگا کرتی۔ ابھی بھی وقت ہے اپنا فیصلہ بدل لو۔“ وہ حد درجہ سنجیدہ تھا۔

”یعنی آج تم نے بھی مجھے طعنہ دے ہی دیا۔“ اس نے ہمیشہ کی طرح فقرے سے اپنا من پسند مطلب اخذ کیا اور موخرالذکر بات بالکل نظرانداز کر دی۔

”تم اپنی یہ فضول منطق اپنے پاس ہی رکھو احمق عورت! بات کو گھمانے کی کوشش نہ کرو۔“ وہ جھنجلایا۔

”مجھے تو پہلے ہی پتا تھا کہ تم عورت ذات کی عزت کر ہی نہیں سکتے۔ آج مجھے موری کی اینٹ کے بعد احمق بھی کہہ دیا۔“ اس کے انداز سے صاف عیاں تھا کہ وہ بات کو دانستہ طور پر طول دے کر منفی باتیں اخذ کر رہی ہے۔

”زیادہ ایکٹنگ کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اچھی طرح سمجھ رہی ہو کہ میں نے کیا کہا ہے۔“

”تو تم بھی اچھی طرح سمجھ لو کہ عورت گھر بسانے کا فیصلہ صرف ایک ہی بار کرتی ہے۔ جب وہ ایسا کرتی ہے تو دل اور روح کی شدت و گہرائی شامل ہوتی ہے۔ ایک بار اس کے من کو کوئی بھا جائے تو اس کے بعد وہ کسی بادشاہ کو بھی نظر بھر کر دیکھنا گوارا نہیں کرتی۔“ وہ رُکھائی سے بولی۔

”تمہارے اس فیصلے میں توازن ہوتا تو میں خود ہی رستے سے ہٹ جاتا۔ تم ایک غیر متوازن کام کر رہی ہو اور جہاں توازن نہ ہو وہاں معاملات بگڑتے بگڑتے اکثر جرائم کی طرف جا نکلتے ہیں۔“ اس نے اپنی زندگی کا تجربہ بیان کیا۔

”میں تمہاری یہ منطق نہیں مانتی۔“

”تم جان بوجھ کر انجان بن رہی ہو۔ آج میری ایک بات لکھ لو! تم جرائم پیدا کرو گی اور ایک بار جرائم کا سلسلہ شروع ہو جائے تو پھر اس کی سزا نسلیں بھگتا کرتی ہیں۔“

”تم جو مرضی کہو۔ میرا یہ فیصلہ تبدیل نہیں ہو گا۔“ وہ

ڈھٹائی سے بولی۔

''یعنی تم نے مستقبل میں مجرم ہی دیکھنے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو مجھ میں کیا خرابی تھی؟''

''مستقبل کا حال خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

''بے شک نہیں جانتا۔ لیکن اسی خدا نے انسان کو عقل بھی تو دی ہے کہ اپنے بھلے بُرے کی تمیز کر کے مستقبل کا اندازہ لگا لے۔'' وہ اسے کسی بھی قیمت پر قائل کر لینا چاہتا تھا۔

''ارے جاؤ! اتنے آئے تم نجومی۔'' اس نے حقارت سے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ اس کا انداز نہایت دل شکن تھا۔

''ریشم! آخری بار سوچ لو۔ میں سچ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔'' وہ گڑگڑانے لگا۔

''ارے کیا سوچوں میں؟ اگر تمہیں مجھ سے واقعی محبت ہوتی تو تم مجھے ان ڈانس پارٹیز میں جا کر وحشی مردوں کے سامنے ناچنے سے منع کرتے۔ میرے لیے کچھ سوچتے۔ لیکن تم تو خود اپنے جرائم کے سلسلے میں حوالات پہنچ گئے۔ جمال ایک شریف مرد ہے۔ اس نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر مجھے ان لڑکوں کے خفیہ ٹھکانے سے نکالا۔ اسے اللہ نے میرے لیے فرشتہ بنا کر ہی بھیجا تھا ورنہ وہ خود کہتا ہے کہ اتنی رات تک وہ کبھی ریڑھی لیے باہر نہیں رہتا۔ میں کیسے بھول جاؤں وہ لمحے جب ان اٹھارہ، بیس سال کے تین لڑکوں نے زبردستی ایک اور دوست کے مکان میں بند کر دیا مجھے۔ کیسے بھول جاؤں کہ میں گھر میں اکیلے منیب کے بارے میں سوچ کر کتنا پریشان تھی۔ کیسے بھول جاؤں کہ جمال اس ویرانے میں میری دعاؤں کے صلے میں آیا تھا۔ اس نے میری چیخ و پکار سن کر آزاد کروا دیا مجھے۔ اگر ذرا بھی دیر ہو جاتی تو وہ لڑکے اپنے باقی دوستوں اور میرے ریپ کے لیے کیمرے کا بندوبست کر کے آ جاتے۔ وہ مجھے قید کر کے اتنے بے فکر اور پُراعتماد تھے کہ کسی نے بھی وہاں پہرا دینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ کون جانے مجھے زندہ بھی چھوڑتے یا مار کر وہیں دفنا دیتے۔ تم کہتے ہو کہ تم سے شادی کر لوں۔ میں کیا جانتی نہیں کہ تمہاری اصل نیت کیا ہے۔ تم یہ چاہتے ہو کہ کل کلاں کو اگر پھر کسی حوالات میں پہنچ جاؤ تو میں اپنا جسم اور خوبصورتی کیش کروا کے تمہیں آزاد کرواتی پھروں۔ محبت تو جمال کرتا ہے مجھ سے۔ اس نے یہ ڈانس پارٹیز چھوڑ کر ایک صاف ستھرا بیوٹی پارلر کھولنے کا مشورہ دیا ہے۔ بھرپور مدد بھی کرے گا میری۔ تمہاری کوئی جگہ ہی نہیں میری زندگی میں۔ آئندہ مجھے اپنی شکل نہ دکھانا کبھی۔'' وہ کف اُڑاتے ہوئے کہتی چلی گئی۔

قاسم کے لیے اب وہاں سے خاموش روانگی کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

ریشم کے اس انکار اور شادی کے اعلان پر قاسم نے اس سے دوبارہ کبھی ملاقات کی، نہ ہی اس کے متعلق کوئی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے ماضی کا یہ باب بند کر دینا چاہتا تھا۔ کچھ وقت اور گزرا تو اس نے بھی ایک غریب گھرانے کی معمولی شکل و صورت کی حامل لڑکی سے شادی کر لی۔ اس نے اپنی پیشہ وارانہ زندگی ترک تو نہیں کی تھی تاہم جبلی تقاضوں کے تحت گھریلو زندگی کا سکون حاصل کرنا بہت ضروری ہو گیا۔ ماہ و سال کا حساب رکھنا اس نے چھوڑ دیا تھا۔ اسے علم ہی نہیں تھا کہ ریشم کا بیوٹی پارلر زیادہ کامیاب نہیں رہا تھا۔ جمال نے اسے ایک متوسط آبادی کے طبقے میں کرائے کے ایک کمرے میں یہ پارلر کھلوا کے دیا تھا۔ آمدنی گزارے لائق ہی رہی۔ ریشم اس کی گرویدہ اس لیے بھی رہی کہ جمال نے کبھی اپنا پیشہ ترک کرنے کی بات یا اس کی کمائی پر نظر نہیں رکھی تھی۔ اسی دوران قاسم پولیس کی آئے روز کی مداخلت سے تنگ آ کر شہر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ انہی دنوں اس کے گھر بیٹے کی پیدائش ہوئی۔ اہلیہ کی فرمائش پر عقیقہ کیا گیا۔ گوشت تقسیم کرتے اسے اچانک ہی ریشم نظر آ گئی۔

وہ دونوں غیر متوقع طور پر سرِراہ ملے تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھٹکے، رکے اور لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ سجائے بات کا آغاز کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈنے لگے۔

''کیسی ہو تم؟'' قاسم نے نرمی سے پوچھا۔

''اچھی...... بہت اچھی۔'' وہ گردن اکڑا کر بولی۔

اُن کے درمیان کچھ دیر کے لیے پھر خاموشی چھا گئی۔

وہ اس کے لان کا سستا سوٹ اور فربہ جسم بغور دیکھتے ہوئے ایک عجیب سی کسک میں مبتلا ہو رہا تھا۔ دوسری جانب وہ بھی اس کی متین خاموشی سے ایک بے عنوان خلش محسوس کرنے لگی تھی۔

''اور سناؤ! کیسی گزر رہی ہے زندگی؟'' الفاظ نہ ملنے کی صورت میں ایسے ہی سرسری انداز اختیار کیے جاتے ہیں۔

''بہت ہی زبردست! تم سناؤ۔'' وہ بھی حتی الامکان بشاشت سے بولی۔

''پروردگار کا بہت شکر ہے۔ ویسے کافی ٹائم بعد ملنا

ہوا ہے ہمارا، نہیں؟''

''ہاں! چھ سال تو گزر ہی گئے ہیں۔'' وہ بے دھیانی سے بولی اور پھر خود ہی خفیف ہوگئی۔ قاسم نے بہت گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا تھا۔ وہ ان نظروں کی تاب نہ لاکر خود کو کوسنے لگی۔

''یہاں کیا کر رہی ہو؟ اکیلی آئی ہو کیا؟'' وہ اس کے ہاتھ میں سبزی کا خالی تھیلا دیکھ کر بولا۔

''ہاں! میں اپنے کام انڈی پینڈینٹ ہو کر مکمل کر لیا کرتی ہوں۔ کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ بہت خوش ہوں میں۔'' اس نے بھرپور انداز میں جتایا۔

''پروردگار تمہیں ہمیشہ ہی خوش رکھے۔'' وہ مسکرایا اور اس کے فربہ سراپا کو دیکھتے کسی فوری خیال کے تحت بولا۔

''بچے کتنے ہیں تمہارے؟''

''ابھی تک تو کوئی نہیں۔'' اس کے چہرے پر افسردگی چھائی۔

''کیوں؟ تمہیں تو بچے بہت پسند ہوا کرتے تھے۔'' اس کی حیرانی بھی بے ساختہ تھی۔

''کرتے تھے کیا مطلب؟ مجھے اب بھی بچے بہت پسند ہیں۔ رب کے گھر میں دیر ہے، اندھیر تو نہیں۔ ہو ہی جائے گی اولاد بھی۔''

''آہاں! صحیح کہا۔ رب کے گھر میں دیر ہے، اندھیر تو نہیں۔ لیکن......'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔

''اب یہ مت کہنا کہ اس میں بھی انہی کا کوئی قصور ہے۔'' اس نے فوری طور پر ٹوکا۔

''میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا لیکن شاید خود تمہارے ذہن میں بھی ایسی ہی کوئی بات ضرور ہے۔'' وہ اس کی نادانی پر ہنسا۔

''ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے آئندہ کبھی ہمارا آمنا سامنا ہو تو تم میری گود میں اولاد بھی دیکھ لو۔''

''ہوسکتا ہے وہ وقت آنے سے پہلے میں ہی یہاں نہ رہوں۔'' اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

''کہیں جا رہے ہو تم کیا؟'' وہ چونکی۔

''ہاں! دور...... اس علاقے سے بہت دور...... دوسرے شہر یا ملک یہ ابھی مجھے نہیں پتا۔''

''صاف کیوں نہیں کہتے کہ مجھے خوش دیکھ کر دکھی ہو گئے ہو تم۔ اس لیے روایتی مجنوؤں کی طرح یہ گاتے ہوئے چلے جانا چاہتے ہو کہ میں تیرا شہر چھوڑ جاؤں گا۔'' وہ نخوت سے ہنسی۔

''تمہیں ایسا لگتا ہے تو یہی سہی۔'' اس نے خلاف عادت کوئی بحث نہ کی۔ ''اچھا! اب مل ہی گئی ہو تو یہ گوشت رکھ لو۔''

''عید قربان تو ابھی بہت دور ہے۔ پھر یہ گوشت کیسا؟'' اس نے نیلے رنگ کے شاپر میں بکرے کی گوشت کی صاف ستھری نصف درجن سے زائد بوٹیاں دیکھ کر کہا۔

''میں نے اپنے بیٹے کا عقیقہ کیا ہے آج۔ اسی خوشی میں بانٹ رہا تھا۔'' وہ سادگی سے بولا اور پھر اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی بوکھلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں یکدم بہت سے آنسو امڈے تھے۔

''ارے یہ کیا؟ تمہاری آنکھوں میں یہ آنسو کیسے؟'' وہ حیرانی سے پوچھنے لگا۔ ریشم سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

''خوشی کے ہی ہوں گے۔ تم خوش جو بہت ہو۔'' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی طنز کر گیا۔

''ہاں! بہت خوش ہوں میں۔ میری زندگی بالکل سیٹ ہے۔ میرا فیصلہ غلط نہیں تھا۔'' میکانکی انداز میں کہتے ہوئے اس نے بے دھیانی سے نیلا شاپر اپنے تھیلے میں منتقل کیا اور آگے بڑھ گئی۔ اسے اپنے عقب میں کھڑے قاسم کی آنکھوں سے جھلکتے تاسف، حیرت، بے یقینی اور افسوس کا کوئی بھی رنگ نظر نہیں آرہا تھا۔

☆☆☆

اس ملاقات کے بعد قاسم کو ایک طویل عرصے تک اس کی کوئی خبر نہیں مل سکی۔ شہر چھوڑنے کا فیصلہ بھی قدرت کی جانب سے ہی مؤخر ہوگیا۔ اس کی جملہ خوبیوں کی وجہ سے ایک مقامی سیاست داں نے اسے اپنی چھتر چھایا میں لے کر پولیس کی مداخلت سے بالکل ہی آزاد کر دیا۔ قاسم کی زندگی ہموار طریقے سے چلتی رہی۔ ریشم کا خیال اب کوئی بھولی بسری یاد بن چکا تھا۔ وہ اسے مکمل طور پر ہی بھول جاتا لیکن ایک روز منیب کے سامنے آنے سے ▪ بے طرح چونک گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ ریشم ایک بار پھر جوان ہو کر اس کے سامنے چلی آئی ہے۔ اُس روز وہ اپنے سسر کی تدفین کے بعد قبرستان سے نکل رہا تھا۔

''تم...... کیا نام تھا بھلا تمہارا؟ تم وہ ریشم کے بھائی ہونا؟'' قاسم نے ذہن پر زور دے کر پوچھا۔ اسے کوشش کے باوجود منیب کا نام یاد نہیں آیا تھا۔

''جی ہاں! میرا نام منیب ہے۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ قاسم اتنے سال بعد اس کی وہی روش دیکھ کر تاسف سے سر ہلانے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکا۔

''ریشم کیسی ہے؟ بچّے کتنے ہیں اُس کے؟'' قاسم نے بلاارادہ پوچھا۔

''باجی کا تو انتقال ہوگیا ہے۔ میں انہی سے ملنے تو آیا تھا۔'' اس نے ہاتھ لہرا کر ایک قبر کی طرف اشارہ کیا۔ قاسم حیرت وصدمے سے ساکت رہ گیا۔

''کیا ہوا تھا اُسے؟ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی یار؟'' وہ جذباتی ہوگیا۔

''بریسٹ کینسر ہوگیا تھا انہیں۔ علاج بھی کروایا لیکن جو اللہ کی مرضی۔'' منیب نے خالصتاً عورتوں کے سے انداز میں کہا۔ قاسم خون کے گھونٹ پیتے ہوئے اسے ایک ریستوران میں لے آیا۔

''تمہیں شاید یاد نہ ہو لیکن میرے ساتھ خاندانی مراسم ہوا کرتے تھے تم لوگوں کے۔'' اس نے رسان سے بات کا آغاز کیا۔ ''تمہاری امی کے پاس بھی اکثر آیا کرتا تھا میں۔ تم اس وقت اسکول میں تھے۔''

''جی ہاں! مجھے یاد ہے انکل۔ آپ انہیں ایک بار اسپتال بھی لے کر گئے تھے۔'' منیب مسکرایا۔ ''آپ باجی کی شادی کے بعد کہیں چلے گئے تھے شاید۔'' اس نے اپنی یادداشت کے مطابق جواب دیا۔

''شادی کے بعد خوش تو تھی وہ؟ جمال کا رویّہ کیسا تھا اس کے ساتھ؟ تمہارے ساتھ ٹھیک رہتا تھا وہ؟''

''جی ٹھیک تھے۔ بس کبھی کبھی لڑائی جھگڑا ہو جاتا تو موٹاپے اور عمر کے طعنے دیتے۔ ان کی بیٹی اقصیٰ نے باجی کو کبھی قبول نہیں کیا۔ وہ بہت تنگ کرتی تھی انہیں۔ مجھے جنانا کہہ کر چڑاتی۔ پارلر میں آنے والی عورتوں کو باجی کے اسٹیج ڈانس کا حوالہ دے دیا کرتی۔ اس وجہ سے ہم نے کرائے کے بڑے مکان بدلے۔ باجی کے شوہر اقصیٰ کی غلطی کو کبھی مانتے ہی نہیں تھے۔ بہت بدلحاظی کرتی تھی وہ باجی سے۔ عورتوں سے بھی بدتمیزی کرتی۔ اس وجہ سے گاہک کم آیا کرتے۔ اسی اقصیٰ کی وجہ سے زیادہ جھگڑے ہوتے تھے۔'' منیب نے ریشم کی زندگی کا خلاصہ بیان کر دیا۔

''علاج نہیں کروایا اس کا جمال نے؟''

''کروایا تھا۔ پارلر کا سامان اور ساری جمع پونجی ختم ہو گئی۔ علاج مہنگا ہی بڑا تھا جی۔'' وہ نظریں چرانے لگا۔ قاسم کو کچھ غلط ہونے کا احساس ہونے لگا۔

''کینسر کا علاج تو بڑا مہنگا ہوتا ہے۔ معمولی ریڑھی چلانے والا کوئی شخص سامان بیچ کر یا جمع پونجی لگا کر علاج نہیں کروا سکتا۔ مجھے بتاؤ کہ علاج کی رقم کہاں سے آئی تھی۔'' اس نے بڑی نرمی اور محبت سے منیب کو کریدا۔ وہ پہلے تو پس وپیش کرتا رہا لیکن پھر اس کے اصرار کی تاب نہ لا سکا۔ خوفزدہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے منیب نے جو انکشاف کیا، وہ قاسم کے قدموں تلے سے زمین نکال کر جمال کی بے حسی اور کمینگی ظاہر کرنے کے لیے کافی تھا۔

☆☆☆

جمال، منیب اور اقصیٰ ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔

ان کے چہروں پر طاری بے بسی، ملال اور تھکاوٹ سے واضح طور پر معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کسی طویل اور بے نتیجہ بحث کے بعد تھک ہار کر ہی خاموش ہوئے ہیں۔ ملال، بے بسی اور الجھن کے جذبات نے وجود مزید شکستہ کر رکھے تھے۔ ان سب میں ایک شخص ایسا بھی تھا جس کے چہرے پر ان سبھی کیفیات کے علاوہ ایک انوکھا سا خوف طاری تھا۔ وہ منیب تھا۔

''یہ سب مجھ سے نہیں ہوگا۔'' اس نے یہ جملہ کوئی بیسویں دفعہ ادا کیا تھا۔

''تو پھر کون کرے گا یہ بھی بتا دو۔'' جمال نے جھنجلا کر کہا۔ گزشتہ ایک گھنٹے سے اسے قائل کرنے کی کوشش میں ناکامی پر یہی کیفیات غالب آسکتی تھیں۔

''کیا کوئی اور رستہ نہیں نکل سکتا؟'' اس نے اضطراب سے ہاتھ مسلے۔

''تمہیں ایک بات سمجھ میں کیوں نہیں آرہی ہے؟ ہم میں سے کوئی اس قابل نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو تمہیں زحمت ہی کیوں دی جاتی؟''

''حالانکہ دیکھا جائے تو اس کام میں سب سے زیادہ فائدہ اسی کا ہے۔ بلکہ یہ کام تو اسے اپنا فرض سمجھ کر کرنا چاہیے۔ اور یہ اتنے نخرے دکھا رہا ہے۔'' وہاں پر موجود تیسرے فرد اقصیٰ نے طنز کیا۔ اس نے والد کو مکمل طور پر اپنے قابو میں کیا ہوا تھا۔ وہ اس کی ہر بات پر آنکھیں بند کیے یقین کرتا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ اگر تیری مرضی نہیں ہے تو ہم زبردستی تو نہیں کر سکتے۔'' جمال نے غصہ جتایا۔

''لیکن اگر کسی کو علم ہوگیا تو؟'' منیب نے سراسیمگی سے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''کسی کو کچھ پتا نہیں لگے گا۔ مجھ پر بھروسا رکھ۔'' اس کا غصہ ٹھنڈا ہونے لگا۔

''مم...... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

''ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ بڑا ہاتھ ایسے ہی مارا

جاتا ہے۔ ہماری سبھی مشکلوں کا حل تیرے اسی 'کام' میں ہے۔ مان جا! تیری مہربانی۔''
''کسی نے مجھے پہچان لیا تو؟'' اس بار وہ نیم رضامند نظر آیا۔
''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک دفعہ یہ کام ہو جائے تو پھر اس شہر میں رہے گا ہی کون؟ ہم کہیں اور ٹھکانا کر لیں گے۔ اللہ پاک کی زمین بہت بڑی ہے۔''
''ٹھیک ہے! میں تیار ہوں۔'' اس نے شکست تسلیم کر لی۔ اقصیٰ اور جمال کے چہرے کھل اٹھے۔
''بس ابھی ایک فون کرنے کی دیر ہے۔ سارے اریجنمنٹ ہو جائیں گے۔ یہ کام دو دن میں ہی ہو جانا چاہیے۔'' جمال کی خوشی دیدنی تھی۔ ہارے ہوئے کھلاڑی منیب نے افسردگی سے اس کی جانب دیکھا۔ اسے تو یہ توقع تھی کہ اس کے فیصلے پر منہ ماتھا چوم کر مشکور ہو جائے گا لیکن جمال کا ردعمل بہت مایوس کن تھا۔ اقصیٰ بھی بے نیازی سے اپنے موبائل فون میں مصروف تھی۔
منیب نے مایوسی سے ہونٹ بھینچے اور اپنے نئے 'کام' کے لیے خود کو ذہنی طور پر مزید تیار کرنے لگا۔ کام مشکل سہی لیکن اس کا 'انعام' بلاشبہ بہت سے مسائل حل کر سکتا تھا۔
''کیا کام تھا آخر وہ؟'' قاسم ہیجان زدہ ہوا۔
''وہ جی اصل میں باجی کے علاج پر جب سارا پیسہ خرچ ہو گیا تھا تو انہوں نے جمال پائی کو کسی سے قرضہ لینے کا کہا۔ لیکن لاکھوں میں قرضہ دینا کس نے تھا؟ پھر باجی نے کسی پروڈیوسر کا ایڈریس دیا۔ ہم اس کے پاس گئے۔ بڑی مشکل سے ملاقات ہوئی تھی جی۔ اس بندے نے ہمیں ایک آپشن دی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں باجی کا گیٹ اپ لے کر اسٹیج پر ڈانس کروں۔ وہ اعلان کروا دیتا کہ ماضی کی مشہور ڈانسر ریشم کی واپسی۔ میک اپ سے نقوش کی مردانگی ختم کرنے کی ذمے داری بھی اس نے اٹھائی تھی۔ مجھے تو صرف باجی کی طرح ڈانس کرنا تھا اور وہ میں بچپن سے ہی شیشے کے سامنے کھڑا کرتا رہتا تھا۔'' منیب نے سادگی سے بتایا۔
''تم ایک لڑکی کے روپ میں اسٹیج پر ڈانس کرنے کے لیے راضی ہو گئے؟ تمہاری عقل گھاس چرنے چلی گئی تھی کیا؟'' قاسم حیرت سے چلا اٹھا۔
''ایک جنانا اور کر بھی کیا سکتا تھا جی؟ مجھے بس اپنی باجی کی زندگی بچانی تھی۔'' منیب کی بات نے اسے دہلا کر رکھ دیا۔ قاسم کو اپنے سامنے بیٹھے اس لڑکے پر شدید ترس آیا۔ وہ اچھا خاصا 'ہینڈسم' لڑکا تھا۔ صرف انداز گفتگو نے اسے کیا سے کیا بنا رکھا تھا۔
''کتنا عرصہ کرتے رہے تھے یہ پروگرام تم؟''
''ایک ہفتے تک۔ پھر باجی مر گئی۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
''پیسے کتنے دیے اس پروڈیوسر نے؟'' قاسم کا مزاج بھی افسردہ ہونے لگا۔
''صرف پانچ ہزار۔ جمال پائی تو چکر کاٹ رہے ہیں اس کے پاس لیکن وہ ملتا ہی نہیں۔ سیکریٹری کہتا ہے کہ میں ان سے ایگری منٹ کر لوں مگر اب باجی ہی زندہ نہیں تو میں کس کے لیے پیسہ اکٹھا کروں؟''
''آہ ریشم! کتنا بڑا دھوکا کھا گئیں تم۔ کیا دیکھ کر شادی کی تھی جمال سے؟'' قاسم افسردہ تھا۔ اس نے کچھ دیر کے لیے خاموشی اختیار کر لی۔ اس کا ذہن نہایت تیزی سے چل رہا تھا۔ وہ جمال کی فطرت اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ اس نے بھی ریشم کی عمر کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ وہ کسی بھی طرح اسے اسٹیج کی دنیا میں دوبارہ بھیجنا چاہتا تھا لیکن شادی کے بعد اکثر خواتین کی طرح موٹاپے کا شکار ہو جانے والی ریشم سے اب رقص ممکن ہی نہ تھا۔ منیب کو بھی ساتھ لے جانے کا مقصد نیک ہرگز نہیں تھا۔ قاسم نے ذہنی جمع تفریق کی اور منیب کو رگڑنے کا فیصلہ کر لیا۔
''کس نے بنایا ہے تمہیں یہ جنانا؟ اللہ پاک نے تو ایسا نہیں بھیجا تھا نا؟ اس نے تو تمہیں اتنی زبردست شکل صورت عطا کر رکھی ہے۔ تم نے خود اپنے آپ کو یہ روپ دیا ہے۔''
''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جی! پہلے مجھے باجی اور امی منع کرتی تھیں۔ میں رو پیٹ کر انہیں کہتا کہ اللہ کرے میں ہی مر جاؤں۔ ہر کوئی مجھے ڈانٹتا ہے۔ میں انہیں یہ بھی دھمکی دیتا کہ میں باجی کی چوڑیاں پیس کر کھا لوں گا۔ ایک بار مرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ میں بھی کیا کرتا جی؟ اس طرح بات چیت کرنے سے سب وہاں مجھ سے خوش ہوتے تھے، ہنستے بھی تھے تو مجھے بھی یہ سب اچھا لگنے لگا۔''
''کیا تمہارا دل نہیں کرتا کہ تم بھی عام لڑکوں کی طرح زندگی گزارو۔ اس روپ سے باہر نکلو۔'' قاسم نے نرمی سے پوچھا۔
''کیوں نہیں کرتا جی؟ بالکل کرتا ہے۔ تنگ آ گیا ہوں اس زندگی سے، لوگوں کی نظروں، نفرت اور طعنوں سے۔ لیکن یہ سب مجھ سے نہیں ہوگا۔'' وہ افسردہ ہوا۔
''تم ہمت کرو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ آج سے مجھے

اپنے بڑے بھائی کی طرح سمجھ لو۔ میری بات مانو گے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔‘‘

’’میں آپ کی ہر بات مانوں گا جی۔‘‘

سب سے پہلے تو یہ وعدہ کرو کہ کچھ بھی ہو جائے تم اپنے اس اسٹیج ڈانس کی بات کسی اور سے کبھی نہیں کرو گے۔ مجھے اس پروڈیوسر کا نام پتا بھی بتاؤ۔ میں اس کے حلق سے پیسے نکلوا کر لاؤں گا۔ یہ پیسے تم گھر میں کسی کو بھی نہیں دو گے۔ سمجھے؟‘‘ قاسم نے سختی سے کہا۔

’’اوکے جی! میں ایسا ہی کروں گا۔‘‘ منیب نے نہایت شرافت سے ہامی بھر لی۔ قاسم نے اگلے ہی روز پراچہ نامی اس شخص سے بندوق کی نوک پر ٹھیک ٹھاک اصل سے بھی کہیں زیادہ رقم نکلوالی۔ قاسم کو ملنے والی سیاسی پشت پناہی نے اسے بہت مضبوط بنا رکھا تھا۔ اس نے فوری دوڑ دھوپ کر کے بینک اکاؤنٹ کھلوایا اور ساری رقم وہیں جمع کروادی۔ منیب بلاچون وچرا اس کی ہر بات تسلیم کر رہا تھا۔

قاسم نے جمال سے بھی ملاقات کی۔ اس نے اپنے آپ کو رشدہ کے کسی پرانے واقف کار اور مقامی سیاست داں کے خصوصی کارندہ کی حیثیت سے متعارف کروایا۔ قاسم کے تیور اور رسائی دیکھ کر جمال کی سٹی گم ہو گئی۔ قاسم کے اندازے کے عین مطابق وہ بے حس اور لالچی ہونے کے ساتھ بزدل اور منافق بھی تھا۔ ایسے کسی بھی شخص کو صرف جارح مزاجی سے ہی قابو کرنا ممکن ہوتا ہے۔ قاسم اسے یہ بھی باور کروانا چاہتا تھا کہ منیب بالکل ہی لاوارث نہیں ہے۔ پہلے پہل اس کے ذہن میں منیب کو ان دونوں سے علیحدہ کر دینے کا خیال بھی آیا تھا لیکن پھر یہ سوچ حاوی ہوتی گئی کہ ریشم کی زندگی میں کانٹے بچھانے والوں کے لیے اس سے بڑی سزا کیا ہو گی کہ وہ منیب کے زیر دست ہو جائیں۔ قاسم نے اوپری متوسط طبقے میں ایک چھوٹا سا مکان خرید کر منیب کے نام کر دیا۔ وہ کسی بھی قیمت پر اس کے قدم مضبوط کر دینا چاہتا تھا۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی قاسم نے منیب کو اپنے پاس طلب کر لیا۔

’’ہاں بھئی جوان! کیا حالات ہیں اب گھر کے؟‘‘

’’بالکل ہی تبدیل ہو گئے ہیں جی! جمال پائی کی زبان اب مجھے پُتر، پُتر کہتے نہیں سوکھتی۔ سیانے تو وہ خیر شروع سے ہی تھے اب کہنے لگے کہ نئے محلے میں یہ کیسے بتائیں کہ میں ان کا سگا رشتے دار نہیں ہوں۔ مرحومہ بیوی کے چھوٹے بھائی کے ساتھ جوان بیٹی کا رہنا ان کی عزت پر انگلیاں اٹھوا سکتا ہے۔ اس لیے وہاں سب کو یہی کہا ہے کہ میں ان کا سگا بیٹا ہوں۔‘‘ وہ تلخی سے ہنسا۔ قاسم کے ہونٹوں پر بھی معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

’’ابھی آگے آگے دیکھنا۔ تم بہت جلد اتنی ترقی حاصل کر لو گے کہ یہ لوگ تمہارے تلوے بھی چاٹیں گے۔‘‘

’’وہ کیسے جی؟‘‘ منیب حیران ہوا۔ قاسم نے ایک بوجھل سانس لی اور اپنے الفاظ مجتمع کرنے لگا۔

’’دیکھ شہزادے! انسان ہمت کرے تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ایک بات کیوں بھول جاتا ہے کہ تو پیدائشی طور پر ایسا نہیں تھا۔ تجھے حالات نے اس روپ میں ڈھالا تھا اور اب حالات ہی ایک نیا روپ بھی دیں گے۔‘‘ قاسم نے ٹھہرے ہوئے انداز میں اسے سمجھایا۔ منیب ناسمجھی اور الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

’’ایک بات بتا مجھے! اگر تمہیں ایک نئی زندگی ملے تو تم اسے کس طرح گزارنا چاہو گے؟‘‘ قاسم نے دوسرے زاویے سے سوال کیا۔ منیب یکدم کسی سوچ میں گم ہوا اور پھر کسی خواب کے عالم میں کہنے لگا۔

’’اگر مجھے ایک نئی زندگی ملتی یا یہی زندگی دوبارہ جینے کا موقع ملے تو میں ایک باعزت گھرانے میں پیدا ہوتا۔ ایک ایسا گھرانا جس کا سربراہ کوئی تعلیم یافتہ، غیرت مند مرد ہوتا۔ اسے اپنے خاندان کی پروا ہوتی۔ وہ دن رات محنت کر کے ان کے لیے کمائی کرتا۔ میری ماں ایک حساس، پڑھی لکھی اور عبادت گزار ہوتی۔ اس کی زندگی کا مقصد اور محور صرف اور صرف اولاد، اس کی زندگی اور خوشی ہوتی۔ وہ محفل کی شمع نہیں بلکہ گھر کا چراغ ہوتی۔ میں اس نئی زندگی میں اکلوتا ہوتا۔ والدین میرے ناز نخرے اٹھاتے۔ میں بھی ان کی قدر کیا کرتا۔ پڑھائی میں خوب محنت کرتا۔ والدین کو میری پڑھائی کی فکر ہوا کرتی۔ اگر میں کبھی دیر سے گھر آتا تو وہ فکرمندی سے پوچھا کرتے۔ ایگزامز کی ٹینشن لیا کرتے۔‘‘ وہ گفتگو کرتے کرتے خلاؤں میں تکتا رہا۔

’’ابھی مزید پڑھنا چاہو گے تم؟‘‘ قاسم نے پوچھا۔

’’چاہتا تو ہوں...... لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ ایسا ہونا مشکل ہے۔ اسکول میں بھی سب میرا مذاق اُڑاتے تھے۔ میں نے تنگ آکر اسکول چھوڑ دیا۔ باجی نے کسی طرح پرائیویٹ میٹرک کروا دیا تھا۔ کالج میں تو ماحول اور بھی مختلف ہوتا ہے۔ تماشا بن جاؤں گا میں۔‘‘ وہ خوفزدہ تھا۔

’’بالکل نہیں بنو گے۔ اس کا ایک سادہ سا علاج میں تمہیں بتاتا ہوں۔ تم کالج جاؤ گے لیکن اس روپ میں نہیں بلکہ ایک بہروپ میں۔ وہ کیا کہتے ہیں ریاضی میں؟ جو چیز

موجود نہ ہو فرض کر لی جاتی ہے۔ تم بھی فرض کر لینا کہ تم منیب نہیں کوئی بھی ایکس، وائی، زیڈ ہو۔ وہاں اپنا کوئی بھی نک نیم بتا دینا۔ والدین اور فیملی کے متعلق کوئی بھی جھوٹ بول دینا۔ وہاں سے کوئی چیک کرنے تو آئے گا نہیں۔ صرف چند گھنٹے کی اس اداکاری سے تمہاری زندگی رفتہ رفتہ مکمل بدل جائے گی۔"

"لیکن کالج کی فیس کون دے گا؟ میں نے آپ پر پہلے ہی بہت برڈن ڈال رکھا ہے۔ اب مزید بالکل نہیں۔" وہ ہچکچایا۔

"فکر نہ کرو! فیس تم خود ادا کرو گے۔ میں تمہیں جمال کے سہارے تو چھوڑوں گا نہیں۔ کسی کام کا بندوبست کروا دوں گا۔ ہاں ایک طریقہ ہے نا!" قاسم نے چٹکی بجائی۔ "میرے پاس ایک ایکسٹرا گاڑی موجود ہے۔ تم اسے آن لائن ٹیکسی بنالو۔"

یہ تجویز منیب کے دل کو لگی۔ تھوڑی سی پس و پیش کے بعد وہ راضی ہو گیا۔

"میں اپنے گھر میں کسی کو پڑھائی کے متعلق نہیں بتاؤں گا۔ اقصیٰ بہت کمینی فطرت کی لڑکی ہے۔ وہ میری نئی زندگی جینے کی اس کوشش کو کبھی قبول نہیں کرے گی۔ بہت ذلیل کرے گی مجھے۔ میں اپنی ہمت اور حوصلہ سے یہ نیا سفر بالکل اکیلا طے کروں گا۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ انسان اپنی جنگ خود اعتمادی اور ذاتی کوشش سے ہی جیت سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس نئے بہروپ میں ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔ میں ہر موڑ اور قدم پر تمہارے ساتھ ہوں۔ گھر والوں کو کما کر دکھاؤ گے تو وہ تم سے دبنے لگیں گے اور تمہیں بھی کسی سے ڈرنے یا پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بس اپنے بہروپ پر فوکس رکھنا۔" قاسم نے اسے حوصلہ دیا۔

اس روز کے بعد منیب نے حقیقتاً ایک نئی زندگی کا آغاز کر دیا۔ قاسم نے اس کی سہولت کے لیے ہر ممکن تعاون کیا۔ اس نے اپنی صوابدید پر منیب کو ڈرائیونگ سکھائی، لائسنس بنوایا۔ ڈرائیونگ کے دوران وہ 'رشی' بن جاتا۔ اس نے ایک نئے کردار کے لیے بول چال اور اطوار بڑی تیزی سے اپنائے۔ روپ بہروپ کا سلسلہ کامیابی سے جاری ہو گیا۔ اس کا کالج بیگ گاڑی کی ڈکی میں رہتا تھا۔ فرصت ملنے پر آرام سے کتابوں کا مطالعہ کر لیتا۔ یونیفارم کی تبدیلی بھی گاڑی میں ہی ہوتی۔ یونیفارم کی دھلائی اور استری قاسم اپنے گھر میں ہی کروا دیا کرتا۔ وہ اس کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کر رہا تھا۔ منیب کالج میں خود کو غیر نمایاں رکھنا چاہتا تھا اس لیے قاسم نے اسے ایک پرانی موٹر سائیکل بھی دے دی۔ کالج میں چند گھنٹے گزارنے کے بعد وہ بقیہ وقت محنت مشقت کرتا۔ زندگی ایک ہموار دھارے پر آ گئی تھی۔ قاسم اس کی کارکردگی سے بہت خوش اور مطمئن تھا۔ اس ہمواری میں تلاطم کا پہلا پتھر اس وقت آیا جب منیب دن بھر کے لیے غائب رہا۔ وہ کسی بھی فون یا میسج کا جواب بھی نہیں دے رہا تھا۔ قاسم کو اچھی طرح یاد تھا کہ وہ جمعہ کا روز تھا۔ رات کے وقت منیب اچانک ہی اس کے پاس چلا آیا۔ اس کی آنکھوں میں شدید وحشت، خوف اور چہرے پر بھونچال کی کیفیت تھی۔ وہ ابھی تک کالج یونیفارم میں ہی ملبوس تھا۔

"کدھر غائب تھا تو صبح سے؟ کتنے فون کیے تجھے میں نے؟"

"بھاگ رہا تھا۔" اس کی آواز بھینچی ہوئی تھی۔

"کس سے؟" قاسم کو اس کی حرکات سمجھ ہی نہیں آ رہی تھیں۔

"اپنے آپ سے۔" وہ تلخی سے ہنسا۔

"کیا ہوا ہے؟ سب خیریت تو ہے نا؟" قاسم کو کچھ غلط ہونے کا احساس ہونے لگا۔

"آج ایک بات ثابت ہو گئی ہے۔ ماضی کبھی نہیں مرتا۔ وہ کسی نہ کسی روپ میں ہمارا امتحان لینے پلٹ کر ضرور آتا ہے۔ ماضی کبھی مر ہی نہیں سکتا۔ بدنصیب ہمیشہ بدنصیب ہی رہتا ہے۔ سب جھوٹ ہے کہ وقت بدلتا ہے سب جھوٹی باتیں ہیں۔" وہ وحشت کے عالم میں کہتا چلا گیا۔

"یہ کیا انا پ شناپ بک رہا ہے؟ کیا ریشم کے حوالے سے پہچان لیا ہے کسی نے تجھے؟ مجھے بتا تو سہی کچھ۔" قاسم نے زور دیا۔ اس کے ذہن میں ماضی کے حوالے سے صرف ریشم کا ہی نام آیا تھا۔

"ہوں...... ہاں...... پہچان لیا ہے مجھے...... لیکن میں ہمت نہیں ہاروں گا...... میں یہ جنگ آخری سانس تک لڑوں گا۔" وہ ہانپنے لگا۔

"شاباش میرے شیر! ہمت نہیں ہارنی تو نے...... اس بہروپ کو کسی بھی قیمت پہ کامیاب کرنا ہے...... کسی بھی قیمت پر......" قاسم نے اسے حوصلہ دیا۔

"میں چلتا ہوں۔ کچھ دن گاڑی نکالنے کی روٹین خراب رہے گی۔ آپ دیکھ لینا معاملہ آگے۔"

"فکر نہ کر۔ سنبھال لوں گا میں۔" قاسم نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ اس نے منیب کے رویے کا

سوچ لگانے کا ارادہ کرلیا لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ اسے اپنے 'سیاسی آقا' کے ساتھ کچھ روز کے لیے دارالحکومت جانا پڑا۔ اس نے منیب کا یہ معاملہ واپسی تک مؤخر کر دیا لیکن یہاں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ وہ اس حادثے کا شکار ہو چکا ہے۔ قاسم نے اپنے تعلقات کی بنا پر فی الفور اسے نجی اسپتال میں منتقل کروا دیا۔

☆☆☆

قاسم کا کا کے انکشافات ایک دبیز خاموشی میں ڈھل گئے۔ علی مراد رانا بھی خود کو ابھی تک کسی مقناطیسی رو میں بہتا محسوس کر رہا تھا تاہم اس کے چہرے سے کسی بھی قسم کے تاثرات کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔

''دل تو چاہتا ہے کہ اپنے سروس ریوالور کی ساری گولیاں تیرے اس بھوسے بھرے دماغ میں اتار دوں۔ تجھے کس طرح یہ خیال آ گیا کہ اس 'پرسنالٹی ڈس آرڈر' بندے کو اس طرح کے مشورے راس آ جائیں گے؟ تو اسے سیدھی طرح کسی سائیکاٹرسٹ کے پاس کیوں نہیں لے گیا؟ وہ کیا جھک مارنے بیٹھے ہوئے ہیں؟ اتنا پیسا لگا دیا اس اونڈے پر لیکن جو کام سب سے پہلے کرنے والا تھا بس وہی نہیں کیا اور حالات یہاں تک پہنچ گئے۔'' وہ طیش میں تھا۔

''مجھ کو رانا جی معاف کرنا۔ غلطی مارے سے ہو گئی۔'' قاسم افسردگی سے بولا۔ ''لیکن میرا رب جانتا ہے کہ میری نیت غلط نہیں تھی۔''

''تو مان لے کاکے! مان لے کہ تجھے جمال پر بڑا 'ساڑ' تھا۔ تو اپنی پرانی معشوقی اور ہار کا بدلہ لینا چاہتا تھا اس سے۔ منیب کو اس کے سامنے کھڑا کر کے، گھر نام لگا کر، روزگار دلوا کر تجھے اور تیری انا کو تسکین مل رہی تھی۔ تو وہ سب کر رہا تھا جو کچھ سال پہلے ریشم کا گھر والا بن کر کرنا چاہتا تھا۔ تو اس وقت بھی منیب کی لائف کمانڈ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے سدھارنا چاہتا تھا۔ تیرے دماغ میں سائیکاٹرسٹ کا خیال کیوں نہ آیا اُلّو کے پٹھے!'' رانا نے صفائی سے اس کا تجزیہ کیا۔

''بس غلطی ہو گئی۔ پتا نہیں یہ خیال کیوں نہیں آیا مجھے؟'' قاسم نے ہاتھ مسلے۔

''تیری اس غلطی میں ایک زندگی یہاں پڑی سسک رہی ہے۔ تین لڑکے وہاں ہمیشہ کے لیے کسی پر بھی اعتبار کرنے کی طاقت سے محروم ہو گئے ہیں۔ وہ جانے کب تک اپنے والدین سے جھڑکیاں کھاتے رہیں گے۔ آج کے بعد وہ ہر ایک مددگار کو شک کی نظروں سے دیکھا کریں گے۔

خیر! مجھے اب یقین ہو گیا ہے کہ جمال اور اقصیٰ کا قتل بھی اسی نے رشی بن کر کیا ہے۔ میرے ذہن میں کچھ سوال اور اُلجھنیں ہیں۔ مجھے اس کی گاڑی کی چیکنگ کروا۔ مجھے اس کے بیگ کی تلاشی لینی ہے۔ اس کے بعد میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔'' علی مراد وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ قاسم نے اس کا مطالبہ پورا کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ وہ علی مراد رانا کے شیطانی دماغ سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسے علم تھا کہ اگر وہ کچھ دیر اور یہاں موجود رہا تو اس 'پہلو' کو بھی جان لے گا جو اس نے تا حال 'پوشیدہ' رکھا ہوا تھا۔

''گاڑی میرے گھر میں ہے رانا جی! میں ملازم کو فون کر دیتا ہوں۔ وہ آپ سے ہر طرح کا تعاون کرے گا۔'' قاسم نے اس کے سامنے ہی ملازم کا نمبر ملا دیا۔ علی مراد مزید کچھ کہے بغیر لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

قاسم کاکا کے ملازم نے رانا سے بھرپور تعاون کیا۔ گاڑی کی چابیاں تھما کر وہ اس کی خاطر مدارت کا اہتمام کرنے چل دیا۔ علی مراد گاڑی کا باریک بینی سے معائنہ کرتا رہا۔ اس کا مطلوبہ ہدف ڈکی سے ملا۔ کالج بیگ میں کامرس کی چند کتابوں کے علاوہ نیلی جلد والی ایک ڈائری، رنگت تبدیل کرنے والی چند کریمیں، بالوں کو عارضی سنہرا پن دینے اور پھر دوبارہ اصل رنگت میں لانے والے دو ہیئر اسپرے اور ناک، ہونٹوں کی ساخت تبدیل کر دینے والے مصنوعی ربر بھی موجود تھے۔ علی مراد کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے ڈائری نکال کر ڈکی بند کی اور گاڑی کی اگلی نشست پر بیٹھ کر ڈائری کا پہلا صفحہ کھول لیا۔

☆☆☆

7 مارچ 2018ء

''آج میں خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہا ہوں۔ دل کی بات کرنے کے لیے کوئی بھی تو پاس نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ کسی کے سامنے تو بوجھ ہلکا کروں۔ کوئی بھی میری نہیں سنتا۔ باجی کو دن رات یہی فکر رہتی ہے کہ پارلر کا کام ترقی کر لے لیکن بے چاری کی ہر کوشش ناکام ہو جاتی ہے۔ اقصیٰ کے لیے میں صرف 'جنانا' ہوں۔ پتا نہیں زندگی کب تک ایسے گزرے گی؟''

11 مئی 2018ء

''آج باجی کے پارلر میں ایک لڑکی آئی۔ اس نے جینز اور شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ بوائے کٹ بال تھے۔ آ بروز بنوانے تھے اسے۔ پارلر میں اس وقت دو عورتیں ا بھی تھیں۔ وہ لڑکی کو بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ اسے کہ لگیں بہت کیوٹ لگ رہی ہو تم۔ میں تو حیران رہ گیا۔ یہ کیا ڈبل اسٹینڈرڈ ہے۔ لڑکی اگر مردوں جیسا لباس پہنے، مرد جا حرکتیں کرے تو کیوٹ لگتی ہے۔ لڑکا اگر لڑکی جیسا انداز اپنائے تو 'جنانا' بنا دیا جاتا ہے۔ یہ منافقت کیوں؟''

12 نومبر 2018ء

''باجی کی طبیعت بہت خراب رہنے لگی ہے۔ لیکن اتنے پیسے ہی نہیں کہ ڈھنگ کی جگہ سے علاج ہو جائے۔''

18 جنوری 2019ء

''آج میرا پہلا اسٹیج شو تھا۔ جمال پائی کو ڈر تھا کہ میں کہیں نروس نہ ہو جاؤں۔ لیکن مجھے پتا تھا کہ میری پرفارمنس بہت اچھی ہو گی۔ بچپن سے ہی میں باجی کی طرح پریکٹس کی کرتا تھا۔ ڈانس کے بعد تماشائی پاگل ہو گئے تھے۔ جمال پائی کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میرا پہلا شو ہی اس قدر کامیاب رہے گا۔ ہے نا بے وقوف! ایک طوائف زاد ڈانس نہیں تو اور کیا کرے گا؟ ڈانس اور ایکٹنگ تو اس کے خون میں شامل ہوتی ہے۔ بے وقوف کہیں کا! ویسے بڑا سیا بنا پھرتا ہے۔''

25 جنوری 2019ء

''آج باجی نے مجھ سے وعدہ لیا کہ حالات جو بھی ہوں میں جمال پائی کے ساتھ ہی رہوں گا۔ باہر کی دنیا بڑی ظالم ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ اسے کہنا اصل میں یہ تھا کہ میں طبیعتاً ایک جنانا ہوں۔ بیرونی دنیا میں میرا کوئی رشتے دار یا جگہ نہیں۔ وہاں مجھے کوئی قبول نہیں کرے گا۔ جمال تو سالوں سے مجھے جانتا ہے۔ وہ میرا خیال کرے گا۔ بڑی بھولی ہے میری بہن۔ اسے ابھی تک اندازہ ہی نہیں ہوا کہ اس نے ہیرا سمجھ کر ایک کنکر کا انتخاب کیا تھا۔ ممکن ہے اندازہ ہو بھی گیا ہو لیکن انا بھی یہ بات تسلیم نہ کرنے دے۔ میں نے باجی سے وعدہ کر لیا کہ حالات چاہے جو بھی ہوں میں اسی خاندان کا حصہ بنا رہوں گا۔''

29 جنوری 2019ء

''باجی مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ آج دنیا سے میرا اکلوتا رشتہ بھی ختم ہو گیا۔ امی کی وفات پر میں اتنا سمجھدار نہیں تھا۔ دکھ تو تب بھی تھا لیکن اس وقت مجھے باجی نے سنبھال لیا تھا۔ باجی میں تو بچپن سے ہی میری جان بستی تھی۔ مجھے اس سے اپنی ماں جیسی گرمی اور خوشبو ملتی تھی۔ آج وہ گرمی موت کی

ڈک بن گئی۔ خوشبو ہواؤں میں بکھر گئی اور نرمی زمانے کی سختیوں میں بدل گئی۔ اب کوئی بھی تو میرا نہیں رہا۔"

18 فروری 2019ء

"آج مجھے قبرستان کے باہر ایک انکل ملے۔ مجھے یاد ہے وہ ہمارے گھر بھی آیا کرتے تھے۔ باجی کے بعد اس پر اعتبار کرنے کو دل کرتا ہے۔ مجھے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے نرمی اور محبت نظر آئی۔"

یکم مارچ 2019ء

"میری زندگی تبدیل ہوتی جارہی ہے۔ قاسم انکل میرے لیے واقعی ایک مسیحا بن کر آئے ہیں۔"

14 جولائی 2019ء

"میرا نام رشی ہے۔ میں اس شہر میں نیا آیا ہوں۔ پہلے ہم دوسرے شہر میں رہتے تھے۔ میرے والد سعودی عرب میں ملازمت کرتے ہیں۔ میری والدہ کا نام سدرہ ہے۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ ہمارا ننھیال ایبٹ آباد میں مقیم ہے۔ ددھیال کراچی میں ہے۔ میں نے حال ہی میں میٹرک پاس کیا ہے اور اب کالج میں ایڈمیشن لوں گا۔"

15 ستمبر 2019ء

"کالج میں فرسٹ ایئر کی کلاسز کا آغاز ہوگیا ہے۔ یہاں اکثر لڑکیاں مجھے ہینڈسم اور ڈیشنگ کہتی ہیں۔ مجھ سے دوستی کرنا چاہتی ہیں لیکن مجھے کسی سے راہ و رسم نہیں بڑھانی۔ سب لڑکیوں میں منال بہت مختلف ہے۔ اس نے پہلے دن سے میری بہت مدد کی۔ تھوڑی جذباتی ہے۔ غصہ بھی جلدی آجاتا ہے لیکن مجھے اچھی بھی بہت لگتی ہے۔"

13 اکتوبر 2019ء

"کالج کا ماحول بہت ایڈوانس ہے بھئی! کبھی کبھی لگتا ہے کہ میرا یہاں گزارہ نہیں ہوسکتا۔ خیر! اتنی بے فکری ضرور ہے کہ فیس اور داخلہ پر زیادہ پیسا نہیں لگا ہوا۔ انکل نے اس وقت ٹھیک ہی کہا تھا کہ ابھی صرف ٹرائل کے لیے داخلہ لے لو۔ اگر اداکاری میں کوئی جھول آگیا تو بغیر نقصان کے بغیر کسی دوسری جگہ شفٹ ہو جاؤں گا۔ آرٹس پڑھنے کے باوجود بورڈ میں داخلہ پرائیویٹ ہی ہے۔ اس کالج میں افیئرز اور ڈیٹنگ عام ہے لیکن مجھے تو پڑھائی کرنی ہے۔ رشی کو اپنی زندگی میں کوئی ناجائز نہیں کرنا۔"

یکم نومبر 2019ء

کالج کی کوآرڈی نیٹر آج کل مجھے اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کررہی ہے۔ مجھے اس عورت سے سخت چڑ ہے۔ کالج کا کوئی بھی شخص اس کی عزت نہیں کرتا۔"

7 نومبر 2019ء

"آج کا دن قیامت تھا۔ کالج پہنچا تو شازیہ نے کہا رشی ڈارلنگ! ذرا اپنا واٹس ایپ تو چیک کرنا۔ میں نے موبائل دیکھا تو وہاں میرے اسٹیج ڈانس کی ایک ویڈیو تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ویڈیو کیسے بنی ہوگی۔ یہ کام یقینی طور پر اقصیٰ کے ہوں گے۔ وہ تو یہ ضد بھی کررہی تھی کہ اسٹیج شو دیکھنے چلے گی لیکن اس کی ہر ضد ماننے والے باپ نے یہ بات ماننے سے انکار کردیا۔ اقصیٰ کی کمینی فطرت مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ اس نے اپنے کسی بوائے فرینڈ سے یہ کام کروایا ہوگا تاکہ بعد میں مجھے ذلیل و خوار کرتی رہے۔ پتا نہیں کیا سچ تھا کیا جھوٹ؟ لیکن شازیہ کے ہاتھ ویڈیو نہیں لگنی چاہیے تھی۔ وہ مجھے اپنا 'کیپ' بنا کر رکھنا چاہتی تھی۔ مار آیا ہوں میں اس حرامزادی کو۔ رشی کی زندگی میں جو بھی رکاوٹ ڈالے گا اسی انجام کو گلے لگائے گا۔"

8 نومبر 2019ء

"آج میں نے تین نئے دوست بنائے۔ انہیں مجھ پر بالکل شک نہیں ہوا۔ چند کریموں کے استعمال سے رنگ سانولا یا ایکسٹرا سفید کرنا، اسپرے سے بالوں کا رنگ تبدیل کرنا اور میک اپ سے ناک موٹی یا پتلی کرنا میں نے انٹرنیٹ سے سیکھا ہے۔ گھر میں پارلر ہونے سے بھی بہت کچھ سیکھا ہے۔ میری تیاری پوری تھی۔ نئے دوست بہت سوئٹ بچے ہیں۔ ان کے ساتھ وقت گزار کر مجھے اندازہ ہوا کہ اقصیٰ، جمال اور منیب کو لوگ کیسی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اقصیٰ کی شہرت بہت داغدار ہے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے منیب کو دیکھا۔ اقصیٰ کے سامنے منمناتے ہوئے عجیب احمق لگ رہا تھا۔ اسے اپنی حیثیت، عزت یا خودداری کا ذرا بھی احساس نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کو جینے کا کوئی حق نہیں ہونا چاہیے۔"

10 نومبر 2019ء

چڑی پہلوان، دولہا اور نانی بہت یاد آتے رہے۔ بہت معصوم لیکن ذہین بچے ہیں۔ ان کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کا ایک ادھورا خواب پورا کرلیا۔ بہت شوق ہوا کرتا تھا مجھے کہ میں بھی گلیاں اور بازار سجاؤں، پہاڑیاں بناؤں، چودہ اگست پر جھنڈیاں لگایا کروں۔ لیکن بازارِ حسن کی گلیاں ایسے موقعوں پر نہیں سجائی جاتیں۔ نئے محلے میں آکر بھی مجھے ایسا کرنے کا کوئی موقع نہ ملا۔ میں ایک طوائف زادہ تھا

اور جنانا بھی۔ جنانوں پر صرف ہنسا جاتا ہے، ان کا مذاق اُڑایا جاتا ہے، اُن کی پوری، پوری نقل کی جاتی ہے۔ان کے خواب بھلا تھوڑے ہی پورے کیے جاتے ہیں۔لیکن اب میرا وہ خواب بھی پورا ہوگیا۔ ارے ہاں! یاد آیا۔ آج میں نے اقصیٰ کو بھی شاندار موت دی ہے۔ جمال یہ زخم ساری زندگی نہیں بھولے گا۔"

اس صفحے پر پہنچ کر علی مراد رانا کی آنکھوں میں گہری چمک پیدا ہوگئی۔اس کا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ کیس کی گتھیاں اور اس کے ذہن کی سبھی اُلجھنیں سلجھ گئی تھیں۔

"صاحب جی! آپ اندر آجایئے۔ کاکا صاحب کو معلوم ہوگیا کہ میں نے آپ کو گاڑی میں ہی بیٹھے رہنے دیا تو وہ مجھ سے بہت ناراض ہوں گے۔ اندر آجایئے! چائے تیار ہے۔" ملازم نے تیسری دفعہ آکر منت سماجت کی۔علی مراد ڈائری لیے اس کی معیّت میں ڈرائنگ روم تک پہنچ گیا۔ اگلے صفحے پر اسی روز کی تاریخ درج کر کے لکھا تھا۔

"آج کا دن بہت بھیانک تھا۔ میں سارا دن رائیڈز میں مصروف رہا۔ واپسی پر گھر کے باہر مجمع لگا تھا۔ دروازہ لاکڈ تھا۔ کھلوانے پر اندر اقصیٰ کی لاش ملی۔ کمرے میں تیز مردانہ خوشبو تھی۔ میرا دماغ کھول رہا ہے۔ اقصیٰ ہمارے گھر کی بچی تھی۔ اس کا یہ حال جس نے بھی کیا ہے، وہ مجھ سے بچے گا نہیں۔"

12 نومبر 2019ء

"میں نے منیب کو بھی قتل کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس کے بعد جمال کو بھی ٹھکانے لگا دوں گا۔ رشی کی زندگی میں دخل دینے کا حق کسی کو بھی نہیں ہے۔ اگر وہ پروڈیوسر مل گیا تو اسے بھی ٹھکانے لگا دوں گا۔ میں ساری دنیا کو آگ لگانے کے لیے تیار ہوں۔ سب کچھ جل کر خاک ہو جائے گا۔"

علی مراد رانا نے گہری سانس لے کر ڈائری بند کر دی۔ صورتِ حال کافی حد تک واضح ہوگئی تھی۔ اس ڈائری کے مندرجات سے ایک بات تو واضح ہوگئی تھی کہ منیب بہت تنہا اور حساس تھا۔ عین ممکن تھا کہ قاسم کی جانب سے یہ راستہ دکھانے سے پہلے بھی اس کے ذہن میں نیا روپ اختیار کر کے زندگی جینے کا کوئی خیال موجود ہو۔ اس نے منیب سے رشی بننے کا سفر ناقابلِ یقین رفتار سے طے کیا تھا۔ اس کے باوجود ذہنی اُلجھنیں اور نفسیاتی گرہیں ختم یا کم نہیں ہوئی تھیں بلکہ ان میں شدید اضافہ ہوا تھا۔ وہ کبھی منیب کے روپ میں ڈائری لکھتا تھا تو کبھی رشی کے معمولات لکھ دیتا۔ کہیں کہیں تو ذہنی کشمکش کا یہ عالم تھا کہ اس نے ایک ہی تاریخ اور دن میں بیک وقت دونوں ہی کے روپ میں اپنی کیفیات درج کی تھیں۔ علی مراد رانا کا تجربہ واضح طور پر بتا رہا تھا کہ وہ زیادہ مضبوط قوتِ ارادی کا مالک نہیں تھا۔ اس کے دل میں اپنا زنانہ اندازِ گفتگو تبدیل کرنے کی خواہش تو لازم موجود ہو گی۔ رشی کے روپ میں اس کوشش کی عملی شکل بھی سامنے آئی تھی لیکن دوسری جانب وہ برسا برس سے پختہ ہو چکی اس عادت سے اتنا مغلوب تھا کہ کالج کے علاوہ دیگر اوقات میں اسے ترک کرنا بھی دشوار لگتا تھا۔ رانا کو یہ بھی یقین تھا کہ اس نے اپنی مشکلات، مسائل اور موجودہ تلخیوں سے فرار کے لیے جاگتی آنکھوں سے بھی رشی کی زندگی مجسم دیکھنی شروع کر دی ہو گی۔ جب وہ رشی ہوتا تھا تو اسے منیب مجسم چلتا پھرتا کسی نہ کسی سرگرمی میں مصروف نظر آتا۔ منیب کے روپ میں ہونے کی صورت میں وہ رشی کو مجسم چلتے پھرتے کسی نہ کسی صورت میں دیکھنے لگا تھا۔ قاسم کاکا نے اسے سائیکاٹرسٹ کو دکھانے کے بجائے ایک نئی راہ پر لگا کر ہی اس ساری 'تباہی' اور 'قتل و غارت' کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کیس میں اب کوئی بھی تجسّس یا حل طلب بات نہیں بچی تھی۔ بڑی سیدھی سادی سی کہانی تھی۔ رویّوں اور نفرتوں کا مارا ہوا ایک لڑکا نفسیاتی اُلجھنوں بلکہ امراض کا شکار ہو کر قاتل بن گیا تھا۔ اگر اس قتل و غارت کے بدلے میں وہ سزا پانے کے لائق تھا تو انصاف کا تقاضا یہ بھی تھا کہ اسے ان حالات تک پہنچانے والے ہر ایک شخص کو سزا ملے۔ علی مراد رانا نے چائے کا کپ خالی کیا اور ڈائری واپس بیگ میں رکھ کر ڈکی بند کر دی۔

"یہ چابیاں کاکا کو دے دینا اور کہنا بڑا ظلم کمایا تو نے اپنی معشوقی میں۔ بڑا ہی ظلم کمایا۔" اتنا کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

"مجھے کیا پاگل کتے نے کاٹا ہے جو صاحب جی کو یہ سب کہتا پھروں۔" ملازم نے سر جھٹک کر خود کلامی کی اور اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔

☆☆☆

اسپتال کے اس کمرے میں مشینوں کی مدھم سرسراہٹ کے سوا اور کوئی آواز نہ تھی۔ منیب سرتاپا پٹیوں میں لپٹا بستر پر لیٹا تھا۔ جسمانی چوٹوں کے درد کا اسے بالکل احساس نہیں تھا۔ بس ذہن میں جاری سوچوں کا سفر اسے بہت نڈھال کر دیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ قاسم کی بے چینی

اور اضطراب محسوس کر کے حیران تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے کسی کا نمبر ملا کے دھیمے لہجے میں گفتگو کی تھی۔ منیب کو گفتگو کے الفاظ تو سمجھ نہیں آئے تھے البتہ اتنا ضرور محسوس ہو گیا تھا کہ وہ غصے، بے یقینی اور پھر بے بسی کا شکار ہوا تھا۔

قاسم اس وقت سے ہاتھ کمر کی پشت پر باندھے ٹہل رہا تھا۔ چند لمحے مزید آگے سرکے تو منیب کو دروازہ کھلنے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک جانی پہچانی سی خوشبو فضا میں پھیل گئی۔ منیب سخت بے چین ہونے لگا۔ وہ اس خوشبو کو پہچانتا تھا۔ یہ اکثر رائل کالج کے کلاس روم میں اس سے ٹکراتی تھی۔ یہی وہ خوشبو تھی جو نہر کے کنارے بھی اس سے الجھی تھی۔ یہ وہی مہک تھی جس نے پیشتر کے اس خوابناک رومانوی ماحول میں اسے ہوش وحواس سے بے گانہ کر دیا تھا۔ وہ اس مہک سے اس قدر دیوانہ ہوا تھا کہ گھر آنے کے بعد بھی کئی گھنٹوں تک اپنے گرد اسے ہی چکراتا محسوس کرتا رہا۔ وہ مناہل تھی جو یقینی طور پر اسی سے ملنے آئی تھی۔ آہ! اس نے منیب کی غلطی معاف کر دی تھی۔ وہ اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ اسی لیے تو یہاں چلی آئی تھی۔ منیب کے وجود میں ایک طاقتور رد پیدا ہوئی۔ وہ اپنے بستر سے اٹھنا چاہتا تھا۔ آگے بڑھ کر مناہل کے قدموں سے لپٹ کر اسے اپنی محبت اور وفا کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ اسی کی خواہش اور حدود تک رومانس کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے یہ بھی بتانا چاہتا تھا کہ وہی اس کی زندگی میں آنے والی واحد لڑکی تھی۔ منیب کی روح میں اس کی شدید طلب تھی۔

"کیوں بلوایا ہے آپ نے مجھے یہاں؟ میں آپ کو کن الفاظ میں سمجھاؤں کہ مجھے اب اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔"

منیب کی سماعت نے جانے کتنی مدت بعد وہ آواز سنی تھی لیکن الفاظ...... مناہل کے الفاظ اتنے تند تو نہیں ہوا کرتے تھے۔

"میں نے تمہیں اس کا حال دکھانے کے لیے بلوایا ہے۔ دیکھو اسے...... کیا یہ ایسا تھا کبھی؟" قاسم نے متانت سے کہا۔

"دیکھ لیا ہے۔ اب جاؤں میں؟" وہ رکھائی سے بولی۔

"ایک جیتا جاگتا، ہنستا کھیلتا وجود اس طرح نیم مردہ بن کے بستر پر پڑ گیا ہے۔ تو چاہے تو یہ ٹھیک بھی ہو سکتا ہے۔" قاسم اب بھی ضبط سے بولا۔

"ایکسکیوزمی خالو جی! یہ نہ تو کبھی جیتا جاگتا تھا اور نہ ہی ہنستا کھیلتا۔ ایک نہایت بور، ڈل اور اپنے آپ میں مگن رہنے والا شخص جیتا جاگتا نہیں ہوا کرتا۔ اس سے فرینڈشپ کرنے کے لیے مجھے اپنی سیلف ریسپیکٹ کئی دفعہ ہرٹ کرنی پڑی۔ آپ نے ہی مجھ پر دباؤ ڈال رکھا تھا کہ میرے دوست کا بیٹا ہے، بچپن سے ہی اکیلا ہے، اس کا خیال رکھنا۔ اس سے فرینڈشپ کر لینا۔ یہ میرے لیول کا تھا ہی کب؟ ہاں ایک پلس پوائنٹ ضرور تھا اس کے پاس۔ ہینڈسم اور چارمنگ لکس میں اس جیسا پورے کالج میں کوئی نہ تھا۔"

"لیکن تم ہی تو کہتی تھیں کہ رشی کی عادتیں بہت اچھی ہیں۔ وہ کافی مختلف لڑکا ہے۔" قاسم نے دوسرے زاویے سے بات کی۔

"ایسا ہی تھا۔ ساری کلاس اور ٹیچرز ہی اسے مختلف کہتے تھے۔ ہمارے کلاس فیلوز بھی اس تعلق سے جیلس ہونے لگے تھے۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا لیکن پھر یہ میرے دل سے اتر گیا۔ انسلٹ کی ہے اس نے میری۔ یہ شخص ٹھیک ہو بھی جائے تو میرے کسی کام کا نہیں۔ یہ پیار، محبت، جذبات اور دوستی کی حقیقت کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔"

مناہل کے الفاظ و انداز پر اذیت کی ایک تیز لہر منیب کے وجود میں سرایت کر گئی۔ چکراتے دماغ میں ان نئے انکشافات سے مزید تاریکی سی پھیلنے لگی۔ قاسم نے اسے رائل کالج میں داخلے کی تجویز بلاوجہ نہیں دی تھی۔ وہ منیب کو اس کائنات کے بظاہر نرم و نازک لیکن درحقیقت مضبوط ترین وجود کی قوت سے مستقل تبدیلی کی طرف لے جانا چاہتا تھا۔ بلاشبہ مناہل کا ساتھ ملنے سے منیب میں قوت مدافعت پہلے سے کئی گنا زیادہ بڑھی تھی لیکن یہ رشتہ ایسے ہی کسی مقام پر بے نقاب ہونا تھا کیونکہ اس کی بنیاد سچائی اور خلوص نہیں بلکہ ہمدردی، فریب اور جھوٹ تھا۔ منیب کا اعتماد پل بھر میں ہی چکنا چور ہو گیا۔ اس لمحہ اسے یقین ہو گیا کہ کائنات میں کوئی بھی روپ خالص نہیں ہے۔ ہر ایک کے باطن میں دھوکا، فریب اور منافقت ہی بستی ہے۔ سچائی تو محض خدا اور بندے کے تعلق کے بعد ماں اور اولاد کے رشتے میں تھی۔ اس کی سماعت میں مناہل کی ہٹ دھرم اور قاسم کی تحمل سے کچھ سمجھاتی ہوئی آوازیں پہنچ رہی تھیں لیکن اب اسے ان سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کا دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ جسم کے مانند اس کی سماعت اور ذہن بھی ہمیشہ کے لیے مفلوج ہو جائے۔ جینے کی تمنا اب کسے تھی؟

☆☆☆

منیب کو بستر نشین ہوئے تین ہفتے کا عرصہ بیت چکا تھا۔ اس کی حالت ہر گزرتے دن کے ساتھ تنزلی کی جانب گامزن تھی۔ ڈاکٹرز کی کوششیں بلا تکان جاری تھیں۔ اس اَن تھک کام میں بھی بنیادی طور پر اسپتال کو ملنے والی رقوم کا ہی عمل دخل تھا۔

قاسم آج کل اپنی نجی مصروفیات میں بُری طرح اُلجھا ہوا تھا۔ وہ دن میں ایک ہی بار اس سے ملنے آپاتا تھا۔ اس شام بھی وہ اپنے سیاسی آقا کے معاملات بھگتا کر اسپتال پہنچا تھا کہ ریسیپشن پر کھڑے شخص نے اسے مخاطب کرتے ہوئے روک لیا۔

''سر! یہ خاتون کل سے دو بار یہاں چکر لگا چکی ہیں۔ کہتی ہیں کہ انہیں منیب صاحب سے ملنا ہے، ان کی عیادت کرنی ہے۔ آپ کی اجازت نہیں تھی اس لیے میں نے انہیں مریض کے پاس نہیں بھیجا۔''

''ہمم! اچھا کیا! میں خود ہی بات کر لیتا ہوں ان سے۔'' قاسم نے بے نیازی سے کہا اور بڑی سی چادر میں لپٹی اس عورت کی جانب مڑتے ہوئے بولا۔

''ہاں بی بی! کون ہو تم؟''

''میرا نام زیتون ہے جی! میں منیب پُتر سے ملنا چاہتی ہوں ایک بار۔''

''تمہیں کس نے بتایا کہ وہ اس اسپتال میں ہے؟'' قاسم نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا۔

''پولیس اسٹیشن گئی تھی جی اس کے ایکسیڈنٹ کا سن کر۔ وہیں ایک افسر نے ترس کھا کر بتا دیا کہ وہ یہاں ملے گا۔'' وہ بات کرتے ہوئے سراسیمگی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی تھی۔

''تم پولیس اسٹیشن تک چلی گئی تھیں؟'' قاسم حیران ہوا۔

''ہاں جی! یہ کم بخت محبت بڑا بڑا کچھ کروا لیا کرتی ہے۔ میں تو بس پولیس اسٹیشن تک ہی گئی تھی۔'' زیتون کی اس بات نے بھی قاسم کو چونکا دیا۔ وہ اس کی جانب بغور دیکھنے لگا۔ چادر کی اوٹ سے صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ گہری، پُرسوچ اور کسی اندرونی کرب کی آئینہ دار۔ قاسم کو اس عورت سے یک لخت ہی بہت اپنائیت محسوس ہوئی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ زیتون بھی اسی کی ہم قبیلہ ہے۔ قاسم نے اسے منیب سے ملوانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اسے لیے اسپیشل وارڈ کی طرف چل دیا۔

''ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں جی اس کے بارے؟ ٹھیک تو ہو جائے گا نا؟'' زیتون نے چلتے چلتے پوچھا۔

''ڈاکٹرز بالکل مایوس ہو چکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ منیب رسپانس ہی نہیں دے رہا۔ وہ اپنی قوتِ ارادی سے محروم ہو چکا ہے۔ یہی حال رہا تو زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ ہفتہ۔'' قاسم نے افسردگی سے بتایا۔ زیتون کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے۔ اسی اثناء میں وہ وارڈ میں پہنچ گئے۔ زیتون بوجھل قدموں سے چلتی منیب کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

''کیسا ہے میرا چن پُتر؟ یہ چند ہی دنوں میں کیسا آسیب کھا گیا ہے تمہارے ہنستے بستے گھر کو؟'' اس کا لہجہ رُندھ گیا۔ منیب یہ آواز سن کر بے چین ہونے لگا۔ کچھ دیر ذہن پر زور دینے سے اس آواز سے جڑی سبھی یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔

''تم کیسے جانتی ہو اسے؟ کوئی رشتے داری وغیرہ ہے؟'' قاسم نے چھوٹا سا فریج کھول کر جوس کا ایک ڈبا نکالا۔

''رشتے داری تو بنتے بنتے رہ گئی۔ برباد کر دیا اس محبت نے مجھے۔ منزل ملی نہیں اور گھر بھی خراب کر بیٹھی۔'' زیتون نے گول مول جواب دیا۔ قاسم کا دل یکدم گداز ہوا۔ اس کا اندازہ صحیح ثابت ہوا تھا۔ زیتون اسی کی ہم قبیلہ تھی۔

''یہ محبت ایسے ہی دغاباز ہوتی ہے۔ ایسے مقام پر لا کر مارتی ہے کہ انسان کہیں کا بھی نہیں رہتا۔'' وہ تلخی سے ہنسا۔ منیب کی آنکھوں میں بھی پُتلیاں تیزی سے گردش کرنے لگیں۔ کیا حسنِ اتفاق تھا کہ اس چھوٹے سے کمرے میں تین محبت گزیدہ جمع ہو گئے تھے۔

''میں تجھ سے معافی مانگنے آئی ہوں منیب پُتر! جانے انجانے میں تیرا ذکر سن کر دل ہی دل میں بڑا ہنسا کرتی تھی۔ اس وقت محبت میری مٹھی میں تھی تو ایسا لگتا تھا کہ مجھ سے زیادہ خوش نصیب اور طاقتور کوئی نہیں لیکن جب تقدیر نے مجھے آسمان سے زمین پر پٹخا تو اندازہ ہوا کہ میں موم کے پنکھ لگائے سورج تک پرواز کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اب میری سزا یہی ہے کہ ہر روز ڈاکٹر کے بتائے گئے کسی دوا کے نسخے کی طرح صبح، دوپہر، شام اپنے شوہر کے ہاتھوں ذلیل ہوتی رہا کروں۔'' اس کی تڑپ شدید تھی۔

''دیکھو! اگر تمہیں میری کسی بھی مدد کی ضرورت ہو تو.....'' قاسم کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی زیتون نے

کلامی کرتے ہوئے کہا۔

''نہ باؤ جی نہ! بھگتنے دیں مجھے یہ سزا۔ میرا جرم ہی بڑا تھا۔''

''صحیح کہہ رہی ہو تم۔ یہ محبت بہت بڑی سزائیں دیا کرتی ہے۔ کبھی کبھی تو نسلوں تک چلتی ہیں یہ سزائیں۔'' قاسم نے نم آنکھوں سے منیب کی طرف دیکھا۔ علی مراد رانا کی باتیں اس کے دل پر منوں بوجھ بنی ہوئی تھیں۔ اسی لیے تو زیتون کا مکمل تعارف لیے بغیر ایسی گفت وشنید کرنے لگا تھا۔

''ہاں جی! نسلوں تک ہی چلتی ہیں۔'' زیتون کے ذہن میں اپنی نو سالہ بیٹی کا سراپا ابھرا۔ اس کی بدقسمتی ان دنوں عروج پر تھی۔ بچی نے اسے نیند کی گولیاں چائے میں ملا کر باپ کو پلاتے دیکھ لیا تھا۔ بلال نے بھی اپنے طریقے سے اس کے ذہن میں ایسا زہر بھرا کہ وہ ماں کے سامنے تن گئی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر زیتون نے اس کے باپ سے علیحدگی کی کوشش کی تو وہ خود عدالت میں اپنے گھر قلفیوں والے انکل کی آمدورفت کا بتادے گی۔ زیتون حیران تھی کہ اس کی احتیاط کے باوجود جمال کی آمد پوشیدہ کیوں نہ رہ پائی۔ بلال بھی اپنے 'رقیب' کی شناخت سے اس کے قتل سے کچھ دیر پہلے بیٹی ہی کی زبانی واقف ہوا تھا۔

''پتا نہیں ایسا کیوں کرتی ہے یہ محبت؟'' قاسم کے دل میں ریشم کی کسی یاد نے چٹکی لی۔

''پتا نہیں! اگر پتا لگ جائے تو ہر دکھ ہی ختم نہ ہو جائے۔''

''موت بھی تو نہیں آتی اس کم بخت کو۔'' قاسم نے جھنجلا کر کہا۔

''یہ ساری خدائی مار کر ہی مرے گی۔'' زیتون کی اذیت بھی دو چند ہوئی۔ ان کی یہ خود کلامیاں سنتے منیب کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے پھسلے اور کنپٹیوں سے رینگ کر سرہانے میں جذب ہو گئے۔

''باؤ جی! مجھے ایک بات بتانی تو یاد ہی نہیں رہی۔ جس افسر نے مجھے یہاں کا پتا بتایا تھا ناں۔ اس نے آپ کے لیے ایک سندیسہ بھیجا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ کاکے سے کہنا بڑا ہی ظلم کمایا تو نے اپنی معشوقی میں۔ بڑا ہی ظلم کمایا۔ وہ ایسا کیوں کہہ رہا تھا باؤ جی؟'' زیتون نے اُلجھ کر پوچھا۔ قاسم کے ضبط کا ہر بندھن ٹوٹ گیا۔ وہ اپنی نشست پر بیٹھا بلکتے ہوئے رونے لگا۔ اس نے اپنے بال مٹھیوں میں بھینچ لیے تھے۔

''میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ یہ سب ہو جائے گا؟ میں تو جیون جوگے کو زندگی کی طرف لانا چاہتا تھا۔ اسے 'جینا' سکھانا چاہتا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ یہ سب ہو جائے گا۔ مجھے کیا پتا تھا؟'' بار بار ایک ہی فقرے کی گردان کرنے لگا۔ اس کی تڑپ دیکھ کر زیتون کے سبھی زخم... ہرے ہو گئے۔ وہ بھی اپنا ضبط کھو بیٹھی۔

''کاش! میں نے خود پر قابو پا لیا ہوتا۔ اس کم بخت محبت کے سامنے گھٹنے نہ ٹیکتی تو آج عزت سے زندگی بسر کر رہی ہوتی۔'' وہ بھی اپنا چہرہ پیٹنے لگی۔ ''مجھے کیا پتا تھا کہ یہ سب ہو جائے گا؟ مجھے بھی کیا پتا تھا؟''

ان دونوں کی یہ آہ وزاری سنتے منیب کے آنسو بھی تیزی سے بہنے لگے۔ اس کا دل کسی نے بہت بُری طرح مٹھی میں بھینچا تھا۔

وارڈ کی پچھلی جانب کھڑکی پر دسمبر کی کہر آلود شام اوس کی صورت میں اپنے نشان چھوڑتی رہی۔ 'محبت' کے کہنہ سال، شکستہ اور خمیدہ وجود نے ایک نظر اپنے جلو میں موجود اپنے ہی ایک 'آپ ڈیٹڈ' تروتازہ، بے نیاز اور بے پروا ہم جولی 'رومانس' کو دیکھا اور دوسری نظر سے ان آبلہ پا مسافروں کو دیکھ کر خاموشی سے سر جھکا دیا۔ اس نئے دور کی نئی 'چاہتوں' سے دیمک خوردہ اس وجود کے پاس ان کے سوالوں کا کوئی جواب اور آہ وزاری کا کوئی تریاق نہ تھا۔

☆☆☆

فضا میں ہر سُو نور اور تقدس بکھرا تھا۔

ماحول کی خوشگواریت کا یہ عالم تھا کہ مزاج میں سرشاری اور طمانیت خودکار انداز میں پیدا ہونے لگتی۔ رشی نے گہری سانس بھرتے ہوئے یہ فرحت اپنی روح میں جذب کی اور نظریں سامنے دکھائی دیتے پُرہیبت، پُروقار اور دل گداز کر دینے والے خانہ کعبہ پر جما دیں۔

وہ دو روز قبل ہی سدرہ کے ساتھ اس خوبصورت ترین شہر میں آیا تھا۔ عمرے کی سعادت ملنے سے زیادہ خوشی بے بہا تھی۔ وہ جی بھر کر اس مقدس نظارے کو نہار رہا تھا۔ اطمینان بخش بات یہ تھی کہ اس نے یہاں آمد کے ساتھ ہی والد کو اپنے فیصلے کے متعلق اعتماد میں لے لیا تھا۔ ان کا ردِعمل حسب توقع تھا لیکن رشی نے بھی ہمت ہار کر نہ دی۔ اپنی پڑھائی اس ملک میں جاری رکھنے کا بھرپور یقین دلایا۔ نتیجتاً انہیں قائل ہونا ہی پڑا۔

خانۂ خدا میں دن بھر بسر کرنے کے بعد وہ نماز عشا کے بعد سدرہ کے ساتھ ہوٹل کے کمرے میں پہنچ گیا۔ والد چونکہ چند دیگر غریب الوطن افراد کے ساتھ ایک کرائے کے کمرے میں رہتے تھے اس لیے ان کے ساتھ رہائش رکھنا

ممکن نہ تھا۔ وہ سونے کے لیے اپنے پرانے ٹھکانے کو ہی ترجیح دیا کرتے۔ اس روز سدرہ تھکاوٹ کے باعث جلد سو گئیں۔ رشی نے وقت گزاری کے لیے اپنا فیس بک اکاؤنٹ کھول لیا۔ وہ دوستوں سے اسی پلیٹ فارم کے توسط رابطے میں تھا۔ سعودی عرب آمد کے بعد حرم شریف میں گزارے گئے لمحات کی تصاویر بھی پوسٹ کر رکھی تھیں۔ دوستوں کے توصیفی کلمات کے جواب دیتے میسجز پر مناہل کی جانب سے ویڈیو کال کا اشارہ موصول ہونے لگا۔ رشی نے مسکراتے ہوئے سبز بٹن دبا دیا۔

''کیسے ہو مائی لو؟'' وہ بڑے جذب سے بولی۔ یہاں آنے سے قبل ایک بھرپور ملاقات کے بعد ان کی باہمی غلط فہمیاں مکمل طور پر ختم ہو چکی تھیں اور اب تو یک جائی کا یہ عالم تھا کہ دن بھر میں اکثر ہی کسی نہ کسی طرح ویڈیو لنک کے ذریعے رابطے میں رہتے تھے۔

''تمہارے بغیر کیسا ہو سکتا ہوں سوئٹ ہارٹ؟ ہر ایک پل تمہیں مس کر رہا ہوں۔'' وہ بے چینی سے بولا۔

''ہمم...... ابھی تو صرف دو ہی روز ہوئے ہیں اور تمہیں تو وہاں......'' مناہل نے دانستہ طور پر بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس کا اشارہ واضح طور پر یہاں مستقل منتقلی کی طرف تھا۔ رشی نے اسے کسی بھی اندھیرے میں نہیں رکھا تھا۔

''اس بارے میں کوئی بحث نہیں مناہل! میں نے جو فیصلہ کر لیا ہے، اس پر ہر حال میں عمل کرنا ہے۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولا۔

''میں ہر فیصلے میں تمہارے ساتھ ہوں رشی! ہمارا رشتہ کوئی کمزور تھوڑی ہے جو ان فاصلوں کے زہر سے کھوکھلا ہو جائے گا۔ ہم ساتھ ہیں اور آخری سانس تک ساتھ ہی رہیں گے۔'' وہ حیرت انگیز طور پر رشی کی تابعدار ہو چکی تھی۔ اس قدر ٹوٹ کر چاہنے لگی تھی کہ رشی ہواؤں میں اڑنے لگتا۔

''اچھا! ایک وعدہ تو کرو رشی!'' وہ یکدم بولی۔

''وہ کیا بھلا؟'' رشی نے انگلیوں کی پوروں سے اس کے نقوش چھونے کی خواہش پر بمشکل ضبط کیا۔

''تم مجھے ہنی مون کے لیے یہیں لاؤ گے۔ بولو وعدہ؟''

''اللہ کا پکا وعدہ سوئٹ ہارٹ!'' وہ مناہل کی اس ادا پر فریفتہ ہونے لگا۔ وعدے کے یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے ایک معصوم اور زندگی کی شوخیوں سے گندھا اپنا 'چڑی پہلوان' یاد آ گیا تھا۔ اس کے دل میں ہوک سی اٹھی اور پل بھر میں ہی ان سے رابطے کی تجدید کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''لو یو رشی! مجھے پتا تھا تم کبھی انکار نہیں کرو گے۔''

''لو یو ٹو! تمہیں کسی بھی بات سے انکار کر ہی نہیں سکتا۔'' رشی نے والہانہ انداز میں کہا۔ مناہل کی مسکراہٹ دیدنی تھی۔ رات قطرہ قطرہ بھیگتی رہی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو حال دل سناتے مستقبل کے لیے ڈھیروں وعدوں کا شیش محل تعمیر کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد رشی کی سماعت میں ایک عجیب آواز گونجنے لگی۔ وہ لاؤڈ اسپیکر پر کسی اعلان کے مشابہ تھی۔ رشی الجھ گیا۔ اذان کا تو ابھی وقت ہی نہ ہوا تھا۔ اس نے الفاظ پر غور کیا اور حیران ہو گیا۔ یہ اسی کے نام کی پکار تھی۔ اسے کہیں طلب کیا جا رہا تھا۔ وقت مکمل ہونے کی ندا دی جا رہی تھی۔ رشی کے وجود میں ایک اینٹھن سی ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی سردی کا احساس ہونے لگا۔

''یہ مجھے کہاں بلوایا جا رہا ہے؟ ابھی تو میں نے مناہل سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ ابھی تو اپنے دولھے' چڑی پہلوان اور نانی سے تجدید تعلق کرنا تھا۔ مجھے کہاں جانا ہے بھلا؟'' سرد وجود میں ابھرتی سوچیں بہت ہولناک تھیں۔

''مناہل...... دولھے...... چڑی...... نانی...... مجھے ملنا ہے تم لوگوں سے۔ میں تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں ایک بار...... کرکٹ کھیلیں گے یارا!'' وہ دایاں ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے بولا۔ اس ہاتھ کی پشت میں ایک عجیب سی چبھن کا احساس بھی تھا۔ شاید وہ کوئی سوئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اب دبیز دھند تھی...... سفید...... خوشبودار...... مسحور کن...... اس دھند کے عقب میں چند شناسا چہرے بھی تھے۔ امی جی، رشدہ باجی۔ یہ دونوں چہرے گڈ مڈ ہو کر سدرہ کا روپ دھار لیتے۔

''اچھا ہوا یہ مجھے مل گئیں۔ مناہل کے گھر رشتہ لینے جائیں گے۔ دوستوں سے بھی ملواؤں گا۔'' سوچیں بکھرتی ہی جا رہی تھیں۔ ''نانی! میں تجھے اب کسی کا مذاق بننے نہیں دوں گا۔ میں تجھے بتاؤں گا کہ روپ اور بہروپ کا سلسلہ کس طرح قائم رکھنا ہے۔ چڑی پہلوان! اب ہم دونوں مل کر سب محلہ والوں کی پیروڈی کیا کریں گے۔ دولھے یار! ہم ایک ہی کالج میں ایڈمیشن لے لیں گے۔ ٹھیک ہے نا! مناہل! میں تم سے بھرپور رومانس کروں گا۔ بس مجھ سے ناراض نہ ہونا اب کبھی۔''

وجود بری طرح اینٹھ کر بل کھا رہا تھا۔ سردی شدید تر ہونے لگی۔ دھند آنکھوں کے پار اب دماغ میں بھی اتر آئی تھی۔ اب کہیں کوئی منظر نہ تھا...... اب کہیں کوئی آواز اور احساس نہ تھا۔



صلۂ محبت

طاہر جاوید مغل

دل کتنا ہی آباد ہو... مگر دید کے بغیر اسے قرار نہیں... دور ہو جانے کے بعد دھیان و خیال میں بسے ایسے ہی کردار کی ناداری... اس کی زندگی مختلف سمتوں میں بکھری تھی... کبھی شہروں کی خاک اور کبھی پابندِ سلاسل کی صعوبتیں... مجرم نہ ہوتے ہوئے اس کی سزا میں کمی نہ ہورہی تھی... عشق و عاشقی کے رشتے میں برباد ہونے والوں کا قصۂ فریب جاں...

للکار کے کرداروں کا دوام......کوچۂ جاناں میں دل فگاروں کا انتقام......

سردی جوبن پر تھی مگر آج کل دھوپ نکل رہی تھی اس لیے موسم بڑا خوشگوار تھا۔ جب یخ بستہ ہوا اور چمکیلی دھوپ کا ملاپ ہوتا ہے تو ایک عجیب سا پُرلطف لمس، ہر ذی نفس محسوس کرتا ہے۔ میں اندرونِ شہر، عمران کے کرائے کے گھر میں موجود تھا۔ ہم چھت پر بیٹھے تھے اور دودھ جلیبی کھارہے تھے۔ یہ دعوت شیراز عمران یعنی عمران جونیئر کی طرف سے تھی۔ اس نے کہا تھا کہ آج اس کی والدہ کی سالگرہ ہے۔ عمران نے اب تک جو معلومات مجھے دی تھیں، ان کے

مطابق وہ انڈیا کے شہر جھانسی میں رہتی تھیں۔ عمران دانش کی وصیت کے مطابق انہوں نے چند سال بعد شادی کر لی تھی۔ ایک شریف النفس ڈاکٹر، عمران کا سوتیلا باپ تھا۔ ان کی اولاد نہیں تھی مگر وہ خوشگوار زندگی گزار رہے تھے۔

عمران دودھ جلیبی کے فوائد بیان کر رہا تھا اور بتا رہا تھا کہ دودھ میں جلیبی ملا کر کھانے کا آئیڈیا سکندر اعظم قدیم عراق سے لے کر آیا تھا اور بہادر شاہ ظفر نے سکندر اعظم سے باقاعدہ درخواست کر کے اس سے اس کی ترکیب حاصل کی تھی۔

اس کی یہ لاف زنی جاری تھی جب ایک نوجوان ہانپتا ہوا چھت پر پہنچا۔ ''ہیرو بھائی...... جلدی کریں حسنات صاحب کو کچھ ہو گیا ہے۔ شاید دل کا دورہ پڑ گیا ہے......''

حسنات صاحب کا نام سن کر عمران فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی۔ ''چاچو جی، آؤ ذرا۔'' اس نے مجھ سے کہا اور بازو پکڑ کر مجھے اٹھا لیا۔

ہم تیزی سے سیڑھیاں اترے اور تیز رفتاری سے کوئی ایک منٹ تک پیدل چل کر ایک سہ منزلہ گھر میں پہنچ گئے۔ یہ اندرونِ شہر ہونے کے باوجود نئی تعمیر کا گھر تھا۔ ہم ایک کشادہ کمرے میں پہنچے تو بیس بائیس سال کی ایک لڑکی بے قراری سے ایک بوڑھے شخص کی ہتھیلیوں کا مساج کر رہی تھی۔ پچپن ساٹھ سال کا یہ شخص بستر پر چت لیٹا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور وہ کچھ بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ وہیل چیئر پر ایک دبلا پتلا نوجوان بوڑھے کے قریب موجود تھا اور اس کے منہ میں کوئی دوا ٹپکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ عمران نے اسے منع کیا۔ بوڑھے کی نیم سفید داڑھی مسلسل حرکت میں تھی۔ وہ غشی کی حالت میں بول رہا تھا۔

''میں نے کہا تھا نا...... وہ آئے گا — میں نے کہا تھا نا...... یا اللہ رحم کر...... یا اللہ ہم پر رحم کر۔''

نوجوان نے اشک بار لہجے میں کہا۔ ''خدا کا شکر ہے، ہوش میں آ گئے ہیں۔ کچھ دیر کے لیے تو یہی لگا تھا کہ پتا نہیں اب کیا ہو جائے گا۔''

مزید ایک دو منٹ گزرے تو حسنات صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔ ان کے لب، اب بھی بڑبڑانے والے انداز میں بے ساختہ ہلتے جا رہے تھے۔ آنکھوں میں جیسے گہرا خوف نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ ایسا ہی خوف مجھے معذور لڑکے اور لڑکی کے چہروں پر بھی نظر آیا۔ لڑکی اچھے نین نقش کی تھی، چہرے پر عجیب سی معصومیت تھی۔ اس نے مجھے اپنی طرف دیکھتے پایا تو آنچل درست کرتے ہوئے جلدی سے اندر چلی گئی۔

ہم نے حسنات صاحب کو ٹیک لگوا کر نیم دراز کر دیا۔ اسی دوران میں دو پڑوسی عورتیں بھی آ گئیں۔ نوجوان نے لڑکی کو آواز دی۔ ''صوفیہ! آ جاؤ، ابو کے پاس بیٹھو۔''

پھر وہ ہمیں لے کر گھر کے مختصر سے ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ پتا چلا کہ لڑکے کا نام راشد ہے۔ صوفیہ اس کی بہن ہے۔ یہ گھر ان لوگوں کا اپنا تھا۔ گھر میں آرائشی اشیا بھی نظر آ رہی تھیں اور اندازہ ہوتا تھا کہ ان کا تعلق متوسط طبقے سے ہے۔ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر راشد باقاعدہ آنسو بہانے لگا اور بولا۔ ''عمران بھائی، ابو کی یہ حالت اس کمانڈو کی وجہ سے ہوئی ہے...... وہ جیل سے چھوٹ گیا ہے۔ ہمیں بالکل پتا نہیں تھا کہ وہ ایسے چھوٹ جائے گا۔''

''کمانڈو؟ یہ کون ذات شریف ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

راشد کو جیسے احساس ہوا کہ اس نے بات درمیان میں سے شروع کر دی ہے۔ آنسو پونچھ کر بولا۔ ''نام تو اس کا شاہنواز ہے لیکن کمانڈو کے نام سے مشہور ہے۔ بڑا سخت بندہ ہے عمران بھائی، باقاعدہ باکسر بھی رہا ہے۔ اگر سچ پوچھیں تو ابو کراچی سے یہاں لاہور میں شفٹ بھی اسی کی وجہ سے ہوئے تھے۔ اس نے صو...... صوفیہ......'' وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

بہرحال بات کچھ نہ کچھ ہماری سمجھ میں آ گئی تھی۔ شاید یہ کمانڈو نامی بندہ راشد کی بہن کے درپے تھا (بعد ازاں یہ اندازہ درست ثابت ہوا)

''یہ بندہ کہاں ہے اب؟'' میں نے پوچھا۔

''چار دن پہلے ہمیں پتا چلا تھا کہ اس نے سزا کے خلاف کوئی اپیل کر رکھی تھی جس کی وجہ سے وہ ڈیڑھ سال پہلے ہی چھوٹ گیا ہے اور لیاری میں آ گیا ہے...... اسی دن سے ابو کو پریشانی تھی کہ وہ یہاں لاہور چلا آئے گا اور آج یہی ہوا ہے۔ ابو کے ایک دوست حفیظ صاحب نے اسے مین روڈ کے ایک ہوٹل سے نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ اسی علاقے میں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اسے کسی طرح ہماری یہاں رہائش کے بارے میں بھی پتا چل گیا ہے۔ کیا پتا کہ......'' وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا پھر ذرا سنبھل کر بولا۔ ''کیا پتا کہ وہ آج رات ہی ہم پر چڑھ دوڑے۔'' راشد کی آنکھوں میں پھر آنسو تیر گئے۔

''اس کو جیل کیسے ہوئی تھی؟'' عمران نے پوچھا۔

''لیاری کی ہی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کا الزام تھا اس

''راشد نے جواب دیا۔
اسی اثنا میں ایک اور ادھیڑ عمر شخص کی آواز بھی باہر سے سنائی دینے لگی۔ راشد نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ابو کے دوست انکل حفیظ آئے ہیں۔ صوفیہ نے ان کو بھی فون کر دیا تھا۔''
راشد باہر چلا گیا۔ عمران کھوپڑی سہلا کر بولا۔ ''مجھے حلبی کے آگے پیچھے کی کبھی سمجھ نہیں آئی اور نہ ہی بھی یہ سمجھ آئی ہے کہ جب کبھی جلیبی کھانے بیٹھتا ہوں کوئی نہ کوئی پھڈا ہو جاتا ہے۔''
''تم تاریخ کا حلیہ بگاڑو گے تو اسی طرح ہوگا۔ سکندر حلبی کا موجد نہیں تھا اور وہ عراق سے نہیں یونان سے آیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ بہادر شاہ ظفر کے پیدا ہونے سے دو ڈھائی ہزار سال پہلے وہ فوت بھی ہو چکا تھا۔''
''یہ ایک لمبی بحث ہے چاچو! ویسے بھی ہم یہاں تاریخ درست کرنے نہیں آئے، یہ کمانڈو والا معاملہ کافی سیریس لگتا ہے۔''
اسی دوران میں حسنات صاحب کا ادھیڑ عمر دوست حفیظ شاہ بھی ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ پتا چلا کہ حسنات صاحب کی طرح وہ بھی چار پانچ سال پہلے تک کراچی کا رہائشی تھا مگر پھر امن و امان کی صورتِ حال سے بیزار ہو کر لاہور شفٹ ہو گیا۔ اب وہ بھی حسنات صاحب کی طرح یہاں ایک کراکری اسٹور چلا رہا تھا۔ حفیظ شاہ اپنے دوست اور اس کے اہلِ خانہ کی پریشانی پر تناؤ کی کیفیت میں تھا۔ باتوں سے پتا چلا کہ وہ بھی کمانڈو کو اچھی طرح جانتا ہے۔ شاید وہ راشد کے سامنے کھل کر بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے راشد کو باپ کی تیارداری کے لیے باہر بھیج دیا تب عمران سے مخاطب ہو کر رازداری کے انداز میں بولا۔ ''شاید راشد نے آپ دونوں کو کھل کر نہیں بتایا۔ یہ کمانڈو بڑا ظالم بندہ ہے۔ آدھا شہر اس کے نام سے کانپتا تھا اور اب بھی کانپتا ہو گا۔ میرے خیال میں تو سرکار کی طرف سے اس کے ساتھ رعایت ہی ہوئی ہے۔ ایسے بے رحم بدمعاش کو سرِعام پھانسی لگا دینا چاہیے۔ لیاری اور اردگرد کے علاقوں میں دہشت تھی اس کی۔ مشہور تھا کہ لڑائی میں تین چار بندوں کے ہاتھ پاؤں یہ اکیلا توڑ لیتا ہے۔''
''جیل کیسے گیا یہ؟'' عمران نے حفیظ شاہ سے بھی یہی سوال پوچھا۔
''کوئی ایک دفعہ تھوڑی گیا ہے۔ جیل حوالات کے چکر تو یہ لگاتا ہی رہتا ہے۔ آخری واردات اس نے کسی شمسہ نامی لڑکی سے کی تھی۔ پہلے اُس پر تیزاب پھینکنے کی دھمکیاں دیتا رہا، پھر اٹھا کر لے گیا۔ خبیث نے اسے کئی دن اپنے قبضے میں رکھا۔ جب وہ واپس آئی تو اس کا سر منڈا ہوا تھا، بھویں صاف تھیں، جسم پر تشدد کے نشان تھے۔ بعد میں کیس چلا اور پانچ سال کی سزا ہوئی۔ اب پتا نہیں کیسے تین ساڑھے تین سال میں چھوٹ گیا ہے۔''
''حسنات صاحب سے اس کی کیا دشمنی ہے؟'' میں نے اسے کریدا۔
''حسنات صاحب سے نہیں...... سمجھیں کہ بیٹی صوفیہ کے ساتھ ہے۔ بدبخت ہاتھ دھو کر اس شریف بچی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ پہلے اس کو آتے جاتے تنگ کرتا رہا پھر بے چاری کا گھر سے نکلنا مشکل کر دیا۔ بات بہت بڑھ گئی تو حسنات کراچی چھوڑ کر یہاں چلا آیا۔ انہی دنوں یہ خبیث شمسہ والے معاملے میں گرفتار بھی ہو گیا۔''
''کہتے ہیں کہ یہ باکسر وغیرہ بھی رہا ہے؟''
''ہاں، پہلے پہلے کھیلتا رہا ہے۔ ایک دفعہ سنا تھا کہ کسی بڑے مقابلے میں حصہ لینے کے لیے حکومت کی طرف سے ملائیشیا جا رہا ہے مگر پھر بدمعاشیوں اور حرامزدگیوں میں پڑ کر جیل چلا گیا لیکن مار اماری بھی چھوڑی نہیں ہے اس نے۔ کسی ملائیشین کے ساتھ مل کر کراچی میں باکسنگ کا ایک بڑا کلب بھی چلاتا رہا ہے۔ وہ ملائیشین بھی تو ایک نمبر کا بدمعاش تھا۔''
اسی دوران میں راشد کمرے میں واپس آ گیا۔ حفیظ پاشا نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تو حسنات کو بھی یہی مشورہ دیا ہے کہ فوراً سے پہلے پولیس کو اطلاع دے دینی چاہیے۔ اگر وہ یہاں لاہور پہنچ گیا ہے تو چند گھنٹوں سے زیادہ نچلا نہیں بیٹھے گا۔ کسی بھی وقت یہاں آ دھمکے گا۔''
راشد نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ''ابو پولیس کو انوالو کرنے سے بھی ڈر رہے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ یہ بہت بدنامی والی بات ہو جائے گی۔ وہاں کراچی میں بھی تو یہی کچھ ہوا تھا...... وہ تو کہہ رہے ہیں کہ گھر کو تالا لگا کر کچھ دنوں کے لیے کہیں نکل جاتے ہیں۔''
''اس سے کیا ہوگا؟'' میں نے کہا۔ ''کیا وہ آپ لوگوں کا پیچھا ہمیشہ کے لیے چھوڑ جائے گا؟ ویسے بھی کسی بدمعاش کے خوف سے اپنے گھر کو چھوڑ جانا کوئی مناسب بات نہیں ہے۔''
''تو...... پھر کیا کریں؟'' راشد نے روہانسے انداز میں پوچھا۔
''پولیس کو اطلاع دی جائے...... یا پھر خود ہی اُس شخص

کے پاس پہنچ کر اس سے بات کی جائے۔ پوچھا جائے اس سے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ کیا ارادے ہیں اس کے؟"

راشد کا رنگ زرد ہو گیا۔ "نہیں جی، آپ اسے جانتے نہیں اس لیے اس طرح کی بات کر رہے ہیں۔"

اتنے میں راشد کے موبائل فون پر کال آ گئی۔ یہ کراچی سے اس کے کسی قریبی دوست کی وڈیو کال تھی۔ اس نے بھی راشد کو یہی اطلاع دی کہ شاہنواز کمانڈو جیل سے رہا ہو گیا ہے اور لاہور پہنچ گیا ہے۔ اس کو جاننے والے کہتے ہیں کہ حسنات صاحب کی فیملی کے بارے میں اس کے ارادے بالکل اچھے نہیں ہیں۔

یہ فون کال سننے کے بعد راشد کی حالت مزید پتلی نظر آنے لگی۔ وہیل چیئر پر بیٹھا وہ بالکل منحنی سا لگ رہا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ گھٹنے کے اوپر سے کٹی ہوئی تھی۔ یقیناً یہ کسی پرانے حادثے کا نتیجہ تھا۔ گو اس کی دوسری ٹانگ سلامت تھی مگر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی ٹھیک سے کام نہیں کرتی۔

اسے کراچی سے کال کرنے والے دوست نے ڈائریکٹ بات نہیں کی تھی، ورنہ اس کے کہنے کا مطلب یہی تھا کہ وہ بدمعاش صوفیہ کی عزت کے درپے ہے اور جیل سے چھوٹ کر سیدھا اس کی طرف ہی آیا ہے۔ کال کرنے والے اس دوست کا لب ولہجہ بتا رہا تھا کہ وہ بھی اس کمانڈو نامی بدمعاش کی دہشت کے اثر میں ہے۔

اب پتا نہیں کیوں مجھے بھی کچھ کچھ یاد پڑ رہا تھا کہ تین چار سال پہلے میں نے کراچی کے کسی ایسے بدمعاش کے بارے میں سنا تھا جو جانا پہچانا باکسر بھی تھا۔ انٹرنیشنل باکسر بنتے بنتے وہ پکا غنڈا بن گیا تھا اور پھر گرفتار ہو گیا تھا۔

عمران نے حسنات صاحب کے ادھیڑ عمر دوست حفیظ سے پوچھا۔ "آپ نے آج اسے کس ہوٹل میں دیکھا ہے؟"

حفیظ شاہ نے ہوٹل کا نام بتایا اور پھر کہنے لگا۔ "دیکھو عمران! ہمیں پتا ہے کہ تم ہر مشکل میں ہاتھ ڈالنے کے لیے تیار رہتے ہو لیکن اگر تمہارا خیال یہ ہے کہ اس سے مل کر تم اسے کسی طرح دبا لو گے یا یہاں سے جانے پر مجبور کر دو گے تو یہ غلط فہمی دل سے نکال دو۔ وہ بالکل اور ٹائپ کا بندہ ہے۔ میں یہ بات کوئی محاورتاً نہیں کہہ رہا، وہ تین چار بندوں کے ہاتھ پاؤں توڑ کر انہیں دو منٹ میں زمین پر لٹا سکتا ہے۔"

راشد بولا۔ "لیاری میں وہ ہمارے محلے کا ہی تھا...... شروع سے ہی تماشے لگاتا رہتا تھا۔ اس کا چیلنج تھا کہ کوئی "آرم ریسلنگ" میں دونوں ہاتھ بھی استعمال کرے تو اس کا بازو نیچے نہیں لگا سکتا اور سچ میں ایسا ہی تھا۔ وہ بھرا ہوا پستول کسی شخص کے قدموں میں پھینک دیتا تھا اور خود آٹھ دس فٹ دور کھڑا ہو جاتا تھا۔ اسے چیلنج کرتا تھا کہ وہ اس سے پہلے یہ پستول اٹھا کر ہوائی فائر کر دے، وہ اسے اپنا پیر استاد مان لے گا...... ایسے بہت سے الٹے سیدھے کام کر کے وہ لوگوں پر دہشت ڈالتا تھا...... اور وہ اس میں پوری طرح کامیاب بھی تھا۔"

حفیظ شاہ صاحب نے کہا۔ "فطرتاً خبیث شخص ہے اور مجھے تو لگتا ہے کہ جیل سے نکل کر اور بھی خطرناک ہو گیا ہو گا۔ سنی سنائی باتیں تو بہت ہیں، ایک دو مرتبہ میں نے خود بھی اس کی بدمعاشی اور مار کٹائی کے سین دیکھے ہیں۔ مرنے مارنے پر آئے تو زہریلا ناگ بن جاتا ہے۔ پولیس کے کچھ پہلوانوں (چھاپا ماروں) سے بھی اس کی پکی یاریاں ہیں......"

عمران نے کہا۔ "اگر آپ مجھے ڈرانا چاہتے ہیں تو میں واقعی بہت ڈر گیا ہوں...... مجھ پر کپکپی بلکہ کپکپا طاری ہو گیا ہے۔ مزید ثبوت چاہیے تو تھوڑا انتظار فرمائیے۔ میری پینٹ بس گیلی ہونے ہی والی ہے۔"

راشد اور حفیظ شاہ ہونقوں کی طرح ہمارا منہ دیکھنے لگے۔ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "حفیظ صاحب! عمران مذاق کر رہا ہے۔ بہرحال ہم ایک بار آپ کے اس کنگ کمانڈو سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ بے فکر رہیں ہمارے ملنے سے حسنات صاحب یا ان کی فیملی پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ ہم اپنی ذاتی حیثیت سے ملیں گے۔ آپ ہمیں بس اُس کے ٹھکانے تک لے جائیں۔"

کچھ بحث وتمحیص کے بعد ہم نے راشد اور حفیظ شاہ کو قائل کر لیا۔

☆☆☆

جیسا سنا تھا، شاہنواز کمانڈو کو اس سے بڑھ کر پایا۔ اس سے ہماری ملاقات راوی روڈ کے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں ہوئی۔ وہ ہوٹل کی لابی میں بیٹھا کسی سے فون پر گفتگو میں مصروف تھا۔ چھ فٹ سے نکلتا قد، نہایت مضبوط ورزشی جسم، ناک پھولی ہوئی، رنگ گندمی، تنومند گردن اور ٹھوڑی پر زخم کے دو پرانے نشانات۔ وہ سخت سردی میں بھی عام شرٹ اور جین کی پتلون پہنے ہوئے تھا۔ عمر اٹھائیس سال سے اوپر ہی رہی ہو گی۔ اردگرد موجود لوگوں کی نگاہیں آپوں آپ ہی اس کی جانب اٹھ جاتی تھیں۔ اس کے کرخت چہرے کی چمک اور تازگی دیکھ کر ہرگز نہیں لگتا تھا کہ وہ ساڑھے تین سال کی جیل کاٹ کر آیا ہے۔

عمران فدویانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا۔ جھک کر بڑی عقیدت سے اس سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ ”ایک دفعہ کراچی میں آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ آپ لیاری کے اک خانے والی سڑک پر بندر کا تماشا دکھا رہے تھے۔“

مخاطب کا تھوبڑا ایک دم سرخ ہو گیا۔ اس نے کڑی نظروں سے عمران کو دیکھا۔ ”بندر کا تماشا؟ کیا بات کر رہے ہو؟“

”او جناب! آپ اس غنڈے کو جس طرح پھینٹی لگا رہے تھے وہ بندر کا تماشا ہی تھا۔ وہ آپ کی چوٹیں کھا کر دو دو فٹ اوپر اچھل رہا تھا۔“

اس تشبیہ پر کمانڈو نام کے اس خونخوار شخص نے بُرا سا منہ بنایا۔ ”پتا نہیں کب کی بات کر رہے ہو۔ میری یادداشت میں ایسا کچھ نہیں۔“

”او بادشاہو! یادداشت تو اس بندے کی خراب ہونی چاہیے تھی جس کی کھوپڑی میں آپ کے مکّوں سے چاند روشن ہوئے تھے۔ آپ بھول رہے ہیں۔ مارنے کے بعد آپ نے اس کو تمباکو والا میٹھا پان بھی کھلایا تھا۔“

”تمباکو والا میٹھا پان؟“

”ہاں جی۔ اسی بات پر تو اس چغد پان فروش سے آپ کی مارا ماری ہوئی تھی۔ آپ نے اسے میٹھا پان کہا تھا۔ اس کھوتے نے تمباکو بھی ڈال دیا پھر ویسا ہی پان آپ نے اس سے بنوا کر اس کی ناک میں گھسیڑا تھا۔ یعنی ناکوں پان چبوایا تھا اُس کو۔“

اس سے پہلے کہ وہ شخص برہم ہو کر کچھ کہتا، عمران نے جلدی سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت یہ میرے انکل بھی میرے ساتھ تھے۔ آپ کی طرح یہ بھی بڑے پائے کے باکسر ہیں۔ ٹھیک ٹھاک نام ہے ان کا۔“

باکسنگ کے ذکر پر وہ گرانڈیل شخص تھوڑا سا چونکا اور غور سے میری طرف دیکھنے لگا۔ ”کیا نام ہے تمہارا؟“ وہ میری عمر کا لحاظ کیے بغیر نخوت سے بولا۔

”تابش۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”کہاں کھیلتے رہے ہو...... کسی سے سیکھا بھی یا پیدائشی چیمپئن تھے؟“

اُس کے آخری فقرے نے میرے جسم میں جھرجھری سی دوڑا دی۔ میں اسے کیا بتاتا کہ میں نے کس سے سیکھا اور کیا کیا سیکھا...... کون تھا میرا استاد؟ میرا نہیں خیال تھا کہ وہ عظیم فائٹر باروندا جیکی کے بارے میں کچھ جانتا ہوگا...... آہ باروندا جیکی اور اس کا بے مثل فلسفہ...... کئی یادوں نے ایک دم ذہن پر یلغار کی۔

کمانڈو پُرغرور انداز میں میری جانب دیکھ رہا تھا۔ یقیناً اپنی جوانی پر اور اپنے ہنر پر گھمنڈ کر رہا ہوگا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ اس کے سامنے بھی کوئی معمولی شخص نہیں ہے۔

ہم ابھی تک کھڑے تھے۔ عمران نے کہا۔ ”کیا ہم بیٹھ سکتے ہیں؟“

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، ایک اور ہٹا کٹا شخص اس کے عقب سے نمودار ہو گیا۔ یہ بھی اس کا کوئی بدمعاش ساتھی ہی تھا۔ ”وڑی کیا بات ہے؟ تم کیا کہنا مانگتا ہے شاہنواز صاحب سے؟“ وہ درشت لہجے میں بولا۔

کمانڈو نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا اور پُرنخوت انداز میں ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ عمران کی چرب زبانی کام آئی اور وہ اس کمانڈو نامی بندے کے ساتھ گفتگو کو طول دیتا چلا گیا۔ اس گفتگو سے ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ شخص واقعی اپنے اندر ایک نیلی آگ چھپائے ہوئے ہے۔ اسے اپنے آپ پر گھمنڈ بھی ضرورت سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ باکسنگ کے بارے میں بات کرتے ہوئے وہ کچھ اور ”اوور“ ہو جاتا تھا۔ آس پاس کے لوگ اسے کیڑے مکوڑے نظر آتے تھے۔ اس کا خیال یہی تھا کہ اگر وہ اپنے کیریئر کے عروج پر بدقسمتی سے جیل نہ چلا جاتا تو اس وقت شاید مائیک ٹائی سن کے جوڑ کا فائٹر ہوتا۔

”ہو سکتا ہے آپ مائیک ٹائی سن سے بھی آگے چلے جاتے۔ طور اطوار تو آپ کے بھی بالکل ویسے ہی ہیں۔“ عمران نے بظاہر سنجیدگی سے کہا۔

”کیا مطلب؟“ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے عمران کو گھورا۔

وہ عام سے انداز میں گویا ہوا۔ ”چیمپئن مائیک ٹائی سن کے بارے میں مشہور تھا نا کہ اس نے ایک لڑکی کی عزت لوٹ لی تھی۔ ارادے تو آپ کے بھی کافی نیک ہیں۔“

شاہنواز کمانڈو کے تھوبڑے پر خون کی سرخی دوڑ گئی۔ یقیناً اسے عمران سے ایسی بات کی توقع نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ عمران کا گریبان پکڑ لے گا مگر پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ کچھ دیر تک کھا جانے والے انداز میں ہم دونوں کو دیکھتا رہا تب زہری ناگ کی طرح پھنکارا۔ ”کون ہو تم؟ کیسے آئے ہو میرے پاس؟“

اس کے اس سوال کا جواب میں نے دیا اور پوری وضاحت سے دیا۔ چار پانچ منٹ کے اندر میں نے بڑے اطمینان کے ساتھ ساری بات اس کے سامنے کھول کر رکھ

دی۔ حسنات صاحب اور صوفیہ کے ذکر نے کمانڈو کے چہرے پر ہیجان پیدا کر دیا تھا، اس کے ساتھ ہی اسے یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ جو بندے اس کے ساتھ اتنے اطمینان سے اتنی اہم بات کر رہے ہیں، وہ بھی معمولی نہیں ہیں۔

میری بات ختم ہوئی تو شاہنواز کمانڈو کی آنکھوں میں بھوکے شکرے جیسی چمک نظر آنے لگی تھی۔ وہ بولا۔ ''تو صوفیہ کے کچھ لگتے بن کر آئے ہو میرے سامنے...... زبردست...... بہت خوب...... تو اب لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دو کہ کیا اکھاڑو گے میرا اور کس طرح؟''

گردن ایک جانب ٹیڑھی کر کے وہ خطرناک انداز میں بول رہا تھا۔ جیسے اس نے صوفیہ کے بجائے ایک بھرا پستول میرے سامنے پھینک دیا ہو اور بہ زبانِ خاموشی کہہ رہا ہو۔ ''چلو آؤ...... میری پکڑ سے بچا کر دکھاؤ اسے۔''

میں نے اس بندے کے بارے میں اب تک جو اندازہ لگایا تھا، وہ یہی تھا کہ وہ پرلے درجے کا خود پسند ہے۔ سب سے زیادہ غرور اسے اپنی جسمانی طاقت اور بے خوفی پر ہی تھا۔ ایسے لوگوں کو انسانیت کے دائرے میں لانے کا اس سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں ہوتا کہ انہیں ان کے گھمنڈ کی شکست دی جائے۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اگر میں اور عمران اسے ایک بار سلاخوں کے پیچھے بھی پہنچا دیں گے تو یہ بیماری جڑ سے ختم نہیں ہو گی لیکن اگر اس کے غرور کی اکڑی ہوئی گردن جھکا دی جائے تو یہ تڑت، عرش سے فرش پر آجائے گا۔

میں نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ''اس لڑکی کو میری چھوٹی بہن سمجھ لو، یا بیٹی سمجھ لو یا کسی بھی پیارے رشتے کا نام دے لو...... لیکن اس کی طرف آنکھ اٹھانا تو دور کی بات ہے، تم نے اس کے بارے میں سوچا بھی تو ہم تمہاری سانسیں کھینچ لیں گے۔''

اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ غالباً اسے یقین ہی نہیں آیا کہ اس کے بارے میں جانکاری رکھنے والا کوئی شخص اس لہجے میں اس سے بات کر سکتا ہے پھر اس کی حیرت بتدریج ایک غضب ناک تاثر میں ڈھل گئی۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ''پہلے مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ وہ لگتی کیا ہے تمہاری؟''

میں نے ایک لمحہ سوچا پھر کہا۔ ''بھانجی ہے میری۔''

اس نے ہوٹل کے چمکیلے فرش پر تھوکا اور پھنکارا۔ ''لگتا ہے کہ کوئی بہت بڑی بدبختی تمہارا پیچھا کر رہی تھی جو میرے سامنے آ گئے ہو...... یا ہو سکتا ہے کہ بددعا ہو کسی کی۔''

''یہی شک تمہارے بارے میں مجھے بھی ہو رہا ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''اور مجھے بھی۔'' عمران نے لقمہ دیا۔

عمران کو نظرانداز کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر مجھے سرتاپا گھورا اور سرسراتی آواز میں کہا۔ ''انکل! تیری عمر نہیں، ایسے پھڈوں میں پڑنے کی...... جا کہیں دھوپ میں بیٹھ کر اخبار پڑھ یا کسی پوتے پوتی کے ساتھ گھسی بارغ (چلڈرن پارک) میں انجوائے کر۔ ایویں کوئی ہڈی کڑک ہو گئی تو اس عمر میں جُڑ کر نہیں دے گی۔''

عمران نے کہا۔ ''میں نے بھی چاچو جانی کو یہی مشورہ دیا تھا۔ میں نے کہا تھا یہ عمر لڑائی کرنے کی نہیں، لڑائی چھڑانے کی ہوتی ہے۔ ویسے بھی جوان سانڈ سے جوان چیتا ہی لڑے تو اچھا ہوتا ہے۔''

شاہنواز کمانڈو کی خونخوار نگاہ ایک لمحے کے لیے عمران کے چہرے کی طرف اٹھی، جیسے اس نے سمجھنے کی کوشش کی ہو کہ سانڈ کس کو کہا گیا ہے اور چیتا کس کو؟ پھر وہ عمران سے نہایت سرد لہجے میں مخاطب ہوا۔ ''تم اپنے چاچو سمیت آجاؤ نا...... ابھی دو منٹ میں دونوں کی پتلونیں نہ اتار دیں تو نام بدل دینا۔ اس کے بعد دونوں کی تشریفات پر جو جوتے ماروں گا وہ علیحدہ سے ہوں گے...... ماروں گا بیس اور گنوں گا دس۔'' اس کے لہجے میں بھسم کر دینے والی آگ تھی۔

چند لمحوں کے لیے لگا کہ وہ ابھی ہم پر جھپٹ پڑے گا۔ میں نے اسے دھیرج رکھنے کا کہا اور مشورہ دیا کہ ''اگر بات مارا ماری پر آ ہی گئی ہے تو پھر یہاں پھڈا ڈال کر پولیس کو دعوت نہ دی جائے بلکہ اطمینان سے بات کر لی جائے کہ کیا کرنا ہے۔''

''کوئی رشتہ دینا ہے مجھے، جو اطمینان سے بات کرنی ہے تم نے......'' وہ خطرناک انداز میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس موقع پر عمران نے پھر چرب زبانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے سنبھالا اور دوبارہ بٹھا دیا۔ اردگرد موجود لوگ پُرتشویش نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ کمانڈو کے دو ساتھی بھی آس پاس موجود تھے اور میرے اندازے کے مطابق دونوں مسلح تھے۔ اگلے دس پندرہ منٹ نتیجہ خیز ثابت ہوئے۔ میں نے بے حد سنجیدہ لہجے میں شاہنواز عرف کمانڈو سے کہا۔ ''اگر بات اس طرف چل نکلی ہے تو چلو کچھ شرائط طے کر لیتے ہیں۔ میں تم سے دوبدو لڑنے کو تیار ہوں۔ میں اس بات پر نہیں جاتا کہ تم زبردستی ایک شریف لڑکی کو اپنے گھر میں ڈالنا چاہ رہے ہو۔ تم اس بات پر نہ جاؤ کہ تمہاری

انی کو ایک بڑی عمر کا بندہ باکسنگ کے "رِنگ" میں چیلنج
کر رہا ہے...... ہم بات یہ کرتے ہیں کہ اگر میں تمہارا یہ غرور
توڑ دوں تو تم بدلے میں کیا دو گے؟"

"تو کیا دے گا انکل؟" وہ تُرت بولا۔

"میں اپنے ہاتھ سے اُس لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر تمہارے
ہاتھ میں دے دوں گا۔ مجھے اس کا اختیار حاصل ہے اور میں
دے سکتا ہوں (ظاہر ہے کہ آخری الفاظ میں نے اسے صرف
قائل کرنے کے لیے کہے تھے) اب بتاؤ تم کیا دو گے؟"

وہ زہریلے لہجے میں بڑے ٹھسے سے بولا۔ "میں
تیرے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر اور تجھے سلام پیش کر کے یہاں
سے چلا جاؤں گا۔ دوبارہ کبھی اِدھر کا رخ نہیں کروں گا۔"
جوش کے عالم میں اب اس کا چہرہ سیاہی مائل ہو رہا تھا اور
بازوؤں کی مچھلیاں پھڑکتی محسوس ہوتی تھیں۔

ایک دم بڑا ڈرامائی سا ماحول بن گیا تھا۔ وہیں بیٹھے
بیٹھے ہمارے اور شاہنواز کمانڈو کے درمیان کچھ شرائط طے ہو
گئیں۔

☆☆☆

پولیس کے محکمے سے بطور فزیکل ٹرینر منسلک ہونا
میرے لیے ایک خوشگوار تجربہ ثابت ہوا تھا۔ مارشل آرٹ کا
مزید ارتقا بھی میری اس مصروفیت میں شامل تھا۔ یہ جاب
میری اپنی "فٹ نس" اور صحت کے لیے بھی بہت مفید تھی۔
بارونداجیکی کے فلسفے کے مطابق میں نے خود کو مسلسل سخت
ترین مشقت اور جفاکشی کے حوالے کر رکھا تھا۔ اب یہ
مشقت مجھے مشقت لگتی ہی نہیں تھی، روزمرہ کا معمول بن چکی
تھی۔ (نئے قارئین کو یہ بتانا ضروری ہے کہ بارونداجیکی
میرے استاد کا نام تھا)

ڈیوٹی سے فارغ ہو کر میں شام آٹھ بجے، اندرونِ شہر
عمران کے پاس پہنچا۔ عمران اس وقت حسنات صاحب کے
گھر میں ہی موجود تھا۔ وہ حسنات صاحب اور ان کی فیملی کا
خوف کافی حد تک دور کر چکا تھا۔ اس نے انہیں تفصیل تو نہیں
بتائی تھی، بس اتنا کہا تھا کہ ہم ہوٹل میں جا کر شاہنواز کمانڈو
سے ملے ہیں۔ اس کے ساتھ اپنے طریقے سے بات چیت
کر رہے ہیں۔ کم از کم اتنی تسلی ضرور ہو گئی ہے کہ وہ ایک دو
روز تک اس گھر کا رخ نہیں کرے گا۔

تسلی تشفی کی اس گفتگو کے دوران میں راشد وہیل چیئر
پر خاموش بیٹھا رہا۔ اس کی معذوری کے بارے میں بھی کچھ
جانکاری ملی۔ حسنات صاب تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز
تھے۔ انہوں نے بتایا۔ "چار سال پہلے راشد کے ساتھ حادثہ
پیش آیا تھا۔ ان دنوں ہم لوگ کراچی میں تھے۔ گھر کی چھت
پر کچھ تعمیر ہو رہی تھی۔ راشد کا پاؤں پھسلا اور نیچے گر گیا۔
دونوں ٹانگوں میں کئی فریکچر ہوئے مگر بائیں پاؤں والا فریکچر
آپریشن کے بعد بگڑ گیا۔ ڈاکٹرز نے بتایا کہ زہر پھیل رہا
ہے۔ پاؤں کاٹنا پڑے گا......" وہ ایک سرد آہ بھر کر خاموش
ہو گئے۔

میں نے پوچھا۔ "اب کیا پوزیشن ہے؟"

وہ آبدیدہ ہو کر بولے۔ "درحقیقت راشد کی ٹانگ دو
دفعہ کاٹی گئی ہے۔ دوسری مرتبہ گھٹنے کے اوپر سے کٹی۔ یہ
آپریشن کوئی ڈیڑھ سال پہلے لاہور میں ہی ہوا تھا۔ سات
آٹھ ماہ تو خیریت سے گزر گئے لیکن اب پھر زخم میں بگاڑ پیدا

ہو رہا ہے۔ اب معاملہ زیادہ......" انہوں نے بیٹے کی طرف دیکھا اور بات مکمل نہیں کی۔

راشد بولا۔ "اب ڈاکٹر، ٹانگ کو بالکل کولھے کے پاس سے کاٹنے کی بات کرتے ہیں۔ یہ کافی مہنگا آپریشن ہے، کچھ کہتے ہیں کہ یہ آپریشن پاکستان سے باہر ہونا چاہیے۔ بہرحال اللہ مدد کرنے والا ہے۔ واجد صاحب بھی کوشش کر رہے ہیں کہ آپریشن باہر ہو جائے۔"

واجد کا نام میں پہلی بار سن رہا تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے پہلے عمران اور پھر راشد کی طرف دیکھا۔ حسنات صاحب بولے۔ "واجد میرے ہونے والے داماد کا نام ہے میرا مطلب ہے صوفیہ کا منگیتر۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ بے حد خیال رکھنے والا۔ اللہ نے اس کو نوازا بھی بڑا ہے۔ لیدر جیکٹس کا کام کرتا ہے۔ آج کل پاکستان سے باہر گیا ہوا ہے۔ یہاں ہوتا تو شاید خود ہی اس کمانڈو والے بکھیڑے کو سنبھال لیتا۔"

"ایسے لوگوں سے نمٹنا بہت اچھی طرح آتا ہے واجد بھائی کو۔" راشد نے بھی تائید کی۔

مزید جو گفتگو ہوئی، اس سے پتا چلا کہ حسنات صاحب کی بیٹی صوفیہ نے ٹیکسٹائل میں کوئی ڈپلوما وغیرہ کر رکھا تھا۔ گھر کی مالی حالت کو سہارا دینے کے لیے اس نے ایک فرم ڈائمنڈ ٹیکسٹائل میں ملازمت کی تھی۔ واجد احمد فرم کے مالک کا بیٹا تھا۔ صوفیہ اس کی نگاہوں کو بھائی۔ وہ اس کے اخلاق سے بھی متاثر ہوا۔ دھیرے دھیرے وہ دونوں ایک دوسرے میں "انوالو" ہو گئے اور پھر طبقاتی فرق کے باوجود واجد نے صوفیہ کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ راشد نے اپنے موبائل فون پر واجد کی تصویر بھی دکھائی۔ روشن چہرے، کھڑی ناک اور پتلے پتلے ہونٹوں والا وہ ایک مضبوط اور باہمت شخص لگتا تھا۔ عمر پچیس چھبیس سال رہی ہوگی۔ اسی دوران میں صوفیہ ٹرے میں چائے لیے ہمارے پاس آ گئی۔ آنچل چہرے پر ڈھلکا ہوا تھا۔ آدھے چہرے کی دلکش جھلک بھی یہ دکھانے کے لیے کافی تھی کہ اگر اس نے اپنے باس کے دل میں گھر کیا ہے تو یونہی نہیں کیا۔

اسی دوران میں عمران کے موبائل پر حسنات صاحب کے دوست حفیظ شاہ کی کال آ گئی۔ وہ تازہ صورتِ حال جاننے کے لیے بے چین تھے۔ عمران نے انہیں بھی تسلی دی اور بتایا کہ کل کمانڈو سے پھر ہماری ملاقات ہے۔ امید ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح اسے لگام ڈالنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ عمران انہیں مقابلے وغیرہ کی بات تو نہیں بتا سکتا تھا۔ اگر بتاتا تو... اسے ایک بچکانا سوچ کہا جاتا اور شاید سرے سے یقین ہی نہ کیا جاتا۔

☆☆☆

یہ ایک مقامی کالج کا اسپورٹس کمپلیکس تھا۔ یہاں باکسنگ اور ریسلنگ وغیرہ کے لیے ایک شاندار رِنگ بھی موجود تھا۔ رات کے دس بجے تھے۔ اس وقت کمپلیکس بالکل ویران تھا۔ میں اور کمانڈو آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ہم نے صرف ٹراؤزر اور بنیانیں پہن رکھی تھیں۔ ہاتھوں پر باکسنگ گلوز تھے۔ تماشائیوں میں عمران کا ایک یار زریں خاں اور تین چار دیگر دوست شامل تھے۔ اس کے علاوہ کمپلیکس کے دو تین ملازم بھی تھے۔ فیصلے کے لیے میں اپنے ڈپارٹمنٹ کے ہی ایک باکسنگ ریفری کو لے آیا تھا۔ بہرحال کمانڈو کو ہنوز یہ علم نہیں تھا کہ میرا تعلق پولیس ڈپارٹمنٹ کے فزیکل ونگ سے ہے۔

ٹیوب لائٹس میں کمانڈو کا جسم فولاد کی طرح چمک رہا تھا۔ وہ شیڈو باکسنگ کر کے خود کو گرم کر رہا تھا۔ اس کے مکّوں کی رفتار دیکھ کر یہ بات میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ وہ گھمنڈی ضرور ہے مگر آسان حریف ہرگز نہیں۔ پانچ راؤنڈ کا مقابلہ طے ہوا تھا۔ ضرورت پڑنے پر راؤنڈ بڑھائے جا سکتے تھے۔

گھنٹی کی آواز کے ساتھ ہی ہم دونوں مقابل آئے۔ باکسنگ میں پہلا راؤنڈ کافی خطرناک ہوتا ہے۔ باکسر کے اسٹاک پنچ میں بہت طاقت ہوتی ہے۔ پہلے دوسرے راؤنڈ میں ایک بھی اسٹاک پنچ ٹھکانے پر لگ جائے تو ناک آؤٹ کی نوبت آ جاتی ہے۔ پہلا راؤنڈ ہم دونوں نے سنبھل کر کھیلا مگر پھر دوسرے راؤنڈ میں دونوں طرف سے تابڑتوڑ حملے ہوئے۔ وہ یقیناً شاندار باکسر تھا۔ بدمعاشیوں میں نہ پڑتا تو بہت آگے تک جاتا۔ اس کے ایک دو نہایت خطرناک مکّوں سے میں خود کو بمشکل بچا پایا۔ دوسری طرف کمانڈو کو بھی احساس ہونا شروع ہو گیا تھا کہ بڑی عمر کے جس باکسر کو وہ تر نوالہ سمجھ رہا تھا، وہ تر نوالہ نہیں ہے۔ میری سب سے بڑی طاقت تو میری قوتِ برداشت ہی تھی۔ برسوں گزر گئے تھے جب یار وندا جیکی نے تکلیف سہنا اور اس پر غالب آنا جیسے میری "گھٹی" میں ڈال دیا تھا۔

تیسرے راؤنڈ میں جب کمانڈو کا ایک دندان شکن پنچ میں نے بڑی سہولت سے برداشت کر لیا تو اس کی آنکھوں میں طیش کے ساتھ کچھ حیرت بھی نظر آنے لگی پھر وہ اندھا دھند حملوں پر آ گیا۔ ساتھ ساتھ ▪ بدزبانی بھی کر رہا تھا۔ اسے اضافی غصے میں دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ مجھے یقین ہو گیا

کہ عنقریب وہ کوئی ایسی غلطی کرے گا جو اسے فرش چٹا دے گی۔ عمران باہر سے پکار رہا تھا۔ ''چاچو جانی! تمہیں مرحومہ چچی کی قسم۔ اسے بتا دو کہ تم کون ہو۔ میں تو کہتا ہوں، ایسی جگہ مُکّا مارو کہ...... یہ شادی وادی کے قابل ہی نہ رہے۔''

تیسرے راؤنڈ کے ختم ہونے کے بعد میں اسٹول پر بیٹھا سانسیں درست کر رہا تھا جب لمبا تڑنگا عمران جست لگا کر رِنگ میں آ گیا اور میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ''چاچو جانی! تمہارے سر کی قسم، مزہ آ گیا۔ اس درمیانی عمر میں بھی تم جیکی چن کے کان کاٹتے ہو۔ میں تو خدا کا شکر کر رہا ہوں کہ یہ فائٹ دکھانے کے لیے مہدی کو یہاں نہیں لے آیا۔''

''کیا مطلب؟''

وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''مہدی، یعنی وہی اپنی مہوش حیات، فلموں والی۔ اگر وہ تمہیں دیکھ لیتی تو عین ممکن تھا کہ مجھے چھوڑ کر تم پر فدا ہو جاتی۔ میں بیٹھے بٹھائے رقیب بن جاتا اپنے چاچو کا۔''

''اچھا بکواس بند کرو۔ ٹھنڈا پانی دو...... کُلّی کرنی ہے۔''

وہ مجھے کُلّی کراتے ہوئے پھر بولا۔ ''بندہ تو یہ کافی ٹائٹ ہے لیکن لگتا ہے کہ اب زیادہ غصے میں آ گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ فاؤل شاؤل بھی کرے، میں تو کہتا ہوں چاچو! اگر فاؤل کرے ناں تو تم بھی سیدھا اس کی...... ہوس گاہ پر مُکّا مارو۔ فنش ہی کر دو یہ ٹینٹا۔''

میں نے اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹایا اور چوتھے راؤنڈ کے لیے اٹھ گیا۔

چوتھا راؤنڈ شروع سے ہی زوردار تھا۔ راؤنڈ کے دوسرے منٹ کے شروع میں وہی کچھ ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ کمانڈو اپنا ضبط کھو بیٹھا۔ اس نے ''باکسنگ'' لپیٹ کر ایک طرف رکھ دی اور ارنے بھینسے کی طرح سیدھی سیدھی میرے سینے پر ٹکر دے ماری۔ ہم گتھم گتھا ہو گئے۔ ریفری دھکا کھا کر دور جا گرا۔ کمانڈو، اپنے گھٹنے، کہنیاں، سر، سب کچھ استعمال کرنے لگا۔ مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ اس میدان میں مجھے زیادہ آسانی تھی۔ یہ مکس مارشل آرٹ کی شکل تھی جو میرا اصل میدان تھا۔ میں نے ایک ڈیڑھ منٹ کے اندر اسے روئی کی طرح دھنک ڈالا۔ میرے اڑنگے نے اسے پشت کے بل گرایا تو میں نے اسے ایک فرشی داؤ میں جکڑ لیا۔ کمانڈو کے ناک منہ سے خون جاری ہو چکا تھا۔ ایک آنکھ سوج کر تقریباً بند ہو گئی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کا

ایک آدمی بچے سے۔ ''بیٹا ذرا یہ رومال سونگھو۔''
بچہ۔ ''مجھے پتا ہے اسے سونگھ کر میں بے ہوش ہو جاؤں گا اور آپ مجھے بوری میں بند کر کے لے جائیں گے۔''
آدمی۔ ''یہ تمہیں کیسے پتا چلا؟''
بچہ۔ ''میرے ابو نے مجھے بتایا تھا۔''
آدمی۔ ''تمہارے ابو کون ہیں؟''
بچہ۔ ''یہ تو مجھے پتا نہیں کیونکہ وہ مجھے کہیں سے بوری میں بند کر کے لائے تھے۔''

شدید نقصان ہو گیا۔ میرے ''آرم لاک'' سے نکلنے کی اندھا دھند کوشش میں اس نے اپنا بازو کندھے کے اوپر سے تڑوا لیا۔ اس کے باوجود اس کی سخت جانی اسے مزاحمت پر اکسا رہی تھی مگر...... جب چند سیکنڈ بعد اس کی پُرنخوت گردن میرے بازو کے مہلک شکنجے میں آئی تو اس نے بدمعاشی کے انداز کو خدا حافظ کہا اور شریف کھلاڑیوں کی طرح فرش پر اپنا دایاں ہاتھ مار مار کر اپنی شکست کا اعتراف کر لیا۔ عمران اور اس کے دوستوں نے نعرہ ہائے تحسین بلند کیے۔ کمانڈو اسی طرح فرش پر اوندھا پڑا رہا۔ اس کا بایاں بازو کانپتا چلا جا رہا تھا۔ زخموں سے بہنے والا خون ''رِنگ'' کے فرش پر گلکاری کر رہا تھا۔ اس کا جھکا ہوا سر دیکھ کر میرے دل نے گواہی دی کہ آج یہ شخص اپنے گھمنڈ کے گھوڑے پر سے اتر آیا ہے اور اب صدقِ دل سے اپنی پسپائی بھی تسلیم کرے گا۔

ایک دو منٹ بعد جو کچھ ہوا، وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ میں ''رِنگ'' سے نیچے اتر ہی رہا تھا کہ اسپورٹس کمپلیکس کے باہر ایک دو گاڑیوں کے رکنے کی آوازیں آئیں۔ چند سیکنڈ بعد سات آٹھ افراد گیٹ کیپر سے اُلجھتے ہوئے ہال کے اندر آ گئے۔ میں نے پہچان لیا۔ ان میں سب سے آگے تھری پیس سوٹ والا شخص وہی تھا جس کا نام واجد احمد معلوم ہوا تھا اور جو صوفیہ کا منگیتر تھا۔ وہ غالباً آج ہی بیرونِ ملک سے لوٹا تھا اور شاید ائرپورٹ سے سیدھا یہ یہاں چلا آیا تھا۔ اسے یہاں کا پتا یقیناً ہوٹل میں کمانڈو ہی کے کسی ساتھی سے معلوم ہوا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کمانڈو کے حوالے سے سخت طیش میں ہے۔

اس نے عمران سے چند فقروں کا تبادلہ کیا پھر بپھر کر ''رِنگ'' میں داخل ہو گیا۔ کمانڈو ''رِنگ'' کے اندر ہی دو زانو بیٹھا تھا اور ریفری ایک دوسرے شخص کے ساتھ مل کر اس کے

ٹوٹے کندھے کو ایک عارضی بینڈ تیج میں لپیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک واجد احمد، کمانڈو پر ٹوٹ پڑا۔ عالم طیش میں چلاّتے ہوئے اس نے کمانڈو کو ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ میں دوبارہ لپک کر ''رنگ'' میں داخل ہو گیا۔ عمران بھی میرے ساتھ تھا۔ عمران نے پکار کر کہا۔ ''اِٹ از ناٹ فیئر واجد صاحب۔ اس کا بازو ٹوٹ گیا ہے...... ہار مان لی ہے اس نے......''

''اس کمینے کی ایک ایک ہڈی توڑ دوں گا میں۔ اس کو جرأت کیسے ہوئی۔'' واجد چلاّیا اور کمانڈو کو سر کے بالوں سے جکڑ کر اس کے منہ پر گھونسے برسانے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ گرج رہا تھا۔ ''تجھے کہا تھا نا...... تجھے کہا تھا نا۔''

واجد کے ساتھ آنے والے دو تنومند شخص بھی اس مار پیٹ میں شامل ہو گئے۔ یہ زیادتی تھی۔ میں نے واجد کو روکا۔ ''یہ ٹھیک نہیں ہے۔ آپ لوگ چھوڑ دیں اِسے۔ فیصلہ ہو گیا ہے۔''

''فیصلے کی ایسی کی تیسی۔'' واجد احمد پھنکارا۔ ''فیصلہ تو اب ہو گا۔ اس کمانڈو بدمعاش کو زندہ لاش نہ بنا دیا تو نام نہیں میرا۔'' اس نے ایک اور طوفانی ٹھوکر کمانڈو کے ٹوٹے کندھے پر رسید کی۔

وہ اذیت کی شدت سے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ ایک سخت مقابلے کے بعد اس میں اب اتنی سکت کہاں تھی کہ اپنا دفاع کر سکتا۔ میں نے ایک بار پھر واجد کو روکنے کی کوشش کی تو اس کے ایک مسلح ساتھی نے مجھے بھی دھکا دیا۔ ''اپنے ہاتھ پیچھے ہٹاؤ سر جی سے۔'' وہ گرجا۔

میرا دماغ بھی چیخ گیا۔ میں نے اسے الٹے ہاتھ کا تھپڑ مارا تو واجد احمد مجھ پر دہاڑنے لگا۔ ''کون ہو تم؟ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ نیچے اترو ''رنگ'' سے۔ یہ ہمارا معاملہ ہے، ہم خود نمٹیں گے۔''

بالکل غیر متوقع طور پر واجد احمد کے ساتھی نے جیکٹ کے اندر سے پسٹل بھی نکال لیا۔ جی تو چاہا کہ اِس ناعاقبت اندیش کو پستول دکھانے کا مزہ چکھا دوں مگر عمران نے مجھے بازوؤں میں جکڑ کر روک لیا۔ یہی وقت تھا جب میں نے تین چار مزید افراد کو اندر آتے دیکھا۔ ان میں دو شلوار قمیص اور کوٹ والے ہٹے کٹے افراد کو میں نے فوراً پہچان لیا اور ٹھٹک گیا۔ ان میں سے ایک ہمارے ایس ایس پی چیمہ صاحب تھے۔ وہ سیدھا ہماری ہی طرف آئے۔ تب تک واجد نے مجھے گھورنا بند نہیں کیا تھا۔

''کیا ہوا ہے واجد صاحب؟'' ہمارے چیمہ صاحب نے واجد کو بڑے دوستانہ لہجے میں مخاطب کیا۔

دو منٹ کے اندر اندر واضح ہو گیا کہ چیمہ صاحب یہاں واجد احمد کے مددگار بن کر آئے ہیں۔ انہوں نے بھی کمانڈو کے بارے میں وہی زبان بولنا شروع کر دی تھی جو اس سے پہلے واجد احمد بول رہا تھا۔ چیمہ صاحب نے مجھے اور عمران کو ہال سے باہر جانے کی ہدایت کی۔ ان کی بات ماننے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میں اور عمران باہر آ گئے۔ کمانڈو ابھی تک رِنگ میں چت پڑا تھا اور اسے ٹھڈے وغیرہ مارے جا رہے تھے۔

ہال سے باہر آ کر ہم دونوں اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ واجد احمد کا رویّہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی تھی۔ وہ بڑی کم ظرفی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ایک گرے ہوئے شخص کو زدوکوب کر کے ''چیمپئن'' بننے کی کوشش میں تھا وہ۔ تب ہم نے ایک اور منظر دیکھا جس نے دل و دماغ میں کچھ اور چنگاریاں بھر دیں۔ واجد احمد کے بندے کمانڈو کو ٹھنڈے فرش پر باقاعدہ گھسیٹتے ہوئے ایک لگژری اسٹیشن وین کی طرف لا رہے تھے۔ اس کی بنیان پھٹ چکی تھی۔ جسم لہولہان تھا۔ وہ نیم بے ہوش لگتا تھا۔ اسے وین میں پھینکا گیا۔ پھر سب گاڑیاں یکے بعد دیگرے وہاں سے رخصت ہو گئیں۔

''کیا خیال ہے۔ پولیس اسٹیشن لے کر جائیں گے؟'' عمران نے پوچھا۔

''پتا نہیں۔ یہ چیمہ صاحب تو علیحدہ گاڑی میں یہاں سے نکلے ہیں۔''

''لگ تو یہی رہا ہے کہ واجد احمد پہلے سے کمانڈو کو جانتا ہے۔ شاید وہی رقابت کا چکر ہی ہو۔'' عمران نے خیال ظاہر کیا۔

''اس بارے میں تو راشد اور اس کے گھر والے ہی بتا سکتے ہیں۔''

عمران نے وہیں بیٹھے بیٹھے حسنات صاحب کو فون کیا اور انہیں یہاں کی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ فون کا اسپیکر آن تھا۔ حسنات صاحب کی آزردہ آواز سنائی دی۔ ''ہاں واجد بیٹا آج شام ہی انگلینڈ سے لوٹا ہے۔ وہ سخت غصے میں تھا۔ مجھے پہلے ہی ڈر تھا کہ کوئی اس طرح کا واقعہ ہو جائے گا۔''

عمران نے کہا۔ ''یہ آپ کے ہونے والے داماد صاحب نے کچھ اچھا نہیں کیا...... ہم نے کمانڈو کے ساتھ معاملہ بالکل سیٹل کر لیا تھا۔ ہمارے خیال میں تو واجد کے یہاں آنے سے خرابی ہی ہوئی ہے۔''

''کیا واجد اور کمانڈو میں پہلے بھی کوئی رابطہ ہوا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

میرے سوال کے جواب میں حسنات صاحب نے نحیف آواز میں جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ کراچی میں کسی طرح کمانڈو کو اس رشتے کے بارے میں پتا چل گیا تھا۔ اس وقت وہ جیل میں تھا۔ اس نے اپنے ایک دوست کے ذریعے واجد کو ٹیلی فون پر سخت دھمکیاں دی تھیں۔ ایک دو مرتبہ فون پر ہی گالی گلوچ کی نوبت بھی آئی تھی۔''

حسنات صاحب ظاہر ہے ہونے والے داماد کی سائڈ ہی لے رہے تھے مگر داماد صاحب نے یہاں اسپورٹس کمپلیکس میں جو کچھ کیا تھا، وہ ہمیں ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز اتوار تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں دوپہر کے وقت عمران کے گھر پہنچ گیا۔ رات والے واقعے کی وجہ سے اس کی شوخی ماند پڑی نظر آتی تھی۔ ہم کمانڈو اور واجد احمد کے بارے میں ہی بات کر رہے تھے جب زریں نے آکر عمران کو اطلاع دی کہ ایک برقع پوش لڑکی آپ سے ملنے آئی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ آپ سے اکیلے میں کوئی بات کرنی ہے۔
''کہیں یہ کمانڈو والا کوئی چکر ہی تو نہیں؟'' عمران نے دیدے گھمائے۔

مجھے بھی کچھ شک سا ہو رہا تھا۔ میں ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ عمران نے اس لڑکی کو اندر بلوالیا۔ سیاہ برقع میں سے فقط اس کی آنکھیں ہی نظر آتی تھیں...... میں دروازے کی باریک جھری میں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھ سے فقط دس فٹ کے فاصلے پر بیٹھی تھی لیکن جب تک وہ بولی نہیں مجھے بالکل پتا نہیں چلا کہ وہ صوفیہ ہے۔ اس کا پورا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ اس نے بڑی دھیمی آواز میں اپنا تعارف کرایا پھر سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔ ''ہیرو بھائی! آپ ایک مسیحا کی طرح ہمارے علاقے میں آئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس سے پہلے آپ کے والد تھے جو اسی طرح لوگوں میں گھل مل کر ان کے دکھ درد بانٹتے تھے اور ان کی دعائیں لیتے تھے...... میں...... آپ سے بھی ایسی ہی امید لے کر آئی ہوں۔''

کچھ مزید تمہید باندھنے کے بعد وہ بولی۔ ''بھائی! مجھے ڈر ہے کہ واجد اس کو کوئی بڑا نقصان پہنچا دیں گے۔ یہ دشمنی کسی کے لیے اچھی نہیں ہوگی۔''

میری طرح یقیناً عمران بھی یہی سمجھا کہ وہ اپنے ہونے والے شوہر کو کسی سنگین جھگڑے سے بچانا چاہتی ہے...... لیکن اس کی گفتگو سے جو انکشاف ہوا وہ ششدر کر دینے والا تھا۔ وہ اپنے ہونے والے شوہر سے کہیں زیادہ شاہنواز عرف کمانڈو کے لیے فکر مند تھی۔ مجھے عمران کے چہرے پر بھی حیرت کے آثار نظر آئے۔ وہ بولا۔ ''آپ کی بات کچھ سمجھ میں نہیں آرہی۔ اس شخص نے تو آپ کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اس کی وجہ سے آپ لوگ کراچی چھوڑ کر یہاں آئے۔''

وہ سسکی۔ ''بھائی! آپ کو پوری طرح نہ جانتے ہوئے بھی آپ پر...... سگے بھائیوں کی طرح اعتماد کر رہی ہوں۔ ہاتھ جوڑ کر آپ سے کہتی ہوں کہ آپ میرا پردہ رکھنا......'' اس نے برقع کے اندر ہی ہاتھ جوڑ دیے۔ عمران نے اسے تسلی دی۔ ''وہ بُرا ہے لیکن اتنا بُرا نہیں جتنا اسے سمجھا جا رہا ہے۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔ اس کا اشارہ یقیناً شاہنواز کمانڈو کی طرف تھا۔

''آپ یہ کس طرح کہہ رہی ہو...... میری سمجھ میں نہیں آرہا۔'' عمران بولا۔ ''کچھ بھی ہے یہ شخص جرائم پیشہ ہے۔ ایک سنگین جرم میں جیل کاٹ کر آیا ہے اور اب باہر آتے ساتھ ہی......''

''میں نے کہا ہے نا وہ بُرا ہے لیکن اس کی برائی کے پیچھے کچھ باتیں چھپی ہوئی ہیں آپ...... آپ ہیرو بھائی! اس کے جیل کاٹنے کی بات کر رہے ہیں۔ لوگوں کی نظر میں یہ ایک بڑا جرم ہے لیکن ہم جانتے ہیں اور خاص طور سے میرا بھائی راشد جانتا ہے کہ یہ جرم کیسے ہوا؟''

وہ بتانا چاہ رہی تھی اور ہچکچا بھی رہی تھی۔ آخر عمران کی بے لوث ہمدردی نے اسے بولنے پر آمادہ کر دیا۔ آہیں بھرتے ہوئے لرزاں آواز میں اس نے جو کچھ بتایا، وہ چشم کشا تھا۔ اس کے بھائی راشد کی معذوری اور بیماری کے پیچھے ایک چھوٹی سی پُردرد کہانی تھی۔ وہ چھت سے پھسل کر نہیں گرا تھا۔ اس نے سخت ڈپریشن اور مایوسی کے عالم میں خودکشی کی کوشش کی تھی۔ کالج کے دور میں وہ ایک پری چہرہ لڑکی کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہوا۔ اس کے بغیر جینا اسے ناممکن نظر آنے لگا لیکن وہ اپنے عشق میں اکیلا تھا۔ وہ تو ہرجائی تھی۔ پھول پھول منڈلانے والی تتلی۔ سوشل میڈیا پر اپنے حسن کے لشکارے دکھا کر کئی لڑکے پھانس چکی تھی۔ راشد اس الیے سے قطعی بے خبر تھا اور جب اسے خبر ہوئی وہ یہ ناقابلِ یقین صدمہ جھیل نہیں سکا۔ پہلے اس بے وفا سے اپنی بربادی کے شکوے کرتا رہا پھر نشہ آور گولیاں کھائیں اور چھت سے کود گیا۔ اس کی بدقسمتی نے اسے زندگی اور موت کے درمیان لٹکا دیا۔ اس لڑکی کا نام شمسہ تھا۔ وہی شمسہ جو

بعدازاں کمانڈو کے غضب کا شکار ہوئی۔ دوسری طرف کمانڈو اور صوفیہ والا معاملہ بھی چل رہا تھا۔ کمانڈو، صوفیہ کا محلے دار ہی تھا۔ صوفیہ اس کو اچھی لگتی تھی۔ وہ اسے تا کتا تھا اور آہیں بھرتا تھا لیکن یہ سب کچھ بھی تقریباً یک طرفہ ہی تھا۔ پڑھی لکھی شریف گھرانے کی صوفیہ، کمانڈو کی پیش قدمیوں کا جواب کیسے دے سکتی تھی۔ وہ ڈری سہمی رہتی تھی۔

جب یہ راشد والا واقعہ ہوا اور پری چہرہ شمسہ کی بے وفائی سے ٹوٹ کر راشد نے زندگی ختم کرنا چاہی تو کمانڈو کو بھی اس بات کا دکھ ہوا۔ اس نے شمسہ کی ٹوہ لگائی اور اسے معلوم ہوا کہ وہ تو اپنی خوب صورتی کو ایک ہتھیار کی طرح استعمال کرتی پھرتی ہے۔ کھاتے پیتے گھرانوں کے کئی لڑکوں کو تباہ حال کر چکی ہے۔ وہ اس کے درپے ہو گیا۔ اس پر تیزاب پھینکنے کی دھمکیاں دیں۔ جب وہ اپنے چلن سے باز نہ آئی تو ایک دن اس نے اسے اٹھا لیا اور درگت بنا ڈالی۔ شروع میں کمانڈو پر یہ الزام بھی لگا کہ اس نے شمسہ کی عزت لوٹی ہے لیکن بقول صوفیہ یہ سچ نہیں تھا۔ اس سزا کے خلاف کمانڈو نے ہائی کورٹ میں اپیل کر رکھی تھی۔ (اس کی جلدی رہائی کی وجہ بھی اس اپیل کا منظور ہونا تھا)

اپنے بھائی کی رُوداد سناتے سناتے صوفیہ کی آنکھوں سے تارآنسو بہنے لگے۔ اس کے زیریں چہرے کا نقاب تر نظر آ رہا تھا۔ رُوداد ختم ہوئی تو وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔

عمران یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا پھر اس نے اچانک صوفیہ سے ایک نہایت اہم سوال پوچھ ڈالا۔ ”ایک بات بالکل سچ بتانا صوفیہ! کیا تم بھی کمانڈو کے لیے اپنے دل میں جگہ رکھتی ہو؟ میرا مطلب ہے اُسے پسند کرتی ہو؟“

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بھائی! میں جانتی ہوں، اس کی اور میری دنیا الگ ہے اور سچ یہی ہے کہ میں نے کبھی اسے اس نظر سے نہیں دیکھا..... لیکن میں اس بات سے انکار نہیں کر سکتی کہ اس کے لیے میرے دل میں ہمدردی ہے۔ کہنے والے اس کے بارے میں کچھ بھی کہتے رہیں لیکن کراچی میں اس نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہ کی جس کی وجہ سے مجھے دوسروں کے سامنے شرمندگی اٹھانا پڑی ہو۔“

عمران نے کہا۔ ”لیکن یہ بات بھی تو ہے کہ اس کی وجہ سے تم لوگوں کو نقل مکانی کر کے یہاں لاہور آنا پڑا۔“

”بس اس کا میرے آس پاس رہنا۔ ہمارے گھر کے سامنے ایک پان شاپ پر کھڑے رہنا۔ آتے جاتے مجھے گھورنا..... یہ سب کچھ پریشان کن تھا۔ اُڑانے والوں نے یہاں تک خبر اُڑا دی تھی کہ وہ میرا رشتہ مانگے گا اور انکار پر اٹھا کر لے جائے گا۔“

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اب تم کیا چاہتی ہو؟“

وہ لرزاں آواز میں بولی۔ ”ہیرو بھائی! واجد مزاج کے بڑے سخت ہیں۔ پولیس میں بھی ان کی لمبی چوڑی واقفیت ہے۔ وہ اس کے ساتھ بہت کچھ کر سکتے ہیں، کہیں.....“ وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔ صورتِ حال اب کافی حد تک واضح ہوتی جا رہی تھی۔

میرے دل میں جو بات آ رہی تھی، وہی عمران نے صوفیہ سے پوچھ لی۔ ”صوفیہ! لگتا ہے کہ تم اپنے ہونے والے شوہر سے کچھ خوف زدہ بھی ہو۔ اگر ایسا ہے تو پھر یہ شادی کیوں ہونے والی ہے؟“

ایک دو سیکنڈ کے لیے یوں لگا کہ وہ اس بارے میں بہت کچھ کہے گی۔ پھٹ پڑے گی مگر پھر وہ اپنے سیاہ برقع کے اندر ہی جیسے تڑپ کر اور کسمسا کر رہ گئی۔ وہی تڑپ اور کسمساہٹ جو ہمیشہ سے مشرقی عورت کا نصیب رہی ہے۔

☆☆☆

رات کے دس بجے تھے، میں اور عمران کلٹس کار میں ایک ہاؤسنگ سوسائٹی کی نسبتاً خاموش سڑک پر موجود تھے۔ سڑک کی دوسری طرف قریباً دس مرلے کی ایک کوٹھی ہماری نگاہوں کا مرکز تھی۔ اس کوٹھی سے باہر سرخ رنگ کی ایک ہنڈا کار موجود تھی۔ یہ کار واجد احمد کی ہی ملکیت تھی۔ اس کوٹھی کے بارے میں ہمیں صوفیہ سے ہی پتا چلا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا تھا کہ اس کا ہونے والا شوہر کبھی کبھی اس مضافاتی کوٹھی میں بھی ایک آدھ دن کے لیے رہائش رکھتا ہے، اس نے کھل کر تو نہیں بتایا تھا لیکن اس کی باتوں سے پتا یہی چلا تھا کہ اکثر امیر زادوں کی طرح واجد احمد بھی اس جگہ کو تفریح اور عیش و عشرت کے لیے استعمال کرتا ہوگا۔ پچھلے دس بارہ گھنٹوں میں ہمیں واجد احمد کے بارے میں اور بھی کافی کچھ معلوم ہوا تھا۔ وہ ایک شریف کاروباری شخص کا کرپٹ بیٹا تھا۔ شہرت اچھی نہیں تھی۔ پولیس کے حوالے سے اس پر ایک دو کیس تھے۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ لیدر جیکٹس کی ایکسپورٹ کی آڑ میں وہ غیر قانونی کام بھی کرتا تھا۔

ہمیں اس ہاؤسنگ سوسائٹی میں مذکورہ کوٹھی کے سامنے کھڑے اب ایک گھنٹا ہونے کو آیا تھا۔ واجد احمد کی کار چونکہ کوٹھی سے باہر ہی آڑی ترچھی کھڑی تھی لہٰذا ہمارا

اندازہ یہی تھا کہ وہ جلد ہی یہاں سے چلا جائے گا۔ ہم تب ہی اندر جا کر صورتِ حال کا جائزہ لے سکتے تھے۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق ہمیں پتا چل گیا تھا کہ کمانڈو پولیس کی تحویل میں نہیں ہے۔ غالب امکان یہی تھا کہ واجد احمد نے اپنے اس ”رقیب“ کو اسی کوٹھی میں بند کر رکھا ہے۔ عین ممکن تھا کہ اس نے اس کوٹھی کو اس کے لیے ”نجی ٹارچر سیل“ کی حیثیت دے دی ہو۔

عمران نے طویل جماہی لیتے ہوئے کہا۔ ”چاچو جانی! مجھے تو لگتا ہے کہ اس لفنڈر نے اندر جاتے ہی الجبرے کا کوئی طویل سوال حل کرنا شروع کر دیا ہے...... ایکس تھری جمع فور ایکس جمع فائیو ایکس، منفی انرجی مع سستی مساوی لمبی نیند...... میرا مطلب ہے کوئی لڑکی شڑکی ہو گی اندر......“

”اگر ایسی بات تھی تو وہ گاڑی کو اس طرح باہر ہی کیوں کھڑا کر گیا۔“

”ہو سکتا ہے کہ اسے چڑھی ہوئی ہو۔ وہ اندر جاتے ہی الجبرے کے سوال پر گر پڑا ہو۔“ وہ بھویں اچکا کر بولا۔ ”بولتے ہوئے اس کا انداز بالکل عمران دانش جیسا ہو جاتا تھا۔

میں نے کہا۔ ”ذرا غور سے سنو۔ کوٹھی کے اندر چھت پر کوئی ٹینکی ’اوور فلو‘ ہو رہی ہے۔ پانی آدھ پون گھنٹے سے مسلسل گر رہا ہے۔ اسے بند نہیں کیا گیا۔ ایسا کیوں ہے؟“

وہ دھیان سے میری طرف دیکھنے لگا۔ چند سیکنڈ کے اندر ہم نگاہوں ہی نگاہوں میں جیسے ایک فیصلے پر پہنچ گئے۔

میرے کوٹ کی اندرونی جیب میں لوڈڈ پستول موجود تھا۔ گاڑی لاک کر کے ہم دروازے پر پہنچے۔ باؤنڈری وال کے اوپر سے جھانک کر اندر کا جائزہ لیا۔ چہار سو ایک پُراسراری خاموشی تھی۔ ادھر اُدھر دیکھ کر عمران نے احتیاط سے چار دیواری پھاندی اور اندر جا کر چھوٹا دروازہ کھول دیا۔ میں بھی اندر چلا گیا۔ ہم احتیاط سے اندرونی حصے کی طرف بڑھے۔ پچھلے صحن میں پانی کے گرنے کی آواز کے سوا کوئی صدا نہیں تھی۔ اندر کہیں لینڈ لائن فون کی بیل مسلسل بج رہی تھی۔ داخلی دروازہ کھلا تھا، ہم احتیاط سے اندر چلے گئے۔ پوری کوٹھی میں بظاہر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا پھر کچھ مدھم آہٹیں سنائی دیں۔ یہ بیسمنٹ کے بند دروازے کے عقب سے آ رہی تھیں۔ ہم اس بیسمنٹ میں داخل ہوئے اور ہکا بکا رہ گئے۔ جو کچھ نظر آیا اس پر یقین کرنے میں کئی سیکنڈ لگ گئے۔

طریقہ

پاگل خانے کا دورہ کرنے والے ایک وزیر نے وہاں کے نگران سے پوچھا۔ ”آپ یہ جاننے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ کوئی پاگل اس حد تک صحت یاب ہو گیا ہے کہ اسے پاگل خانے سے ڈسچارج کر دیا جائے؟“

انچارج نے سنجیدگی سے بتایا۔ ”ہم ایک بڑے حوض میں پانی کا نل کھول دیتے ہیں۔ حوض میں پانی بھرنے لگتا ہے تو ہم چند منتخب ذہنی مریضوں کو حکم دیتے ہیں کہ وہ حوض کو خالی کر دیں۔ وہ بالٹیاں بھر بھر کر پانی نکالنا شروع کر دیتے ہیں مگر حوض میں پانی مزید بھرتا رہتا ہے۔ جو مریض ذہنی طور پر صحت یاب ہو چکا ہوتا ہے وہ بالٹیوں سے پانی نکالنے کے بجائے نل بند کر دیتا ہے اور ہمیں اس کے ٹھیک ہونے کا پتا چل جاتا ہے۔“

”کمال ہے۔“ وزیر صاحب حیرت سے بولے۔ ”یہ طریقہ تو میرے ذہن میں بھی نہیں آیا تھا۔“

نازجی اینڈ سوہا جی، لاہور

ہم نے کمانڈو کو دیکھا۔ وہ ایک کرسی کے ساتھ بڑی مضبوطی سے بندھا ہوا تھا۔ پورا جسم زخم زخم تھا۔ ہونٹ سوج کر لٹک گئے تھے۔ اس کے جسم پر صرف وہی ٹراؤزر تھا جو مجھ سے ”باکسنگ فائٹ“ کے وقت اس نے کمپلیکس میں پہن رکھا تھا۔ تہ خانے کے شفاف فرش پر دو خونچکاں جسم نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک واجد احمد کا تھا۔ اس کے قریب اس کا وہی تنومند ساتھی پڑا تھا جس نے دو دن پہلے اسپورٹس کمپلیکس میں بھی مجھ پر پسٹل نکالا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اندازہ ہوا کہ اسے گولیاں لگی ہیں اور وہ زخمی حالت میں بے ہوش پڑا ہے۔ ہم آگے بڑھے تو واجد احمد کو بھی زیادہ وضاحت سے دیکھنے میں کامیاب ہوئے۔ وہ ”زخمی“ نہیں تھا۔ وہ مر چکا تھا۔ کم از کم تین گولیاں اس کے سینے اور سر میں لگی تھیں۔ یہ جس مہلک ہتھیار کی گولیاں تھیں یہ وہی چھوٹے سائز کا ”جیکل مشین پسٹل“ تھا جس کی ایک جھلک مجھے واجد کے ساتھی کے پاس کمپلیکس میں نظر آئی تھی۔ اس پسٹل کے بیرل پر سائیلنسر بھی نظر آ رہا تھا۔ تہ خانے کے اس سارے

منظر نے ہمیں سکتہ زدہ سا کر دیا۔
کمانڈو کراہ رہا تھا اور خود کو مضبوط رسی کی بندشوں سے چھڑانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔
دو تین منٹ میں ہم پر قریباً سبھی کچھ واضح ہو گیا۔ واجد احمد نے اپنے جذبۂ رقابت کی قرار واقعی تسکین کے لیے اس تہ خانے کو کمانڈو کے لیے عقوبت گاہ بنا رکھا تھا۔ یقینی بات تھی کہ وہ اسے جان سے نہ بھی مارتا تو ہاتھ پاؤں توڑ کر عبرت کی مثال بنا دیتا...... لیکن...... کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹا پہلے اس تہ خانے میں ایک غیر متوقع واقعہ اچانک پیش آ گیا۔ واجد احمد اور اس کا ساتھی غیور اختر جب کمانڈو کو بے رحمی سے زدوکوب کر رہے تھے اور سگریٹس سے داغ رہے تھے۔ اچانک کمانڈو اپنا دایاں سلامت ہاتھ غیور کی جیکٹ کے نیچے اس کے مشین پسٹل تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ بندھے ہوئے ہاتھ کے ساتھ ہی وہ پسٹل کا رخ پھیرنے اور اس کا ٹریگر دبانے میں کامیاب ہو گیا۔ اسے بھی پتا نہیں تھا کہ پسٹل کا میکنزم ''برسٹ'' پر سیٹ ہے اور ٹریگر دبانے کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ پسٹل سے چلنے والے ایک ہی برسٹ نے واجد کا کام تمام کیا اور اس کے کارندے کو شدید گھائل کر دیا۔
قبضے میں لینے کے بعد ہم نے نیم جان شاہنواز عرف کمانڈو کی بندشیں کھولیں۔ اس کا ٹوٹا ہوا بازو توری کی طرح لٹک رہا تھا۔ وہ قابلِ رحم حالت میں تھا۔ مردہ واجد احمد کے کوٹ کے اندر اس کا سیل فون مسلسل شور مچا رہا تھا۔ گاہے بگاہے بے ہوش غیور کے سیل فون کی بیل بھی ہونے لگتی تھی۔ یہ بات بالکل واضح تھی کہ کچھ ہی دیر میں اس تہ خانے میں واجد کے قتل کا راز کھلنے والا ہے۔ عین ممکن تھا کہ دوسرا شخص بھی جانبر نہ ہو سکتا۔ مطلب یہ تھا کہ ٹریگر کے دبنے کا حتمی نتیجہ، کمانڈو کی سزائے موت کی صورت میں نکلنے والا تھا۔ میری نگاہوں میں صوفیہ کی صورت آئی اور میرے کانوں میں اس کے الفاظ گونج گئے۔ اس نے کہا تھا۔ ''وہ بُرا ہے لیکن اتنا بھی بُرا نہیں جتنا اسے سمجھا جا رہا ہے......'' میں نے اور عمران نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور جیسے ایک لمحے میں ایک فیصلے پر پہنچ گئے...... (ایسے دلیرانہ فیصلوں تک پہنچنے میں عمران دانش بھی تو فقط چند سیکنڈ ہی لگایا کرتا تھا)
عمران نے اپنے قریبی ساتھی زریں خاں کو فون کیا کہ وہ اپنی گاڑی لے کر پندرہ منٹ کے اندر اندر ہاؤسنگ سوسائٹی پہنچے...... کسی کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہم کمانڈو کو یہاں سے نکالنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

☆☆☆

زریں خاں کے پہنچنے تک ہم نے بڑی تیزی اور احتیاط کے ساتھ یہاں اپنی موجودگی کے سارے ثبوت ختم کر دیے تھے۔ واجد کا ساتھی مسلسل بے ہوش تھا۔ اس کے پیٹ میں دو گولیاں لگی تھیں۔ ایک زخم زیادہ سنگین نہیں تھا۔
ہم نے کمانڈو کو نیا لباس دینے اور اسے تہ خانے سے نکالنے میں دس منٹ سے زیادہ نہیں لگائے۔ عمران نے زریں خاں کو فون پر ہی سب کچھ بڑی اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ اب وہ کمانڈو کو قبائلی علاقے تک پہنچانے کا ذمے دار تھا۔ وہاں کمانڈو کو روپوش ہونے کے لیے خود کوشش کرنا تھی، اور امید تھی کہ وہ ایسا کر لے گا کیونکہ وہاں اس کا ایک پرانا ''لنک'' موجود تھا۔
جب نڈھال کمانڈو رخصت ہونے لگا تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''شاہنواز! تم جانتے ہو ہم تمہاری یہ مدد کیوں کر رہے ہیں؟'' اس نے جواب نہیں دیا۔ بس سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے کہا۔ ''اس لیے کہ اپنی تمام تر برائیوں کے باوجود تم نے ''فائٹ'' میں ایک اچھے اسپورٹس مین کی طرح اپنی شکست تسلیم کی اور تمہارے رویّے سے ہمیں یہ عندیہ ملا کہ تم اپنا وعدہ نبھاؤ گے اور اب بھی، کسی بھی طرح صوفیہ کی زندگی میں دخل اندازی نہیں کرو گے۔''
اس نے سر جھکا لیا...... چند لمحے بعد اس نے اپنے سر کو خفیف حرکت دی۔ یہ اثباتی حرکت تھی۔ اس کی آنکھ میں اُمڈنے والا ایک آنسو اس کی جھولی میں گرا...... کچھ ہی دیر بعد وہ زریں خاں کے ساتھ ہائی روف گاڑی میں بیٹھ چکا تھا پھر گاڑی کے پہیے چرچرائے اور وہ تیزی سے روانہ ہو گئی۔ ہم جانتے تھے۔ اب ہمارا بھی یہاں سے نکلنے کا وقت ہے۔ دور کہیں کسی پولیس کار کا سائرن سنائی دینے لگا تھا۔
بے شک صوفیہ اپنے چاہنے والے آوارہ گرد کو کچھ اور نہ دے سکی تھی، لیکن آخر میں وہ اس کی زندگی کا وسیلہ تو بن ہی گئی تھی۔ دوسری طرف وہ بھی جاتے جاتے اسے ایک اندھے کنویں میں گرنے سے بچا گیا تھا۔ تہ خانے کے چمکیلے فرش پر واجد احمد ''لاش کی صورت'' پڑا تھا۔ ہم دونوں کے ذہن میں صوفیہ کے بھائی راشد کے نہایت مہنگے آپریشن کے حوالے سے سوالات موجود تھے۔ اس سلسلے میں عمران تہیہ کر چکا تھا کہ وہ اس کام کو آسان بنانے کی بھرپور کوشش کرے گا اور مجھے پتا تھا کہ وہ یہ کر لے گا۔

❖❖❖



رسید کی گواہی

تنویر ریاض

ہر انسان کی کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ ایسی کمزوری کہ وہ جس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور خود کو بے بس محسوس کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جو محبت کرتے ہیں، وہ محبت کی دھند میں لپٹے ہوتے ہیں... ان سے فیصلے کرنے کے اختیارات چھین لینے چاہئیں... ایک ایسے ہی بے بس شخص کا ماجرا جس نے دل کا کہا مانتے ہوئے اپنی کمزوری عیاں کردی تھی...

قتل کی ایک مکمل واردات جس کا سراغ لگانا مشکل تھا......

وہ ساحلِ سمندر پر پانی میں پاؤں بھگوئے بیٹھی..... تھی۔ اس کے چہرے سے خوف جھلک رہا تھا... لگتا تھا کہ جیسے وہ کافی دیر تک روتی رہی ہے۔ مجھے اس پر ہمیشہ سے زیادہ پیار آ رہا تھا۔ اس نے صرف گلابی رنگ کا باریک گاؤن، کاٹن کا کرتہ اور چیک کا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ وہ سیاہ بالوں والی تیس سال کی خوب صورت لڑکی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ کام مکمل ہوگیا ہے۔" میں اپنی آواز کی لرزش پر قابو نہ پاسکا کیونکہ میں نے ایک ناخوشگوار فرض

انجام دیا تھا۔ ”میں نے لاش وہاں سے ہٹا دی ہے اور خون صاف کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے فریج کی صفائی کر کے سب چیزیں اپنی کار کی ڈکی میں رکھ دی ہیں اور بستر بھی ٹھیک کر دیا ہے۔ میں نے اس گھر کے تمام کمرے دیکھ لیے ہیں، وہ اپنی اصلی حالت میں نظر آ رہے ہیں۔“

میں اس کے برابر بیٹھ گیا اور اپنا بازو اس کے گلے میں ڈال دیا۔ اس نے میری پیش قدمی کا گرم جوشی سے جواب دیا اور مجھ سے لگ کر بیٹھ گئی۔ یہ ایک خوشگوار احساس تھا۔

”میں نہیں جانتی کہ کس طرح تمہارا شکریہ ادا کروں۔“ وہ میرے سینے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔

”اس کی ضرورت نہیں۔“

اس نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔ ”تم نے فلپ کے ساتھ کیا کیا؟“

میں نے اسے گھر کے برابر میں ایک متروکہ فارم کے ناکارہ گڑھے میں دفن کر دیا تھا۔ اس میں مجھے کافی مشکل پیش آئی کیونکہ وہ خاصا وزنی تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیا تم واقعی جاننا چاہتی ہو؟“

اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا میں محفوظ ہوں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ”میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ اگر ہم پُرسکون اور محتاط رہیں۔“

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔ ہم دونوں ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھتے رہے۔ فضا میں خنکی بڑھ رہی تھی اور میں نے محسوس کیا کہ وہ تھوڑا کپکپا رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”اب چلنا چاہیے، ہمیں جانے سے پہلے ایک دو کام کرنا ہوں گے۔“

”کون سے کام؟“

”میں چاہتا ہوں کہ ہم کاٹیج میں جا کر اسے ایک دفعہ اور چیک کر لیں۔“

لمحہ بھر کے لیے وہ خوف زدہ نظر آئی۔ ”میں نہیں جانتی کہ وہاں جا سکوں گی۔“

”تمہیں جانا ہوگا ہمیشہ ایک سے دو بہتر ہوتے ہیں۔“

اس کی سمجھ میں میری بات آ گئی۔ ”اس کے علاوہ اور کیا کرنا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”اپنی کار بھی یہاں سے لے جاؤ۔“ گو کہ وہ ایک عام سلور کلر کی بی ایم ڈبلیو تھی اور فوری طور پر کسی کی نظر میں نہیں آ سکتی تھی۔ ایسی لاکھوں کاریں سڑکوں پر نظر آتی ہیں۔

”ہم اسے کہیں دور لے جائیں گے۔“

”نہیں، صرف تم کار چلاؤ گی، تمہیں یاد نہیں کہ میں اپنی کار میں یہاں آیا تھا۔“

اس کے چہرے پر ایک اُداس مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ”ہاں یاد ہے۔“

”وہ تقریباً ایک میل کے فاصلے پر کھڑی ہے۔ تم مجھے وہاں تک چھوڑ سکتی ہو۔“

”اس کے بعد ہم کہاں جائیں گے؟“ اس نے کہا۔

”کہیں بھی، پہلے تو یہاں سے نکلنا ہے۔“

”لیکن یہاں سے جانے کے بعد ہماری ملاقات کہاں ہوگی؟“

وہ کچھ زیادہ ہی بے تاب ہو رہی تھی۔ ”ہماری ملاقات کسی اور جگہ ہوگی۔ وہ کوئی سروس اسٹیشن بھی ہو سکتا ہے۔“

”کون سا؟“

وہ بچوں کی طرح سوالات کر رہی تھی۔ میں نے یونہی موٹروے کے کنارے ایک سروس اسٹیشن کا نام لے دیا تو وہ مطمئن ہو گئی۔ اس کے بعد ہم کاٹیج واپس آ گئے۔

☆☆☆

میں نے اپنی کمر کا درد چھپانے کی کوشش کی لیکن اس نے میرے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھ لیے جب میں جھک کر کچن کے نیچے دیکھ رہا تھا۔

”تم ٹھیک تو ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”نہیں، تم تکلیف میں ہو۔“

”یہ محض ہلکی سی ٹیس تھی......“

”کیونکہ......“ وہ براہِ راست کچھ کہنے سے کترا رہی تھی۔ ”کیونکہ تم نے جو کچھ میرے لیے کیا۔“

میں نے کندھے اچکا دیے۔ ”تمہیں بتا دینا چاہیے تھا کہ تمہاری کمر میں تکلیف ہے۔“

”فی الحال اس بات کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس وقت ہمیں یہ اطمینان کرنے کی ضرورت ہے کہ یہاں اختتام ہفتہ تمہاری موجودگی کا کوئی ثبوت نظر نہ آئے۔ یہ معاملہ زیادہ اہم ہے۔“

اس نے مزید کچھ نہیں کہا اور ہم اپنے کام میں لگ گئے۔

تیس منٹ بعد ہم کچن میں واپس آئے۔ اس نے خوف زدہ انداز میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”او میرے خدا، یہاں بہت زیادہ خون تھا۔“

میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب تو سب

پھ نارمل لگ رہا ہے؟''
اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔
اس نے ایک بار پھر اس جگہ کا جائزہ لیا اور سر ہلاتے ہوئے بولی۔''میرا بھی یہی خیال ہے۔''
میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔''ٹھیک ہے پھر ہمیں چلنا چاہیے۔''

☆☆☆

پانچ منٹ بعد جب ہم بڑی سڑک پر آئے تو اس نے پوچھا۔''کیا تم نہیں جاننا چاہتے کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟''
میں نے ریڈیو آن کیا۔ اس وقت میرا پسندیدہ میوزک بج رہا تھا۔ اس لیے میں نے صرف اتنا کہا۔''بعد میں۔''
''میں نے کچھ نہیں کیا ایلیکس۔''
میں نے اسے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔''میں نے یہ نہیں کہا کہ تم نے اسے قتل کیا ہے۔'' وہ اتنی خوب صورت تھی کہ میں اس کے لیے اپنے دل میں ہمدردی محسوس کر رہا تھا۔
''لیکن......''
''شش...... ہم اس بارے میں بعد میں بات کر سکتے ہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ہمارے لیے یہاں سے دور جانا زیادہ اہم ہے۔''
''ہم ابھی اس پر بات کیوں نہیں کر سکتے؟'' اس نے چڑچڑے پن سے پوچھا۔ وہ ہمیشہ ہی ایسی بچکانا باتیں کرتی تھی۔ شاید یہ بھی ایک وجہ تھی کہ وہ مجھے چھوڑ کر فلپ کے ساتھ چلی گئی۔
''کیونکہ اب ہمیں جو کچھ کرنا ہے میں اس پر اپنی توجہ مرکوز کرنا چاہتا ہوں۔ کم از کم یہ بہت ضروری ہے کہ ہم فلپ کے مکان سے میلوں دور چلے جائیں۔ اس کے بعد ہم تمام باتوں پر تفصیل سے بات کر سکیں گے۔''
اس کی سمجھ میں میری بات آ گئی۔ اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولی۔
ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں سڑک کے کنارے میری کار کھڑی .... تھی۔ میں نے اشارے سے بتایا کہ یہی میری کار ہے۔ اس نے اس کے پیچھے اپنی گاڑی روک لی۔ وہاں ہمارے سوا اور کوئی نہیں تھا۔''کیا ہم قافلے کی شکل میں آگے پیچھے چلیں گے؟'' اس نے پوچھا۔
''نہیں، تم فوراً یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔ میں پندرہ منٹ انتظار کروں گا۔ موبائل پر بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ کال ٹریس ہو سکتی ہے۔'' میں نے اسے تاکید کی۔

ویسے بھی میرا موبائل سارا دن بند ہی رہتا تھا۔
وہ میرے قریب آئی اور گال پر بوسہ دیتے ہوئے بولی۔''تم ایک اچھے انسان ہو ایلیکس، میں تمہارے لائق نہیں۔''
میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔''فکر مت کرو پینی۔ میں تمہیں اس مشکل صورتِ حال سے نکال لوں گا۔''
''میں نے کچھ نہیں کیا۔''
''یہ تم مجھے پہلے بتا چکی ہو۔ میں نے یقین کر لیا تھا اور اب بھی ہے۔''
میں اس کی کار سے باہر آ گیا اور دروازہ بند کرنے سے پہلے جھک کر بولا۔''سروس اسٹیشن پہنچ کر اپنی کار کو دکانوں، ریسٹورنٹ اور فلنگ اسٹیشن سے دور کھڑی کرنا۔ میں تمہیں تلاش کر لوں گا۔''
ہمارے درمیان مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا۔ میں کافی پُراعتماد تھا جبکہ وہ کچھ گھبرائی ہوئی تھی پھر میں اپنی کار کی طرف چل دیا۔ اب مجھے اس کے روانہ ہونے کے بعد پندرہ منٹ انتظار کرنا تھا۔ میں نے پہلے بی۔ روڈ پھر اے روڈ اور اس کے بعد موٹروے پر کئی میل سفر کیا جب میری کار کی رفتار بڑھ جاتی تو میں اپنا پیر ایکسلریٹر سے ہٹا دیتا۔ میں اس بارے میں خاصا محتاط تھا کہ حدِ رفتار سے تجاوز نہ کروں اور صرف توقع کر سکتا تھا کہ پینی بھی اتنی ہی سمجھ دار ہو گی۔
میں تقریباً ایک گھنٹے بعد سروس اسٹیشن پہنچا اور اس کی کار ڈھونڈنے لگا جب وہ مجھے نظر آ گئی تو میں نے اس سے پچاس گز کے فاصلے پر گاڑی کھڑی کی۔ اس کے بعد میں نارمل انداز میں چلتا ہوا اس کی کار تک گیا اور پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے خوب صورت چہرے پر سکون دیکھ کر میں مطمئن ہو گیا۔
''اب ہمیں کیا کرنا ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''ہم کسی ریستوران سے کافی لیں گے۔''
''کیوں؟''
''صرف یہ اطمینان کرنے کے لیے کہ اگر کوئی ہماری نگرانی کر رہا ہے تو اس پر یہی ظاہر ہو کہ ہم بالکل نارمل ہیں۔''
ہم دونوں ہجوم میں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھے۔ اس ہجوم میں کچھ نیوز ایجنٹ تھے۔ کچھ کا تعلق سویٹ، کافی اور سینڈوچ کی دکانوں سے تھا جبکہ بہت سے لوگ دکانوں کے گرد منڈلا رہے تھے۔ میں نے کافی کے دو کپ خریدے اور انہیں لے کر پینی کے پاس چلا گیا۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور مسکرانے کی کوشش کی۔

"میں نے اسے قتل نہیں کیا۔" اس نے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ابھی نہیں، ہم بعد میں بات کریں گے۔"

"پھر کب؟" اس نے پوچھا۔

"کار میں بیٹھنے کے بعد۔ یہ میرا وعدہ ہے۔" میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے دونوں ہاتھ دبائے۔ مجھے اس کے ہاتھوں میں پہلے کی طرح نرمی اور گرماہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور نہ ہی اپنا ہاتھ پیچھے کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔

"میں نہیں جانتی کہ تم اتنے پُرسکون کیوں ہو؟"

"میں...... میرا مطلب ہے کہ ہم دونوں کو پُرسکون رہنا ہے۔"

اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی گہری نیلی آنکھیں دیکھ کر یوں لگا جیسے اس نے آسمان کا ایک ٹکڑا چرا لیا ہو۔ وہ بہت دیر تک مجھے گھورتی رہی۔ میں نے نرمی سے کہا۔ "مسکراؤ، تمہارے چہرے پر اُداسی اچھی نہیں لگتی۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور مسکرادی۔ فلپ کی کار میں واپس آنے کے بعد ہم دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔ "اب مجھے بتاؤ۔"

اس نے فوراً ہی بولنا شروع نہیں کیا لیکن مجھے بھی کوئی جلدی نہیں تھی پھر وہ سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "ہم کاٹیج میں ویک اینڈ گزارنے آئے تھے۔"

میں یہ جانتا ہوں بے بی، میں نے دل میں سوچا۔ "پھر کیا ہوا؟"

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ "وہ تقریباً صبح گیارہ بجے کا وقت تھا اور ہم اسی وقت بیدار ہوئے تھے۔ فلپ نے کہا کہ وہ مجھے بستر میں ہی ناشتا کروائے گا اور پھر وہ کچن کی طرف چلا گیا لیکن......"

یہ کہہ کر اس نے رونا شروع کر دیا۔ "لیکن کیا؟" میں نے بے دلی سے پوچھا۔

"لیکن وہ واپس نہیں آیا۔ میں نیچے گئی اور وہاں جیسا تم نے دیکھا...... وہاں بہت زیادہ خون پڑا ہوا تھا۔"

میں اس سے بحث نہیں کر سکا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اس خون کو صاف کرنا انتہائی محنت طلب کام تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس کی پوری بات سمجھ چکا ہوں پھر اس نے ایک ایسا سوال پوچھا جس سے میں ڈر رہا تھا۔

"اس کی موت کیسے واقع ہوئی؟"

"اس پر چاقو سے حملہ کیا گیا تھا۔" میں نے جھوٹ بولا جبکہ اس کا گلا کاٹا گیا تھا۔ میں نے اپنے جھوٹ کو نبھانے کے لیے پوچھا۔

"جب تم نے اس کی لاش دیکھی تو تم نے کیا کیا؟"

"میں نے تمہیں فون کیا۔"

"تم نے پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دی؟ مجھے کیوں فون کیا؟"

"کیونکہ میں خوف زدہ ہو گئی تھی۔"

مجھے خاموش ہونا پڑا۔ میں ایسا نہیں چاہتا تھا لیکن اس وقت خاموشی بہتر تھی۔ میں جانتا تھا کہ اسے خاموشی پسند نہیں پھر اس نے آہستہ سے جھجکتے ہوئے کہا۔

"فلپ غیر قانونی کاموں میں ملوث تھا۔"

میرے لیے یہ ایک حیران کن انکشاف تھا۔ میں تو یہی جانتا تھا کہ وہ فنانشل ایڈوائزر رہے۔ میں نے پوچھا۔ "اس کا کیا مطلب ہے؟"

"اسے اپنے کلائنٹس سے جتنی رقم لینی چاہیے تھی، اس سے زیادہ وصول کر لی۔"

"اوہ......"

"اس کا خوف بڑھتا جارہا تھا کہ وہ کہیں پکڑا نہ جائے۔"

"کیا اسے پولیس کا ڈر تھا؟"

"نہیں وہ اپنے کلائنٹس سے خوف زدہ تھا۔"

کچھ دیر خاموشی رہی پھر میں نے کہا۔ "کیا اس سے میں یہ سمجھوں کہ اس کے کچھ کلائنٹس بھی غیر قانونی کاموں میں ملوث تھے؟"

وہ افسردہ لہجے میں بولی۔ "میرا بھی یہی خیال ہے۔"

اس کے بعد وہ کچھ دیر تک کچھ نہ بولی لیکن میں جانتا تھا کہ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ لہٰذا اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ شاید وہ مناسب لفظ تلاش کر رہی تھی۔

"اس نے مجھے پیسے دینا شروع کر دیے۔" میں نے اب بھی کچھ نہیں کہا لیکن بہت کچھ سوچنے لگا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "ان میں بڑی بڑی رقومات بھی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ مجھے یہ رقومات چھپانے کے لیے دے رہا تھا۔"

"لہٰذا تم نے محسوس کیا کہ پولیس کو اس کے قتل کی اطلاع نہیں دینی چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس کے کاروباری معاملات کی چھان بین کرنے لگ جائیں اور تمہیں بھی اس میں گھسیٹ لیا جائے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور دوبارہ رونے لگی۔ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ڈر تھا کہ کہیں پولیس یہ نہ سمجھے کہ میں نے اسے قتل کیا ہے۔''

''پیسوں کی خاطر؟''

''ہاں۔''

''اندازاً وہ کتنی رقم ہوگی؟''

''اس نے مجھے تقریباً دو ملین پونڈ دیے تھے۔''

میں یہ سن کر دنگ رہ گیا اور چند سیکنڈ کچھ نہ بولا پھر میری زبان سے بے اختیار نکلا۔ ''واؤ۔''

''بالکل، اسے قتل کرنے کے لیے یہ محرک کافی ہے۔''

''لیکن تم نے قتل نہیں کیا۔'' میں نے اپنی بات دہرائی۔

''نہیں۔''

میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ''پھر قاتل کون ہے؟''

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''اس نے بہت سے لوگوں کو ناراض کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ انہی میں سے کوئی اس کا قاتل ہوسکتا ہے۔ وہ ایسے لوگ نہیں تھے کہ انہیں ناراض کیا جائے۔''

پینی... بعض اوقات بچوں جیسی باتیں کرتی تھی۔ بہرحال مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی اور میں نے کہا۔ ''کیا انہوں نے اسے قتل کیا ہوگا؟''

وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ ''اور کون ہوسکتا ہے؟''

شاید مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میں نے اپنے آپ کو پُرسکون رکھتے ہوئے کہا۔ ''بہت جلد میں تمہیں یہاں سے دور کسی بہتر جگہ پر لے جاؤں گا۔''

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''تم کار میں گھر جاؤ اور اسے وہیں کھڑا کر دو جہاں یہ عموماً ویک اینڈ پر ہوتی ہے پھر ٹیوب کے ذریعے میرے گھر آجاؤ۔''

''ٹھیک ہے۔''

''اور یہ اطمینان کر لینا کہ کسی نے تمہیں نہیں دیکھا۔''

☆☆☆

میں وسطی لندن میں واقع بیرون کورٹ کے ایک ٹاؤن ہاؤس میں رہتا ہوں۔ گو کہ یہ اتنا اچھا نہیں لیکن میری ضرورت کے لیے مناسب ہے۔ جب میں وہاں پہنچا تو اندھیرا ہو چکا تھا اور سڑک ویران پڑی ہوئی تھی جب میں نے اپنی کار فرنٹ ڈور کے قریب کھڑی کی تو مجھے کسی نے نہیں دیکھا۔ بارش ہو رہی تھی اس لیے میں تیز قدموں سے چلتا ہوا گھر کی طرف بڑھا۔ اندر داخل ہونے کے بعد مجھ پر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ میں باری باری ہر کمرے میں گیا اور کوشش کی کہ جو ہو چکا اس کے بارے میں نہ سوچوں۔ میں جو کچھ کر رہا تھا، اس پر سوچنا تھا اور یہ کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میرے اعصاب بُری طرح کشیدہ ہو چکے تھے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھ سے اتنی بھیانک غلطی کیسے سرزد ہوئی اور اب اس کی تلافی کیسے کی جائے۔

بالآخر پینی بھی آگئی۔ وہ بہت پریشان لگ رہی تھی لیکن اس کی پریشانی قابلِ فہم تھی۔

جیسے ہی میں نے بیرونی دروازہ کھولا۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی اور گرم جوشی سے میرا بوسہ لیا۔ میں نے اپنے اوپر اس کے جسم کا دباؤ محسوس کیا۔ اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لیتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''میں اب بھی تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔''

''میں بھی۔'' اس نے کسمساتے ہوئے کہا۔ میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے لیکن میں نے اسے اہمیت نہیں دی۔

میں اسے سٹنگ روم میں لے گیا۔ میں نے دو گلاسوں میں برانڈی انڈیلی اور ہم ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔ اس نے پوچھا۔ ''اب کیا ہوگا؟''

''کیا کسی کو معلوم تھا کہ تم اس کے ساتھ کاٹیج گئی ہو؟''

اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''میرا نہیں خیال کہ میں نے کسی کو بتایا تھا۔''

''کیا فلپ نے کسی کو اس بارے میں بتایا تھا؟''

''میں نہیں جانتی۔''

''یعنی ہم صرف امید کر سکتے ہیں کہ اس نے کسی کو نہیں بتایا ہوگا۔''

اس نے مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''اور کچھ؟''

''جب تم کاٹیج میں تھیں تو وہاں کسی نے تمہیں دیکھا؟''

''کسی نے نہیں۔''

''کیا کسی نے فلپ کو دیکھا؟''

''نہیں۔''

''پھر تو ہمارے پاس ایک موقع ہے۔''

''وہ کیا؟''

''اگر اس نے کسی کو نہیں بتایا کہ تم دونوں ویک اینڈ پر کاٹیج جا رہے ہو اور جب تک پولیس تمہارے موبائل فون کا ریکارڈ چیک نہیں کرتی تب تک ہم محفوظ ہیں۔''

یہ سن کر وہ تھوڑی سی پُرسکون ہوگئی۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''بشرطیکہ کسی نے ہم دونوں کو کاٹیج کے

آس پاس نہ دیکھا ہو۔ اس صورت میں ہم جائے وقوعہ سے اپنی غیر موجودگی ثابت کر سکتے ہیں۔''

اس نے کچھ سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ رات ہم نے پرانے وقتوں کی طرح گزاری جب فلپ اس کی زندگی میں نہیں آیا تھا اور میں پینی کے ساتھ خوش گوار لمحات گزار رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ وقت کبھی ختم نہیں ہو گا اور وہ بھی میری قربت سے اسی طرح لطف اندوز ہوتی رہے گی جیسے میں ہو رہا تھا۔

گوکہ یہ میری بے وقوفی تھی۔ میں پینی کو سمجھ ہی نہ سکا۔ وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتی تھی۔ فلپ میرے مقابلے میں کم عمر اور مجھ سے زیادہ امیر تھا گوکہ یہ دولت اس نے ناجائز طریقے سے حاصل کی تھی۔ مجھ جیسا معمولی وکیل کس طرح اس کا مقابلہ کر سکتا تھا؟ جب فلپ نے پینی میں دلچسپی لینا شروع کی تو اس نے فلپ کی بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ وہ اس موقع کو گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ایک مادہ پرست عورت تھی اور اس کی نظر میں محبت سے زیادہ دولت کی اہمیت تھی۔

میں ایک درمیانی عمر کا فربہی مائل شخص تھا جس کے بالوں میں سفیدی اتر آئی تھی جبکہ فلپ ہر لحاظ سے مجھ سے بہتر تھا۔ لہٰذا پینی کو فیصلہ کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی اور اس نے فلپ کو مجھ پر ترجیح دینے کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن یہ ماضی کا قصہ تھا۔ اس وقت وہ میرے ساتھ بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور ہم محبت کی وادی میں کھوئے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے آپ کو میرے حوالے کر دیا تاہم وہ کچھ بے چین دکھائی دی۔

صبح میری آنکھ جلدی کھل گئی اور میں نے اپنے آپ کو بستر پر اکیلا پایا۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ باتھ روم میں ہو پھر میں دوبارہ سو گیا۔

ناشتے پر مجھے اس کا رویہ عجیب سا لگا لیکن میں اس کی وجہ نہ جان سکا۔ میں نے تجویز پیش کی کہ ہم پورا دن ساتھ گزاریں کیونکہ اتوار ہونے کی وجہ سے ہم دونوں میں سے کسی کو بھی کام پر نہیں جانا تھا لیکن اس نے کہا۔ ''کیا یہ مناسب ہو گا؟''

''بالکل۔'' میں نے کہا۔

اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں اتنی جلدی نہیں کرنا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس کے علاوہ میں کیا کہہ سکتا تھا۔

وہ چلی گئی اور مجھے لگا کہ کچھ غلط ہو گیا ہے تاہم میں اسے سمجھ نہیں سکا۔ میں چرچ چلا گیا۔ وہاں سے مجھے سپر مارکیٹ جانا تھا۔ جب میں لنچ سے کچھ دیر پہلے تین بھرے ہوئے تھیلوں کے ساتھ واپس آیا تو ایک سیاہ فام عورت اور سفید فام مرد میرے انتظار میں تھے۔

''الیگزینڈر رابیٹ؟''

''ہاں۔''

اس نے مجھے کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔ ''میں سراغ رساں چیف انسپکٹر اسمتھ اور یہ سراغ رساں سارجنٹ ہنری ہے۔''

''میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''کیا ہم اندر آ سکتے ہیں؟''

سٹنگ روم میں بیٹھنے کے بعد اس عورت نے پوچھا۔ ''کیا تم پینی لوپ کو جانتے ہو؟''

''ہاں، وہ میری گرل فرینڈ ہے۔''

سارجنٹ ہنری نے کہا۔ ''یقیناً وہ کبھی تمہاری گرل فرینڈ تھی۔ کیا اس نے حال ہی میں تمہیں فلپ بورک کی خاطر نہیں چھوڑ دیا تھا؟''

''اچھا......'' میں نے ٹالنے کی کوشش کی۔

''جوکہ اب لاپتا ہے۔'' اسمتھ نے کہا۔

''اس کی گمشدگی کا مجھ سے کیا تعلق؟''

''مس پینی آج صبح ہمارے پاس آئی تھی اور اس نے ایک بڑی دلچسپ کہانی سنائی۔'' اسمتھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس نے بتایا کہ تم نے مسٹر بورک کو قتل کیا ہے؟''

''میں نے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس کا یہی کہنا ہے۔''

بعض اوقات ہمیں مشکل فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ میں نے بھی ایسا ہی ایک فیصلہ کیا۔ ''وہ پریشان ہے۔''

ان دونوں نے میری بات پر یقین نہیں کیا۔ ہنری بولا۔ ''وہ پریشان نظر نہیں آ رہی تھی۔''

اسمتھ نے اس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''درحقیقت وہ بڑی پُرسکون نظر آ رہی تھی، اس نے ہمیں بتایا کہ تم نے فلپ بورک کو قتل کر کے تمام ثبوت مٹا دیے اور اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ جائے وقوعہ سے تمہاری غیر موجودگی ظاہر کرے۔''

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کہاں سے شروع کروں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ ''وہ جھوٹ بول رہی ہے۔''

ہنری کے تاثرات سے لگا کہ وہ پینی کو جھوٹا نہیں سمجھتا لیکن اس کی باس نے کہا۔ ''تم اس بارے میں کیا کہتے ہو مسٹر

ایبٹ؟“
مجھے جواب دینے سے پہلے کچھ سوچنا پڑا کیونکہ میرے راستے میں بہت سے جھوٹ حائل تھے۔
”پینی نے مجھے فون کر کے کاٹیج آنے کے لیے کہا تھا۔“
”اس وقت تم کہاں تھے؟“
”یہیں اپنے گھر پر۔“
”کیا تمہیں اس کاٹیج کا پتا معلوم تھا؟“
”بالکل نہیں، اس نے مجھے بتانا تھا کہ وہ کاٹیج کہاں پر ہے۔“
ہنری نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ جگہ سڑک سے ہٹ کر ہے اور وہاں تک پہنچنا آسان نہیں جب تک کہ مناسب رہنمائی نہ ہو۔“
”میں نے اس کا بندوبست کرلیا تھا۔“
اسمتھ نے پوچھا۔ ”اور جب تم وہاں پہنچے تو کیا دیکھا؟“
”ایک لاش کچن میں پڑی ہوئی تھی۔“
”کیا وہ فلپ بورک کی لاش تھی؟“
”ہاں، وہ ایک لاش ہی کافی تھی۔“ شاید مجھے طنزیہ انداز اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہنری کو یہ اچھا نہیں لگا۔
”مس پینی نے تمہیں اس بارے میں کیا بتایا؟“ اس کی آواز تھکی ہوئی لیکن کسی حد تک دھمکی آمیز تھی۔
”یہی کہ اس نے وہاں لاش دیکھی تھی۔“
”یعنی اس نے یہ نہیں کہا کہ اس نے فلپ کو قتل کیا ہے؟“
”نہیں۔“
”اس نے یہ نہیں بتایا کہ فلپ کا قاتل کون ہے؟“
”اس کا کہنا تھا کہ فلپ بورک نے کئی دشمن بنا لیے تھے۔“
اسمتھ نے ناقابلِ یقین انداز میں کہا۔ ”کیسے دشمن؟“
”اس نے اپنے کلائنٹس کی رقومات میں خرد برد کی تھی اور ان میں کچھ جرائم پیشہ تھے۔“
”اور ان میں سے کسی ایک نے اس کا گلا کاٹ دیا؟“
میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
پھر خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ ہنری اپنے ٹیبلٹ پر مصروف ہو گیا۔ شاید وہ کچھ نوٹس لے رہا تھا۔ اسمتھ میری طرف دیکھ رہی تھی لیکن اس کا انداز دوستانہ نہیں تھا۔ بالآخر اس نے کہا۔
”مجھے ایک چھوٹی سی مشکل پیش آ رہی ہے مسٹر ایبٹ۔ شاید تم اس سلسلے میں میری کچھ مدد کرسکو۔“
”بالکل۔“
”کیا یہ سچ ہے کہ مس پینی نے چند ماہ قبل مسٹر بروک کی خاطر تمہیں چھوڑ دیا تھا؟“
”ہاں۔“
”اس بارے میں تمہارے کیا احساسات تھے؟“
”میں اپنے آپ کو بالکل کھوکھلا محسوس کر رہا تھا۔“
”مس پینی کے ساتھ تمہارے تعلقات کتنا عرصہ رہے؟“
”کم و بیش دس سال۔“
اسمتھ نے یوں سر ہلایا جیسے وہ میرے الفاظ پر غور کر رہی ہو پھر بولی۔ ”تمہیں یقیناً بہت غصہ آیا ہوگا جب اس نے مسٹر... بروک کی خاطر تمہیں چھوڑا۔“
”ظاہر ہے۔“
”لیکن تم نے اس پر قابو پالیا۔“
”ہاں، میں نے کسی اور سے دل لگالیا۔“
وہ مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ”تو مسٹر بروک کی لاش کو خون میں لت پت دیکھ کر تمہیں کیا خیال آیا؟“
جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ”مجھے خوشی ہوئی۔“
”کیا تم نے اسے مس پینی کو دوبارہ حاصل کرنے کا موقع جانا؟“
”میں یہی سمجھتا ہوں۔“
”اسی لیے تم نے جائے وقوعہ کی صفائی کی؟“
”میرا یہی خیال ہے۔“
ہنری نے کہا۔ ”ہمارا کرائم سین یونٹ جائے وقوعہ پر جا رہا ہے۔ اگر تم ہمیں بتا دو کہ فلپ کی لاش کہاں ملے گی تو اس سے ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔“
اب چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا اس لیے میں نے انہیں بتا دیا کہ لاش کہاں پھینکی تھی۔
ان دونوں نے بُرا سا منہ بنایا پھر ہنری بولا۔ ”لاش کو ٹھکانے لگانے اور جائے وقوعہ کی صفائی کرنے کے بعد تم پینی کو واپس یہاں لے آئے؟“
”ہاں۔“
”اور اسے اپنے بستر پر لے گئے؟“
”ہاں۔“ میں نے آہستہ سے جواب دیا۔ لیکن میں سوچ رہا تھا کہ اس انتہائی ذاتی نوعیت کے سوال کا کیا مقصد ہے۔
”کیا وہ اپنی رضامندی سے بستر پر گئی تھی؟“
”کیا؟“ میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔
ہنری میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم نے اسے زبردستی مجبور نہیں کیا تھا؟“

''کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں نے اس کی عصمت دری کی؟''

ہنری نے تڑخ کر کہا۔ ''ہاں۔''

''یہ غلط ہے۔'' میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اس کے ساتھ زبردستی نہیں کی۔''

ہنری نے اسمتھ کی طرف دیکھا، وہ بولی۔ ''اس کا کہنا ہے کہ تم نے اسے مجبور کیا اور اصرار کرتے رہے کہ وہ تمہاری گرل فرینڈ ہے۔ گو کہ وہ نہیں چاہتی تھی اس کے باوجود تم نے اس کے ساتھ جنسی تعلق قائم کیا۔''

''یہ بکواس ہے۔''

''فارنسک میڈیکل ایگزامنر نے اس سے اتفاق کیا ہے کہ تم اس پر جنسی حملہ کے مرتکب ہوئے ہو۔''

''شاید فلپ نے اس کی عصمت دری کی ہو؟''

''یہ ہم نہیں جانتے۔''

''کیا تم نے پینی کا بینک اکاؤنٹ چیک کیا ہے؟''

''ابھی نہیں، اس سے ہمیں کیا ملے گا؟''

''اس میں لاکھوں پونڈ ہوں گے۔''

''اس کے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی؟''

''فلپ بورک نے غبن شدہ رقم اس کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دی تھی۔''

انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اسمتھ نے ہنری سے کہا کہ وہ اس معاملے کو بعد میں دیکھے۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو تمہارے گھر کی تلاشی لے لیں۔''

میں بھی کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''ہاں، مجھے اعتراض ہے۔''

اب اسمتھ کے کھڑے ہونے کی باری تھی۔ وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''ٹھیک ہے پھر ہمیں سرچ وارنٹ لینا ہو گا کیونکہ تم تعاون نہیں کر رہے ہو۔''

میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، تم تلاشی لے سکتے ہو۔''

بیس منٹ بعد ان کی واپسی ہوئی۔ ان کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ انہیں تلاشی میں کچھ نہیں ملا۔ ہنری نے کہا۔ ''کیا تم مجھے کار کی چابیاں دے سکتے ہو؟''

میں نے کار کی چابیاں اسے دے دیں۔ وہ مجھے ایک بار پھر تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ میں نے برانڈی پیتے ہوئے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ یہ کیا ہو رہا ہے پینی ایسی باتیں کیوں کر رہی ہے؟

تھوڑی دیر بعد ان کی واپسی ہوئی۔ اسمتھ نے ایک کاغذ پکڑا ہوا تھا۔ ''یہ تمہارا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے کاغذ پر نظر ڈالی، وہ ایک سینڈوچ کی رسید تھی جو ویل بریڈ سے خریدا گیا تھا۔ ''مجھے کچھ یاد نہیں۔'' میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہاری کار کی ایش ٹرے میں رکھی ہوئی تھی۔''

''واقعی؟'' میں نے حیرت سے کہا کیونکہ میرا خیال تھا کہ ایش ٹرے خالی ہے۔

''اس پر درج تاریخ اور وقت دیکھو۔''

اس رسید پر گزشتہ روز کی تاریخ اور بارہ بج کر چھپن منٹ کا وقت لکھا ہوا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پوچھا۔ ''یہ کس بارے میں ہے؟'' حالانکہ میں جانتا تھا کہ یہ معاملہ کس جانب جا رہا ہے۔

اسمتھ نے وہ رسید واپس لے لی۔ اب وہ دستانے پہن رہی تھی۔ اس نے وہ رسید ہنری کو دے دی۔ وہ بھی دستانے پہن چکا تھا۔ اس نے وہ رسید ایک تھیلے میں رکھ لی۔

''یہ سب کیا ہے، اس کا کیا تعلق ہے؟''

اسمتھ نے کہا۔ ''یہ سینڈوچ شاپ اس کاٹیج سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ہے۔''

میں نے اپنا منہ کھولا لیکن کچھ نہ کہہ سکا۔

انہوں نے مجھے گرفتار کر لیا۔ صاف ظاہر تھا کہ مجھے پھنسایا گیا ہے۔ اب میں صرف یہی امید کر سکتا تھا کہ انہیں پینی کے اکاؤنٹ میں ایک بڑی رقم مل جائے لیکن مجھے ڈر تھا کہ شاید ایسا نہ ہو اور وہ میرا موبائل چیک کریں گے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں نے پینی کی پہلی کال اسی منحوس سینڈوچ شاپ میں سنی تھی تاہم میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ وہ رسید میری کار کی ایش ٹرے میں کیسے پہنچی۔ شاید پینی نے اسے وہاں رکھا ہو۔

جب پینی نے لاش دریافت کی تو مجھے اس کی کال کا جواب نہیں دینا چاہیے تھا لیکن میں اس کے لیے پاگل ہو رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اسے مجھ سے بے وفائی کرنے کی سزا ملنی چاہیے لیکن میں نے جانا کہ اب بھی اسے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

میرا خیال تھا کہ فلپ بورک کا قتل ایک مکمل جرم ہے اور اس کا کبھی سراغ نہ لگ سکے گا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ اس کی موت کا الزام پینی پر آئے۔ مجھے شک ہے کہ وہ یہ سمجھ گئی تھی۔ وہ بہت ہوشیار ہے اور میں سدا کا بے وقوف۔ رہی سہی کسر اس رسید نے پوری کر دی۔





تماشہ

حسام بٹ

منصوبہ بندی کرتے ہوئے ایک ایک نکتے کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں... منصوبے کا تمام پہلوئوں سے جائزہ لینے کے بعد ہی قابلِ عمل قرار پاتا ہے... اس نے بھی اپنے ذہن و دل میں جو ترتیب بٹھائی تھی... اسے حالات و واقعات کے مطابق ڈھالتے ہوئے زندگی لینے اور بدلنے کا حتمی وقت آگیا تھا...

اس کوچہ گرد کا سفر جس کے مقدر میں وفائے عہد کا کوئی منظر نہ تھا......

جہاز نے مقررہ وقت پر لینڈ کیا۔ یہ اس کی اسلام آباد ائرپورٹ پر پہلی آمد تھی اور شاید آخری بھی کیونکہ اس نے پاکستان کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس نے آج زندگی میں پہلی بار نادیہ سے کئی ایک جھوٹ بولے تھے اور اسے اپنے اس فعل پر ذرا سی بھی ندامت اور شرمندگی نہیں تھی۔

وہ صبح دانش کو بائیک پر اس کے اسکول چھوڑ کر آیا تھا تو نادیہ نے خفگی آمیز لہجے میں کہا تھا۔ ”کاشف! آج

احساس ہو رہا ہے کہ گاڑی زندگی کی کتنی اہم ضرورت بن کر رہ گئی ہے۔ اگر تم نے اپنی گاڑی مکینک کے پاس نہ چھوڑی ہوتی تو دانی (دانش) کو اسکول پہنچانے کے لیے پڑوسیوں سے بائیک نہ مانگنا پڑتی!''

دانش عرف دانی ان کی اکلوتی اولاد تھی جو اس وقت لگ بھگ سات سال کا تھا اور کلاس ٹو میں پڑھتا تھا۔ ان کی شادی کو کم و بیش آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔

''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ گاڑی کافی دنوں سے تنگ کر رہی تھی۔'' کاشف نے کہا۔ ''آج جمعہ ہے۔ ہفتہ، اتوار دانی کے اسکول کی چھٹی ہے۔ گاڑی کو ٹھیک کرانے کا اس سے زیادہ موزوں اور کوئی موقع نہیں تھا۔ مکینک اتوار کی دوپہر میں گاڑی کو اوے ون کر کے یہاں چھوڑ جائے گا اور اتوار ہی کی رات میں بھی اسلام آباد سے لوٹ آؤں گا۔ باقی جہاں تک پڑوسی سے بائیک لینے کا معاملہ ہے تو......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''ہم بھی تو بارہا ان لوگوں کے کام آئے ہیں۔ اگر میں نے تھوڑی دیر کے لیے ان کی بائیک مانگ لی تو اس میں ایسی کون سی نامناسب بات ہے؟''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' نادیہ نے گول مول جواب دیا۔

کاشف نے ابھی ڈبل جھوٹ بولا تھا۔ اس نے نادیہ کو بتایا تھا کہ وہ پرسوں یعنی اتوار کی رات کو اپنے ٹور سے واپس آجائے گا حالانکہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ آج اپنی بیوی اور بیٹے کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر پاکستان سے باہر جا رہا تھا۔ دوسرا جھوٹ اس نے یہ بولا تھا کہ گاڑی کو مرمت کی غرض سے وہ مکینک کے پاس چھوڑ آیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کورے میں ایک دو سنجیدہ کام نکل آئے تھے مگر وہ اسے مکینک کے پاس نہیں لے کر گیا تھا بلکہ اس نے اپنی کورے فروخت کر دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا بینک اکاؤنٹ بھی خالی کر دیا تھا اور اس تمام و کمال رقم کو اس نے یو ایس ڈی (امریکی ڈالرز) میں تبدیل کروا کر محفوظ ذریعے سے وہاں منتقل کر دیا تھا جہاں وہ جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

''تم نے اپنی پیکنگ تو مکمل کر لی ہے نا؟'' نادیہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس وقت وہ دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ دو بیڈ، ایک لاؤنج کیٹگری کا چھوٹا سا صاف ستھرا فلیٹ تھا جو ان لوگوں نے کرائے پر حاصل کر رکھا تھا۔ نادیہ سے گفتگو کے دوران میں کاشف مسلسل اپنے سیل فون کے ساتھ مصروف تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے نگاہ اٹھا کر نادیہ کی طرف دیکھا پھر فرش پر پڑے ہوئے سفری بیگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''بالکل......میرا بیگ ریڈی ہے۔''

''تم ائرپورٹ کے لیے گھر سے کتنے بجے نکلو گے؟''

''میرا خیال ہے، مجھے آئندہ ایک گھنٹے کے اندر ائرپورٹ کے لیے روانہ ہو جانا چاہیے۔'' اس نے بیزاری سے کہا۔ ''لیکن اس ''سی این جی'' کی اسٹرائیک نے کام خاصا خراب کر دیا ہے۔ میں کافی دیر سے اوبر اور کریم کو چیک کر رہا ہوں مگر...... آج ایک تو رائیڈز بہت کم ہیں، دوسرے اماؤنٹ بھی آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔''

''ایسے ہی مواقع پر اپنی گاڑی شدت سے یاد آتی ہے۔'' نادیہ نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

کاشف نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے سرسری انداز میں استفسار کیا۔ ''آج کل تمہارے کزن کی کون سی شفٹ چل رہی ہے؟''

''کس کی......!'' نادیہ نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم نبیل کی بات کر رہے ہو؟''

''ہاں بھئی......میں تمہارے صرف ایک ہی کزن کو جانتا ہوں اور اس کا نام نبیل ہی ہے۔''

''میں پوچھ کر تمہیں بتاتی ہوں۔'' نادیہ نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔ ''ویسے اس وقت اچانک نبیل کی یاد کیسے آگئی؟''

''کیا تمہارے کزن کو یاد کرنے سے پہلے کوئی خاص قسم کا وظیفہ پڑھنا پڑتا ہے۔'' کاشف نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''اچانک یاد آجانے سے کوئی مشکل کھڑی ہو جائے گی کیا؟''

''ارے نہیں...... یہ تو میں نے ایسے ہی کہہ دیا۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''تم نبیل کا ذکر بہت کم کرتے ہو نا اس لیے۔''

''میں اس وقت نبیل کی اشد ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔'' کاشف نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ذرا پتا کرو۔ اگر وہ اس وقت فری ہے تو میں اس کے ساتھ ائرپورٹ چلا جاؤں گا۔ اس طرح دانی کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ ہم ایک ساتھ نبیل کی گاڑی میں ائرپورٹ جائیں گے۔ تم لوگ

ائرپورٹ پہنچا کر واپس آجاتا۔ اتنی دیر میں دانی کی اسکول کا وقت بھی ہو جائے گا۔ واپسی پر تم دانی کو اسکول سے پک کر لینا۔ نبیل تم لوگوں کو یہاں ڈراپ کر دے گا۔"

"آئیڈیا تو بہت اچھا ہے۔" فرطِ مسرت سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ "میں ابھی نبیل کو فون کرتی ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی نادیہ ڈرائنگ روم سے اٹھ کر بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔ کاشف دوبارہ اپنے سیل فون کا ہو کر رہ گیا۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ اپنے سفری بیگ سمیت لاؤنج (ڈرائنگ روم) میں جم کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کو یہاں سے جانا تھا اور بس ائرپورٹ کے لیے روانہ ہو جانا تھا۔

نبیل ایک کال سینٹر میں کام کرتا تھا اور ترقی کرتے کرتے سپروائزر کے عہدے تک پہنچ گیا تھا۔ حال ہی میں اس کی جانب سے اسے ایک ٹویوٹا کرولا گاڑی بھی دی گئی تھی جو ظاہر ہے، ملکیت تو کمپنی ہی کی تھی لیکن نبیل اس وقت تک اسے اپنے استعمال میں رکھ سکتا تھا جب تلک وہ مذکورہ کمپنی کا ملازم تھا۔

"کام ہو گیا کاشف......!" نادیہ نے دوبارہ ڈرائنگ روم میں آکر نویدِ مسرت سنائی۔ "آج کل نبیل کی نائٹ شفٹ چل رہی ہے۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی سو کر اٹھا ہے اور اس وقت ناشتا کر رہا ہے۔ میں نے اسے سچویشن سے آگاہ کر دیا ہے۔ وہ آدھے گھنٹے میں یہاں پہنچ رہا ہے۔"

"دیٹس گڈ......!" کاشف نے ستائشی نظر سے نادیہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "تم نے تو چٹکی بجاتے میں مسئلہ ہی حل کر دیا۔ چلیں آج تمہارے کزن کی نئی کرولا میں ہم بھی مزے لے لیں گے......!"

"ہاں، ہاں......کیوں نہیں......" وہ چہک کر بولی۔

☆☆☆

کاشف نے ڈومیسٹک ارائیول سے چیک آؤٹ کرنے کے بعد ایک آسودہ سانس خارج کی۔ اگلے ہی لمحے اس نے انٹرنیشنل ڈپارچر کے لیے چیک اِن کر لیا۔ لگ بھگ دو گھنٹے کے بعد اسے دبئی جانے والے جہاز پر سوار ہونا تھا۔ اس نے ایک ناشناسا ٹریول ایجنٹ سے اپنی مرضی کی فلائٹس کے لیے ٹکٹ حاصل کیے تھے۔ اس کے آفس اور گھر والے یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ دو روز کے لیے اسلام آباد گیا ہے مگر وہ دو گھنٹے کے بعد پاکستان کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہنے والا تھا اور اس کا یہ عمل ایک سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ تھا۔

تمام شد

چھ ماہ پہلے وہ اپنے آفس کی جانب سے ایک ایگزی بیشن میں شرکت کرنے تین روز کے لیے دبئی گیا تھا اور وہاں اس کی ایک انڈین مسلمان منصور خان سے ملاقات ہوئی تھی جو چند گھنٹوں میں گہری دوستی میں بدل گئی۔ کاشف سیلز کے شعبے سے تعلق رکھتا تھا اور منصور خان بھی، اس فیلڈ کا چیتا تھا۔ وہ ایک معروف دبئی بیس کمپنی کے لیے کام کر رہا تھا اور کمپنی میں اس کی پوزیشن خاصی مضبوط تھی۔ کاشف کے لیے منصور خان ایک ایسا شخص تھا جس پر وہ بھروسا کر سکتا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے دل کا احوال کہہ سنایا۔

کاشف کی کہانی نے منصور خان کو بہت متاثر کیا۔ اس نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "یار! تمہیں پہلی فرصت میں پاکستان کو چھوڑ دینا چاہیے۔ اگر تم کچھ عرصہ اور اس ماحول میں رہے تو تمہارا دماغ پھٹ جائے گا۔"

"پاکستان سے نکل کر کہاں جاؤں......" کاشف نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "اور سب سے بڑی بات کہ نکلوں کیسے؟"

"ہماری کمپنی کے لیے کام کرو گے؟" منصور خان نے اس سے پوچھا۔

"مطلب، یہاں دبئی میں......!" کاشف نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"یس!" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اگر تم کہو تو میں تمہارے لیے اپنے باس سے بات کر سکتا ہوں۔ میں نے تمہیں دیکھا ہے، تمہارا پروفائل دیکھا ہے۔ تم جیسے قابل ورکرز کی باس کو تلاش رہتی ہے۔"

"اگر یہ سب تمہارے بس میں ہے تو میں تیار ہوں۔" کاشف نے معتدل انداز میں کہا۔

"باس کو تمہارے لیے قائل کرنا میری ذمے داری ہے۔" منصور خان سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں ایک چیک لسٹ بنا دیتا ہوں۔ اس کے مطابق تم مجھے اپنے ڈاکومینٹس فارورڈ کر دینا۔ اس کے بعد میرا کام شروع ہوگا۔ کمپنی ابتدا میں تم سے دو سال کا کنٹریکٹ سائن کرے گی۔ یہ مدت پوری ہونے کے بعد نیا معاہدہ تیار کر لیا جائے گا اور پھر چل سو چل......مطلب یہ کہ تمہیں کبھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔"

"اگر ایسا ہو جائے تو میرا مسئلہ نمٹ جائے گا۔" کاشف نے تشکرانہ نظر سے منصور خان کو دیکھا۔ "میری طرف سے اوکے ہے۔ تم اپنے اینڈ سے کوشش شروع کر

دو۔ یہ ایک بہت بڑا کام ہوگا اور میں...... تمہارا یہ احسان زندگی بھر یادرکھوں گا۔‘‘

’’دوست بھی کہتے ہو اور احسان کو یاد رکھنے کی باتیں بھی کرتے ہو۔‘‘ منصور خان نے شاکی نظر سے کاشف کی طرف دیکھا۔ ’’دوست اگر سچا ہو تو وہ اپنے دوست پر کبھی احسان نہیں کرتا بلکہ اپنا فرض نبھاتا ہے۔ کیا ہم سچے دوست نہیں ہیں یا مجھے فرائض کی ادائی کی اجازت نہیں ہے؟‘‘

’’آئی ایم ریئلی ویری سوری......‘‘ کاشف نے سچے دل سے کہا۔ ’’میں آئندہ خیال رکھوں گا۔‘‘

اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا، وہ منصور خان کا رہینِ منت تھا۔ جاب، ویزا، ٹکٹ، رہائش وغیرہ...... کا بندوبست منصور خان کے توسط سے کمپنی کے پلیٹ فارم پر ہوا تھا۔ کاشف کو کمپنی نے دو سال کے لیے ماہانہ چھ ہزار درہم تنخواہ پر اپنے سسٹم کا حصہ بنا لیا تھا اور آج وہ اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر ہمیشہ کے لیے جانب دبئی اڑان بھرنے والا تھا۔

اس کی پرواز کے ٹیک آف کرنے میں ابھی اچھا خاصا وقت تھا۔ وہ ائرپورٹ کے مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد ایک ایسی جگہ پر جم کر بیٹھ گیا جہاں اس کی نگاہ کے سامنے ایک ایل ای ڈی پر کوئی نیوز چینل چل رہا تھا۔

☆☆☆

وہ میاں بیوی تو تیار ہی بیٹھے تھے۔ نبیل کے آنے پر ان کے بیچ رسمی علیک سلیک ہوئی پھر وہ فلیٹ کو لاک کر کے نیچے اتر آئے۔ بلڈنگ کی دیوار کے ساتھ ہی نبیل کی چمچماتی بلیک ٹویوٹا کرولا کھڑی تھی۔ کاشف کا سفری بیگ نبیل نے اٹھا رکھا تھا۔ جب نبیل اس بیگ کو کار کی ڈکی میں رکھنے لگا تو کاشف نے توصیفی انداز میں کہا۔

’’یار! تمہاری گاڑی زبردست ہے۔ بہت بہت مبارک ہو لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔‘‘

’’خیر مبارک۔‘‘ نبیل نے ڈکی کو بند کرنے کے بعد کہا پھر پوچھا۔ ’’کون سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں بیٹھ رہی؟‘‘

’’بلیک کار ہی کیوں؟‘‘ کاشف نے گاڑی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’تم نے کوئی اور کلر کیوں نہیں پسند کیا؟‘‘

’’اس کی دو وجوہات ہیں۔‘‘ نبیل نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ’’آؤ تمہیں راستے میں بتاتا ہوں۔‘‘

اس دوران میں نادیہ کار کی عقبی نشست پر براجمان ہو چکی تھی۔ کاشف دروازہ کھول کر نادیہ کے پہلو میں بیٹھ گیا اور نبیل نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

نبیل نے کار کو اسٹارٹ کرنے کے بعد گلی میں بمشکل دس گز آگے بڑھایا ہوگا کہ عقبی نشست سے کاشف کی بوکھلاہٹ بھری آواز ابھری۔

’’ایک منٹ رکنا نبیل۔ میں ایک ضروری چیز تو گھر پر ہی بھول آیا ہوں۔‘‘

نبیل نے کار کو سائڈ پر لگا دیا۔ نادیہ نے پوچھا۔ ’’کاشف! تم کس چیز کی بات کر رہے ہو؟‘‘

’’ارے یار، وہ ناول......‘‘ کاشف نے اضطراری لہجے میں جواب دیا۔ ’’لاؤ، چابی دو مجھے۔‘‘

نادیہ نے گھر کی چابی اپنے پرس میں سے نکال کر اس کی جانب بڑھا دی۔ کاشف دروازہ کھول کر گاڑی سے اتر گیا۔

نبیل نے عقبی نشست کا منظر دکھانے والے آئینے میں نادیہ کو دیکھا اور پوچھا۔ ’’کاشف نے ناول پڑھنا کب سے شروع کر دیے؟‘‘

’’ابھی دو ماہ پہلے ہی اسے یہ شوق اٹھا ہے۔‘‘ نادیہ نے بتایا۔

’’میرے لیے یہ ایک چونکا دینے والی بات ہے۔‘‘ نبیل نے حیرت بھرے انداز میں کہا۔ ’’کاشف اور ناول بینی...... بات سمجھ میں نہیں آتی۔‘‘

’’ابتدا میں مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا اور میں یہی سمجھی تھی کہ سمندر کے جھاگ کے مانند چند روز میں اس کا یہ شوق چپ چاپ بیٹھ جائے گا لیکن ایسا ہوا نہیں......‘‘ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بتایا۔

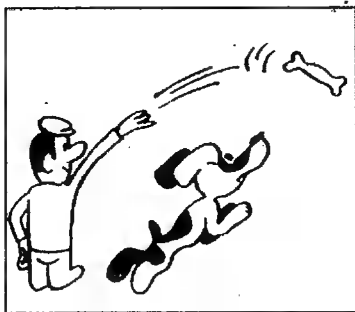
’’آج کل اس نے ’’گن اینڈ روزز‘‘ نامی ایک ناول شروع کر رکھا ہے۔ شاید وہی لینے گیا ہے۔‘‘

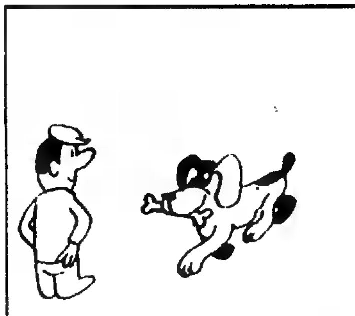
’’گن اینڈ روزز......‘‘ نبیل نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’اس نام کا ایک ’’میوزیکل بینڈ‘‘ ہے مگر ناول کا نام میں نے پہلی بار سنا ہے۔ کیا تم نے اس ناول کو کھول کر دیکھا ہے؟‘‘

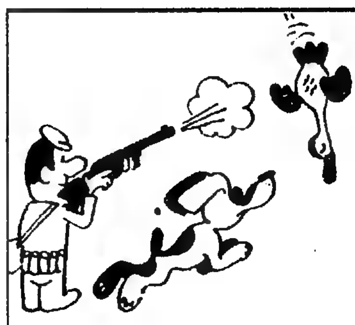
’’نہیں...... مجھے انگلش ناولز سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔‘‘ وہ بیزاری سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ’’اور پھر اس ناول کا تو نام بھی عجیب سا ہے۔‘‘

’’اسی لیے تو......‘‘ وہ ایک، ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ’’شوہر پر نظر رکھو نادیہ۔ یہ تمہارا فرض ہے تمہیں خبر ہونا چاہیے کہ تمہارا شوہر کیا، کیا کرتا پھر رہا ہے

تمام شد









...ان کے ٹیسٹ سے اس کے ذہنی رجحانات کا پتا چلتا ہے۔ تمہیں ''گن اینڈ روزز'' کا سرسری مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔''

نبیل کی بات میں وزن تھا۔ وہ اس کے فائدے کی ... رہا تھا۔ ہر بیوی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اسے اپنے ... کے پل، پل کی خبر ہو۔ اگرچہ نادیہ کو کاشف کی جانب ... کسی قسم کی بے وفائی کا خدشہ تو نہیں تھا لیکن اس نے یہ ... ن رکھا تھا کہ مرد ذات کا کوئی بھروسا نہیں۔ یہ بے ... ائی کرنے اور کرانے کے ماہر ہوتے ہیں۔

''تم ٹھیک کہتے ہو نبیل!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے ... بولی۔ ''کاشف اسلام آباد سے واپس آجائے، پھر ... ''گن اینڈ روزز'' کو چیک کروں گی۔''

ان کے بیچ یہ بات چیت چل ہی رہی تھی کہ عقب ... کاشف نمودار ہوا۔ نبیل نے اسے بیک ویو مرر میں دیکھ ... تھا۔ کاشف گاڑی کے عقب میں پہنچ کر رک گیا پھر ڈکی ... تک دیتے ہوئے بہ آواز بلند بولا۔

''نبیل! یار اسے کھولو۔ میں ناول کو بیگ میں رکھنا ... ہتا ہوں۔''

نبیل نے کاشف کے ہاتھ میں ایک ضخیم ناول دیکھ کر ... ل سانس خارج کی پھر ایک بٹن آپریٹ کر کے، گاڑی ... اندر رہتے ہوئے ڈکی کھول دی۔

کاشف نے کمر کے بل جھک کر ڈکی کے اندر رکھی ... ولی اسٹپنی (فاضل ٹائر) کو اِدھر اُدھر کیا پھر اپنے سفری بیگ ... کو اسٹپنی کے اوپر رکھ کر کھول لیا اور ''گن اینڈ روزز'' کو ... کے اندر پہنچانے کے بعد ڈکی بند کر دی۔

اگلے ہی لمحے ان کا سفر شروع ہو گیا۔

''نادیہ بتا رہی ہے کہ آج کل تم ناول وغیرہ پڑھ ... ہے ہو۔'' نبیل نے پوچھا۔ ''سچ پوچھو تو مجھے بالکل یقین ... ہیں آیا لیکن تمہارے ہاتھ میں ایک ہٹا کٹا ناول دیکھ کر ... ان کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ یہ شوق تمہیں کہاں سے لگ ... گیا کاشف......؟''

''کہاں سے لگ گیا...... کا جواب کبھی تفصیل سے ... دوں گا۔'' کاشف نے گاڑی کے باہر دیکھتے ہوئے خواب ... لہجے میں کہا۔ ''البتہ یہ شوق ہے بڑا سنسنی خیز اور ... مزے دار۔ میرا مشورہ ہے کہ اگر موقع ملے تو تم بھی ٹرائی ... کرنا...... خاص طور پر ''گن اینڈ روزز'' ضرور پڑھنا۔''

''اوکے...... میں اس بارے میں سوچوں گا۔'' ... نبیل نے سرسری انداز میں کہا۔

کاشف نے استفسار کیا۔ ''تو اس بارے میں تم نے کیا سوچا؟''

''کس بارے میں......؟'' نبیل کا الجھن زدہ سوال اُبھرا۔

''ارے یار! ایک تو تم ذرا ذرا سی بات پر اس طرح چونک جاتے ہو جیسے کسی نے تمہیں نقب لگاتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو......'' کاشف نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''میں بلیک کار کے حوالے سے پوچھ رہا ہوں۔ تم نے کہا تھا نا، اس کی دو وجوہات ہیں......!''

''اچھا وہ......'' نبیل نے اطمینان بھری سانس لی اور بولا۔ ''دیکھو، پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یہ کار میری ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ یہ کال سینٹر والوں کی پراپرٹی ہے۔ انہوں نے مجھے دی اور میں نے بسم اللہ کر کے لے لی۔ اور دوسری وجہ......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اگر کار کے رنگ کے انتخاب کا معاملہ میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں تب بھی بلیک کار لیتا ہی پسند کرتا۔''

''اس پسندیدگی کا کوئی خاص سبب؟'' کاشف نے جاننا چاہا۔

اس وقت کاشف اور نبیل ہی میں گفتگو ہو رہی تھی۔ نادیہ چپ چاپ بیٹھی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ نبیل نے کاشف کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔

''کالا رنگ مجھے اس لیے پسند ہے کہ یہ ہر قسم کی بُری نظر سے محفوظ رکھتا ہے اور میرا اس بات پر پختہ یقین ہے......''

''مطلب، تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ کالے رنگ کی گاڑیوں کا کبھی ایکسیڈنٹ نہیں ہوتا یا پھر انہیں ساری زندگی کسی مکینک کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی......؟'' کاشف نے جھلاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ ''ہماری کورے بھی تو بلیک کلر کی ہے۔ اس کا تین بار ایکسیڈنٹ ہو چکا ہے اور اس وقت بھی وہ ایک مکینک کے گیراج میں کھڑی ہے۔''

''میرے کہنے کا وہ مقصد نہیں تھا کاشف جو تم سمجھے۔'' نبیل نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ہر انسان کا اپنا ایک عقیدہ ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ دوسرے بھی اس سے اتفاق کریں۔''

''بہر حال، میں ایسی دقیانوسی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے باہر نکال دیتا ہوں۔'' کاشف نے بے پروائی سے کہا۔ ''ضعیف الاعتقادی انسان کے ایمان کو کمزور کر دیتی ہے۔ پھر وہ اپنے کالے کرتوتوں کو دوسروں کے سر تھوپنے کے لیے ہزار قسم کی تاویلات کا سہارا لے کر خود کو بہت جگادری سمجھنے لگتا ہے۔''

''فلسفی بھائی! ہم ائیرپورٹ پہنچ گئے ہیں۔'' نبیل نے اس بور اور بیزار کن گفتگو کو فل اسٹاپ لگاتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''تم نے ہمیں آج بہت گیان دیا ہے۔ امید ہے، آئندہ بھی مستفید ہونے کا موقع فراہم کرتے رہو گے۔ اب یہ بتاؤ کہ ہم تمہارے ساتھ اندر چلیں یا یہیں پر ڈراپ کر دیں؟''

کاشف نے نبیل کے معنی خیز بلکہ طنزیہ تبصرے کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی اور اضطراری لہجے میں کہا۔

''دس بج چکے ہیں اور چیک اِن کا عمل شروع ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے، تم لوگ مجھے ڈراپ کر کے واپس چلے جاؤ۔ اب مجھے ''اِن'' ہو جانا چاہیے۔''

نبیل نے گاڑی روک دی۔ وہ تینوں کار سے نیچے اترے۔ کاشف نے خود ڈِکی کھول کر اپنا بیگ نکالا پھر اس نے باری باری نبیل اور نادیہ سے گرم جوش مصافحہ کیا اور بیگ کو چلاتے ہوئے انٹری ڈور کی جانب بڑھ گیا۔ جب کاشف ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو وہ گاڑی میں بیٹھ کر واپسی کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

''یہ کاشف کو ہو کیا گیا ہے؟'' نبیل نے پسنجر سیٹ پر براجمان نادیہ سے پوچھا۔ ''عجیب بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے۔''

نادیہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''دیکھ لو، میں کس قسم کے جھکی شخص کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوں۔''

''لیکن کاشف پہلے تو ایسا نہیں تھا۔'' وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے بے یقینی سے بولا۔ ''کیا یہ ناول بینی کے اثرات ہیں یا......؟''

نبیل نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو نادیہ نے جلدی سے پوچھا۔ ''یا......کیا؟''

''تم نے کہیں اسے الو کا گوشت تو نہیں کھلا دیا؟'' نبیل نے اپنی بات مکمل کر دی۔

نادیہ نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے استفسار کیا۔ ''کہ کسی الو کو بھی الو کا گوشت کھلانے کی ضرورت ہوتی ہے؟''

''تم بڑی ظالم ہو نادیہ......!'' کاشف نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔

تمام شد

"ہاں ہوں...... مگر تم سے زیادہ نہیں۔" نادیہ نے
لی ہتر کی جواب دیا۔
چند لمحے تک گاڑی کے اندر خاموشی کا راج رہا پھر
ملن نے نادیہ سے پوچھا۔ "دانی کی چھٹی کتنے بجے ہو
گی؟"
"عام دنوں میں تو ایک پندرہ پر ہوتی ہے۔" نادیہ
نے بتایا۔ "مگر آج جمعہ ہے اس لیے ساڑھے بارہ بجے ہو
گی۔"
"اوہ، ابھی تو دانی کی چھٹی میں کافی وقت باقی
" نبیل نے کہا۔ "جب تم نے مجھے فون کیا تو میں ناشتا
رہا تھا۔ تمہارے پاس آنے کی جلدی تھی اس لیے
نہیں پی سکا۔ اب سر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا ہے کیوں نہ
سی ریسٹورنٹ میں تھوڑی دیر رک کر ایک ایک کپ
پی لیں؟"
"نبیل! تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں چائے
ہیں پیتی......" نادیہ نے شاکی لہجے میں کہا۔
"ہاں، جانتا ہوں۔" وہ سرسری انداز میں بولا۔
"ہم چائے نہیں، کافی پئیں گے اور وہ بھی لاوا آئسکریم
ساتھ......!"
"یہ ہوئی نا بات......" وہ توانا لہجے میں بولی۔



اسلام آباد سے دبئی جانے والی ایمریٹس ائر لائنز کی
ٹ نمبر یہ یہ کے لیے بورڈنگ کا آغاز ہو گیا۔ کاشف
ای ڈی کے سامنے ٹک کر بیٹھا ہوا تھا اور اس کی نگاہ
سل نیوز چینل پر جمی ہوئی تھی۔ اس کا دل مطمئن اور چہرہ
ون تھا۔ اس کی نشست و برخاست، حرکات و سکنات
آنکھوں سے کسی نوعیت کی بے چینی نہیں جھلکتی تھی۔ اسے
کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے اپنوں کو
کر جا رہا ہے۔
کاشف کے شک کو یقین کی منزل تک رسائی حاصل
نے کے لیے کم و بیش ایک سال کا عرصہ لگ گیا تھا۔ اس
سی بھی بات پر آنکھیں بند کر کے اعتبار نہیں کر لیا تھا بلکہ
معاملے کو بار بار چیک کیا تھا حتیٰ کہ اس نے اپنے یقین کو
الیقین تک پہنچانے کے لیے کڑی دوڑ دھوپ کی تھی اور
کنفرمیشن کے لیے کسی کے علم میں لائے بغیر ڈی این
ٹیسٹ بھی کروا ڈالا تھا......
"سر! آپ کی فلائٹ کی بورڈنگ شروع ہو چکی
" ائر پورٹ اسٹاف کی ایک پری وش نے کاشف کے
نزدیک آ کر نہایت ہی شائستہ لہجے میں اسے مطلع کیا۔
"تھینکس میم!" اس نے ایل ای ڈی سے نگاہ چرا
کر اطلاع کنندہ کا شکریہ ادا کیا اور اپنے بیگ کی سمت ہاتھ
بڑھا دیا۔
اپنوں کی طرف سے سدا کے لیے منہ موڑ لینا کوئی
آسان کام نہیں ہے لیکن انسان بعض دفعہ ایسے حالات میں
گھر جاتا ہے کہ اس قسم کے مشکل فیصلے کرنا لازمی قرار پاتا
ہے اور یہ سب کچھ طرفتہ العین ہو جاتا ہے، جیسے کوئی ان
دیکھی غیبی طاقت ایسا سوچنے پر مجبور کر دے۔ ایسے ہی
مواقع کے لیے کہا جاتا ہے...... تعلق روگ بن جائے تو
اسے توڑنا اچھا......!
دانی کے اسکول سے گھر تک کی ڈرائیو آدھے گھنٹے کی
تھی۔ اگر کوئی ڈرائیور ٹریفک جام کی پروا کیے بغیر گاڑی کو
ہوا کا گھوڑا بھی بنا ڈالے تو بھی بیس منٹ سے پہلے گھر پہنچنا
ممکنات میں سے نہیں تھا۔ آج دانی (دانش) کی چھٹی
ساڑھے بارہ بجے ہونا تھی۔ پانچ منٹ گاڑی تک پہنچنے کے
شمار کر لیے جائیں تو ان لوگوں کو ایک پانچ تک گھر پہنچ جانا
چاہیے تھا۔ وقت کے انہی اعداد و شمار کو ذہن میں رکھ کر
کاشف نے ٹائمر میں بارہ پینتالیس کا وقت سیٹ کیا تھا۔
وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسی لمحے نیوز چینل سے ایک
بریکنگ نیوز چلنے لگی۔
"آج دن دہاڑے کراچی شہر کی ایک مصروف سڑک
پر، ایک کار خوفناک دھماکے سے اڑ گئی۔ ابتدائی تحقیق سے
پتا چلا ہے، بلیک کرولا کی ڈکی میں کوئی طاقتور ٹائم بم نصب کیا
گیا تھا۔ ذرائع کے مطابق اس کار میں تین افراد موجود
تھے۔ ایک مرد، ایک عورت اور ایک سات سالہ بچہ۔ یہ
دھماکا اتنا زوردار تھا کہ کار کے ساتھ ہی ان تینوں کے بھی
پرخچے اڑ گئے ہیں۔ مزید تحقیقات جاری ہیں......"
کاشف کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی
اور وہ اپنے بیگ کو چلاتے ہوئے اس کاؤنٹر کی جانب بڑھ
گیا جہاں بورڈنگ ہو رہی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں
نادیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
"نادیہ بیگم! تمہیں، تمہارے آشنا اور اس کے بیٹے کو
میں نے اس جگہ پہنچا دیا ہے جو تم لوگوں کا اصل ٹھکانا ہے
کیونکہ میرے نزدیک بے وفائی اور غداری کی صرف اور
صرف ایک ہی سزا ہے...... موت...... ایک دردناک اور
عبرت انگیز موت!"





قسط :7

اناگیر

امجد جاوید

زندگی کی کشمکش میں فنا و بقا ایک حقیقت ہے۔ قدرت کا دستور ہے کہ کوئی غیر معمولی طاقت اسی کو ملتی ہے جو اس کا موزوں استعمال جانتا ہے۔ فنا و بقا سے نبرد آزما ہونے والے خود شناس ہوتے ہیں۔ یہ وصف انہی کو حاصل ہوتا ہے جو اناگیر ہوں اور اپنا ادراک رکھتے ہوں... جو ظلم و جبر کے بگولوں کو مات دینا جانتے ہوں... سنہری ریت کے باطن سے اُبھرنے والے ایک نوجوان کی پرت در پرت کھلتی داستانِ دل نواز۔ وہ ریت کی طرح بکھر سکتا تھا مگر ذروں میں بٹ نہیں سکتا تھا۔ دھرتی کی مٹی میں نکھرنے اور سنورنے کا فن بخوبی جانتا تھا... اپنی ذات کو انا کے بھنور سے بچانا جانتا تھا... حالات کی آندھیوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کے گر سے آگاہ تھا۔ جانتا تھا کہ بگولے ریت کو اِدھر اُدھر لے جاسکتے ہیں، فنا نہیں کرسکتے۔ ریشمی سراب تھے جو اس کی راہ میں حائل ہو رہے تھے۔

صحرا کے سرابوں سے ایک دیدہ بینا فگار نوجوان کی ہنگامہ خیزیاں



پرتاب سنگھ میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا جبکہ دائیں طرف جگو دادا مجھے گھور رہا تھا۔ سارا کھیل جگو دادا کے سر پر تھا۔ وہ جو فیصلہ کرتا، حالات اسی طرف مڑ جاتے۔ میں تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اگر دادا میرے خلاف چلا جاتا ہے تو پھر مجھے کیا کرنا ہوگا؟

''بول جگو کیا فیصلہ کرتا ہے؟'' پرتاب کی بھاری آواز گونجی تو جگو نے یوں اسے دیکھا جیسے کسی گہری سوچ سے بیدار ہوا ہو۔ وہ دھیمے قدموں سے آگے بڑھا اور پرتاب کے بالکل سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

''میرے دو جوان بیٹے مارے ہیں تم نے، یاد ہے نا تمہیں؟''

''میں مانتا ہوں پر یہ وقت......'' اس نے کہنا چاہا تو جگو دادا نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا اور جذباتی لہجے میں بولا۔

''وہی وقت میں اب تک اپنے کندھوں پر اٹھائے پھر رہا ہوں بے غیرت۔ تب سے اب تک میں نے صرف تم سے انتقام لینے کا ہی سوچا ہے۔ اس کے سوا میں نے کچھ نہیں سوچا۔ میں نے سوچوں ہی سوچوں میں نجانے کتنی بار تمہارے بیٹے کو مارا ہے۔ تم مجھے ڈراتے ہو کہ مجھے غدار کہہ دیا جائے گا۔''

''مگر تم اب بچ نہیں سکتے، مجھے اپنی موت کی کوئی فکر نہیں۔'' پرتاب نے کہا تو جگو دادا بولا۔

''ابھی تمہارے مرنے کا وقت نہیں آیا۔ ابھی تو تمہارے سامنے تمہارے بیٹے کو مجھے مارنا ہے۔ پھر تمہیں پتا چلے گا، بیٹے کی موت کا دکھ کیا ہوتا ہے۔''

''دادا، جو کرنا ہے کرو، یہ نہ ہو کہ باہر کے لوگ اندر آجائیں۔'' میں نے اسے یاد دلایا تو وہ بولا۔

''یہ ذلیل ہمیں، ہمارے ہی گھر میں ماریں گے، ایسا انہوں نے سوچا بھی کیسے۔ ابھی بتاتا ہوں انہیں۔''

''کچھ کرنا ہے، بتانا نہیں انہیں۔'' میں نے اسے یاد دلایا تو اس نے سر ہلاتے ہوئے پرتاب کو کالر سے پکڑا اور باہر کی جانب دھکا دیا، پھر مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے اسے دھکے دے کر باہر نکالنے لگا۔ دائیں جانب چند کمرے تھے جن کے ساتھ ہی اوپر کی جانب سیڑھیاں جا رہی تھیں۔ وہ ہمیں ایک کمرے میں لے گیا۔ ساتھ چلتے ہوئے اس نے مجھ سے پسٹل لے لیا تھا۔ جیسے ہی ہم کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے گھما کر پسٹل پرتاب کے سر پر مارا، وہ لڑکھڑا گیا، اگلے چند لمحوں میں وہ فرش پر گر گیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

''یہ کیا کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی بتاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھا سامنے کی دیوار میں ایک الماری تھی۔ اس کے پٹ سیا[ہ] لکڑی کے تھے۔ اس نے تیزی سے وہ پٹ کھولے، اندر کی طرف ہاتھ ڈال کر اس نے ایک خاص جگہ پر دباؤ ڈالا [تو] اندر ایک ریک گھوم گیا۔ سامنے اندھیرا غار سا دکھائی دیا۔ وہ کوئی خفیہ راستہ تھا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہاں رہو تھوڑی دیر، پھر بتاتا ہوں کہ کیا کرنا ہے۔ اسے اپنے ساتھ اندر رکھو، میں سب کو مطمئن کر کے آ[تا] ہوں۔''

''یہاں سے باہر......'' میں نے پوچھنا چاہا تو وہ تیز[ی] سے بولا۔

''ادھر کمرے میں بھی آسکتے ہو اور یہ راستہ باہر ایک دوسرے مکان میں کھلتا ہے، وہ مکان بھی اپنا ہے، وہا[ں] سے جدھر چاہو نکل سکتے ہو۔ لیکن ابھی پرتاب کو نہیں مارنا۔''

''ٹھیک ہے......'' میں نے کہا اور اس کو ٹانگوں کی طرف سے پکڑا، جگو دادا نے اس کے بازو پکڑے اور اس غار نما راستے میں ڈال دیا۔ میں بھی اس غار نما راستے میں چلا گیا تو دادا نے وہ الماری بند کر دی۔ اندر گھپ اندھیرا چھا گیا۔ گرمی کے ساتھ ساتھ کافی گھٹن بھی تھی۔ دونوں طرف کے در بند تھے۔ میں نے فون نکال کر اس کی بیٹری روشن کر لی۔ بے ہوش پرتاب مجھ سے کچھ فاصلے پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ مجھے وہاں کھڑے دو منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ جگو دادا کا فون آگیا۔ میں نے کال ریسیو کی تو وہ تیزی سے بولا۔

''اس لیے کال کی ہے کہ تم باہر کی باتوں کو سنتے رہو، اگر کوئی گڑبڑ ہو گئی تو اسی راستے سے باہر نکل جانا، پرتاب سنگھ کو یہیں چھوڑ دینا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا تو جگو دادا کی آواز ختم ہو گئی لیکن کال چلتی رہی۔ شاید وہ چلتا ہوا باہر برآمدے میں آگیا تھا۔ اس نے کسی سے کہا۔

''گیٹ کھول کر دیکھو، کون ہے باہر......؟''

کچھ دیر تک یونہی بھاگ دوڑ کی آوازیں آتی رہیں۔ گیٹ کھلنے کی آواز آئی اور پھر کسی نے اونچی آواز میں کہا۔

''کہاں ہے پرتاب سنگھ اور وہ دشمن ملک کا غدار؟''

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے بلکہ میں کہوں تم غلط جگہ پر

ہو۔'' جگو دادا کی آواز ابھری۔

''نہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے اور نہ میں غلط جگہ پر آیا ہا۔''

''تو پھر دیکھ لو، ایک ایک انچ کی تلاشی لے لو۔'' جگو ا نے کہا۔

''تم نے انہیں بھگا دیا ہوگا؟'' وہ آواز ابھری تو جگو ا نے غصے میں کہا۔

''دیکھ میں سکون سے اپنے گھر کی تلاشی دے رہا ہوں م پھیلتے جا رہے ہو۔ سیدھے مجھے پکڑ کر لے جانا چاہتے لے جاؤ۔''

''چلو تلاشی لو۔'' وہ آواز ابھری۔

پھر ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔ کہیں کہیں، کسی طرف کسی کے بولنے کی ہلکی ہلکی آوازیں آتی رہیں۔ اس غار راستے میں گھٹن بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ مجھے وہاں پر س لینا مشکل ہو گیا تھا۔ ایسے میں پرتاب سنگھ نے کروٹ وہ شاید ہوش میں آ رہا تھا۔ میرے لیے مشکل ہو گیا کہ اچھی طرح سانس لوں، یا اسے پھر سے بے ہوش کردوں چند منٹ یونہی گزر گئے تو پرتاب ہوش میں آ گیا۔ اس اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو میں نے پوری قوت سے ایک ونسا اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ پلٹ کر پیچھے کی جانب ا۔ وہ راستہ اتنا بڑا تھا کہ پورے قد سے کھڑا ہوا جا سکے۔ ڈر یہی تھا کہ پرتاب اونچی آواز میں چیخنا شروع نہ کر ے۔ میں نے فون اپنے کان سے لگایا ہوا تھا لیکن اس کوئی واضح آواز سنائی نہیں دے رہی تھی کہ جس سے مجھے دازہ ہوجاتا کہ باہر کیا چل رہا ہے۔

گھٹن زیادہ بڑھنے لگی تو میں نے وہاں سے نکل جانے ا سوچا۔ پرتاب فرش پر پڑا تھا۔ وہ کوئی حرکت نہیں کر رہا ا۔ میں اس گومگو میں تھا کہ کیا کروں کہ جگو دادا کی آواز ھری۔

''ہاں ہو گئی تم لوگوں کی تسلی؟''

''دیکھ جگو، ہم غلط نہیں آئے۔ وہ ہیں یہیں پر۔ سیدھی رح بتا دے ورنہ تجھے ہمارے ساتھ جانا پڑے گا۔'' وہی آواز ابھری۔

''تم آئے ہی اسی لیے ہو کہ مجھ پر الزام دھرو اور ساتھ جاؤ، چلو لے چلو، پھر مجھ پر کوئی الزام مت دھرنا کہ لون، کہاں قتل ہو گیا۔'' جگو دادا نے پوری بدمعاشی دکھاتے ہوئے دھمکی دی۔

''اگر مجھے پتا......''

''اگر مگر مت کرو، اب اور کیا کروں جو تمہیں یقین آجائے؟'' جگو نے کہا۔

''ابھی جاتا ہوں لیکن میری نظر تم پر رہے گی۔ نہیں چھوڑوں گا میں تمہیں۔'' اس نے دھمکی دی۔

''او لڑکے، یہ جائیں تو گیٹ لگا دینا۔'' جگو دادا نے مزید بات نہ کرنے کے لیے کہا۔ اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا تھا۔ وہ شاید برآمدے میں کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ تقریباً دو منٹ بعد اس نے کہا۔

''ویر سنگھ، ہوش میں ہونا؟''

''ہاں ہوش میں ہوں لیکن جلدی بے ہوش ہو جاؤں گا۔'' میں نے بہ مشکل کہا تو وہ بولا۔

''بس ابھی آیا۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

الماری کھلتے ہی تازہ ہوا کے جھونکے سے میری سانس بحال ہونے لگی۔ ایسے میں جگو دادا بھی اندر آ گیا۔ اس نے آتے ہی کہا۔

''دوسرے مکان میں جاتے ہیں، وہاں جا کر سوچتے ہیں کیا کرنا ہے۔''

''جو کرنا ہے، جلدی کرو۔'' میں نے کہا تو وہ غار نما راستے میں آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہوا کا جھونکا تیز ہوتا گیا تو میں سمجھ گیا کہ ادھر کا دروازہ بھی کھل گیا ہے۔ جگو دادا واپس آیا، اس نے پھر پرتاب کو کندھوں سے پکڑا تو میں نے ٹانگوں سے پکڑ لیا۔ ہم اسے گھسیٹتے ہوئے دوسرے مکان میں لے گئے۔ اسے فرش تک لاتے ہوئے ہم ہانپنے لگے تھے۔ ایک تو پرتاب کا وزن زیادہ تھا دوسرا اس غار نما راستے میں ہوا کا دباؤ بہت کم تھا۔

''جگو دادا، مجھے لگتا ہے کہ اب اس پرتاب سے جان چھڑانا پڑے گی، ورنہ یہ تیرے لیے عذاب بن جائے گا۔'' میں نے پھولے ہوئے سانس میں کہا تو وہ سوچتے ہوئے بولا۔

''مجھے بھی یہی لگتا ہے۔''

''تو چل پھر دیر نہ کر، سوچ اس کا کیا کرنا ہے۔'' میں نے کہا تو وہ بولا۔

''لیکن پہلے سوچنے والی بات ایک اور بھی ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''تمہارے لیے محفوظ ٹھکانے کی، اب تم رانی بھاگ وتی کے پاس نہیں جا سکتے ہو۔'' اس نے دھیمے سے کہا تو مجھے لگا کہ ایسا ہی ہے۔ میرے خیال میں ریاست کے لوگ متحرک ہو گئے تھے۔ ممکن ہے انہوں نے رانی بھاگ وتی کو

پکڑ ہی لیا ہو۔ میرا من چاہ رہا تھا کہ میں ریتو کو فون کروں، تبھی میں نے پوچھا۔
''تیرے پاس ہے کوئی ٹھکانا......؟''
''ہاں ہے، اگر تمہیں یہاں سے نکلنا بھی پڑے تو کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔''
''چل ٹھیک ہے۔ پہلے اسے ہوش میں لا۔'' میں نے کہا۔
''ہوش میں کیا لانا، ٹھوک دے اِسے۔'' جگو دادا نے نفرت سے کہا۔
''ابھی نہیں، ابھی تھوڑی دیر ٹھہر۔'' یہ کہتے ہوئے میں پرتاب کو... ہوش میں لانے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور ہونقوں کے مانند دیکھا پھر مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس نے کہا۔
''دیکھ، مجھے قتل کرے گا تو باہر آئے لوگ تجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے تو اور جگو دادا دونوں ہی......''
''چھوڑ اِن باتوں کو، میرے اور جگو داد کے درمیان ایک بات طے ہوگئی ہے، اگر تو سچ بولے گا تو میں تجھے کچھ نہیں کہوں گا اور اس کے حوالے کر کے چلا جاؤں گا۔ اگر تو نے جھوٹ بولا تو میں تجھے ابھی مار دوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے پسٹل اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ اپنے سامنے موت دیکھ کر مضبوط اعصاب والا بھی بچنے کی کوشش تو کرتا ہے۔ اس نے ایک لمحے کو سوچا اور پھر دھیرے سے بولا۔
''پوچھو کیا پوچھنا ہے؟''
''وہی، تجھے کس نے کہا تھا ڈاکٹر صاحب کو قید خانے میں ڈالنے کے لیے، بس یہ بتا دے۔'' میں نے پوچھا اور پسٹل کی نال اس کے ماتھے پر رکھ دی۔ وہ کسمسا کر رہ گیا۔ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔
''سارے راجستھان کا بڑا جے پور میں رہتا ہے۔ مجھے جو بھی کرنا ہوتا ہے، اسی کے کہنے پر کرتا ہوں۔ اوپر کیا معاملات ہوتے ہیں، مجھے کچھ پتا نہیں۔''
''کیا وہ بھی کلیان ہے یا......''
''وہ سب کچھ ہے۔'' اس نے بتایا۔
''کیا نام ہے اُس کا؟''
''ناگیشور۔'' اس نے سرسراتے ہوئے کہا تو میں نے پسٹل کی نال اس کے ماتھے سے ہٹالی۔ اس نے ایک طویل سانس لیا تو میں اس کے قریب سے اٹھ گیا۔ تبھی جگو دادا نے کہا۔
''کچھ دیر ٹھہر، میں گاڑی کا بندوبست کر کے ہوں۔''
یہ کہتے ہوئے وہ باہر کی جانب چلا گیا۔ میرے سا پرتاب بیٹھا مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں سوچنے لگا، جب میں شہر میں آیا تھا تو اس کا کتنا خوف تھا ہر طرف، اب بھی ہ لیکن یہ میرے سامنے بے بس پڑا تھا۔ یہ ایک مہرہ ت شاطر تو نجانے کہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد ہی دادا نے ہانک لگائی۔
''چلو آؤ نکلو باہر۔''
میں اٹھا تو میرے ساتھ پرتاب بھی اٹھ گیا۔ اسے یق نہیں آرہا تھا کہ میں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ میں نے دل میں ٹھان لی تھی کہ جگو اس کے بارے میں جو بھی فی کرے، وہ جانے۔ صحن کے آخر میں ایک کار کھڑی تھی۔ لوگ برآمدے میں کھڑے تھے۔ پرتاب حیرت سے د رہا تھا کہ یہ سب الٹ کیسے گیا۔ میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹ تھا۔ ایسے میں پرتاب اچانک زمین پر گر گیا۔ میں نے تی سے دیکھا، جگو دادا نے اس کے گلے میں رسی ڈالی ہوئی تھ وہ اس قدر نفرت سے اس رسی کو کس رہا تھا کہ اس کا بھیانک ہو گیا۔ پہلی بار اتنی نفرت میں نے اس کے چہر پر دیکھی تھی۔
پرتاب زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ اس کی زبان باہر آنکھیں ابل چکی تھیں۔ ایڑیاں رگڑ رہا تھا کچھ دیر بع ساکت ہو گیا۔ جگو دادا نے اسے چھوڑا تو اس کا پسینہ بہ تھا۔ اسی اثنا میں دو لڑکے بھاگتے ہوئے آئے، انہوں کار کی ڈکی کھولی اور لاش اس میں رکھ کر بند کر دی۔ جگو پچھلی نشست پر آبیٹھا، ایک نوجوان اس کے ساتھ بیٹھ ڈرائیور نے کار بڑھا دی۔ اس وقت تک ایک لڑکے گیٹ کھول دیا تھا۔
اس گنجان آباد علاقے سے نکلتے ہوئے ہمیں کچھ وق لگا، پھر جیسے ہی بڑی شاہراہ پر کار آئی، ڈرائیور نے گاڑ بھگا دی۔ تقریباً آدھا گھنٹا کار بھاگتی رہی، ہم میں سے ک نہیں بولا تھا، کار میں سکوت طاری تھا۔ ایک جگہ ک سارے درخت تھے۔ وہیں جگو دادا نے کار روکنے کا کہ کار ایک جانب رک گئی۔ ڈرائیور اور لڑکا باہر نکلے، انہ نے لاش نکالی اور سڑک کنارے پھینک دی۔ پھر وہ ا طرح واپس آبیٹھے۔ ڈرائیور نے کار بڑھا دی۔

☆☆☆

رات کا آخری پہر چل رہا تھا۔ کار ایک پہاڑی سل

کے سامنے رکوا دی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی جگو دادا نے مجھے باہر نکلنے کو کہا۔ میں کار سے اترا تو مجھے ہوا میں نمی کا احساس ہوا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ایک سمت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''چلو......'' میں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تو وہ کہتا چلا گیا۔ ''یہاں اوپر ایک سادھو مائی رہتی ہے۔ وہ سادھو کیا ہے پوری چنڈال ہے۔ دیکھنے میں تو ایسے ہی سادھو بنی ہوئی ہے لیکن بڑا مال [illegible] ں کے پاس، کئی دھندے چل رہے ہیں اس کے۔ پر [illegible] یں [illegible] ں کے دھندوں سے کیا لینا دینا، تم اس کے پاس رہو۔ وہ تمہیں بڑے آرام سے وہاں پہنچا دے گی جہاں تم جانا چاہو گے۔'' اس نے کہا۔

''وہ کیسے......؟''

''اس کے پاس سو طریقے ہیں۔ یہاں پر کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ بس جتنا وقت تم نے یہاں گزارنا ہے، ان کی طرح کپڑے پہننا ہوں گے تمہیں، یا جیسے بھی وہ تمہیں کہے۔''

''کیا اُس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے، مطلب یہ کسی دوسرے سے رقم......''

''اوئے ویر سنگھ، اس کا میرے ساتھ رقم کا یا مال کا تعلق نہیں ہے۔ یہ کبھی میری جگر ہوا کرتی تھی۔ مرتی تھی مجھ پر۔ بڑا شاندار وقت دیکھا ہے ہم نے۔ یہ تو پرتاب کی وجہ سے سب تلپٹ ہوگیا۔'' اس نے حسرت سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا پھر تیزی سے بولا۔ ''دیکھ جگو، میں نے ریتو کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ اسے ایک شاندار زندگی کی سہولیات دوں گا، یہ وعدہ پورا کر دینا۔ مجھے تم سے اور کچھ نہیں چاہیے۔''

''ہوگیا سمجھو۔'' اس نے کہا تو ہم دونوں ہی خاموش ہو گئے۔ تقریباً آدھے گھنٹے سے زیادہ اوپر چڑھتے ہوئے ہم ایک ایسی جگہ آگئے جہاں گھاس پھوس کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ کئی جگہ پر لکڑیاں جلا کر الاؤ لگایا گیا تھا۔ کوئی الاؤ جل رہا تھا کوئی بجھ گیا تھا۔ اس کے اردگرد گیروے رنگ کے کپڑے پہنے کئی سادھو لیٹے ہوئے تھے، کئی سارے گیروے رنگ کے تکونے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ جگو دادا ان کے درمیان سے چلتا ہوا ایک غار کے دہانے کے سامنے جا رکا۔ باہر دو سادھو بیٹھے ہوئے تھے۔ غور سے دیکھنے پر ہی سمجھ میں آتا تھا کہ وہ سیکیورٹی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک نے غور سے جگو دادا کو دیکھا، پھر بولا۔

''ماتا جی اندر ہی ہیں، جاؤ۔''

''اسے پتا تھا کہ ہم آرہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے فون کیا تھا۔''

ہم اندر چلے گئے۔ وہاں ایک کونے میں بہت سے دیے روشن تھے۔ میرے سامنے ایک ادھیڑ عمر عورت دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کا سر گنجا تھا۔ جس پر اس نے ایک دھجی اوڑھی ہوئی تھی۔ اوپری بدن پر ایک بڑی سی چادر ڈالی ہوئی تھی جس میں اس کے موٹے موٹے بازو کاندھوں سمت ننگے تھے۔ اس کی کمر سے لے کر بغلیں تک دکھائی دے رہی تھیں۔ گول چہرے والی تھی جس پر موٹے نین نقش تھے ہماری جانب بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی۔

''آؤ جگدیش بیٹھو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ وہاں گھاس پھوس ہی تھی، ہم وہاں پر بیٹھ گئے۔ وہ میری جانب دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد بولی۔

''یہی ہے وہ، جس نے پرتاب کو زمین سے لگا دیا؟''

''ہاں یہی ہے۔'' جگو نے ہولے سے کہا۔

''اب وہ ہے......'' اس نے ہولے سے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے ہنکارا بھرنے والے انداز میں کہا تو وہ ایک دم سے خوش ہوگئی، پھر خوشگوار لہجے میں بولی۔

''چل اچھا ہوا سالے نے مال بڑا مہنگا کر دیا تھا۔ اب تو عام ملے گا نا۔''

''تیرے لیے تو جتنا چاہیے ملے گا۔ مفت ملے گا۔'' جگو نے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ پھر اپنے سامنے پڑی ہوئی مٹی کی سلفی اٹھا کر اس میں آگ لگائی تو غار چرس کے دھوئیں سے بھر گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر سلفی پکڑی، پھر ایک طویل کش لے کر دھواں چھوڑتے ہوئے بولی۔

''کیا چاہتا ہے؟''

''جے پور، وہاں کوئی محفوظ ترین ٹھکانا۔'' جگو نے کہا۔

''ہوجائے گا۔'' اس نے کہا۔

''چل پھر میں چلتا ہوں۔'' جگو نے اٹھتے ہوئے کہا پھر میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور باہر نکل گیا۔

سادھو مائی نے سلفی میں سے ایک کش لیا اور میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''پیے گا؟''

''نہیں، میں نہیں پیتا۔'' میں نے سکون سے کہا۔

''چل پھر، ایسا کر وہ کونے میں... چادریں پڑی ہیں، ایک باندھ لے اور دوسری اوپر لے لے اور آجا میرے پاس، یہاں آکر سکون سے سوجا۔''

میں اٹھا اور میں نے کونے میں پڑی کافی ساری چادروں میں سے دو چادریں لیں وہیں ایک باندھ لی۔ دوسری میں

نے اوپر لے لی۔ میرے پاس پسٹل، میگزین اور سیل فون ہی تھا۔ وہ میں نے نیفے میں رکھ لیے۔ میرے کپڑے وہیں پڑے تھے۔

''اپنے ان کپڑوں کو چادروں کے نیچے کر دو۔'' سادھو مائی نے کہا تو میں نے ویسا ہی کر دیا۔ پھر اس کے پاس چلا گیا۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ ایک جانب لٹا لیا۔ پھر وہ سلفی پیتی رہی اور مجھے نجانے کب نیند آ گئی۔

میری آنکھ کھلی تو غار میں ملگجا اندھیرا تھا۔ مگر دہانے پر مجھے لگا جیسے پورا دن ہی گزر گیا ہو۔ میں یہی سوچتے ہوئے اٹھ بیٹھا کہ پتا نہیں سادھو مائی کہاں ہو گی۔ میں کچھ دیر بیٹھا رہا پھر اٹھ کر باہر جانے لگا تو دہانے پر دو سادھو بیٹھے ہوئے دکھائی دیے۔ ان دونوں نے اپنے بدن پر بھوبھل (راکھ) ملی ہوئی تھی۔ گلے میں کنٹھے اور مالائیں تھیں۔ وہ یوں بیٹھے ہوئے تھے جیسے کسی مزار کے باہر مجاور بیٹھے ہوتے ہیں۔ ایک کی مجھ پر نگاہ پڑی تو اس نے فوراً اٹھ کر مجھ سے کہا۔

''آؤ آگے آجاؤ۔''

میں اس کے پاس چلا گیا۔ اس نے انگلی سے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ دیکھو سامنے، وہ آبشار ہے نا، وہاں جا کر نہا دھو آؤ۔''

''لیکن تم لوگوں نے یہ بھوبھل ملی ہوئی ہے؟'' میں نے دھیمے سے پوچھا۔

''ہمیں چھوڑو، تم جاؤ۔'' اس نے کہا تو میں سر ہلاتا ہوا چل دیا۔

تھوڑی سی مشقت کے بعد میں آبشار تک پہنچ گیا۔ وہ ایک نالا سا تھا، پانی ٹھنڈا اور شفاف تھا۔ میں نے اوپری چادر میں پسٹل، میگزین اور سیل فون اکٹھا کر کے رکھا اور دھوتی باندھے نہانے لگا۔ میں پوری طرح فریش ہو چکا تھا۔ میں نے گیلی چادر ہاتھوں میں لی اور خشک چادر باندھ کر واپس اسی غار میں آ گیا۔ میں نے گیلی چادر کو باہر ہی پھیلا دیا، اندر آ کر ایک مزید خشک چادر لے لی۔ میں ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ایک سادھو پیتل کے بڑے سے تھال میں میرے لیے کھانا لے کر آ گیا۔

وہ کھانا بھی عجیب تھا۔ اس میں ایک جانب سالن تھا تو دوسری جانب مٹھائی کے ٹکڑے رکھے ہوئے تھے۔ کہیں حلوہ تھا، تو کہیں پاپڑیاں اور پھل رکھے ہوئے تھے، وہ ایک یادگار کھانا تھا، جس کا لطف آ گیا۔ میں نے پیٹ بھر کر کھایا۔ کچھ دیر بعد وہی سادھو واپس آیا تو اس نے ایک سیاہ رنگ کی مالا میرے گلے میں پہنا دی۔ تبھی میں نے پوچھا۔

''سادھو مائی کہاں ہیں؟''

''وہ اپنے استھان پر ہیں۔'' اس نے کہا اور پیتل تھال اٹھا کر چلا گیا۔ میں کچھ دیر تک وہیں پڑا رہا پھر اٹھ غار سے باہر آ گیا۔ وہ دونوں سادھو اب بھی وہیں بیٹھے ہو۔ تھے۔ انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ میں آگے بڑ گیا۔ باہر کا ماحول بہت اچھا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھ ہر طرف سادھوؤں کی ٹولیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک اونچ جگہ پر سادھو مائی براجمان تھی۔ وہ اس وقت بدن پر بھوبھ ملے ہوئے ایک چٹائی پر بیٹھی تھی۔ اس کے ماتھے پر بڑا قشقہ تھا۔ اس نے اپنے سامنے ترشول گاڑا ہوا تھا۔ جس ساتھ ایک ڈمرو بندھا ہوا تھا۔ وہ خود کو شو کا کا پجاری ظاہر رہی تھی۔ اس کے اردگرد کئی سارے درشنک بیٹھے ہو۔ تھے۔ وہ ایک ایک کو اپنے پاس بلاتی جاتی، ان پر جنتر پڑھتی، مور پنکھ ان پر پھیرتی اور چیخ چیخ کر انہیں آشیر دے رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ سب ڈراما ہے لیکن لوگو کا اس پر اعتقاد تھا تو اتنی دور شہر سے باہر آتے تھے۔ ہو ہے دوسرے شہروں سے بھی لوگ آتے ہوں۔ اس کاروبار خوب چل رہا تھا۔ میں تھوڑی دیر یہ تماشا دیکھتا پھر ایک ویرانے کی جانب بڑھ گیا۔

وہ پہاڑی کا ایک کنارا تھا جس کے آگے ایک نشیب تھا۔ اردگرد درخت اُگے ہوئے تھے۔ راجھستان کے سا ہی صحرا کا تصور ابھرتا ہے، جبکہ یہ علاقہ بھی راجھستان ہی پڑتا تھا لیکن یہ جنوب کی طرف آخری سرے پر تھا۔ یہ سے پہاڑی سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کہاں ہوں، ہو سکتا تھا کہ یہ وہی علاقہ ہو جہاں قید خانہ تھ اس وقت میرا من چاہ رہا تھا کہ میں ریتو کو فون کروں۔ اس کا حال جاننا چاہ رہا تھا لیکن ایک بار اسے فون کر لیتا اس پر کوئی افتاد ہوئی تو مجھے سب کچھ چھوڑ کر اس کی مدد لیے جانا پڑتا۔ میں نے اُسے ایک دم سے نظر انداز کر د میں نے فون نکالا اور چاچا عبدالمجید کو فون کرنے لگا۔ را ہوتے ہی میں نے اسے اپنی لوکیشن بتائی اور پھر نا گیشور بارے میں بتایا تو انہوں نے کہا۔

''مجھے تھوڑا وقت دو، میں اس کے بارے میں معلوما تمہیں دیتا ہوں۔''

''اب مجھے یہ نہیں معلوم کہ میں کب تک جے پور ہوں۔'' میں نے بتایا تو انہوں نے کہا۔

''تم اپنے بارے میں بتا دینا، میں دیکھ لوں گا۔''

اس کے ساتھ ہی الوداعی باتوں کے بعد کال ختم ہو گ

میں کافی حد تک مطمئن ہوگیا۔
شام ڈھل رہی تھی جب میں دوبارہ غار کی جانب آ گیا۔ سادھو مائی واپس غار میں آ چکی تھی۔ اس کے سیوک اسے دبا رہے تھے۔ وہ یوں لیٹی ہوئی تھی جیسے بہت تھک گئی ہو۔ اس نے میری جانب اتنی توجہ نہیں کی۔ میں کونے میں لگ کر بیٹھا رہا۔ ایک سیوک نے غار کے کونے میں دیے روشن کر دیے تھے۔ سیوکوں کے دبانے کا عمل اس وقت تک رہا جب تک بھوجن نہیں آ گیا۔ سادھو مائی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ہمارے پاس دو تھالیاں آئی تھیں، ایک انہوں نے میرے سامنے رکھ دی اور ایک سادھو مائی کے سامنے۔ اس میں وہی کچھ تھا جو شام کے وقت مجھے دیا گیا تھا۔
سادھو مائی نے پیٹ بھر کر کھایا۔ اس دوران میں اس نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ کھا چکی تو ایک سیوک نے سلفی میں کافی ساری چرس رکھی اور سادھو مائی کی جانب بڑھا دی۔ اس نے وہ سلفی پکڑی، اسے آگ دکھائی اور پھر گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے میری جانب دیکھ کر بولی۔
''تم باہر آئے تو دور دور رہے، میرے پاس کیوں نہیں آئے؟''
''یہی ڈر تھا کہ کہیں درشکوں میں کوئی ایسا ویسا بندہ نہ ہو جس کی وجہ سے میں پہچان لیا جاؤں اور کوئی نئی مصیبت نہ پڑ جائے۔'' میں نے دھیمے سے انداز میں کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔
''بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ محتاط رہنا اچھا ہوتا ہے۔''
''لوگ وہاں تھے بھی تو بہت۔'' میں نے یونہی بات بڑھائی۔
''ہاں، بہت آتے ہیں، بڑے مسئلے ہیں لوگوں کے۔'' اس نے آنکھیں بند کیے بڑے سُرور میں کہا۔
''ان کے مسئلے حل ہوتے ہوں گے تو لوگ آتے ہیں۔'' میں نے جان بوجھ کر کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی، پھر بولی۔
''او ظالم، اتنے ان کے مسئلے ہوتے نہیں جتنے ہم پیدا کر دیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک کش لیا پھر گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''اس عوام پر نا، خوف طاری ہے۔ ہر طرح کا خوف۔ ہر بندہ نجانے کتنا خوف اٹھائے پھرتا ہے۔ اس خوف کا اتنا بوجھ ہے کہ اسے سمجھ ہی نہیں آتا کہ وہ کرے تو کیا کرے۔ وہ ہمارے پاس آتا ہے کہ اس کا خوف ختم ہو جائے۔ لیکن ہم اسے مزید خوف میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ یہی خوف اُن سے مال نکلواتا ہے۔''
''میں سمجھا نہیں، جب اُن پر خوف زیادہ طاری ہو گیا تو.....'' میں نے کہنا چاہا تو وہ بولی۔
''اچھا بھلا بندہ جب یہ کہے گا کہ مجھ پر جادو ہو گیا ہے تو ہم نے اس کا جادو ختم کرنا ہے نا، جادو کے خاتمے کے لیے جاپ تو ہمیں ہی کرنا ہے۔ ہم اسے یہی خوف دیں گے کہ اگر اس دوران ہماری موت ہو گئی، یا تمہاری موت ہو گئی تو پھر......؟ بس پھر یہیں سے بات بنتی ہے۔ وہ جادو ختم کرانے کے چکر میں مال ہمارے سامنے ڈھیر کر دیتا ہے۔ کچھ عرصے بعد اس کے دماغ سے یہ بات نکال دی جاتی ہے کہ اس پر جادو تھا۔ اسے یقین دلا دیا جاتا ہے کہ اس پر جادو ختم ہو گیا ہے۔'' اس نے کہا اور سلفی سے مزید گہرا کش لے کر سلفی کو جھاڑ دیا۔ اس پر نشہ طاری ہو چکا تھا۔ مجھے ان باتوں سے کوئی مطلب نہیں تھا کہ اس کا سیکرٹ بزنس کیا ہے۔ میں نے اپنے مطلب کی بات پوچھی۔
''میں جے پور کب تک جا پاؤں گا؟''
''چلیں جائیں گے جلدی کا ہے کی ہے، تم سو جاؤ۔'' اس نے کہا تو میں دیوار کے ساتھ لگ کر لیٹ گیا۔
میں کافی دیر تک لیٹا رہا، مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ جبکہ سادھو مائی خراٹے لے رہی تھی۔ میں لیٹے لیٹے تھک گیا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اٹھ کر باہر چلا جاؤں۔ وہیں کسی کھلی فضا میں سانس لوں۔ مگر میں خود پر جبر کیے پڑا رہا۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت سادھو مائی کی خوشنودی بہت ضروری ہے، ورنہ میں بہت ساری مشکلات میں آ سکتا تھا۔ شاید وہ یہ جاننا چاہ رہی تھی کہ میں کس حد تک اس کی بات مانتا ہوں۔ یہی سوچتے ہوئے میری آنکھ لگ گئی۔
کوئی شور تھا جس کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، سادھو مائی اپنی جگہ پر نہیں تھی۔ پتا نہیں باہر کیا تھا، جبکہ شور باہر ہی سے آ رہا تھا۔ میں نے جب غور کیا تو وہ سنکھ بجنے کی آوازیں تھیں۔ سادھو مائی کے سیوک صبح ہو جانے پر سنکھ بجا رہے تھے۔ میں پھر سے لیٹ گیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد سادھو مائی اندر آئی تو اس نے مجھے جاگتا ہوا پا کر بڑے نرم لہجے میں کہا۔
''تیار ہو جاؤ، تھوڑی دیر بعد ہم جے پور کے لیے نکلیں گے۔''
''جی بہتر......'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا اور اٹھ گیا۔
تھوڑی دیر بعد جب غار کے باہر شور بڑھنے لگا تو سادھو مائی اٹھ کر باہر کی جانب چل دی۔ میں بھی اس کے پیچھے تھا۔

باہر سادھو... مائی کے بہت سارے سیوک موجود تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تکونے گیروے رنگ کے جھنڈے تھے، کچھ ڈھول اور سنگھ بجا رہے تھے۔ سادھو مائی کے سیوکوں نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ ان کے جلو میں چلنے لگی۔ یونہی شور میں چلتے ہوئے ہم نیچے سڑک تک آ گئے۔ دن کافی چڑھ آیا تھا۔ سڑک پر ایک بس کھڑی تھی۔ آدھے سے زیادہ سیوک بس میں سوار ہو گئے۔ میں بھی سادھو مائی کے ساتھ ہی بس میں سوار ہو گیا تھا۔ چند سیوک باقی بچے جو نیچے ہی کھڑے رہے۔ کچھ ہی دیر بعد بس چل دی۔

☆☆☆

تقریباً پانچ گھنٹے کے سفر کے بعد جے پور شہر کی آبادی شروع ہو گئی۔ میں سیوکوں کے ساتھ پچھلی سیٹوں پر بیٹھا خاموشی سے سفر کرتا رہا تھا۔ رستے میں کہیں بھی کسی نے اس بس کو چیک نہیں کیا۔ کہیں پر کوئی ناکا تھا بھی تو سادھوؤں کی بس دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ بس شہر کے اندر ایک بڑی عمارت کے سامنے جا رکی۔ کشادہ آہنی گیٹ کھل گیا تھا تو بس اس گیٹ میں داخل ہو گئی۔ سارے سیوک بیٹھے رہے جب تک سادھو مائی نہیں اتر گئی۔ اس کے بعد ہم بھی اتر گئے۔ ہم سب سادھو مائی کے پیچھے پیچھے اندر چلے گئے۔ میں نے بس سے اتر کر اردگرد کا جائزہ لیا۔ بڑے بڑے سبز لان کے درمیان سڑک تھی۔ سڑک سے آگے پرانی طرز کی دو منزلہ عمارت تھی۔ پورچ کے بعد دائیں بائیں ستونوں کے پیچھے برآمدہ دکھائی دے رہا تھا۔ عمارت دیکھ کے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ عمارت کسی راجا مہاراجا کی چھوڑی ہوئی ہے یا پھر کسی انگریز کی چھوڑی ہوئی جائداد پر قبضہ کیا ہوا ہے۔

سادھو مائی اندر جا چکی تھی۔ بہت سارے سادھو سر جھکائے عمارت کی پچھلی جانب جا چکے تھے۔ میرے ساتھ وہی دو سادھو کھڑے تھے جو غار کے باہر مجاوروں کے مانند موجود رہتے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور پچھلی جانب چل دیے۔ وہاں کافی کمرے بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے چلا گیا۔ سامنے فرش پر میٹرس بچھا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''پدھاریں۔'' یہ کہہ کر وہ لحہ بھر کو رکا، پھر بولا۔ ''کوئی سیوا ہو تو یہ بٹن دبا دیں۔ کوئی نہ کوئی آجائے گی۔''

''دھنے واد۔'' میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا تو وہ مشینی انداز میں واپس پلٹ گیا۔ میں نے سکون کا ایک طویل سانس لیا اور وہیں لیٹ گیا۔

سہ پہر تک میں لیٹ لیٹ کر تھک چکا تھا۔ میں نہا کے تازہ دم ہو چکا تھا۔ الماری میں پڑی صاف دھلی ہوئی دو چادریں نکال کر باندھ چکا تھا۔ مجھے اس ماحول سے وحشت ہونے لگی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں قید ہو کر رہ گیا ہوں۔ ایسے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ وہی ادھیڑ عمر سادھو اندر آ گیا۔ اس نے مجھے نمسکار کیا اور پھر بڑے رسان سے بولا۔

''ماتا جی یاد کر رہی ہیں آپ کو۔''

''چلو۔'' میں نے کہا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔

عمارت کے اندر کا ماحول بڑا خاموش تھا۔ ایک راہداری سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا، ہال میں کافی اور مختلف عمر کی عورتیں ایک ترتیب میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے گیروے رنگ کی وہی دو چادریں پہنی ہوئی تھیں۔ چند عورتوں کے سر پر بال نہیں تھے۔ زیادہ تر کے بال تھے۔ وہ سادھو مجھے ایک کمرے کے سامنے پہنچا کر واپس پلٹ گیا۔

سادھو مائی کمرے میں میٹرس پر اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کافی فریش دکھائی دے رہی تھی۔ شاید نہا دھو کر بیٹھی تھی۔ میں اس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا تو اس نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کیسا لگ رہا ہے؟''

''وحشت ہو رہی ہے۔'' میں نے صاف کہہ دیا۔

''وہ کیوں؟'' اس نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے لگ رہا ہے جیسے میرے ہاتھ پاؤں بندھ گئے ہیں اور میں بے کار پڑا ہوں۔''

''ارے چار دن یہاں سکون سے گزار لو... پھر ایسی موج تمہیں کہاں سے ملے گی، کہیں میرا یار مجھے یہ نہ کہے کہ اس کے دوست کی سیوا نہیں کی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''یہ آشرم ہے، میں نے نہیں بنایا، مجھ سے پہلے ایک سادھو نے بنایا تھا، بہت اچھا بندہ تھا، میں اس کے بہت قریب ہو گئی، بس پھر وہ بے چارہ مر گیا، اس کی جگہ میں آ بیٹھی۔'' اس نے کہا تو میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''اور اگر تم مر جاؤ تو تمہاری جگہ کوئی اور بیٹھ جائے گا۔''

''بالکل، مجھے یہ بھی یقین ہے کئی میرے مرنے کی تمنا لیے پھر رہے ہوں گے، یا ان عورتوں میں کئی اپنے آپ کو میری جگہ دیکھ رہی ہوں گی۔'' اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

’’جب یہاں اتنا بڑا سیٹ اَپ ہے تو پھر وہ ویران پہاڑی......؟‘‘ میں نے تجسس سے پوچھا تو وہ مسکرا کر بولی۔

’’ارے یہاں کہاں اتنا مال ملتا ہے۔ یہاں کے مال سے تو یہاں کا خرچ پورا نہیں ہوتا۔ وہ پہاڑی کوئی ایک ٹھکانا نہیں ہے۔ بہت ساری جگہیں ہیں، جہاں میں جاتی ہوں۔ مال تو وہاں سے اکٹھا ہوتا ہے۔ کئی دھندے چلتے ہیں وہاں پر۔‘‘

’’اچھا وہ تو سب ٹھیک ہے، اب مجھے اجازت دو، میں نکلتا ہوں یہاں سے۔‘‘ میں نے پُرسکون انداز میں کہا۔

’’پر تو جائے گا کہاں؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’کہیں بھی، جہاں سانپ وہاں جوگی۔‘‘ میں نے گول مول بات کی تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

’’ایسے بات مت کر بوا۔ جوگی ایسے ہی جے پور میں نہیں آیا۔ مجھے بول، تجھے اسی خاص بندے تک پہنچا دوں گی۔‘‘

’’اگر وہ تیرا دوست ہوا، بہت طاقتور ہوا تب بھی؟‘‘ میں نے پوچھا تو اس نے ایک طویل سانس لی پھر وکھی لہجے میں بولی۔

’’اس دنیا میں کوئی دوست کوئی دشمن نہیں ہوتا، بس مفاد ہوتا ہے۔ جس سے فائدہ مل گیا وہ دوست جس سے نہیں ملا وہ دشمن۔‘‘

’’ہاں یہ تو ہے، لیکن کچھ باتیں فائدے نقصان سے بھی بڑھ کر ہوتی ہیں۔‘‘ میں نے پُرسکون انداز میں کہا تو وہ میری جانب دیکھ کر بولی۔

’’فائدہ کسی نہ کسی کا ہوتا ہے... کوئی بھی شعبہ ہو، چاہے وہ جرم کی دنیا ہو، ٹھگی چوری چکاری، فراڈ جو بھی ہو، حتیٰ کہ یہ میرا کام بھی، جہاں جتنی کامیابی ہوتی ہے، وہاں اتنے ہی حاسد پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ یا تو ان کی جگہ لینا چاہتے ہیں، یا پھر اسے ختم کر دینے کے درپے ہوتے ہیں۔ تو بتا، میں اس کے مخالف بندے کے پاس تجھے پہنچا دوں گی۔‘‘

’’ابھی مجھے کچھ پتا نہیں۔‘‘ میں نے مترشح لہجے میں کہا۔

’’تو پھر تب تک یہیں پڑا رہ۔ جب جہاں جانا ہو مجھے بتا دینا۔‘‘ اس نے سکون سے کہا۔

’’نہیں، تمہارے ہاں سکون ہے جو مجھے بالکل پسند نہیں، مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں یہاں رہا تو جم جاؤں گا۔‘‘ میں نے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ پھر بولی۔

’’میں سمجھ گئی ہوں۔ آج رات ہی تجھے بھیج دوں گی۔‘‘

’’دھنے واد......‘‘ میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تو اس نے مجھے جانے کا اشارہ [illegible]

میں واپس کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ مجھے جے پور کے بارے میں بالکل پتا نہیں تھا۔ مجھے یہاں کسی نہ کسی کی مدد درکار تھی۔ سادھو مائی نے کوئی نئی بات نہیں کی تھی کہ جس بندے تک مجھے پہنچنا تھا، اس کے کسی مخالف کے پاس ہی مجھے ہونا چاہیے تھا۔ ایسا شروع سے چلتا آرہا تھا۔ دشمن جب بھی وار کرتا ہے، ایسے ہی کرتا ہے۔ وہ پہلے معاشرے کے ناراض لوگوں کو ہی اپنے حصار میں لیتا ہے اور پھر ان کے سہارے انتشار پیدا کرتا ہے۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ چاچا عبدالمجید کا فون آ گیا۔

’’میں تو چاہتا تھا کہ تم واپس آجاتے، تمہارا مشن مکمل ہو گیا تھا لیکن اب تم اصرار کر رہے ہو تو سنو۔ تمہیں ناگیشور کے بارے میں غلط بتایا گیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ انڈر ورلڈ مافیا سے جڑا ہوا ہے۔ لیکن اس کا کلیان جی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔‘‘

’’تو پھر یہاں پر کون ہے جس نے......؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’یہ درست ہے کہ وہ شخص یہیں اسی شہر میں رہتا ہے جو کلیان جی بھی ہے اور ریاست کا ایجنٹ بھی۔ پوری کوشش کے بعد بھی ابھی تک اس شخص کا حتمی نام سامنے نہیں آسکا ہے جس کے بارے میں یقین سے کہا جا سکے۔‘‘ چاچا عبدالمجید نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

’’تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’میں تجھے ایک نمبر بھیجتا ہوں۔ اس پر کال کرو۔ وہ سب تمہیں سمجھا دے گا۔ وہ وہاں پر ہمارا سب سے بااعتماد سلیپر سیل ہے۔‘‘ انہوں نے کہا۔

’’اوکے۔‘‘ میں نے کہا اور پھر کال ختم ہو گئی۔

شام ہو گئی تھی۔ میں آشرم کے پورچ میں تھا۔ میرے تن پر وہی دو گیروے رنگ کی چادریں تھیں۔ میرے ساتھ ایک اور سادھو کھڑا تھا۔ ایسے میں ایک کار کمرے کے سامنے آرکی۔ ہم دونوں اس میں بیٹھے تو کار چل دی۔ کچھ دیر سفر کرتے رہنے کے بعد وہ ایک پوش علاقے میں آ گیا۔ وہاں ایک گھر کے سامنے کار رُک گئی۔ کچھ دیر بعد گیٹ کھلا اور ہم کار سمیت اندر چلے گئے۔

ہم کار سے اتر کر اندر چلے گئے۔ وہ جدید قسم کا سیلون تھا۔ وہاں کئی لوگ اپنے کام میں مصروف تھے۔ ایک نوجوان کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہم سب سے ہاتھ ملایا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

’’ویلکم، آئیں۔‘‘
وہ ہمیں لیتا ہوا ایک کمرے میں آ گیا۔ سادھو اور ڈرائیور ایک جانب بیٹھ گئے۔ تب اس نوجوان نے کہا۔
’’آئیں سب سے پہلے میں آپ کا حلیہ ٹھیک کرتا ہوں۔‘‘
میں آئینے کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے خود کو آئینے میں دیکھا تو پہچان ہی نہیں پایا۔ وہ میرا حلیہ بدلنے لگا۔

میرے بدن پر جدید تراش کا مہنگا سوٹ تھا۔ مہنگا جوتا، ایک ہاتھ میں گھڑی اور دوسرے میں بریسلیٹ تھا۔ یہ سب سادھو مائی کی طرف سے تھا۔ میں اپنا پسٹل، میگزین اور سیل فون سنبھال چکا تھا۔ میں جب تک تیار ہوا، سادھو اور ڈرائیور وہاں سے جا چکے تھے۔ میں نے وہیں سے اس نمبر پر کال کی جو چاچا عبدالمجید نے مجھے بھیجا تھا۔ وہ میرے ہی انتظار میں تھا۔ اس نے مجھے سمجھا دیا کہ میں اس تک کیسے پہنچ سکتا ہوں۔

وہ ایک چھوٹی سی گلی تھی جو اوپر کی طرف اٹھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے ایک طرف مکان تھے اور دوسری طرف ڈھلوان تھی جس کی نشاندہی ایک لوہے کا جنگلا لگا کر کی گئی تھی۔ اس نے اپنے مکان کی جو نشانی بتائی تھی، وہ پوری گلی میں ایک ہی تھا، جس کے آگے سیڑھیاں تھیں۔ وہ گلی کے بالکل آخر میں تھا۔ میں نے ٹیکسی کو وہیں رکوا دیا۔ میں نے اسے ادائیگی کی تو وہ آگے بڑھ گیا۔ میں نے ایک طویل سانس لیا اور اس مکان پر نگاہ ڈالی۔ چند قدم بھرے اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا دروازے تک آن پہنچا۔ دستک کے جواب میں تھوڑی دیر بعد ایک شخص نمودار ہوا۔ اس کا قد لمبا تھا، گٹھا ہوا بدن۔ اس نے ٹی شرٹ اور شارٹس پہنے ہوا تھا۔ سر کے بال کھچڑی اور کلین شیو تھا۔ اس نے گہری نگاہ سے مجھے دیکھا تو میں نے کہا۔
’’مجھے شریدھر سے ملنا ہے، ابھی ان سے فون پر بات ہوئی تھی۔‘‘
’’میں ہی ہوں، تم ویر سنگھ ہو؟‘‘ اس نے پوچھا۔
’’ہاں، میں ویر سنگھ ہوں۔‘‘ میں نے کہا تو اس نے دوبارہ مجھے گہری نگاہ سے دیکھا اور اندر جانے کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ چھوٹے سے لاؤنج میں بڑے مہنگے صوفے سجے تھے۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کچن کی جانب بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں سوڈے کی بوتل تھی۔ اس نے میرے سامنے رکھی اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔
’’میں کبھی کبھی یہاں اکیلے رہنے کے لیے آتا ہوں۔ میری فیملی یہاں نہیں ہے، وہ مستقل لندن میں رہتے ہیں۔ تم اگر یہاں رہنا چاہو تو بڑے آرام سے یہاں رہ سکتے ہو۔‘‘
’’مجھے یہاں رہنا نہیں، کام ختم کرتے ہی چلے جانا ہے۔‘‘ میں نے کہا۔
’’جس کام کے لیے تم یہاں آئے ہو، وہ کام ملے گا تو کرو گے نا۔‘‘ وہ ہنستے ہوئے بولا، پھر لمحہ بھر رک کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ’’خیر، تم یہ سوڈا انجوائے کرو، میں تیار ہو کر آتا ہوں، ڈنر باہر ہی کریں گے۔‘‘
وہ تیار ہو کر آ گیا۔ اس نے بھی بہترین تراش کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ ہم باہر گلی میں آ گئے۔ اس نے ساتھ والے گھر کا گیٹ کھولا جہاں ایک قیمتی کار کھڑی تھی۔ اس نے وہ نکالی، گیٹ کو تالا لگایا اور مجھے ساتھ بٹھا کر چل دیا۔ وہ مجھے اس شہر کے بارے میں بتانے لگا۔ یہ ایسی ہی معلومات تھیں جیسے کسی ٹورسٹ کو دی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ہم ایک مہنگے ریستوران میں آ گئے۔ اس نے ہال میں بیٹھنا پسند نہیں کیا بلکہ اس کے عقب میں ایک بڑے سے سبزہ زار میں کرسیاں اور میز لگی ہوئی تھیں۔ ہر طرف بڑی رنگینی تھی۔ سجاوٹ کا خاص اہتمام کیا ہوا تھا۔ ایک ملگجی سے گوشے میں چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ہم وہاں جا بیٹھے۔ اس نے بیٹھتے ہی کہا۔
’’دنیا میں جہاں بھی کوئی مافیا یا انڈر ورلڈ کام کرتا ہے نا، اس کا مقصد صرف اور صرف فائدہ ہوتا ہے۔ وہاں انسانی جان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اگر تم کسی کے لیے گولی اٹھائے پھرتے ہو نا تو ایک گولی تمہارے لیے بھی کوئی لیے پھرتا ہے۔ وہی کامیاب ہے جس نے پہلے گولی چلا دی۔‘‘
’’تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔‘‘ میں نے کہا۔
’’جدید ٹیکنالوجی نے ان مافیاز اور انڈر ورلڈ کو مزید مضبوط کر دیا ہے۔ یہ اس سے زیادہ کام لے رہے ہیں۔‘‘ اس نے کہا۔
’’اسی وجہ سے ان کی جڑیں زیادہ پھیل رہی ہیں۔‘‘ میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ وہ میری بات نظر انداز کرتا ہوا بولا۔
’’ہر شہر کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اسی طرح وہاں پر کام کرنے کے لیے طریقہ بھی تھوڑا مختلف ہوتا ہے۔ تم آج آئے ہو، کل چلے جاؤ گے یا یہیں کہیں کوئی تمہاری لاش اٹھا کر ٹھکانے لگا دے گا۔ ہم لمبا کھیل کھیلتے ہیں۔‘‘

''کیسا لمبا کھیل......؟'' میں نے پوچھا۔

''اس شہر میں بساط بچھی ہوئی ہے۔ کھیلنے والے کئی شاطر ہیں۔ جو اپنے مہرے بناتے ہیں، ان کے ذریعے چال چلتے ہیں۔ یہ ہر شاطر پر منحصر ہے کہ وہ اپنے مہرے کیسے بناتا ہے۔'' اس نے کہا تو یوں لگا جیسے میں کسی پاگل کے پاس بیٹھا ہوا ہوں اور وہ صرف باتیں کرنا جانتا ہے۔ اگر چاچا عبدالمجید نے اس سے ملنے کے لیے نہ کہا ہوتا تو میں اس کے بارے میں کوئی دوسرا فیصلہ کر چکا ہوتا۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے کہا۔ ''خیر، ایک دو دن میں تمہارے کام کا پتا چل جائے گا۔ پھر تم جو چاہو گے وہی ہوگا۔ لیکن آج میں تمہیں اپنے ہی گھڑے ہوئے ایک مہرے سے ملوانا چاہتا ہوں۔''

''کون ہے وہ؟'' میں نے یونہی بات بڑھانے کو پوچھا تو وہ کہتا چلا گیا۔

''ایک برس پہلے اس کا باپ قتل ہو گیا تھا۔ وہ بڑا بے ضرر آدمی تھا بس اپنے بزنس سے اسے غرض تھی۔ وہ اس شہر میں گولڈ کا بہت بڑا بیوپاری تھا۔ اس لڑکے نے وراثت میں ایک بڑا مضبوط بزنس پایا۔ اس نے خود کو اجاڑا نہیں بلکہ نئے سرے سے اپنا گولڈ کا بزنس شروع کیا، ساتھ میں منی ایکس چینج اور اب ہوٹل انڈسٹری میں قدم رکھنے جا رہا ہے۔''

''تم نے اسے اپنا مہرہ......'' میں نے کہنا چاہا مگر وہ میری بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

''وہ اپنے باپ کے قاتلوں کی تلاش میں تھا، ہم نے اس کے باپ کا قاتل ڈھونڈ دیا۔ قاتل خود اس شہر کا بڑا بزنس مین ہے۔ یہی گولڈ اور ہوٹلنگ میں اس کی ساکھ ہے۔ وہ لڑکا، شیونرائن اب اس کے مقابلے میں آ گیا ہے۔ خود کیا آیا ہے ہم اسے لے آئے ہیں۔ جہاں تک مجھے شک ہے، شیونرائن کے باپ کا قاتل وہ بزنس مین ہی تمہارا مطلوبہ شخص ہوسکتا ہے۔''

''ناگیشور......؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، وہ نہیں ہے، وہ تو بہت چھوٹا سا ڈرگ ڈیلر ہے۔ جس نے بھی تمہیں اس کی راہ پر ڈالا ہے، اس نے جھوٹ بولا ہے۔ وہ اتنا بڑا کام نہیں کر سکتا۔'' اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''وہ قاتل بزنس مین کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''صرف دو گھنٹے یہاں جو ہم بیٹھے ہیں تو صرف اسی لیے۔ شام تک جو معلومات ملی تھیں، وہ میں نے تمہیں بتا دیں۔ اب بس تصدیق باقی ہے۔ ہمارے یہاں بیٹھے ہی

کنفرم ہو جائے گا تو میں تمہیں شیونرائن سے ملوا دوں گا۔ پھر تم جتنی جلدی چاہو، اپنا کام ختم کر سکتے ہو۔'' اس نے کہا تو مجھے اس کے بارے میں اپنی رائے بدلنی پڑی۔

وہاں کی مقامی ڈشز میں مسالے دار چٹ پٹا کھانا تھا۔ کھانے کے دوران میں وہ پھر سے شہر کے بارے میں بتاتا رہا اور میں سنتا رہا۔ اس نے اپنا فون اپنے سامنے رکھا ہوا تھا۔ ڈنر کے بعد ہم بل کے انتظار میں تھے کہ اس کے سیل فون کی اسکرین روشن ہوگئی۔ کوئی میسج آیا تھا۔ اس نے سکون سے وہ میسج دیکھا اور بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

''میرا شک درست نکلا، وہی ہے ستیہ رام......''

''یہ وہی قاتل ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں وہی ہے، اس نے شہر کی سیاست اور بزنس پر اپنی گرفت رکھی ہوئی ہے۔ مجھے شک تو تھا کہ یہ کسی انڈر ورلڈ کے بغیر نہیں چل سکتا مگر آج پتا چل گیا کہ یہ خود مافیا ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''پھر شیونرائن، اس کے سامنے کس طرح ٹھہرا ہوا ہے؟'' میں نے ایک نئے پہلو سے بات کرنا چاہی۔

''وہ اب ستیہ رام کے مخالفین میں سے ہے لیکن ابھی کچھ بھی نہیں کر پا رہا ہے۔'' اس نے دھیمے سے کہا۔

وہ خاموش ہو گیا۔ شاید اس پر سوچیں حاوی ہو گئی تھیں۔ اس نے تیزی سے خود میسج کیا جس کا فوراً ہی جواب آ گیا۔ اس دوران بل آ گیا تو اس نے بل ادا کیا اور پھر اٹھتے ہوئے بولا۔ ''آؤ چلیں۔''

ہم دونوں چلتے ہوئے ریستوران سے باہر آ گئے۔ ہم پارکنگ تک گئے، وہاں سے کار لی اور پھر انجانی راہ پر چل نکلے۔ اس بار شریدھر خاموش تھا۔ اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ ہم واپس آ گئے۔

''کیا ہمیں شیونرائن سے نہیں ملنا تھا؟'' میں نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے پوچھا تو اس نے کہا۔

''میرا نہیں خیال اب اس سے ملنا ضروری ہے۔'' میں خاموش ہو گیا۔ اس نے دروازہ کھولا اور ہم لاؤنج میں جا پہنچے۔ وہاں وہ چند منٹ کھڑا سوچتا رہا پھر بولا۔ ''تم ایزی ہو جاؤ پھر ہم بات کرتے ہیں۔ آؤ تمہیں کمرا دکھاؤں۔''

میں اُس کے پیچھے چل پڑا۔

کچھ دیر بعد ہم پھر سے لاؤنج میں آ بیٹھے تھے۔ ہمارے درمیان دو کافی کے مگ رکھے ہوئے تھے۔ وہ کافی پیے جا رہا تھا اور خاموش تھا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ کافی دیر بعد اس نے لب کھولے۔

''شیونرائن پہلے ہی ستیہ رام کی نگاہوں میں ہے۔ جیسے ہی تم اس سے ملتے، تم بھی نگاہوں میں آ جاتے۔ ستیہ رام کا نیٹ ورک بہت تیز اور پھیلا ہوا ہے۔''

''لیکن کوئی نہ کوئی راستہ تو نکالنا ہے نا۔'' میں نے کہا۔

''مشکل یہ ہے میری جان کہ اتنا بڑا نیٹ ورک توڑنا، اس میں سے ستیہ رام تک پہنچنا کسی ایک بندے کا کام نہیں۔ اس کے لیے ایک طویل پلاننگ کی ضرورت ہے۔'' اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

''تو پھر کیا کرنا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں، کافی پیو، اور اپنے کمرے میں جا کر کرو۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ کوئی راہ تو نکلے گی۔'' اس نے کہا اور مگ اٹھا کر ایک بڑا سا گھونٹ بھر لیا۔

☆☆☆

آدھا دن خاصا چڑھ آیا تھا۔ میں اور شریدھر کافی دیر پہلے گھر سے نکلے تھے۔ ٹریفک بھی اتنا زیادہ نہیں تھا۔ وہ بڑے سکون سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ کار کے اندر پرانے گانوں کی ہلکی ہلکی آواز پھیلی ہوئی تھی۔ میں خاموشی سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ کوئی بات نہیں کر رہا تھا اور میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ایک کراس پر دائیں جانب مڑتے ہوئے اس نے گانے کی آواز کم کی اور بولا۔

''ہم جہاں جا رہے ہیں، وہ جگت پورہ کا علاقہ کہلاتا ہے۔ وہاں پر بنگلے ہیں۔ کوئی زمانہ تھا یہ جے پور کا سب سے پوش علاقہ مانا جاتا تھا، ویسے تو آج بھی ہے۔ وہاں میری ایک بہت پرانی جاننے والی رہتی ہے۔ ہم نے ایک دور اکٹھے گزارا ہے۔ سیدھی بات کہوں وہ ایک کال گرل تھی۔ چونکہ پڑھی لکھی تھی اس لیے بہت دیکھ بھال کر کسی کو اپنا گاہک بناتی تھی اور جب تک وہ اسے افورڈ کر سکتا اس کے ساتھ رہتی۔''

''اب کیا کرتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی دھندا، چور چوری سے جاتا ہے، ہیرا پھیری سے تو نہیں جاتا۔ دراصل اس کے بنگلے کے قریب ایک کالج ہے۔ وہاں بہت لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ اس نے اپنا بنگلا ہاسٹل قسم کا بنایا ہوا ہے۔ وہ لڑکیاں چنتی ہے جو کسی نہ کسی طریقے سے یہ دھندا کرتی ہیں لیکن بڑے اعلیٰ انداز میں، شہر کے خاص لوگوں کے لیے، باہر سے عیاشی کے لیے آئے لوگوں کے لیے۔'' اس نے مزہ لیتے ہوئے بتایا تو میں نے

مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''تو ہم وہاں کیا لینے جا رہے ہیں؟''

''ہاں یہ سوال، اسی سوال کے لیے میں نے یہ ساری تمہید باندھی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا پھر کہتا چلا گیا۔ ''وہاں پر ایک لڑکی رہتی ہے، اس کے پاس، یہی کوئی بیس بائیس عمر رہی ہو گی اس کی۔ وہ دھندا نہیں کرتی، بس اس کے پاس رہتی ہے۔ مجھے یا پھر ایک مزید بندے کو پتا ہے کہ وہ کیا کرتی ہے۔ بہت اچھی اور بڑے کام کی ہے وہ لڑکی، بس دو خامیاں ہیں اُس میں۔ ایک تو بہت موڈی ہے، دوسرا بڑی جنونی ہے۔'' شریدھر یہ کہہ کر خاموش ہو گیا تو میں نے پوچھا۔

''ہمیں اُس سے کیا کام لینا ہے؟''

''وہیں چل کر بتاتا ہوں، اگر مان گئی تو بڑی آسانیاں ہو جائیں گی۔'' اس نے خوشگوار انداز میں کہا اور پھر سامنے دیکھنے لگا۔ میں خاموش ہو گیا۔

شریدھر ایک بڑی سڑک سے مندر کے ساتھ جاتی ہوئی چھوٹی سڑک پر آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی بڑے بڑے پرانی طرز کے بنگلے نظر آ رہے تھے۔ ان میں کئی ایک رہائش کے علاوہ دوسرے کمرشل مقاصد کے لیے بھی استعمال ہو رہے تھے۔ وہ بنگلے کے سامنے رک گیا۔ گیٹ وغیرہ کھلنے اور اندر جانے میں کافی وقت لگ گیا۔ اس نے کار ایک طرف لگائی اور اندر چل دیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ وہ بڑے سے.... لاؤنج میں آ گیا۔ سامنے ایک ادھیڑ عمر موٹی سی عورت کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ نیند سے جاگی ہے۔ اس نے ہلکے ہرے رنگ کی قمیص اور سفید شلوار پہنی ہوئی تھی۔ وہ دوپٹا ٹھیک کرتے ہوئے شریدھر کو دیکھ کر ہنستے ہوئے آگے بڑھی۔ وہ بڑی گرم جوشی سے اس کے ساتھ گلے ملی پھر اپنے بال ٹھیک کرتے ہوئے میری جانب دیکھا۔

''بہت پیارا دوست ہے، ویر سنگھ۔''

''اوہ۔'' اس نے کہا اور میری جانب ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو وہ صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''اتنی صبح آ گیا، خیر تو ہے؟''

''تیرے لیے تو ابھی رات ہے، خیر، تو نے سونا ہے تو سو جا، پر مجھے تو بملا سے ملنا ہے، کہاں ہے وہ؟'' شریدھر نے کہا تو وہ سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''اپنے کمرے میں ہو گی۔''

''اسے ہم دونوں کے بارے میں بتاؤ، کہو کچھ باتیں کرنی ہیں۔'' اس نے کہا تو اس عورت نے اپنا سیل فون اٹھا لیتے ہوئے پوچھا۔

''ناشتا کرے گا؟''

''وہ تو کروں گا۔'' شریدھر نے کہا تو وہ فون پر رابطہ کرتے ہوئے کسی سے بات کرنے لگی۔ یہ اتنی آہستہ گفتگو تھی کہ میں سن نہیں پایا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آؤ، وہ کمرے ہی میں ہے۔''

اوپری منزل کے ایک کمرے کے سامنے جا کر اس نے دستک دی اور پھر دروازے کو دبا دیا۔ وہ کھلتا چلا گیا۔ کمرے میں اے سی کے باعث خاصی خنکی تھی۔ سامنے بڑا سا بیڈ تھا۔ اس کے ساتھ ایک ٹیبل، جس کے اوپر لیپ ٹاپ دھرا تھا۔ اس کے پیچھے ایک پتلی سی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ پہلی نگاہ میں اس کی آنکھوں پر لگی عینک ہی دکھائی دی تھی۔ اس کے گیسو اس کی کمر تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے منی ٹی شرٹ اور شارٹس پہنے ہوئے تھے۔ پیروں میں کچھ نہیں پہنا ہوا تھا۔ اس کا قد اتنا لمبا نہیں تھا۔ اس نے شریدھر سے ہاتھ ملاتے ہوئے حال احوال پوچھا پھر مجھ سے ہاتھ ملایا تو عورت نے بملا سے پوچھا۔

''کچھ کھایا پیا بھی ہے کہ نہیں صبح سے۔''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''چل میں بھیجتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ واپس چلی گئی۔ ہم تینوں بیڈ پر آ کر بیٹھ گئے۔ وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے شریدھر کی طرف دیکھ کر بولی۔

''خیر ہے انکل، اتنی صبح اور وہ بھی بنا اطلاع کے؟''

''بملا، کچھ کام ہی ایسا آن پڑا ہے تم سے۔''

''شریدھر جی آپ کہو، اگر میں کر سکی تو......'' اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

''وہ تو تم کر سکتی ہو۔ بس تمہارے انکار سے ڈر لگتا ہے۔''

''ارے نہیں، آپ بتائیں۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا پھر ایک دم سے چونکتے ہوئے بولی، ''کہیں وہ ستیہ رام کے بارے میں تو نہیں؟''

''ہاں وہی ہے۔'' شریدھر نے تیزی سے کہا۔

''کیا کرنا ہے اب اس کا؟'' اس نے پوچھا۔

''اس کی تمام اَپ ڈیٹ معلومات۔'' اس نے کہا۔

''وہ تو مل جائیں گی، یہ کوئی اتنا بڑا ایشو نہیں۔'' اس نے عینک میں سے جھانکتے ہوئے کہا تبھی شریدھر بولا۔

''لیکن اس کے ساتھ جو شیو نرائن کے بارے میں بتایا تھا، وہ کام کہاں تک پہنچا؟''

''وہ بھی سب میرے سامنے ہے۔ اس کا سب کچھ۔''

''....... بس ان دونوں کے درمیان کنفیوژن ڈالنی ہے۔'' اس نے تیزی سے اپنا مقصد بتا دیا۔ تو بملا چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔

''ہو جائے گا۔''

''ویٹس گڈ۔'' شریدھر نے خوش ہوتے ہوئے کہا پھر سکون سے بولا۔ ''ابھی صرف معلومات چاہئیں۔ کون سی کنفیوژن، کب ڈالنی، یہ میں تمہیں بتاتا رہوں گا۔''

''اوکے انکل۔'' اس نے کہا تو شریدھر نے بڑے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ بملا نے کوئی بات کیے بنا وہ گڈی اٹھائی اور اسے لیپ ٹاپ والی میز پر اچھال دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے آفر قبول کر لی تھی۔

کھانے پینے کے بعد بملا اپنا لیپ ٹاپ بیڈ پر لے آئی۔ میں اور شریدھر اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ اس نے اپنے سامنے لیپ ٹاپ رکھ لیا۔ پھر اس نے ہمیں وہ سب معلومات دیں جو اس نے اب تک حاصل کی تھیں۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ یہ ہمارے کسی کام آسکتی ہیں۔ شریدھر کیا سوچ رہا تھا، میں اس بارے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ہم کچھ دیر وہیں بیٹھے رہے پھر شریدھر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''تم لوگ چاہو تو گپ شپ لگا لو، میں ذرا نیچے......'' یہ کہتے ہوئے وہ ہنس دیا تو بملا نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''آپ بھی پرانی یادیں تازہ کر لیں۔''

''کافی سمجھدار ہو۔'' اس نے کہا اور باہر نکلتا چلا گیا۔ میں سمجھ گیا تھا، شریدھر یہ چاہتا تھا کہ میں بملا کے ساتھ بے تکلف ہو جاؤں۔ اسی لیے اس نے ہمیں تنہائی میں وقت دیا۔ ظاہر ہے، اس موڈی اور جنونی لڑکی سے کام نکلوانا آسان نہیں تھا۔ ایسے لوگ صرف پیار بھرے لفظوں سے پگھلتے ہیں۔ میں اور بملا بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔

دوپہر کے بعد جب ہماری واپسی ہوئی تو میں نے شریدھر سے پوچھا۔

''ستیہ رام اور شیو نرائن کے درمیان اگر جنگ چھڑتی ہے تو دونوں الرٹ ہو جائیں گے۔ تب زیادہ مشکل ہو جائے گی۔''

''مجھے لوہا گرم کرنے دو۔ جس وقت چوٹ لگانا ہوگی، تمہیں بتا دوں گا۔'' اس نے کہا تو میں خاموش ہو گیا۔

☆☆☆

شام ڈھل رہی تھی۔ میں لاؤنج کی کھڑکی سے ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھ رہا تھا۔ آسمان نارنجی رنگ کا ہو رہا تھا اور بادلوں کی ٹکڑیوں اور درختوں میں گڈمڈ ہوتا ہوا سورج مغربی افق میں کہیں غائب ہونے جا رہا تھا۔ مجھے نجانے کیوں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں شریدھر کے پاس آکر پھنس گیا ہوں۔ وہ نجانے کیا سوچ کر اپنی چال چل رہا تھا۔ وہ شاید کھیل رہا تھا لیکن میں نے اپنی زندگی داؤ پر لگائی ہوئی تھی۔ مجھے کسی کے کھیل سے کوئی غرض نہیں تھی۔ مجھے بس ستیہ رام سے انتقام لینا تھا۔ بس اتنی سی خواہش تھی کہ اس کے بڑوں کو معلوم ہو جائے کہ اگر وہ کسی پر ہاتھ ڈالتے ہیں تو ان کی گردن اتارنے والے موجود ہیں۔ میری سب سے بڑی خامی یہی تھی کہ میں اس شہر کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ دوسرا میرے ساتھ تیمور جیسے جاں نثار دوست نہیں تھے ورنہ اب تک میں ستیہ رام کے ساتھ دو دو ہاتھ کر چکا ہوتا۔ اتنا بڑا میدان جہاں قدم قدم پر موت کھڑی انتظار کر رہی تھی، اور میں اکیلا کھڑا تھا۔

''ہیلو ویر سنگھ......'' نسوانی آواز پر میں چونکا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو بملا میرے سامنے کھڑی تھی۔ وہ عینک کے پیچھے سے بڑے اشتیاق سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے پتلے پتلے لپ اسٹک لگے ہونٹوں پر بڑی معصومانہ سی مسکان مچل رہی تھی۔ میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس نے دوپہر کی نسبت خاصے معقول کپڑے پہن رکھے تھے۔ سیاہ تنگ پتلون کے اوپر سفید سلیولیس ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ گلے میں موٹے موتیوں والی سیاہ مالا تھی۔ اس نے درمیان سے مانگ نکال کر گیسو کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ اس نے ایک ہاتھ میں اپنا لیپ ٹاپ سینے سے لگایا ہوا تھا، دوسرا ہاتھ میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''کیسے ہو؟''

''میں تو ٹھیک ہوں تم سناؤ۔''

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کے ہاتھ میں خاصی گرم جوشی تھی۔ اس نے اپنا لیپ ٹاپ صوفے پر رکھا اور وہیں بیٹھتے ہوئے بولی۔

''بڑے اداس لگ رہے ہو، خیریت تو ہے نا؟''

''بس ویسے ہی۔ اکیلا تھا نا، شریدھر تو اپنے کاموں میں مصروف رہتا ہے۔'' میں نے یونہی بہانہ گھڑ دیا۔

''میں آگئی ہوں نا، اب تمہاری تنہائی دور ہو جائے گی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو مجھے عجیب سا لگا۔ میں اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے کے لیے مڑا اور سامنے

والے صوفے پر بیٹھ گیا۔
''اچھا ایسا کرو، بیٹھو نہیں، بس جلدی سے تیار ہو جاؤ، میں تمہیں جے پور گھما دوں۔'' اس نے شوخی سے کہا۔ اتنے میں شریدھر لاؤنج میں آ گیا۔ اس نے بملا کو دیکھا تو پُرجوش انداز میں بولا۔
''ارے واہ، میرے گھر میں تو رونق اتر آئی ہے۔''
''میں نے سوچا، تھوڑا چینج لینا چاہیے۔ بہت دنوں بعد میرا من چاہا کہ تھوڑا گھوموں پھروں، تھوڑی مستی کروں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''ہاں نا، بھئی کرو مستی، ویر سنگھ ہے نا۔'' اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔
''اِسے ہی لینے آئی تھی۔'' اس نے کہا تو شریدھر نے میری طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے کہا۔
''ہاں بھئی تیار ہو جاؤ۔''
میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ مجھے تیار ہونے میں تھوڑا وقت لگا۔ واپس آیا تو شریدھر پورے انہماک کے ساتھ لیپ ٹاپ اسکرین پر دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے کچھ سمجھا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی نگاہوں میں ستائشی احساس ابھر آیا، اس نے لیپ ٹاپ بند کیا اور مجھے تھماتے ہوئے بولی۔
''یہ اپنے کمرے میں رکھ دو۔''
میں اس کا لیپ ٹاپ کمرے میں رکھ آیا۔ شریدھر کچن میں تھا، وہ دروازے میں کھڑی تھی۔ میں اس کے ساتھ گلی میں آ گیا۔ سیڑھیوں کے ساتھ ہی ایک قیمتی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تو میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس نے گاڑی بڑھائی اور بولی۔
''ویر سنگھ، میں یہ گاڑی مانگ کر نہیں لائی، یہ میری اپنی گاڑی ہے۔ پچھلے برس ہی نیا ماڈل لیا ہے۔''
''میں نے یہ تو نہیں کہا کہ تم......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ ہنس کر بولی۔
''میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہ رہی ہوں کہ میں کوئی ایسی اسٹوڈنٹ نہیں، پیسہ جس کا پرابلم ہو، میرا صرف ایک ہی پرابلم ہے اپنے پسندیدہ لوگوں کے ساتھ اچھا وقت گزارنا، اپنی مرضی سے۔''
''اوہ، تو میں تمہیں پسند آ گیا ہوں۔'' میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔
''ہاں، کسی حد تک، میں جانتی ہوں تمہارا ساتھ ایک خواب کے مانند ہے۔ ایک دو دن میں تم اس دنیا کی بھیڑ میں گم ہو جاؤ گے۔ پھر تمہاری ضرورت ہے کہ میری ہاں میں ہاں ملاؤ گے۔ سو میں اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ وقت گزار سکوں گی۔''
''اس کا مطلب ہے تم میری مجبوری کا فائدہ اٹھانا چاہتی ہو؟'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
''آف کورس۔'' اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یہ پیار عشق، محبت یہ سب بیکار کی باتیں لگتی ہیں اور ویسے ہیں بھی۔ میں جب چاہتی ہوں اپنی مرضی سے انجوائے کرتی ہوں۔ عام لڑکیوں کی طرح میں لڑکوں کے والٹ کی طرف نہیں دیکھتی، بلکہ اپنا پرس استعمال کرتی ہوں۔ کسی پسند کے لڑکے پر دل کھول کر خرچ کرنا ہی مجھے مست کر دیتا ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''اوکے، جیسا تم چاہو۔'' میں نے کہا تو اس نے گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔
''کسی حد تک تمہارا کام میں نے کر دیا ہے۔ صبح تک اس کا کوئی نہ کوئی نتیجہ سامنے آ جائے گا۔''
''وہ کیسے ......کیسا نتیجہ......؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔
''یہ سمجھانا مشکل ہے، واپسی پر سمجھاؤں گی۔ باقی رہا کیسا نتیجہ، یہ صبح پتا چلے گا، تب تک سب بھول جاؤ۔ صرف مستی کا سوچو۔'' اس نے خمار آلود لہجے میں کہا اور نگاہیں سڑک پر ٹکا دیں۔ مجھے بھی تجسس ہو گیا کہ اس موڈی اور جنونی لڑکی کے ساتھ گزارا ہوا وقت کیسا ہوگا۔
بملا ایک پُررونق علاقے میں آ گئی۔ ہر طرف نیون سائن چمک رہے تھے۔ گاڑیاں، لوگ، رونق ہر طرف بکھری ہوئی تھی۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔
''بڑی رونق ہے یہاں پر......''
''یہ راجی پارک کا علاقہ ہے۔ یہاں زیادہ تر ریستوران اور پب ہیں۔ ایک دو کیسینو بھی ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ لمحہ بھر کے لیے رکی پھر دھیمے سے بولی۔ ''اگر کوئی ہتھیار ہے تو یہیں گاڑی میں رکھ دو۔''
''ہے تو سہی لیکن......'' میں نے کہا تو وہ تیزی سے بولی۔
''کوئی بات نہیں، رکھو اور چلو۔''
میں نے پسٹل اور میگزین نکال کر ڈیش بورڈ میں رکھ دیے۔
میں اور بملا ایک پب میں چلے گئے۔ کاؤنٹر پر بیٹھی لڑکی اسے جانتی تھی۔ اس نے ایک شوخ مسکراہٹ میری

طرف پھینکی اور ہم اندر چلے آئے۔ تیز میوزک کے ساتھ لڑکے لڑکیاں مستی میں ناچ رہے تھے۔ ایک جانب میز اور صوفے لگے ہوئے تھے۔ کئی جام لنڈھا رہے تھے اور کئی شیشہ پی رہے تھے۔ ہر کوئی اپنی مستی میں گم تھا۔ بملا میرے ساتھ چل رہی تھی۔ وہ اپنے چھوٹے قد کی وجہ سے میرے سینے تک آرہی تھی۔ اس نے دھیرے سے میری کمر میں ہاتھ ڈالا اور ایک صوفے کی جانب بڑھ گئی۔ وہاں بیٹھتے ہی میں نے کہا۔

''بملا، میں شراب نہیں پیتا، تم جو چاہو۔''

''او کے کوئی بات نہیں۔'' اس نے کہا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اس کے پاس ایک تیلی سی مختصر لباس والی لڑکی آگئی۔ ابھی اس کے ساتھ کچھ باتیں ہی کی تھیں کہ ایک جوڑا اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ پہلی لڑکی نے میرے کندھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''بملا، اپنے پارٹنر سے کہو میرے ساتھ ڈانس کرے۔''

''ہاں کیوں نہیں، جاؤ ڈارلنگ.....'' اس نے بڑے سوقیانہ انداز میں کہا تو ایک دم سے میرا دماغ سلگ اٹھا، پھر اگلے ہی لمحے میں نے سوچا یہ سب ایک کھیل ہے، دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ میں نے غصہ دماغ سے نکال دیا اور اس لڑکی کے ساتھ وہاں تک چل دیا جہاں لڑکے اور لڑکیاں مستی میں ناچ رہے تھے۔ میں اس کے ساتھ ناچنے لگا۔ وہ میرے ساتھ چپک گئی تھی۔ اس نے پی بھی ہوئی تھی لیکن اس کا انداز جارحانہ نہیں تھا۔ وہ بڑے نرم انداز میں میرے ساتھ محو رقص تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے... اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔ وہ میرے سینے پر اپنا چہرہ دھیرے دھیرے رگڑنے لگی پھر آہستہ سے بولی۔

''سیانے کہتے ہیں کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔'' اس کے یوں کہنے پر میں چونکا، اس نے اپنا چہرہ میرے سینے سے نہیں ہٹایا بلکہ کہتی چلی گئی۔ ''سیانے یہ بھی کہتے ہیں کہ جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔ جب تک ٹارگٹ پوری طرح نشانے پر نہ آجائے، گولی چلانا خطرناک ہوتا ہے اس لیے ایک یا دو دن بملا کے ساتھ انجوائے کرو۔''

یہ کہتے ہی اس نے اپنا سر میرے سینے پر سے اٹھالیا۔ تبھی میں نے اسے بھینچتے ہوئے اس کی گردن کے پاس اپنا چہرہ لے کر پوچھا۔

''یہ سب کیسے ہوگا؟''

''کہا نا صبر کرو، بملا اکیلی نہیں ہے.....'' اس نے کہا اور مجھ سے الگ ہوگئی۔ میں نے اس کے چہرے پر دیکھا جہاں ہلکی سی مسکان تھی۔ میں نے اس کی طرف تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھا تو وہ مجھے اپنے ساتھ لیتی ہوئی بملا کے پاس لے گئی جہاں اس کے دوسرے دوست بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے شراب کے گلاس پڑے تھے۔ بملا نے ایک گلاس میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے وہ گلاس پکڑا، پینے سے پہلے سونگھا تو وہ عام سوڈا ہی تھا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ کر سوڈا پیتا رہا۔ اس کے دوست اٹھ گئے تھے۔ وہ میرے ساتھ یوں لگ کر بیٹھ گئی تھی جیسے مجھ ہی میں کھوئی ہوئی ہو۔

''میسیج مل گیا تمہیں؟''

''ہاں۔'' میں نے بتایا۔

''یہ اس لیے کہ تمہیں یقین ہو جائے کہ میں اکیلی نہیں ہوں، بس انجوائے کرو۔'' اس نے کہا اور اپنی بانہیں میرے گلے میں حمائل کردیں۔ میں نے بھی اسے بھینچ لیا۔

ہم وہاں سے نکلے تو آدھی رات گزر چکی تھی۔ بملا نے پی تو تھی لیکن اتنے نشے میں نہیں تھی کہ خود کو سنبھال نہ سکے۔ وہ سُرور میں تھی۔ اس نے گاڑی نکالی اور ریستوران کے آگے جا رکی۔ وہاں سے اس نے کھانا پیک کروایا اور پھر ہم واپس چل دیے۔

☆☆☆

دوپہر کے بعد میری آنکھ کھلی تو بملا میرے ساتھ بیڈ پر بیٹھی..... لیپ ٹاپ میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس نے وہی منی ٹی شرٹ اور شارٹس پہنے ہوئے تھے، اپنے گیسو، اکٹھے کر کے جُوڑے میں باندھے ہوئے تھے، چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا اور وہ پوری محویت سے اسکرین پر دیکھ رہی تھی۔ میرے کروٹ لیتے ہی اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ پھر اس نے لیپ ٹاپ میرے پیٹ پر رکھا پھر اپنا سر میرے کندھے پر رکھتے ہوئے بولی۔

''لو یہ دیکھو، کام شروع ہوگیا۔''

''کیا ہوا؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''شیو نرائن کا وہ ہوٹل جو ستیہ رام بننے نہیں دے رہا تھا۔ رات اس پر کچھ لوگوں نے حملہ کیا۔ وہاں پر موجود شیو نرائن کے تین افراد مارے گئے۔ کافی زخمی ہوئے ہیں جو اس وقت اسپتال میں پڑے ہیں۔''

''اوہ بے چارے بے گناہ لوگ.....'' میں نے افسوس کرتے ہوئے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر چند لمحے ٹھہر کر بولی۔

''یہ وہ کرائے کے غنڈے اور بدمعاش تھے جو یہاں کی حفاظت کے لیے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی

مقابلہ کیا۔''

''او کے۔'' میں نے کہا تو وہ تیزی سے بولی۔

''بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی، صبح سویرے ستیہ رام کی کیمیکل فیکٹری میں آگ لگا دی گئی ہے۔ آگ بہت تیز تھی جو ابھی تک نہیں بجھ سکی ہے۔ یہ دیکھو۔''

یہ کہتے ہی اس نے ایک لائیو چینل چلا دیا۔ وہاں آگ بجھائی جا رہی تھی۔ لوگوں کا شور تھا۔ اینکر اپنی طرف سے وجوہات پر بات کر رہا تھا۔ میں کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ تبھی وہ بولی۔

''تم نے ستیہ رام کو دیکھا ہوا ہے؟''

''نہیں تو......'' میں نے کہا۔

''یہ لو، دیکھو۔'' اس نے کہا اور ایک ویڈیو تلاش کر کے چلا دی۔ وہ پھولے گالوں، گول چہرے والا موٹا سا تھا۔ اس کے سر کے بال سفید تھے۔ ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ موٹی گردن، آنکھیں دھنسی ہوئیں اور ہونٹ موٹے موٹے تھے۔ وہ سفید کرتہ پہنے ہوئے پھنسی ہوئی آواز میں بات کر رہا تھا۔

''اب شیو نرائن بھی دیکھ لو۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک دوسری ویڈیو چلا دی۔ وہ ایک وجیہہ نوجوان تھا۔ اس کے نقوش تیکھے تھے۔ اس کے لمبے بال تھے، کلین شیو اور بہترین تراش کا سیاہ سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ وہ کسی کو انٹرویو دے رہا تھا۔

''اس کا مطلب ہے جنگ چھڑ گئی ہے؟'' میں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

''ہاں، کسی بھی وقت تم کو اپنا وار کرنا ہے، وہ وقت بہت قریب آنے والا ہے۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے کہا اور اپنی انگلی سے میرے ہونٹوں کو مسلنے لگی۔ کچھ لمحے یونہی رہنے کے بعد بولی۔ ''اٹھو فریش ہو جاؤ، کچھ کھاتے پیتے ہیں پھر کہیں سیر کے لیے نکلتے ہیں۔''

''شریدھر کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ صبح ہی کہیں نکل گیا تھا۔'' اس نے بتایا اور مجھ سے الگ ہو گئی۔

ہم لاؤنج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے جب شریدھر آیا۔ اس کے چہرے پر مسکان تھی۔ وہ خوش تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔

''کمال کر دیا بملا تم نے۔''

''ابھی کچھ اور ہوگا۔'' اس نے کہا۔

''بس ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا اور ہاتھ ہلاتا ہوا اندر کی جانب چلا گیا۔

شریدھر کے ہاں سے نکلتے ہوئے ہمیں سہ پہر ہو گئی۔ بملا نے سفید پتلون کے ساتھ سیاہ شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس نے چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ کر لیا تھا۔ سیاہ مالا اس کے گلے میں تھی۔ اس نے ہلکے سے لیدر والے سلیپر پہنے ہوئے تھے۔ حالانکہ اسے میرے ساتھ ہیل والے جوتے پہننے چاہیے تھے۔ ہم گاڑی میں بیٹھے اور چل دیے۔ میں نے اس سے بالکل بھی نہیں پوچھا کہ وہ کہاں جانا چاہتی ہے۔

اس نے گاڑی میں میوزک لگایا ہوا تھا جو دھیمی آواز میں تھا۔ کچھ دیر تک چلتے رہنے کے بعد بولی۔

''شہر میں ابھی افراتفری نہیں مچی، حالات کنٹرول کر لیے گئے ہیں۔''

''تم کیا چاہتی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تو امن چاہتی ہوں۔'' اس نے کہا پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''یہ جو اب تک کہیں جلوس نہیں نکلا، کہیں مزید توڑ پھوڑ نہیں ہوئی، اس کا مطلب ہے، دونوں طرف سے سیز فائر ہو چکا ہے یا پھر کسی نئی جنگ کی تیاری ہے۔''

''تمہاری اطلاعات کیا کہتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی تک تو امن ہے، اب دیکھتے ہیں۔'' اس نے کہا اور پُرسکون رفتار سے چلتی چلی گئی۔ وہ کافی دیر تک چلتی رہی پھر ایک جھیل کنارے آ گئی۔ اس نے گاڑی ایک طرف پارک کی۔ ہم چلتے ہوئے اس جھیل کے کنارے آ گئے۔ ممکن ہے کسی وقت وہاں جھیل کا کنارہ اس قابل ہو کہ لوگ پکنک کے لیے آتے ہوں گے لیکن اس وقت وہاں کچرا اور گند پھیلا ہوا تھا۔ جھیل کے درمیان پرانے وقتوں کی کوئی عمارت بنی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ تھوڑے فاصلے پر ایک چھوٹی سی محراب نما برجی تھی۔ ہوا تیز چل رہی تھی۔ وہاں پر بہت... سارے لوگ تھے۔ ایک خاص قسم کی ناگوار بُو پھیلی ہوئی تھی۔ بہرحال یہ بُو ایسی تھی جسے برداشت کیا جا سکتا تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ مجھے یہاں کیوں لے کر آئی تھی۔ وہ کافی دیر تک جھیل کو دیکھتی رہی، پھر اپنی عینک کو درست کرتے ہوئے بولی۔

''اپنے پیچھے مڑ کر دیکھو، تمہیں ایک چار منزلہ عمارت دکھائی دے گی، پیلے رنگ کی ہے۔''

اس کے کہنے پر میں مڑا اور سامنے دیکھنے لگا۔ ایک بڑی سی عمارت تھی جس پر محراب بنے ہوئے تھے۔ مجھے یوں لگا

جیسے وہ کوئی سرکاری عمارت ہے۔ وہ سبز درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔"
"یہ فائیو اسٹار ہوٹل ہے۔ اس کے سامنے تو یہ شاہراہ ہے لیکن اس کے عقب میں ایک طرف نشیب ہے اور اس کے آگے پہاڑی سلسلہ۔"
"تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہی ہو؟"
"اس لیے کہ آج اس ہوٹل میں ستیہ رام کی آمد ہوگی۔"
"کیا کہہ رہی ہو تم؟" میں نے چونکتے ہوئے کہا۔
"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی۔ "میری اب تک کی یہ اطلاع ہے کہ ستیہ رام اور شیو نرائن کے درمیان صلح کروائی جا رہی ہے۔ یہ صلح کروانے والے ظاہر ہے ان سے زیادہ بڑے لوگ ہیں۔"
"تمہیں اتنا یقین کیوں ہے کہ وہ یہیں آئیں گے؟" میں نے پوچھا۔
"ان لوگوں سے جب بھی میٹنگ ہوتی ہے، اسی ہوٹل میں ہوتی ہے۔ میں کچھ مزید باتیں بتا کر تمہیں نفسیاتی دباؤ میں نہیں لانا چاہتی۔" اس نے دھیمے سے انداز میں کہا۔
"تم بتا دو، میرے دباؤ کی پروا مت کرو۔" میں نے سکون سے کہا۔
"تو پھر سنو، صلح کروانے والے وہی لوگ ہیں جنھوں نے کلیان جی بنائی ہوئی ہے۔ یہ ریاست کے لوگ ہیں اور یہ علاقہ بھجو آرمی کا ہے۔"
"اوہ......!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ وہ خاموش رہی اس نے کسی قسم کا ردِعمل نہیں دیا۔
"میں نے تمہارے لیے اتنا کر دیا ہے کہ اس ہوٹل میں ایک کمرا بک ہے، دوسری منزل پر ہوگا۔ وہی رات والی لڑکی سونیتا وہاں موجود ہے۔ کچھ دیر میں دو لڑکے بھی یہیں آ جائیں گے۔ وہ رابطے میں تو ہوں گے لیکن سامنے نہیں آئیں گے۔ میں تمہیں پورچ میں اتار کر آ جاؤں گی۔"
"تم میرے ساتھ......" میں نے کہنا چاہا تو وہ بولی۔
"میں کسی کیمرے کے سامنے نہیں آنا چاہتی۔ سونیتا کی بات کچھ اور ہے۔ وہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی اگر ہم مل سکے تو......" اس نے صاف لفظوں میں کہا اور چل دی۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ گاڑی میں بیٹھ کر جب وہ چلنے لگی تو بملا نے کہا۔
"اپنا پسٹل ڈیش بورڈ میں چھوڑ دو۔ اسکریننگ میں آ جائے گا۔"
"تو پھر میں کیا کروں گا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"سونیتا، لے جا چکی ہے۔ اس سے مل جائے گا۔" اس نے کہا اور گیئر لگا دیا۔ کچھ دیر بعد وہ مجھے پورچ میں چھوڑ کر جا چکی تھی۔
میں لاؤنج میں پہنچا ہی تھا کہ میری نگاہ سونیتا پر پڑی۔ وہ میری طرف یوں بڑھی جیسے ہم برسوں کے بچھڑے ہوئے ہوں۔ وہ مجھے ساتھ لیے لفٹ کی طرف...... گئی۔ وہاں سے وہ سیدھی ایک کمرے میں جا پہنچی۔ میں نے کھڑکی کھول کر دیکھا، وہ ہوٹل کا عقبی حصہ تھا۔ نیچے لان تھا، جس کے آخر میں جالی نما باؤنڈری وال تھی۔ اس کے آگے نشیب تھا۔ کھڑکی میں سے ہوا تیز آ رہی تھی جو کمرے میں لگے اے سی کی خنکی کو ختم کر رہی تھی، میں نے اسے بند کیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ سونیتا میری طرف دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

ہم نے ڈنر ہال کے ایک گوشے میں کیا جہاں سے لان دکھائی دے رہا تھا۔ سونیتا اپنے بارے میں مجھے بہت کچھ بتا چکی تھی۔ اسی ستیہ رام نے اس کے گھر کو آگ لگائی تھی۔ اگرچہ ...اس میں سبھی بچ گئے تھے صرف زخمی ہوئے تھے لیکن اس کی ماں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے مر گئی تھی۔ ستیہ رام وہاں کی زمین خرید چکا تھا۔ سونیتا کا باپ اور اس کے ساتھ کچھ لوگ اڑے ہوئے تھے۔ سونیتا کا باپ ایک سرکاری محکمے میں ملازم تھا، اس لیے اس نے اردگرد کئی محکموں میں درخواستیں دے رکھی تھیں۔ باقی لوگ اس کے پیچھے تھے۔ ایک بار جب بہت ہی تنگ کر دینے والی انتہا ہوئی تو وہ خود ستیہ رام کے آفس چلی گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے وقت لیا اور جا کر اس سے التجا کی کہ جیسے ہی ان سے کچھ بن پڑا وہ یہاں سے چلے جائیں گے لیکن انہیں تنگ نہ کیا جائے۔ جس پر سونیتا کو دھکے دے کر آفس سے نکال دیا۔ آخرکار ستیہ رام کے غنڈوں کا وہ مقابلہ نہیں کر پائے، انہیں وہاں سے جانا پڑا۔ غربت، ذلت اور انتقام نے سونیتا کو جرم کے راستے پر چلا دیا۔ وہ اسی خفیہ نیٹ ورک کا حصہ بن گئی، جس کا ساتھ بملا دے رہی تھی۔ سونیتا کے لیے انتقام کا یہ سنہری موقع تھا۔ اس نے میرا ساتھ دینے کے لیے سب کچھ تج دیا۔
میرا ساتھ دینے میں اسے آسانی بھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ستیہ رام کی مہینے دو مہینے بعد اسی ہوٹل میں میٹنگ ہوتی ہے۔ اس نے بہت سوچ کر یہاں پر ایک لڑکا ویٹر لگوا دیا تھا۔ اس لڑکے کو اس نے ہر طرح سے اپنا گرویدہ کر رکھا

تھا۔ اگر چہ وہ لڑکا اچھے گھر کا تھا اور ہوٹل انڈسٹری میں بہت آگے جانا چاہتا تھا لیکن اس کی مدد کے نام پر وہ اسے تھوڑی بہت رقم دیتی رہتی تھی۔ یوں ستیہ رام کے بارے میں جو ذرائع اسے معلومات دیتے، ویٹر سے اسے تصدیق ہو جاتی تھی۔ اس نے ویٹر کو پوری طرح استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے پہلے ہی ایک بیگ اس کے ذریعے ہوٹل پہنچا دیا تھا۔ پھر آن لائن کمرا بک کر لیا گیا، جس کی ادائیگی بھی کر دی گئی۔ وہ بیگ کمرے میں پہنچ گیا، جس میں پسٹل، میگزین، سائیلنسر تھے۔ اس کے ساتھ ایک دستی بم بھی اس بیگ میں رکھا ہوا تھا۔ لڑکے کو پتا ہی نہیں تھا کہ اس بیگ میں کیا ہے۔ سونیتا کا خیال تھا کہ کوئی بھی اسلحہ کسی وقت بھی استعمال ہو سکتا ہے۔

ڈنر کے بعد ہم لان میں ٹہلتے ہوئے جالی والی باؤنڈری کے پاس جا ٹھہرے جہاں سے نشیب شروع ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک گھومتی ہوئی سڑک بھی تھی جو آبادی کی طرف جا رہی تھی۔

''سونیتا، یہ ایک جیسی دو بلڈنگیں ہیں، اب نجانے وہ کس بلڈنگ کے کس کمرے میں آتا ہے۔''

''اس کی فکر مت کرو، وہ یہیں سامنے والی بلڈنگ میں آتے ہیں اور ہمیشہ دوسری منزل کے چوتھے کمرے میں میٹنگ کرتے ہیں۔ یہ مخصوص ہے۔ ہوٹل والوں نے میٹنگ کے لیے یہی کمرا مختص کیا ہوا ہے۔ وہ لوگ بھی جو ایسی ہی خفیہ میٹنگ کرتے ہیں انہیں بھی یہی کمرا دیتے ہیں۔'' اس نے کہا اور پھر کھڑکیوں کا حساب لگا کر بنا اشارہ کیے مجھے سمجھانے لگی۔

''لیکن اگر یہ......'' میں نے پوچھنا چاہا تو وہ بولی۔

''دیکھو، جب وہ یہاں آ جائیں گے اور اُن کے کمرے کا پتا چل جائے گا تو میں یہاں سے جاؤں گی۔''

''جو کچھ بھی کرنا ہے، مجھے اکیلے کرنا ہوگا؟'' میں نے تصدیق چاہی۔

''بالکل، کیونکہ جب تک تم کچھ کرو گے میں چیک آؤٹ کر جاؤں گی تاکہ اگر مجھ پر کوئی بات آئے بھی تو میں کوئی جواز دے سکوں۔'' اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اوکے۔'' میں نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔ مجھے واپس کمرے میں نہیں جانا تھا۔ سائیلنسر لگا پسٹل میرے پاس تھا۔ ایک دستی بم میری جیب میں تھا۔ جو کارروائی بھی کرنا تھی یہیں سے کرنا تھی۔

ہم وہیں کھڑے یہی باتیں کر رہے تھے۔ ممکن ہے ہمیں دیکھنے والے سمجھیں کہ ہم نجانے کن رومانوی باتوں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہم ایک بینچ پر آ بیٹھے۔ وہ مجھے اپنے بارے میں بتاتی رہی۔ میں بھی اسے اپنے بارے میں جھوٹ سچ کہتا رہا۔

ہمیں وہاں بیٹھے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت ہو گیا تھا۔ ایسے میں سونیتا کا فون بج اٹھا۔ اس نے اسکرین پر دیکھا تو مجھے واضح طور پر اس کے بدن میں لرزش محسوس ہوئی۔ اس نے تیزی سے کہا۔

''وہ آ گئے ہیں۔ دوسری منزل کے اسی کمرے میں ہیں۔''

''یہاں سے دیکھو، کون سا بنتا ہے؟'' میں نے کہا تو اس نے پھر سے مجھے سمجھایا اور بولی۔

''میں نکلتی ہوں، اب تم جانو اور تمہارا کام۔''

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا، اٹھی اور بڑے سکون سے چلتی ہوئی نکل گئی۔ میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ میں کچھ دیر تک اردگرد کا جائزہ لیتا رہا، کھڑکی تک پہنچ جانا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن کھڑکی کھولنا ہی سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ جب تک میں کھڑکی کھولتا، تب تک مجھ پر فائر ہو سکتا تھا۔ میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ ان کے آنے کے بعد اس کے عقب میں کوئی گارڈ تو نہیں آیا، ایسا نہ ہو کہ جیسے ہی میں کھڑکی تک پہنچوں، کوئی مجھے نشانہ بنا دے۔ میں نے چند لمحے سوچا، پھر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ رسک بہرحال مجھے لینا پڑے گا۔ زمین سے کھڑکی تک پہنچنے میں مجھے ایک منٹ سے بھی کم وقت چاہیے تھا۔ کھڑکی کھولنا اگلا مرحلہ تھا، اس پر کچھ نہ کچھ کیا جا سکتا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لی، اپنی قوت کو یکجا کیا، ہتھیار چیک کر کے سکون سے چلتا ہوا عمارت کے پاس جانے لگا۔

میں قدم بڑھاتا جا رہا تھا اور میرے خون کی گردش تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ میں عمارت کے بالکل پاس چلا گیا۔ ایک لمحے کو اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ایک ہی جست میں پہلے کمرے کی الماری پر تھا، اس پر قدم رکھتے ہی میں دوسری الماری کو پکڑ کر اس کے ساتھ بنے ہوئے شیڈ پر چلا گیا۔ میں نے ایک نگاہ دیکھا تین افراد اندر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے سرعت کے ساتھ پسٹل نکالا اور اس کا دستہ شیشے پر دے مارا۔ ایک چھناکے سے شیشہ ٹوٹ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتے، میں نے زور لگا کر کنڈی کھولی تو میرا ہاتھ لہولہان ہو گیا۔ کھڑکی کھلتے ہی میں اندر تھا۔ میں حیران تھا کہ کسی نے کوئی ہتھیار نہیں نکالا۔ یہ رسک تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ ایسی میٹنگ جس میں طرفین پر اعتماد نہ ہو، وہاں ہتھیار بھی نہیں

لائے جاتے تھے۔ صلح کروانے والا ہمیشہ یہ خیال رکھتا ہے کہ ایسا کچھ نہ ہو۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور باہر جانے والے دروازے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا تھا، وہ تینوں مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے ان پر پسٹل تانے ہوئے، دروازے کی چٹخنی لگا دی تھی۔ میں ستیہ رام اور شیو نرائن کو پہچان چکا تھا، تیسرا میرے لیے اجنبی تھا۔

''کون ہو تم؟'' تیسرے نے پوچھا۔

''آسمان سے ٹپکی مصیبت......''

''تم یہاں......؟'' تیسرے شخص نے کہا۔

''میں باہر سے فائر کر سکتا تھا لیکن ایسا نہیں کیا، مجھے تم سے کوئی دشمنی نہیں تم......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ حیرت سے میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''تو پھر تمہارا یوں آنا، کس لیے؟''

''تم اور شیو نرائن ایک طرف ہو جاؤ، مجھے ستیہ رام سے ایک بات کہنی ہے۔'' میں نے کہا تو ستیہ رام نے اعتماد سے کہا۔

''مجھ سے...... بولو، کیا کہتے ہو؟''

''تم نے ڈاکٹر کامران ملک اور ڈاکٹر فائزہ ملک کو کس کے کہنے پر اغوا کرایا تھا؟'' میں نے کہا ہی تھا کہ تیسرے شخص کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''اوہ وہ تم ہو......؟''

''ہاں، میں ہی ہوں۔ بولو؟''

''اچھا ہوا تم خود ہی چل کر یہاں آ گئے ہو، سنو ہم نے انہیں اغوا کیا تھا، دشمن ملک، بس دشمن ملک ہے۔'' اس نے غراتے ہوئے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ میں سمجھ گیا وہ اب مجھ پر حملہ کرنے کو تیار ہو چکا ہے اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ میں نے کہا۔

''تو پھر سنو، ہم زندہ ہیں اور گھس کر واپس بھی لے جا چکے ہیں۔'' یہ کہتے ہی میں نے ستیہ رام پر فائر کر دیا۔ گولی اس کے سر میں لگی تھی، وہ چکرا کر گر گیا۔ میں نے پسٹل اس تیسرے کی جانب کر دیا۔ اب وہ میرے نشانے پر تھا۔ میرے اندر غصے کی لہر سر اٹھانے لگی۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''میں تمہیں زندہ چھوڑنا چاہتا تھا لیکن تو نہیں چاہتا۔''

لفظ میرے منہ ہی میں تھے کہ میں نے اس پر دو فائر کیے۔ اس دوران میں پیچھے ہٹتا ہوا کھڑکی تک چلا گیا۔ جب تک میں باہر نکلا تب تک میں نے دستی بم نکال کر اس کی پن نکالی۔ اس دوران میں نے شیو نرائن کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور بم اندر پھینک دیا۔

پہلی کھڑکی پر آ کر میں نے چھلانگ لگائی اور پوری قوت سے جالی والی باؤنڈری کی جانب دوڑ پڑا۔ میں جانتا تھا کہ ٹھیک پانچ سیکنڈ بعد بم پھٹ جائے گا۔ شیو نرائن کا کیا بنتا، یہ اس کی مستعدی اور حاضر دماغی پر تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بچ جائے اور میرا پیغام ریاستی ادارے کے بڑوں تک پہنچا دے۔ میں نے دستی بم اس لیے پھینکا تھا کہ لازمی بات ہے اس کھڑکی سے مجھ پر فائر ہونا تھے۔ اگر وہاں سے مجھ پر فائر ہوتا تو میں کسی صورت نہیں بچ سکتا تھا۔ کم از کم کچھ وقت کے لیے وہاں سے کوئی بھی فائر نہ کر سکتا۔ جب تک کوئی صورت حال سمجھتا، میں نکل چکا ہوتا۔

میں نے دو قدم ہی آگے بڑھائے تھے کہ ایک زوردار دھماکا ہوا۔ میں بھاگتے ہوئے لڑکھڑا گیا۔ ہو سکتا تھا کہ میں گر جاتا لیکن ایک تو مجھے دھماکے کا خود انتظار تھا، دوسرا میں انتہائی کم وقت میں وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ جب تک میں جالی والی باؤنڈری تک پہنچا، میرے پیچھے چیخ و پکار مچ چکی تھی۔

میں نے اپنے پیچھے نہیں دیکھا اور نہ ہی مجھے کچھ دیکھنے کی ضرورت تھی۔ میں نے جالی والی باؤنڈری کو پار کر لیا۔ دوسری جانب نشیب تھا، مین نے پاؤں ٹکانے کی بہت کوشش کی لیکن نہ جما سکا۔ میں تھوڑی دور تک گھسٹتا چلا گیا۔ جیسے ہی میں ایک کھڈے کی وجہ سے رکا، اٹھا اور تیزی سے قدم جماتا ہوا نیچے کی طرف جانے لگا۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے میں نشیب میں دیکھ بھی نہیں سکتا تھا کہ کہاں پر کیا ہے؟

میں نے سڑک پر پہنچتے ہی اپنا پسٹل شرٹ کے نیچے اڑس لیا۔ میرا بایاں بازو خون میں لت پت تھا۔ میں اپنا زخم بھی نہیں دیکھ پایا تھا۔ اس وقت جلن کا احساس بھی بہت کم تھا، میری ساری توجہ وہاں سے نکل جانے کی طرف تھی۔ میں سڑک پر پہنچا ہی تھا ایک کار زن سے میرے پاس آ کر رکی۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اسے میں دیکھ نہیں پایا تھا کہ بملا کی تیز آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''ارے بیٹھ......''

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ میں نے غور سے دیکھا تو بملا کی عینک مجھے نظر آئی تب تک اس نے گالی دیتے ہوئے کہا۔ ''......بیٹھ جا......''

میں نے پچھلی نشست کا دروازہ کھولا اور سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کار تیزی سے چل دی۔ ذرا سا فاصلہ طے کر کے اس

نے مجھ سے کہا۔
''فوراً اپنی شرٹ بدل لو، ہتھیار پیچھے رکھ لو، اگر ضرورت پڑی تو ڈیش بورڈ میں پڑا ہے پسٹل......''
''شرٹ......؟'' میں نے پوچھا۔
''دیکھو پڑی ہوگی شرٹ۔'' اس نے کہا تو میں نے دیکھا، سیٹ پر کچھ ڈبے پڑے ہوئے تھے۔ ایک ڈبا کھولا تو اس میں میرے سائز کی شرٹ تھی۔ میں نے اپنی شرٹ اتارتے ہوئے پوچھا۔
''کب خریدی تم نے؟''
''ابھی چپ کر جاؤ، مجھے ان گلی محلوں سے نکلنے دو۔''
میں نے تیزی سے شرٹ بدلی، اپنی خون آلود شرٹ کو نیچے دبایا اور بملا سے کہا۔
''تم گاڑی مجھے دو۔''
''تجھے راستوں کا کیا پتا۔''
''تم بتاتی جانا۔'' میں نے کہا تو اس نے ایک چھوٹے سے کراس پر گاڑی روک دی۔ میں سرعت کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور پھر میں چلتا چلا گیا۔ اس فائیو اسٹار ہوٹل سے جگت پورہ کا علاقہ کوئی بیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا، عام حالات میں اگر میں جاتا تو ایک گھنٹا لگتا لیکن میں نے چالیس منٹ میں وہ سفر طے کر لیا۔
میں بملا کے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ تب میں نے اپنا بازو دیکھا، کافی بڑا زخم تھا۔ میں چند منٹ اسے دیکھتا رہا پھر اٹھ کر باتھ روم چلا گیا۔ میں نے اپنا بازو دھویا، تو شدید جلن ہونے لگی، میں وہاں کوئی دوا دیکھنے لگا۔ ایسے میں بملا کمرے میں داخل ہوئی، اس کے ہاتھ میں فرسٹ ایڈ بکس تھا۔ اس نے مجھے باتھ روم میں دیکھا تو بولی۔
''اوکے، تم نہا لو پہلے، میں بعد میں ڈریسنگ کر دوں گی۔''
میں نے سر ہلاتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

☆☆☆

''اس وقت سونیتا پتا نہیں کہاں ہوگی؟'' میں نے چائے کا خالی کپ ایک جانب رکھتے ہوئے یونہی پوچھا۔
''وہ اس وقت سفر میں ہوگی، وہ یہ شہر چھوڑ چکی ہے، اب وہ یہاں نہیں آئے گی۔'' بملا نے بڑے سکون سے بتایا۔
''وہ کیوں؟ کیا وہ......'' میں نے پوچھنا چاہا تو وہ بولی۔
''اسے یقین ہے کہ اس قتل کی اعلیٰ سطح پر تفتیش ہوگی۔ ریاستی ادارے کوئی معمولی تو نہیں ہیں، وہ اس کا کھوج نکال لیں گے۔ اس کا وہی ویٹر دوست اسے پھنسا دے گا، اسے تو پتا نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے، وہ تو سب بتا دے گا۔ وہ روپوش رہے گی یا پھر کسی دوسرے دیش چلی جائے گی۔''
بملا نے یوں کہا جیسے وہ ایک عام سی بات بتا رہی ہو۔
''بملا، یہ تم نے سب کیسے کیا؟''
اس نے میرے چہرے جانب دیکھا پھر بڑے آزردہ لہجے میں بولی۔
''تم کو کیا لینا ہے پوچھ کے، تمہارا کام ہو گیا اور اب تم چلے جاؤ گے۔''
''یہ بات تو سچ ہے کہ مجھے چلے جانا ہے لیکن یہ سب......'' یہ کہتے ہوئے میں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر کہتی چلی گئی۔
''یہ جو دنیا، ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کو بڑا محفوظ سمجھتی ہے نا، ایسا نہیں ہے، اس کا ایک نفسیات سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ وہ ہے دوسروں کو نیچا دکھانا، ہو سکتا ہے میں غلط ہوں، ایسا نہ ہو لیکن میں نے اسی نہج پر کام کیا۔ کہنے کو بڑی آزادی ہے لیکن سبھی کسی نہ کسی حد تک اس کے غلام ہیں۔ یہاں غلط فہمی کو بڑی جلدی فروغ دیا جا سکتا ہے۔ بڑی معمولی سی مثال ہے، جیسے سوشل میڈیا پر... اسکرین شارٹ لگا دینا، کسی کی ویڈیو وائرل کر دینا۔ یہ ایک تفصیل طلب بات ہے، جو ایسے سمجھ نہیں آتی۔''
''تھوڑا سمجھاؤ نا۔'' میں نے کہا۔
''دیکھو، کمپیوٹر بنا ہی اس لیے تھا کہ دشمن پر پورے نشانے سے بم گرایا جا سکے۔ اس ایجاد کی بنیاد ہی میں منفی سوچ ہے۔ یہ تو دنیا اس پر مثبت سوچ لے آئی۔ جس کی بنیاد میں فساد ہو، اس سے خیر کی توقع کیا کی جا سکتی ہے۔'' بملا نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو اچانک مجھے خیال آیا تبھی میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
''بملا، تمہاری گاڑی پورچ تک گئی تھی، ظاہر ہے وہاں پر کیمرے تو لگے ہوں گے۔ اس سے میں بھی اترا تھا، میں......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔
''ان کیمروں سے میں تمہاری تصویر تو نکال نہیں سکتی۔ ہاں، ایک جگہ سے کوشش کی گئی ہے کہ ان کے کمپیوٹر کو ہیک کر لیا جائے اور وہ پوری فلم ختم کر دی جائے، اب پتا نہیں کامیابی ہوئی ہے کہ نہیں۔''
''کیا ایسا ممکن ہے؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔
''ہاں ممکن ہے، جب سے اس ہوٹل کو نگاہوں میں رکھا ہوا تھا، تب سے ان کے کمپیوٹر ہماری نگاہ میں تھے۔''
''اور تمہاری گاڑی، اگر وہ ریکارڈ اس میں رہ گیا

تو......؟'' میں نے پوچھا۔

''گاڑی تو چلی بھی گئی، اس کا رنگ اور نجانے کیا کچھ تبدیل کر دیا جائے گا، پہلے بھی تو ایسے ہی میرے پاس آئی تھی۔'' اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ یہ بملا کوئی عام سی لڑکی نہیں، ایک خطرناک بلا کا نام ہے۔ میں سوچ میں پڑ گیا تبھی میں نے کہا۔

''تم تو الوداع کر کے چلی گئی تھیں، پھر وہاں کیوں رہیں؟''

''ارے میرے راجا، میں تمہیں کہتی کہ میں یہیں ہوں تو لازماً تمہارے دماغ میں میرے بارے میں رہتا۔ جبکہ میں جانتی تھی کہ سونیتا نے جو تمہیں فرار کا راستہ دکھایا ہے، اس کے علاوہ تم کہیں سے نکل ہی نہیں سکتے۔ تمہیں کسی دوسرے راستے کا پتا ہی نہیں تھا اس لیے میں تمہارا نیچے انتظار کر رہی تھی۔''

''اتنا وقت کہاں گزارا؟''

''مختلف اسٹورز پر خریداری کرتے ہوئے...... یہاں تک کہ سونیتا نے مجھے کال کر کے بتا دیا کہ وہ نکلنے لگی ہے۔''

میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بڑے پیار سے میری ہی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس لڑکی کا دماغ کیسا تھا۔ میں اب تک سمجھ نہیں سکا تھا۔ تبھی میں نے اپنے لہجے میں ملائمت گھولتے ہوئے پوچھا۔

''اب میں یہاں سے کیسے نکلوں گا؟''

''کم از کم ایک دو دن تو یہیں رہنا پڑے گا۔ شہر میں ہر طرف ناکے ہوں گے۔ ایسے موقعوں پر پولیس کی عیاشی ہو جاتی ہے۔ وہ عام لوگوں کو تنگ کر کے بہت لوٹتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے خمار آلود لہجے میں کہا۔ ''یہیں پڑے رہو، تمہارا کیا جاتا ہے۔''

''تم پر بھی کوئی افتاد پڑ سکتی ہے؟'' میں نے اسے ڈرانا چاہا۔

''تم سے بڑی افتاد بھی کوئی ہو سکتی ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا پھر چند لمحوں بعد وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''میں جانتی ہوں کہ تم وہ نہیں ہو، جو تم نے اپنے بارے میں بتایا، میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم ہندو نہیں ہو، تم ویر سنگھ نہیں ہو۔ تمہارا اسٹائل بتا رہا ہے کہ تم کوئی تربیت یافتہ ہو۔ وقت آنے پر تم مجھے بھی قتل کر کے جا سکتے ہو۔ میں ایک ایسے انسان کے پہلو میں پڑی ہوں جو خطرے کی صورت میں مجھ پر بھی رحم نہیں کرے گا لیکن، میں تمہارے منہ سے کوئی سچائی نہیں جاننا چاہتی، بس یہ رات اور ایک دن مجھے دے دو، پھر تم جہاں چاہو گے میں تمہیں چھوڑ دوں گی...... وعدہ......'' اس نے کہا تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے یہ رسک لینے کا فیصلہ کر لیا۔ تبھی میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''ٹھیک ہے، میں یہیں ہوں۔'' میرے یوں کہنے پر اس کا چہرہ ایک دم سے سرخ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں تک خوش دکھائی دینے لگیں۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''آؤ دیکھیں اب تک کیا بنا ان کا۔''

وہ مختلف چینل اور سائٹس پر جاتی رہی۔ کچھ سوشل میڈیا کے لوگوں اور گروپس کو دیکھتی رہی۔ ان سب سے یہی پتا چلا کہ ستیہ رام اور تیسرا شخص بُری طرح قتل ہوئے ہیں۔ شیو نرائن باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن انتہائی زخمی ہو جانے کی وجہ سے اسپتال میں پڑا تھا۔ اسے ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں ابھی تک میرا پیغام ریاستی ادارے تک نہیں پہنچا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہی وہ موقع تھا کہ میں فرار ہو سکتا تھا۔ جیسے ہی ریاستی اداروں کو پتا چلتا، ایک ایسا ان دیکھا جال میرے گرد پھیل جانے والا تھا کہ میں چاہتے ہوئے بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ کچھ دیر پہلے کیا گیا بملا سے وعدہ اور یہ معلومات مجھے چکرا دینے کے لیے کافی تھیں۔

جے پور میرے لیے اجنبی ہو چکا تھا۔ شر ید ھر کا فون بند جا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے فون ہی کہیں پھینک دیا ہو۔ اسے ایسا کرنا بھی چاہیے تھا۔ اسے تو یہاں شہر میں رہنا تھا۔ سادھو مائی کا نمبر میرے پاس محفوظ تھا لیکن ان حالات میں اس سے رابطہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بلاشبہ وہ جان گئی ہو گی کہ میں یہاں اس شہر میں کیا کرنے آیا تھا۔ جگو دادا اور پرتاب سنگھ والے معاملے کے بعد ستیہ رام والے واقعے تک پہنچ جانا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اگر کوئی عام قتل ہوتا تو شاید وہ خاموش رہتی۔ لیکن اس میں ایک ریاستی ادارے کا بندہ بھی قتل ہوا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ ایسے حالات میں کسی قاتل کو اپنے ہاں پناہ دینے کا مطلب اپنے اور اپنے سارے ''سیٹ اپ'' کو داؤ پر لگا دینے والی بات تھی۔ ممکن ہے وہ مجھے اپنے پاس رکھ کر خاموشی سے ان کے حوالے کر دیتی تا کہ اپنی ساکھ کو مزید مضبوط بنا کر رکھ سکے۔ اس کے پاس واپس جانا انتہائی خطرناک تھا۔ ان دونوں کے علاوہ شہر میں میرا کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ تیسری بملا تھی، جس کے پاس ٹھہرنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کوئی بھی کڑی ریاستی اداروں کو یہاں تک پہنچا سکتی تھی۔ وہ بھی کچھ عرصے کے لیے یہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔

میں جہاز کا سفر نہیں کر سکتا تھا۔ ظاہر ہے اس کے لیے کچھ نہ کچھ تو شناخت چاہیے ہوتی ہے جو اس وقت میرے پاس نہیں تھی۔ کسی بھی کار سے سفر کرنا بھی ایک رسک تھا۔ شہر بھر میں ناکوں کے علاوہ کسی بھی جگہ میں شک کی زد میں آسکتا تھا۔ میں خود کو ان کی جگہ رکھ کر سوچ رہا تھا۔ ٹرین کا سفر کافی حد تک محفوظ ہو سکتا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ مجھے جانا کہاں ہے؟

میں ساری رات یہی سوچتا رہا۔ بملا میرے ساتھ سکون سے سوتی رہی تھی، میں کبھی سو جاتا اور کبھی اچانک میری آنکھ کھل جاتی۔ عجیب و غریب اور نہ سمجھ میں آنے والے ڈراؤنے خواب مجھے جگا دیتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ یہ سب میرے دماغ کے کرشمے ہیں۔ میرے اردگرد بہت خطرہ تھا۔ اس خطرے سے نکلنا ہی اب سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ بملا نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ بولی۔

''کیا سوچ رہے ہو؟''

''یہی ان دنوں کے حالات کے بارے میں۔'' میں نے کہا۔

''دیکھو ایسا کرتے ہیں، دو چار دن کے لیے میرے آبائی گاؤں جاتے ہیں، جب یہ معاملہ......''

''وہاں بہت تھوڑے لوگ ہوں گے، گاؤں میں ایک اجنبی شخص جلد پہچانا جاتا ہے۔ جہاں ہجوم ہو، وہاں گم ہو جانے میں آسانی ہوتی ہے۔'' میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

''بالکل، ایسا ہی ہے۔ میں اپنے چند دوستوں کو اکٹھا... کرتی ہوں، کسی جگہ ٹور پر نکلتے ہیں۔ تم جہاں چاہو نکل جانا اور میں چند دن بعد واپس آجاؤں گی۔''

''کتنی دیر میں اکٹھا کر پاؤ گی، کیونکہ صبح ہوتے ہی یہاں احتجاج اور نہ جانے کیا کیا شروع ہو جائے گا۔'' میں نے اس سے کہا تو وہ لمحہ بھر سوچنے کے بعد بولی۔

''تم سکون سے کچھ دیر کے لیے سو جاؤ، میں کرتی ہوں کچھ۔''

''اوکے۔'' میں نے کہا اور کروٹ بدل لی۔ میں خود بھی اس کیفیت سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔

☆☆☆

دوپہر ہو چکی تھی۔ شہر میں کرفیو کا سماں تھا۔ کئی جگہ توڑ پھوڑ ہو چکی تھی۔ میں اور بملا صبح ہی...... ایک لڑکی کے اپارٹمنٹ میں آگئے تھے۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں سے ریلوے اسٹیشن نزدیک تھا۔ اس نے اپنے دوستوں کو ریلوے اسٹیشن پر ہی پہنچنے کا کہا تھا۔ میں ایک کمرے میں پڑا رہا اور وہ دونوں اپنے دوستوں سے رابطے میں رہیں۔ جیسے ہی سب پہنچ گئے، اس نے مجھے چلنے کو کہا۔ میں تیار تھا۔ میں نے اپنا بیگ اٹھایا اور ان کے ساتھ چل دیا۔

ہم بلڈنگ سے نکل کر سڑک پر آکھڑے ہوئے۔ میں نے قمیص شلوار پہنی ہوئی تھی جس سے میرے بازو کا زخم چھپ چکا تھا۔ میری جیب میں کچھ روپے، سیل فون اور پسٹل تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آگے کیا ہونے والا تھا۔ ہم کسی ٹیکسی کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد ایک ٹیکسی ہمارے پاس آکر رک گئی۔ تقریباً پانچ سات منٹ کے سفر کے بعد ہم ریلوے اسٹیشن جا پہنچے۔

ریلوے اسٹیشن پر کافی رش تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے سارا شہر ہی یہاں اُمنڈ آیا ہو۔ یہ شہر کے حالات خراب ہونے ... کی وجہ تھی یا پھر ایسا معمول تھا، جو بھی تھا یہ ہمارے لیے فائدے مند تھا۔ اگرچہ وہاں واک گیٹ لگے ہوئے تھے۔ لیکن کوئی ان کی پروا نہیں کر رہا تھا۔ میں نے اسے غنیمت جانا اور واک گیٹ سے الگ ہو کر گزر گیا۔ بملا اور لڑکی واک گیٹ سے گزر گئیں۔ ہم پلیٹ فارم پر آگئے۔

بملا کے سارے دوست اکٹھے ہونے میں پانچ منٹ بھی نہیں لگے تھے۔ ہم کُل سات تھے، جن میں چار لڑکیاں اور تین لڑکے تھے۔ ایک لڑکا جو سب سے پہلے وہاں پہنچا تھا، اس نے ٹکٹ خرید لیے تھے۔ اسی دوران میں ٹرین آگئی۔ لوگوں کا رش ایک دم سے بڑھ گیا۔ میں خاموشی سے ان کے ساتھ چلتا چلا جا رہا تھا۔ میرا دھیان اردگرد زیادہ تھا۔ چند لوگوں پر مجھے شک گزرا جیسے وہ وہاں پر خاص ڈیوٹی کر رہے ہوں۔ میں نے اسے اپنا وہم سمجھا۔ ہم نے بھی اپنے اپنے بیگ اٹھائے اور ٹرین میں سوار ہو گئے۔ وہ ایک سلیپر تھا، جس میں خاصی خنکی تھی۔ ابھی میں سب سے اجنبی تھا۔ سو خاموشی سے سفر شروع ہو گیا۔ تب میں نے بملا سے پوچھا۔

''ہم جا کہاں رہے ہیں؟''

''جیسلمیر......'' اس نے ایک ہی لفظ کہا تو میں چونک گیا۔ میں اسے کیا بتاتا کہ وہ شہر میرے لیے کیسا ہو سکتا تھا۔ میں نے بڑے سکون سے پوچھا۔

''کتنا سفر ہوگا، مطلب کتنے گھنٹے کا؟''

''یہی کوئی بارہ تیرہ گھنٹے لگیں گے۔'' اس نے کہا اور

باقی دوستوں سے مخاطب ہوگئی۔ اس نے بڑی دھیمی آواز میں میرا تعارف کرایا اور آنکھ دبا کر بولی۔ ''میرا نیا بوائے فرینڈ۔''

اس نے کہا تو دبی دبی آوازیں ابھریں۔

''اچھا ہے...... ہینڈسم ہے...... واؤ...... تبھی کہوں اچانک پروگرام...... چلو تمہارے ساتھ ہمارے بھی مزے...... ان دنوں میں تو اچھا ہی تھا......''

میں کافی حد تک دباؤ میں آ گیا تھا۔ ایک تو اس شہر سے نکلنا، دوسرا خیریت سے سفر گزر جانے کی خواہش اور تیسرا پھر سے جیسلمیر...... میں انہیں بتا بھی نہیں سکتا تھا کہ وہاں پہلے ہی ہم ایک داستان چھوڑ آئے ہیں۔ میں نے سوچا، یہاں سے نکل جائیں، پھر باقی بعد میں سوچا جا سکتا ہے۔

''اے بملا، وہاں پر بکنگ کرا لی ہے نا کسی ہوٹل وغیرہ کی؟'' ایک لڑکے نے پوچھا تو وہ بولی۔

''ہاں نا، سب کے لیے الگ الگ کمرا، ایک بچے گی وہ میرے ساتھ رہ لے گی بے چاری۔''

اس نے کہا تو ایک دم سے قہقہہ لگ گیا۔ میں بس مجبوری میں دھیرے سے مسکرا ہی سکا تھا۔

☆☆☆

جیسلمیر ریلوے اسٹیشن پر اُترے تو آدھی رات سے زیادہ کا وقت ہو چکا تھا۔ ہم جے پور سے بھی نکل آئے تھے اور راستے میں بھی تقریباً کچھ نہیں ہوا تھا۔ ہمارے سلیپر میں باتیں بڑے زور و شور سے ہو رہی تھیں۔ چار بندے تاش کھیل رہے تھے، تب ایک ادھیڑ عمر سی خاتون ہمارے پاس آ گئی۔ اس نے بہانہ یہی بنایا تھا کہ وہ بھول کر آ گئی ہے لیکن میرے سمیت سبھی سمجھتے تھے کہ یہ بھول کر آنے والی عورتیں کیسی ہوتی ہیں۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے بیٹھی رہی پھر تھوڑے بہت سفر کے بارے میں سوال جواب کر کے اٹھ گئی تھی۔ بلاشبہ وہ ڈیوٹی پر تھی۔ اسے جہاں بھی شک ہوتا، وہ رپورٹ کرتی۔ اس کے جانے کے بعد میں الرٹ ہو گیا لیکن جیسلمیر آنے تک کچھ نہیں ہوا تھا۔ یہاں سے نکلنا ایک بڑا مسئلہ تھا۔ میں جان بوجھ کر لوگوں کے رش میں آ گیا۔ پھر واک گیٹ سے الگ ہو کر نکلتا چلا گیا۔ باقی میرے ساتھ آ گئے۔ ایک ہائی ایس وین ہمارے لیے ہوٹل کی طرف سے آئی ہوئی تھی۔ ہم اس میں بیٹھے اور چل دیے۔

ہم ابھی راستے ہی میں تھے کہ چاچا عبدالمجید کا فون آ گیا۔ میں نے کال ریسیو کی اور بہت محتاط انداز میں بات کی۔

''کہاں ہو تم اِس وقت......؟''

''جیسلمیر......'' میں نے کہا تو وہ بولے۔

''اوہ، وہاں کیا کر رہے ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''بس آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکنے جا رہا ہوں۔'' میں نے گول مول سی بات کی جسے وہ فوراً سمجھ گئے۔ تبھی انہوں نے کہا۔

''اچھا، جیسے ہی ذرا سکون ملے، مجھے بتانا، میں تم سے ایک اہم بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''اوکے۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

ہم ہوٹل پہنچ گئے تھے۔ وہ ہوٹل بھی شہر سے باہر تھا۔ اب وہ آبادی میں آ چکا تھا۔ اگر کہا جائے تو وہ شہر سے چار پانچ کلومیٹر باہر ہی تھا۔ وہ سب عیش کرنے آئے تھے۔ اتنا سفر ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ ہمیں کمرے مل گئے۔ سامان رکھنے کے بعد جب فریش ہو چکے تو کھانے کے لیے لان میں جا بیٹھے۔ کھانے میں ابھی دیر تھی۔ میں اٹھ کر سوئمنگ پول کی جانب بڑھ گیا۔ اگرچہ وہاں چند لوگ نہا رہے تھے لیکن ان کا شور نہیں تھا۔ میں ایک اندھیرے گوشے میں جا بیٹھا۔ تبھی میں نے چاچا عبدالمجید کو کال کر دی۔ کال ریسیو کرتے ہی انہوں نے کہا۔

''چلو یہ اچھا ہوا، تم جیسلمیر آ گئے۔ جب تم یہاں تھے، ان دنوں ایک بات سامنے آئی تھی، مسنگ پرسن والی، وہ ندیم ڈانڈیا تھا جس نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ مسنگ پرسن ہے؟''

''ہاں بالکل مجھے یاد ہے وہ ندیم ڈانڈیا ہی تھا۔''

''ہاں تب سے ہم نے یہاں ایک پراجیکٹ شروع کیا، دیکھیں تو سہی یہاں کتنے مسنگ پرسن ہیں اور وہ کیا کر رہے ہیں۔''

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''پتا چلا ہے کہ یہاں اکیڈمی نما ایک تربیت گاہ ہے۔ جہاں صرف اور صرف پاکستان مخالف ذہن سازی کی جاتی ہے۔ یہاں پر چونکہ ٹورسٹ زیادہ آتے ہیں تو کوئی غیر ملکی بھی انہیں تربیت دے رہے ہیں۔ یہ سب ہمارے وطن کے خلاف کام کرنے والے ہیں۔ چاہے وہ وطن واپس آ جائیں یا باہر ہی بیٹھے رہیں۔''

''یہ پراجیکٹ کہاں تک پہنچا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ظاہر ہے، اسے ختم کرنا ہے، اس کے لیے چند لوگ یہیں جیسلمیر پہنچ رہے ہیں۔ پہلے شاید دو چار دن لگ جاتے لیکن اب ایک دو دن ہی میں آ جائیں گے۔ اگر تم چاہو

تو......؟'' انہوں نے کہا تو میں تڑپ اٹھا، میں نے تیزی سے کہا۔
''کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟''
''نہیں، کوئی ایسی بات نہیں ہے، میں دراصل تمہارے لیے کچھ دوسرا سوچ رہا تھا، اس سارے مشن میں جس تنظیم نے کام کیا تھا، وہ کلیان جی ہے اور تم سمجھتے ہو کہ ستیہ رام ختم ہو گیا تو اس کا بڑا بھی ختم ہو گیا؟''
''نہیں یہ تو پورے بھارت میں پھیلی ہوئی ہے۔'' میں نے کہا۔
''نہیں یہ اطلاع بالکل غلط ہے۔ یہ صرف راجھستان تک محدود ہے اور بھی چند شہروں میں۔ اس کا پورا کھوج نکل آیا ہے۔'' انہوں نے بتایا۔
''اصل کہانی کیا ہے؟'' میں نے انتہائی تجسس سے پوچھا۔
''اس کا بڑا، کلیان آنند اس وقت پٹایا میں بیٹھا ہے۔ اس کا تعلق اودھے پور ہی سے ہے۔ وہ ایک بہت بڑا مجرم تھا۔ خود ریاست اس سے تنگ تھی۔ اس نے ریاست سے کچھ دو کچھ لو پر ڈیل کر لی۔ وہ ڈیل یہ تھی کہ اپنے کام کے ساتھ وہ ریاست کا کام بھی کرے گا، وہ یہاں سے نکل کر پٹایا چلا گیا۔ وہ دونوں جگہوں پر اپنا نیٹ ورک بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔''
''اوہ، تو وہ پٹایا میں ہے؟ کیا وہاں اس کا پتا چل گیا ہے کہاں ہے؟'' میں نے سرسراتے ہوئے کہا۔
''ابھی اس میں کامیابی نہیں ہوئی، میں نے تمہیں اس لیے بتایا ہے کہ اپنے ذہن پر یہ کلیان جی والا بوجھ ختم کر دو۔ کیونکہ یہاں جتنے بھی کلیان جی مارو گے، اتنے مزید پیدا ہوتے چلے جائیں گے۔'' انہوں نے سمجھاتے ہوئے کہا تو میں نے تیزی سے پوچھا۔
''اور اگر اسی سانپ کا سر کچل دیا جائے تو......؟''
''پھر یہی ہو سکتا ہے کہ ان کا نیٹ ورک ٹوٹ جائے۔'' انہوں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔
''کیا میں پٹایا جا سکتا ہوں؟'' میں نے دبے دبے جوش سے پوچھا۔
''اگر تم چاہو تو یہ مشن تمہارا منتظر ہے۔'' انہوں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔
''یہ مشن میں ہی نمٹاؤں گا۔'' میں نے ایک عزم سے کہا۔
''تو ٹھیک ہے، یہاں پر اکیڈمی والا کام ختم کرو، کل تک کچھ لوگ تمہیں رپورٹ کریں گے۔'' انہوں نے کہا۔
''میں انتظار کروں گا۔'' میں نے کہا تو اس نے کال ختم کر دی۔ میں جس طرح اس پر غور کرتا...جا رہا تھا، میرے اندر کی کیفیت بدلتی جا رہی تھی۔ میں نے فون جیب میں رکھا اور بملا کے پاس آ گیا۔ وہ سب کھانے میں مصروف تھے۔

☆☆☆

دن کافی چڑھ آیا تھا۔ ہم اسی قلعے کے سامنے تھے جہاں اودھے رام کے کہنے پر میں نے ایک قتل کیا تھا۔ اسی قلعے میں وہ ریزورٹ تھا۔ ایک دم ہی سے مجھے مادھو کر یاد آ گیا۔ اس بے چارے کا پتا نہیں کیا بنا ہوگا۔ اس نے آخری وقت تک میرا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ اس کی یاد کی اوٹ میں مانسی جھانکنے لگی۔ وہ سانولی سی لڑکی نے میرا بہت ساتھ دیا تھا۔ میں ان کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ بملا نے میرے بازو میں ہاتھ ڈال دیا۔
''کہاں کھوئے ہوئے ہو؟''
''یہی سوچ رہا ہوں کہ یہ قلعے بنانے والے لوگ کیسے تھے؟ اُس وقت کیا ماحول ہوگا جب یہ قلعہ بنا تھا۔ زندگی کیسی ہوتی ہوگی؟'' میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔
''وہ جیسی بھی ہوگی، ہمیں اس سے کیا، اس وقت کا سوچو جو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ انجوائے کرو۔'' اس نے میرے ساتھ لگتے ہوئے کہا۔
''ویسے بملا، تمہیں اپنی اس اکیلی دوست کا کچھ خیال نہیں، کس طرح تنہا ہے۔ کتنی پریشان سی لگ رہی ہے۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔
''اب اس کا دوست نہیں آیا تو میں کیا کروں۔ اگر تمہیں اتنا ہی خیال ہے تو تم دے دو اسے وقت......'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا تو قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ ہمارے ایک ساتھی نے ٹکٹ خرید لیے تھے اور ہم اندر جانے کو تیار تھے۔ کچھ ساتھی اندر چلے بھی گئے تھے کہ دو افراد ہمارے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ دونوں مقامی لگتے تھے۔ انہوں نے مقامی لباس کے بجائے، بڑی نفیس شرٹ اور پتلون پہنی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ انہوں نے ٹائی بھی لگائی ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک پتلے سے لمبے آدمی نے انگریزی میں پوچھا۔
''ہیلو، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں؟''
''جے پور، ہم جے پور سے آئے ہیں۔'' میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کوئی فورسز کا بندہ

ہے اور اسے ہم پر شک پڑ گیا ہے۔
''وہاں کس جگہ سے؟'' اس نے میری جانب غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔
''جگت پورہ سے۔'' میں نے تیزی سے کہا۔
''یہاں کہاں ٹھہرے ہیں؟'' اس نے پھر میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا تو میں نے ہوٹل کا نام بتا دیا۔
وہ سر ہلاتا ہوا شکریہ کہہ کر چلا گیا۔ دوسرا بھی اس کے پیچھے بڑھ گیا۔ میں اس طریقے سے پوری طرح واقف تھا۔ اگر کسی پر یوں شک پڑ جائے تو اس سے سوال کیے جاتے ہیں، سوال کرنے اور جواب لینے کے دوران چہرہ، آواز اور لہجہ دیکھا جاتا ہے۔ یہی تینوں شک کو یقین میں بدلتے ہیں۔ شک پھر بھی رہتا ہے کیونکہ اہمیت اس بات کو ہوتی ہے کہ شک ہوا کیوں؟ کافی آگے جا کر ہم ایک ٹولی میں ہو گئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ ہمیں دیکھا جا رہا ہوگا۔ اس دوران بملا نے ہولے سے پوچھا۔
''یہ کس وجہ سے سوال کر رہا تھا؟''
''اسے کوئی شک ہو گیا ہوگا۔ تم اپنی باڈی لینگویج سے ان کے شک کو یقین میں مت بدلنا۔'' میں نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔
''اوکے اوکے، میں سمجھ گئی۔'' اس نے تیزی سے کہا۔
میں فطری طور پر یہ سمجھنے لگا تھا کہ اگر مجھے یہاں سے فرار بھی ہونا پڑے تو میں یہاں سے کس طرح نکلوں گا۔ میں نے بملا سے ہاتھ چھڑا لیا تو اس نے مجھے دیکھا پھر دھیرے سے بولی۔
''کوئی خطرہ ہے کیا؟''
''مجھے لگتا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ سر ہلانے لگی۔ میں غیر محسوس انداز میں اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے لگا مگر مجھے کوئی ایسا بندہ دکھائی نہیں دیا جس نے ہم پر نگاہ رکھی ہوئی ہو۔ لیکن میرے اندر بے چینی بڑھنے لگی تھی۔ ایسا یونہی نہیں ہوتا تھا۔ کوئی خطرہ تھا میرے آس پاس۔ میں نے بملا سے کہا۔
''میں اگر اچانک گم ہو جاؤں تو پریشان مت ہونا، اپنے ساتھیوں کے ساتھ سکون سے واپس ہوٹل چلی جانا، میں تم سے رابطے میں رہوں گا۔''
''اوکے، میں سمجھتی ہوں۔'' اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا اور پھر میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگی۔ انہی لمحات میں ایک نوجوان لڑکا ہماری دائیں جانب سے نکلتا ہوا سامنے آ گیا۔ اس نے آتے ہی بڑے ادب سے پوچھا۔
''ہیلو، میں ایک اچھا گائیڈ ہوں، اس پورے قلعے کے علاوہ پورے شہر کے بارے میں ذرا ذرا سی بات جانتا ہوں۔ میں ایسے علاقوں سے بھی واقفیت رکھتا ہوں جو عام سیاحوں کی نگاہوں سے اوجھل رہ جاتے ہیں۔ اگر آپ میری خدمات سے استفادہ کریں گے تو بہت زیادہ انجوائے کریں گے۔''
''شکریہ اپنے بارے میں بتانے کا لیکن ہمیں کسی گائیڈ کی ضرورت نہیں، ہم خود ہی انجوائے کر لیں گے۔'' بملا نے انکار کرتے ہوئے کہا۔
''لیکن آپ......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔
''میم نے تمہیں کہہ دیا سو اب جاؤ۔''
وہ چند لمحے ہمیں دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ گیا۔ میں نے اس پر نگاہ رکھی کہ وہ کسی دوسرے کو بھی اپنی خدمات پیش کرتا ہے یا صرف ہمارے لیے ہی آیا تھا۔ اس وقت مجھے حیرت ہوئی جب وہ لوگوں کی بھیڑ میں اچانک گم ہو گیا۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور سمجھ گیا۔ مجھ پر شک تو انہیں ہو ہی گیا تھا اب وہ مختلف حیلوں سے مجھے پریشان کرنا چاہتے تھے کہ اگر میں بھڑک اٹھتا ہوں، یا کچھ بھی ایسا ویسا کرتا ہوں تو وہ مجھ پر ہاتھ ڈال سکیں یا پھر چھوڑ دیں۔
ہم کافی دیر تک گھومنے کے بعد کھانے کی ایک جگہ پر آ بیٹھے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے اپنے چاروں طرف نگاہ گھمائی۔ کوئی بھی قریب مجھے دکھائی نہیں دیا۔ وہیں بیٹھے مجھے کال آ گئی۔ وہ عرفان حمید تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی جیسلمیر پہنچا تھا۔ وہ ایک مقامی کے گھر پر آ چکا تھا، وہیں سے اس نے مجھے کال کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے وہ ٹھکانا بتا دیا جہاں ہم مل سکتے تھے۔ وہ وقت آ گیا تھا جب مجھے بملا سے الگ ہونا تھا۔ میں خاموشی سے اٹھا اور واش رومز کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے وہاں زیادہ وقت نہیں لگایا، باہر نکلا اور بجائے بملا کی طرف جانے کے، وہاں سے نکلتا چلا گیا۔
میں قلعے سے نکل کر سڑک پر آ گیا تھا۔ سڑک کی دوسری جانب پولیس اسٹیشن تھا۔ میں نے بڑے سکون سے ایک ٹیکسی والے سے بات کی اور چل پڑا۔ عرفان نے مجھے جس ٹھکانے کے بارے میں بتایا تھا، میں اس سے تھوڑے فاصلے پر اتر گیا۔ مجھے یہی خطرہ تھا کہ میرا تعاقب نہ کیا جا رہا ہو۔ میں نے ادائیگی کی اور پیدل چلنے لگا۔ تقریباً ایک گھنٹا

تک ادھر اُدھر پھر کر میں نے یقین کرلیا کہ کوئی میرا پیچھا نہیں کر رہا ہے۔ تب میں اس ٹھکانے کی جانب چل دیا۔

شہر کی اندرون گلیوں میں وہ ایک چھوٹا سا ریستوران تھا۔ جہاں نچلے درجے کے لوگ کھا پی رہے تھے۔ ایک شور مچا ہوا تھا۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ بازار نما اس گلی میں کافی بھیڑ تھی۔ میں نے جاتے ہی چائے کا آرڈر دے دیا۔ میرے سامنے عرفان بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا، نگاہوں ہی نگاہوں میں سلام دعا بھی ہوگئی۔ تب اس نے مجھے میسج کر دیا۔

''اتنی احتیاط کیوں؟''

''نجانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ میرا تعاقب کیا جا رہا ہے۔'' میں نے جواباً میسج کر دیا۔ تب اس نے میسج کیا۔

''کوئی بات نہیں، میں دیکھتا ہوں تم اسی سڑک پر سیدھے چلتے جاؤ، میں تمہارے پیچھے ہوں۔''

میں نے بڑے سکون سے چائے پی، چائے پی کے ریستوران سے پہلے میں نکلا، پھر میرے پیچھے ہی عرفان نکل پڑا۔ تھوڑی دیر بھول بھلیوں میں رہتے ہوئے ہم ایک پرانے سے مکان میں آ گئے۔ وہ بڑا تنگ سا پرانا مکان تھا۔ اس کی دیواروں سے پلستر اکھڑا ہوا تھا۔ سیلن زدہ سا تھا جس سے تھوڑی بدبو اٹھ رہی تھی۔ وہ مجھے لیتا ہوا ایک کمرے میں چلا گیا۔ وہاں زمین پر میٹرس بچھے ہوئے تھے۔ وہ مقامی میزبان وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے ملا، پھر باہر نکل گیا۔ ہم دونوں وہاں بیٹھ گئے۔

''میں نے آتے ہی اس اکیڈمی کو باہر سے دیکھا ہے، اس کی پوری لوکیشن میں نے ریکارڈ کر لی ہے۔'' اس نے مجھے بتاتے ہوئے فون میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے اس میں موجود چند ویڈیوز کو دیکھا۔ وہ شہر کے پوش علاقے میں تین منزلہ بنگلا تھا۔ وہ بالکل کونے میں تھا جہاں اسے دو سڑکیں لگتی تھیں۔ اس کے سامنے ایک چھوٹا سا پارک تھا۔ دیکھنے میں وہ کافی خوبصورت لگ رہا تھا۔ اس کی پارکنگ میں چند موٹر سائیکل اور کچھ کاریں کھڑی تھیں۔ باہر گیٹ پر ایک گارڈ کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں اسلحہ کے بجائے ڈیٹونیٹر تھا...... یہ لوکیشن کی معلومات تھی لیکن اندر کیا تھا، اس بارے میں جاننا بہت ضروری تھا۔ اسی دوران میں مقامی میزبان ٹھنڈا لے آیا۔ اس نے بھی ہماری تھوڑی باتیں سن لی تھیں اس لیے وہ بولا۔

''میرے خیال میں شام سے پہلے پہلے سب آ جائیں گے، تب ہمارا ایک دوست بھی آ جائے گا، جو وہاں پر تربیت حاصل کر رہا ہے۔ وہ سب کچھ بتا دے گا۔''

''یہ ہوئی نا بات۔'' میں نے کہا اور ٹھنڈا پینے لگا۔ ہم باتیں کرنے لگے۔ اسی دوران بملا کا فون آ گیا۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ تم لوگ انجوائے کرو، میں کسی بھی وقت ان سے آملوں گا۔ وہ بڑے آرام سے مان گئی۔

سہ پہر ہوگئی تھی۔ ہمارے دو ساتھی مزید آ گئے تھے۔ ہم

پارسائی

☆ ایک محترم پوپ جیل کے معائنے کے لیے گئے۔ انہوں نے تمام قیدیوں سے ان کا جرم پوچھا۔ قیدیوں نے جرم سے انکار کیا اور کہا کہ وہ بے گناہ ہیں، انہیں سزا غلط دی گئی ہے۔ صرف ایک قیدی نے یہ اعتراف کیا کہ وہ مجرم ہے۔

پوپ نے فوراً حکام سے کہا۔ ''اسے فوراً رہا کیا جائے ورنہ اس کی صحبت تمام پارساؤں کو بگاڑ دے گی۔''

☆ ساؤتھ کیرولائنا کے ایک قحبہ خانے پر پولیس نے کامیاب چھاپا مارا اور درجنوں گاہک گرفتار کر لیے گئے۔ گرفتاری کے فوراً بعد پولیس کے پاس مختلف لوگوں کی سفارشیں آنے لگیں کہ گرفتار شدگان کو الزام لگائے بغیر رہا کر دیا جائے لیکن ایک فون ایسا بھی آیا جس میں ایک ادھیڑ شخص نے پولیس سے درخواست کی کہ گرفتار شدگان میں اس کا نام شامل کرلیا جائے۔

شکار پور سے علی زاہد کا تعاون



طلاق کی خواہش مند ایک عورت نے عدالت میں بیان دیا کہ اس کا شوہر اس سے بات چیت تک نہیں کرتا۔

''کیا یہ الزام درست ہے؟'' عدالت نے شوہر سے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' شوہر نے اقرار کیا۔ ''دراصل مجھے شادی شدہ خواتین سے بات چیت کی عادت نہیں ہے۔''

کراچی سے امتیاز احمد کی عادت

بیٹھے یونہی گپ شپ کر رہے تھے کہ وہ مقامی بھی آ گیا، جو وہاں پر تربیت لے رہا تھا۔ کچھ دیر باتوں کے بعد اس نے کہا۔

''میرے خیال میں تو اتنی تام جھام کی ضرورت نہیں تھی، اس ادارے ہی کو ختم کرنا ہے تو ایک چھوٹے بم کی ضرورت ہے۔ وہ تو میں بھی لگا سکتا ہوں، یا کوئی بھی......''

''ادارے عمارتوں سے نہیں بنتے۔ ایک عمارت ختم ہوگی تو دوسری بن جائے گی۔ چند کروڑ کا ہی نقصان ہوگا نا، ایسے کاموں میں چند کروڑ کا ضائع ہو جانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تو پھر، تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ واقعی اتنے تام جھام کی ضرورت نہیں، پتا نہیں کیوں یہ مشن دے دیا گیا ہے۔'' میں نے ایک خیال کے تحت اپنی سوچ کو اپنے تک محدود رکھا پھر اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''تم تھوڑا تفصیل سے بتاؤ گے، اندر ہے کیا؟''

وہ تفصیل سے بتانے لگا۔ اسے تین منزلوں کے بارے میں پوری جانکاری تھی۔ اس نے اپنی جیب سے چند کاغذ نکالے، ان پر پورا نقشہ بنا ہوا تھا۔ وہ انگلی رکھ کر ہمیں سمجھانے لگا۔ میں سمجھتا گیا اور اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں پلان بنتا چلا گیا۔

☆☆☆

رات کا پہلا پہر تھا۔ ہم نے اس اکیڈمی سے تھوڑے فاصلے پر فوروہیل رکوادی تھی۔ وہ مقامی میزبان گاڑی چلا کر یہاں تک آیا تھا۔ میں نے عرفان حمید کو سمجھا دیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ ان کو تھوڑی دیر بعد فوروہیل سے نکلنا تھا۔ میں بڑے سکون سے چلتا ہوا اکیڈمی کے سامنے گیا۔ اس کا دروازہ لگا ہوا تھا۔ اس کے بارے میں وہ مقامی بتا چکا تھا کہ رات کے وقت اس کے دروازے لگ جاتے ہیں۔ میں سائڈ والی دیوار کے ساتھ آ گیا۔ دور گلی کے سرے پر لگے کھمبے پر بلب روشن تھا۔ پوری گلی سنسان تھی۔ میں نے اپنی جیب سے نائیلون کی رسی نکالی، اس کے ساتھ کنڈی جڑی اور دیوار پر لگی لوہے کی سلاخوں میں پھنسا دی۔ اسے کھینچ کر دیکھا، مضبوط پاتے ہی میں رسی کے سہارے اوپر چڑھ گیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے رسی اندر کی اور نیچے آ گیا۔

میں جانتا تھا کہ جس طرح کی وہ اکیڈمی ہے، وہاں پر کیمرے ضرور لگے ہوں گے، ممکن ہے ان پر کوئی دھیان دیے بھی بیٹھا ہو۔ یہ سب میں نے ذہن میں رکھ کر پلان کیا تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ہوتا ہوا، پہلی منزل کے اندر داخل ہو گیا۔ سامنے گیلری میں ایک سیکیورٹی گارڈ بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ میرا اور اس کا فاصلہ پچاس فٹ سے زیادہ نہیں تھا، میں نے ایک لمحہ غور کیا، اپنا پسٹل نکال کر سیفٹی کیچ ہٹایا اور پھر انتہائی سرعت سے بھاگتے ہوئے اس پر جا پڑا۔ وہ اچانک افتاد پر سنبھل بھی نہیں سکا۔ میں نے جاتے ہی پسٹل کا دستہ اس کے سر پر مارا۔ اس نے مزاحمت کرنا چاہی لیکن میں نے اسے موقع ہی نہیں دیا۔ وہ بے جان سا ہو کر فرش پر لیٹ گیا۔ میں نے اسے ایک طرف کیا، اندر سے گیٹ کھولا اور پھر انتہائی تیزی سے سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ عرفان حمید اور ایک ساتھی باہر کھڑے تھے۔

میں انتہائی تیزی سے تیسری منزل پر پہنچ چکا تھا۔ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد میرے سامنے چار دروازے تھے۔ ان میں سے ایک دروازہ وہاں کے باس کا تھا۔ میں نے اس دروازے کو دبایا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اندر ہلکی ہلکی موسیقی چل رہی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر پتلا سا آدمی، سانولے رنگ کا۔ جس نے اپنے بال رنگے ہوئے تھے۔ ٹی شرٹ اور شارٹس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ایسی ہی ایک ادھیڑ عمر، سفید سی فربہ مائل عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بھی ٹی شرٹ اور شارٹس پہنے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان بوتل کھلی ہوئی تھی۔ وہ دونوں بیٹھے پی رہے تھے۔ ادھیڑ عمر کے ساتھ ہی ایک لیپ ٹاپ کھلا پڑا تھا۔ اس کی اسکرین روشن تھی۔ وہ اس پر بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ان کے درمیان خاموشی حائل تھی لیکن جیسے ہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی، عورت ایک دم سے چیخ پڑی، پھر گھگیاتے ہوئے بولی۔

''وہ......وہ......دیکھو......''

اس ادھیڑ عمر نے میری جانب مڑ کر دیکھا، اس کے چہرے پر حیرت جمی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرتا، میں ان کے پاس پڑی تیسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ عورت کچھ زیادہ ہی گھبرا گئی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر بڑے سکون سے کہا۔

''میم......ری لیکس......آپ اپنا شغل جاری رکھیں، مجھے ان سے بات کرنی ہے۔''

''کیا بات کرنی ہے تم نے مجھ سے، یہ کوئی طریقہ ہے یوں اندر آنے کا، تم اندر آئے کیسے؟'' اس ادھیڑ عمر نے تحکمانہ انداز میں کہا تو میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ اکیڈمی آپ چلا رہے ہیں؟''

"ہاں، میں چلا رہا ہوں۔" اس نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہاں کیا پڑھاتے ہیں آپ؟" میں نے پھر سکون سے پوچھا۔

"مینجمنٹ......" اس نے اس بار تھوڑا تسلی سے جواب دیا تو میں اٹھا اور میں نے گھما کر تھپڑ اس کے منہ پر مارا، وہ چکرا کر گر گیا، قریب بیٹھی عورت کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ سچ بولو۔"

"کون ہو تم؟" اس نے فرش پر پڑے ہوئے شک بھرے انداز میں پوچھا تو میں نے سکون سے کہا۔

"جو پوچھ رہا ہوں، وہ بتاؤ۔"

"اگر تم بچ جان کر آئے ہو تو وہی جو تمہیں پتا ہے۔" اس نے کہا تو میں کھڑا ہو گیا، وہ سمجھ گیا کہ میں کیا کروں گا اس لیے جلدی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں بتاتا ہوں۔"

"جلدی بتاؤ، میرے پاس وقت کم ہے۔" میں نے کہا تو وہ کہتا چلا گیا۔

"تم جانتے ہو گے اب سوشل میڈیا سے ذہنی انقلاب لانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تھوڑے عرصے بعد یہ سوشل میڈیا ہر بندے کی رسائی میں آ جائے گا۔ بس ہم اس کے لیے کچھ خاص لوگوں کو تربیت دے رہے ہیں۔"

"کس قسم کی تربیت ......لوگوں کو ذہنی غلام بنانے کی، لوگوں کو اپنے ہی ملک کے خلاف بھڑکانے کی...... فحاشی پھیلانے کی...... انتشار پھیلانے کی...... مذہب سے دور کرنے کی...... کیا کرنا چاہتے ہو تم؟" میں نے حد درجہ جذباتی انداز میں کہا تو وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

"میں تو کچھ بھی نہیں کر رہا، یہ ہر ملک کر رہا ہے۔ آنے والے وقت کے لیے۔ یہ ففتھ جنریشن وار ہے۔"

"اوکے......" یہ کہہ کر میں اٹھا اور اس لیپ ٹاپ کو اٹھایا تو مجھے لگا، اس کی جان نکل گئی ہے۔ میں نے لیپ ٹاپ بند کیا اور اس سے پوچھا۔

"اب تک جتنے لوگوں کو تم نے تربیت دی ہے، ان کی لسٹ کہاں ہے؟"

"وہ میرے پاس نہیں ہوتی۔" اس نے کہا تو میں نے پسٹل سیدھا کیا اور اس کی طرف نال کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو پروفیسر، میرے ساتھ تعاون کرو گے تو کچھ نہیں کہوں گا، چپ چاپ واپس چلا جاؤں گا، ورنہ مجھے انگلی کا اشارہ کرنا ہے اور تم اس دنیا سے چلے جاؤ گے، اس کے ساتھ ہی تمہاری ففتھ جنریشن وار بھی۔"

"بتا دو نا سب......" وہ عورت چیختے ہوئے بولی۔

لیپ ٹاپ اٹھانے کے بعد میرا کام ختم ہو چکا تھا۔ جو کچھ بھی تھا، اسی میں تھا، میں بس وہاں سے اٹھنے کو تھا۔ میں نے جیب سے سائیلنسر نکالا، پسٹل کے آگے لگا کر نال اس کی جانب سیدھی کر دی۔ وہ سمجھ گیا کہ میں اسے ضرور ماروں گا۔ اس لیے وہ نیم بے ہوش سا ہو گیا۔ اسے پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ میں نے اس کی حالت دیکھ کر لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور اس کے ماتھے پر نال رکھ کر فائر کر دیا۔ پھر اس عورت کی جانب مڑا تو وہ بھی نیم بے ہوش ہو گئی۔ میں نے نال اس کے ماتھے پر رکھ کر کہا۔

"سوری میم......"

اس کے ساتھ ہی ٹریگر دبا دیا۔ وہ بھی ایک جانب لڑھک گئی۔ میں نے لیپ ٹاپ اپنی شرٹ کے اندر رکھا جو بہت مشکل سے آیا۔ مجھے لگا جیسے شرٹ پھٹ جائے گی۔ میں باہر آ گیا۔ ساتھ والے کمرے میں دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی۔ عرفان حمید نے سب کو کور کیا ہوا تھا اور وہاں پر موجود دو مرد اور ایک عورت دیوار کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے۔

"یار ان کا کیا قصور ہے، انہیں کام کرنے دو۔"

"میں نے تو بس ایویں انہیں کور کیا ہوا تھا کہ شور نہ مچائیں۔" اس نے شرارت بھرے انداز میں کہا۔

"بس اب چلیں۔" میں نے کہا تو وہ تیزی سے باہر کی جانب آیا۔ میں نے ان سب کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اچھے بچوں کی طرح سکون سے بیٹھنا، ورنہ تم بھی اپنے باس کی طرح اس دنیا سے چلے جاؤ گے۔"

انہیں مجھ پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن میں نے دروازہ بند کیا اور تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے آ گیا۔ میرے دو ساتھی اپنا کام کر چکے تھے۔ ہم گیٹ سے نکلے اور بڑے اطمینان سے فور وہیل میں جا بیٹھے۔ ہمارے بیٹھتے ہی فور وہیل چل پڑی۔ ہم زیادہ سے زیادہ سو میٹر تک گئے ہوں گے، پہلے ایک دھماکا ہوا۔ جس کا ارتعاش اتنا زیادہ نہیں تھا، اس کے بعد دوسرا دھماکا ہوا، جس کی لرزش ہم نے بھی محسوس کی۔ ہم تیز رفتاری سے نکلتے چلے گئے۔

ایک کراس پر میں اور ایک مقامی اُتر گئے۔ ہم واپس اس گنجان آبادی میں نہیں جانا چاہتے تھے۔ اس مقامی نے پارکنگ میں سے کار نکالی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھا اور چل دیا۔ اس کا گھر موہن گڑھ روڈ کی نئی آبادی والے علاقے میں تھا۔ اس نے باہر سے تالا کھولا اور پھر کار سمیت اندر چلا

گیا۔ اس کی فیملی سوئی ہوئی تھی۔ وہ مجھے لیے اوپر منزل پر چلا گیا۔ وہ دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ اس نے ایک کھولا تو کافی حد تک ٹھیک تھا۔ تاہم وہاں گرمی تھی۔ اس نے میرے لیے چائے بنائی، میرے پاس کپ دھرا، ایک پانی کی بوتل رکھی اور نیچے چلا گیا۔

صبح کا نیلگوں احساس بیدار ہو گیا تھا۔ میں اپنے سامنے رکھے لیپ ٹاپ پر اپنا کام مکمل کر چکا تھا۔ اگرچہ میں کوئی ہیکر نہیں تھا لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ کسی بھی کمپیوٹر سے اس کا ڈیٹا کیسے ٹھکانے لگایا جا سکتا ہے۔ اس لیپ ٹاپ تک ان لوگوں نے فوراً رسائی حاصل کر لی جو اسی کام کے لیے مامور تھے۔ دو سے تین گھنٹوں میں انہوں نے اپنا کام مکمل کر لیا۔ اب وہ لیپ ٹاپ میرے لیے بے کار تھا۔ اسے کہیں بھی پھینکا جا سکتا تھا۔

☆☆☆

صبح کی دھوپ اتنی زیادہ نہیں پھیلی تھی۔ اس وقت بملا اپنے دوستوں کے ساتھ صحرا میں اونٹ کی سواری کر رہی تھی۔ اس کے اکاؤنٹ میں ایک کثیر رقم آ چکی تھی۔ جس کا اسے پتا چل گیا تھا۔ وہ بہت خوش تھی اور مجھے فوراً اپنے پاس پہنچ جانے پر اصرار کر رہی تھی۔ میں اب کھلے میں پھرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں اوپر منزل پر بیٹھا ہوا کئی سوچوں میں گم تھا۔ مجھے چاچا عبدالمجید کے فون کا انتظار تھا۔ رات ان سے طویل بات ہوئی تھی، جس میں انہوں نے مجھے ابھی وہیں رکنے کے لیے کہا تھا۔ انہوں نے مجھے ندیم ڈانڈیا کو چیک کرنے کے لیے کہا تھا۔ اس کے بارے میں اطلاع یہ تھی کہ وہ ایک کھیپ لے کر بارڈر پار کرنا چاہتا ہے۔ وہ کھیپ ان لوگوں کی تھی جو اکیڈمی سے تربیت پا چکے تھے۔ اس نے ایک دو دن میں نکلنا تھا۔ یہ یقین کرنا تھا کہ وہ نکلا ہے یا نہیں؟ اگر نکل گیا ہے تو اس کے ساتھ بارڈر پار کر جاؤں یا پھر رکا ہوا ہے تو اس کے ساتھ نکلنے کی کوشش کروں۔ میں ان کی بات سمجھ گیا تھا۔

میں ایک چارپائی پر لیٹا تھا۔ گرمی کا احساس تھوڑا بڑھ گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ سیدھے ندیم ڈانڈیا سے رابطہ کروں۔ میں نے اس کا نمبر اپنے میل اکاؤنٹ میں محفوظ کر لیا تھا جہاں پہلے سے بہت سارے نمبر درج تھے۔ میں نے اس کا نمبر دیکھنا شروع کر دیا۔ ان میں مانسی کا نمبر بھی تھا۔ اس وقت مجھے شدت سے مانسی یاد آ گئی۔ وہ سانولی سی پتلی سی نازک سی حسینہ۔ آخری ملاقات میں اس نے ندیم ڈانڈیا سے چھپا کر اپنا نمبر میری جیب میں رکھا تھا جو میں نے محفوظ کر لیا تھا۔ میں نے سوچا، کیوں نا مانسی ہی سے ندیم ڈانڈیا کے بارے میں معلومات لے لی جائیں۔

مجھے یہ ڈر نہیں تھا کہ تیمور کے دیے ہوئے اس فون سے میری لوکیشن کا پتا چل جائے گا، بس دل یونہی دھڑکا تھا کہ کہیں وہ نمبر بند نہ ہو یا کسی دوسرے کے پاس نہ ہو۔ میں نمبر پش کر چکا تھا۔ تھوڑی سی دیر کے بعد کال ریسیو کر لی گئی۔ دوسری طرف سے دھیمی سی نسوانی آواز ابھری تب میں نے پوچھا۔

”مانسی بات کر رہی ہو؟“

”تم...... علی زین...... کہاں ہو؟“ مانسی نے میری آواز سنتے ہی ہذیانی انداز میں کہا تو بہت عرصے بعد اپنا اصلی نام سن کر مجھے یک گونہ سکون محسوس ہوا۔ اس سے یہ تصدیق بھی ہو گئی کہ وہ اب تک مجھے یاد رکھے ہوئے ہے۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ میں اسے کتنی شدت سے یاد تھا۔ میں خیالوں میں گم تھا کہ اس کی آواز ابھری ”تم خاموش کیوں ہو بولتے کیوں نہیں......؟“

”ہاں ہاں، میں بات کر رہا ہوں، کہاں ہو تم؟“

”میں بہت مشکل میں ہوں۔ اس وقت میں اسپتال میں پڑی ہوں۔“ اس نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

”کیوں کیا ہوا تمہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”یوں پوچھنے کا فائدہ، شاید میری قسمت ہی ایسی ہے۔“ اس نے روہانسا انداز میں کہا تو میں نے اسے پچکارتے ہوئے پوچھا۔

”بولو، بتاؤ مجھے، تمہیں ہوا کیا ہے۔ مجھے بتاؤ میں تمہارے کیسے کام آ سکتا ہوں، جلدی بولو۔“

”میرے پاس علاج تک کے پیسے نہیں ہیں، مجھ پر اس ندیم ڈانڈیا نے بہت ظلم کیا، اس نے میرا بازو توڑ دیا۔ بس ایک بار میں نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا، وہ شراب کے نشے میں تھا، اس نے بہت مارا مجھے اور اب......“ وہ کہتے ہوئے رو دی تو مجھے بہت دکھ ہوا۔

”اچھا، تم فکر نہ کرو، مجھے بتاؤ، تم کس اسپتال میں ہو؟“ میں نے پوچھا تو وہ مجھے بتانے لگی، پھر میں نے پوچھا۔ ”کیا ڈانڈیا کا وہی نمبر ہے جو اس کے پاس تھا؟“

”ہاں وہی ہے۔“ اس نے کہا۔

”کیا وہ یہیں ہے تمہارے پاس؟“ میں نے پوچھا۔

”نن...... نہیں تو......“ اس نے تیزی سے جواب دیا۔

”کیا اس نے تمہارا پتا نہیں کیا، وہ تمہارا خیال نہیں رکھتا، وہ یہاں اسی شہر میں بھی ہے یا کہیں دفان ہو گیا

ہے؟'' میں نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے تو وہ چند لمحوں بعد یوں بولی جیسے سوچ کر بات کر رہی ہو۔

''وہ یہیں کہیں ہے، میرے پاس نہیں آتا۔ ناراض ہے نا مجھ سے۔''

''اوکے، میں ایک دن بعد تم تک پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے اسے کہا۔

''ایک دن، مطلب تم یہاں نہیں ہو شہر میں؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔

''نہیں، میں اس وقت اودھے پور میں ہوں، یہاں پھنسا ہوا ہوں، شاید آج شام تک یہاں سے نکلوں۔'' میں نے کہا۔

''وہاں کہاں پھنسے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ایک شخص کے پاس ہوں، اس نے وعدہ کیا ہے کہ آج رات مجھے کسی ٹرین یا گاڑی میں بٹھا دے گا۔ بس میرے وہاں سے نکلنے کی دیر ہے، میں سیدھا تم تک پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے یونہی بات بنا دی۔ کیونکہ ہم نے بھی سیدھی بات نہیں کرنی ہوتی۔

''کیا تمہارے پاس اتنے پیسے ہیں کہ مجھے علاج کے لیے کچھ دے سکو؟'' اس نے حسرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ارے مانسی، کیا بات کرتی ہو۔ میں خود تمہارا علاج کرواؤں گا، اس کے لیے مجھے چاہیے دِلی جانا پڑے، تم فکر نہ کرو، میں کل صبح تک تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے ایک بار پھر اس سے اسپتال کا پوچھ لیا۔ اس نے مجھے بتایا تو میں نے اسے ذہن نشین کر لیا۔ اس بار جب اس نے اسپتال کا نام بتایا تو مجھے لگا جیسے پہلے اس نے کوئی اور اسپتال بتایا تھا۔ اگرچہ میں شہر سے واقف نہیں تھا لیکن بتائے ہوئے نام بھول جاؤں، ایسا ہوا نہیں تھا۔ میرا ذہن مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ اس وقت میں مانسی سے بات کر ہی رہا تھا کہ وہ مقامی آ گیا۔ میں نے اس سے پھر بات کرنے کا کہا اور کال بند کر دی۔

مقامی میرے کال ختم کرنے کے انتظار میں تھا۔ اس نے بتایا کہ میرے رہنے کے لیے ایک اچھا ٹھکانا بنا دیا گیا ہے۔ شاید چند دن مجھے وہی رہنا پڑے۔ میں اٹھا اور اسے لیپ ٹاپ ضائع کر دینے کی تاکید کر دی۔ ہم اس نئی آبادی سے نکل کر موہن گڑھ روڈ پر آئے تو شہر کا موسم بہت خوشگوار تھا۔

میرا دماغ اُلجھا ہوا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ مانسی نے مجھ سے سچ بولا تھا یا جھوٹ؟ اگر اس نے جھوٹ بولا تھا تو کیوں بولا؟ اس نے ندیم ڈانڈیا کے بارے میں بھی کوئی واضح بات نہیں بتائی تھی۔ تبھی میں نے سوچا، کیوں نا مانسی کے بارے میں یقین کر لیا جائے۔ اگر وہ واقعی... اسپتال میں ہے تو وہ سچ بول رہی تھی اور اگر اس وقت اسپتال میں نہیں ہے تو پھر جھوٹ۔ یہ جھوٹ سچ کا اندازہ کر لینے کے بعد پھر سوچا جائے گا کہ کیا ہوتا ہے؟

میں نے گاڑی چلاتے ہوئے مقامی سے کہا کہ وہ اسپتال چلے۔ اس نے میری بات مان لی اور اس طرف جانے لگا، میں نے راستے میں اسے سمجھایا کہ کیا کرنا ہے۔ اس نے کار اسپتال کی پارکنگ میں روک دی۔ وہ ایک نجی اسپتال تھا۔ میں بھی کار سے اترا اور ایک طرف لان میں جا بیٹھا۔ کھڑی کار میں بیٹھے ہوئے بندے کو ہر کوئی دیکھتا ہے۔ مقامی کو اچھی طرح دیکھنے اور مانسی کو تلاش کرنے میں تھوڑا بہت تو وقت لگنا تھا۔ میں ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں سے لوگوں کو آتا جاتا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد وہ مقامی واپس آ گیا۔ اس نے واپس آ کر میرے خیال کی تصدیق کر دی۔ مانسی وہاں پر نہیں تھی۔ کوئی بھی نوجوان عورت ہڈی وارڈ میں نہیں تھی جس کا بازو ٹوٹا ہوا ہو۔ اس نے ایک ویڈیو بھی بنا لی تھی۔ میں نے وہ ویڈیو دیکھی اور پھر پوچھا۔

''کیا تم نے اِدھر اُدھر بھی دیکھا؟''

''میں نے ایکس رے روم تک نہیں چھوڑا۔ میں وارڈ میں بیٹھا رہا ہوں، کوئی بیڈ خالی نہیں تھا، خالی ہوتا تو......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''اوکے....'' میں نے کہا اور سیل فون نکال کر مانسی کو فون کیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کال ریسیو کر لی۔ تبھی میں نے کہا۔

''دیکھو، وہاں میرا ایک دوست رہتا ہے، میں نے اس سے بات کی ہے۔ اسے کہا ہے کہ تمہیں تھوڑی رقم دے آئے۔''

''وہ کب آئے گا؟'' اس نے مری ہوئی آواز میں پوچھا۔

''یہی کوئی آدھے گھنٹے میں تم تک پہنچ جائے گا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اس سے اسپتال کے نام کی دوبارہ تصدیق کر لی۔ اس نے بتایا تو میں نے پھر پوچھا۔ ''کس وارڈ میں ہو کون سا کمرا ہے؟''

''وہ مجھے کہاں تلاش کرے گا، جب آئے تو میں

اسے مل لوں گی۔‘‘

’’چلو ٹھیک ہے، وہ آدھے گھنٹے میں پہنچ جائے گا۔‘‘ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اب مجھے اس کی فکر نہیں تھی۔ میرے دل میں جو ہمدردی جاگی تھی، وہ بالکل ختم ہو گئی تھی۔ میرے ذہن میں یہی سوال تھا کہ وہ مجھے ٹریپ کیوں کرنا چاہ رہی ہے؟ کیوں جھوٹ بولا ہے اُس نے؟ آدھے گھنٹے بعد سب واضح ہو جانے والا تھا۔ میں نے اس مقامی کو بھی اپنے ساتھ بٹھا لیا۔

تقریباً بیس منٹ گزرے ہوں گے۔ ایک کار تیزی سے پارکنگ میں آرکی۔ اس میں سے پہلے ندیم ڈانڈیا نکلا، پھر دوسری جانب سے مانسی برآمد ہوئی۔ وہ دونوں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اسپتال کے اندر چلے گئے۔ میں نے مقامی کو ان کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ ان کے پیچھے چلا گیا۔ میں سلگتے ہوئے دماغ کے ساتھ وہیں بیٹھا رہا۔ مجھے کوئی سرا سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ مجھ سے جھوٹ کیوں بول رہی تھی.... اگر مانسی اکیلی آتی تو شاید میں سمجھتا کہ وہ کس وجہ سے مجھے ٹریپ کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ تو ندیم ڈانڈیا بھی تھا۔ ضرور کچھ ایسا ہے جو کم از کم میرے حق میں بہتر نہیں ہے۔ انہی لمحات میں عرفان حمید کا فون آگیا۔ میرے ہیلو کہنے پر اس نے پوچھا۔

’’او یار کہاں رہ گئے ہو تم لوگ......؟‘‘

’’بس یار، ایک اچانک افتاد میں پھنس گیا ہوں؟‘‘ میں نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا تو اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

’’خیر تو ہے نا، ہماری ضرورت ہے تو بتاؤ؟‘‘

’’یار مجھے سمجھ میں نہیں آرہا، اگر تم لوگوں کا باہر نکلنا رسک نہیں ہے تو آجاؤ؟‘‘ میں نے کہا۔

’’رسک ہو نہ ہو، اگر تمہیں مدد چاہیے تو بتاؤ۔‘‘ اس نے پوچھا۔

’’آجاؤ، کسی مقامی کو ساتھ ضرور لے لینا۔‘‘ میں نے کہا اور اسپتال کا بتا کر فون بند کر دیا۔ وہ کسی بھی مقامی کے ذریعے وہاں تک پندرہ بیس منٹ میں پہنچ سکتا تھا۔ میں باہر ٹہلتے ہوئے انتظار کرنے لگا۔

کافی دیر بعد مجھے اندر سے مقامی نے فون کیا۔

’’ہاں بولو کیا بات ہے؟‘‘ میں نے تیزی سے پوچھا۔

’’اس عورت کو کچھ بھی نہیں ہوا، یہاں آدمی نے کسی سے بات کی ہے اور اس کے پٹی کروا رہا ہے۔ میں انہیں دیکھ رہا ہوں۔‘‘

’’چلو واپس آجاؤ۔‘‘ میں نے کہا تو اس نے فون بند کر دیا۔

مجھے اس سارے معاملے کا ماسٹر ندیم ڈانڈیا ہی لگ رہا تھا۔ مجھے یاد پڑ رہا تھا کہ اس نے مجھے کانتی سے بھی متعارف کروایا تھا جس نے ریتا اور رشتا کو اغوا کیا تھا۔ بعد میں وہ بھی کچھ اور ہی نکلی تھی۔ میرے خیال میں وہ مانسی کو استعمال کر کے کوئی کھیل کھیلنا چاہ رہا تھا۔ میں جس قدر بھی اس کے بارے میں سوچتا، مجھے اس کا کردار مشکوک دکھائی دینے لگتا تھا۔

آدھے گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔ عرفان حمید اسپتال کے باہر آگیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک ساتھی اور ایک مقامی تھا۔ وہ ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں سے وہ مجھے دیکھ سکتا تھا۔ اس نے فون پر ہی مجھ سے ساری رُوداد سن لی تھی۔ تبھی اس نے کہا۔

’’میں یہیں ہوں، تم فکر نہ کرو، میں تمہارے کور پر ہوں۔‘‘

عرفان حمید کے کور پر ہونے کی وجہ سے میں مطمئن ہو گیا تھا۔ شاید اس سے پہلے وہ کچھ نہ سوچا جو اس کے آنے سے میں سوچنے لگ گیا تھا۔ شاید پہلے میں انہیں چھیڑے بغیر ویسے ہی واپس چلا جاتا۔ لیکن اب میں نے ندیم ڈانڈیا ہی کو اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے چاہا کہ سارا الجھن ہی دور کر لوں۔ میں اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ مانسی کا فون آگیا۔

’’وہ تمہارا دوست ابھی تک پہنچا نہیں اسپتال؟‘‘ اس نے کہا۔

’’وہ تو تمہیں تلاش کر رہا ہے لیکن تم کہاں ہو؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’میں اپنے وارڈ سے باہر ہوں جہاں کافی سارے مریض بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں انہی کے پاس ہوں۔‘‘ و بولی۔

’’ٹھیک ہے وہ تم تک پہنچ جاتا ہے۔‘‘ میں نے کہا او فون بند کر دیا۔ میں نے مقامی کو آگے کر دیا اور خود پیچھے ہ گیا۔ مقامی داخلی دروازے سے اندر چلا گیا۔ ندیم ڈانڈیا اس سے تھوڑے فاصلے پر کھڑا تھا۔ مقامی نے جا کر ادھ اُدھر دیکھا اور پھر مانسی کی جانب بڑھ گیا۔ ندیم ڈانڈیا ک پوری توجہ اس پر تھی۔ مقامی جیب سے رقم نکال رہا تھا۔ میر ان لمحات میں ان کے ارد گرد کسی کو دیکھتا رہا کہ ان کے کو پر تو کوئی نہیں ہے۔ مجھے کوئی خاص بندہ دکھائی نہیں دیا۔ مق... نے مانسی کو رقم دی اور واپس پلٹ گیا۔ میں وہاں سے ہ

اور پارکنگ میں آگیا۔ میرے پیچھے ہی مقامی پہنچ گیا تھا۔
میں نے عرفان حمید کو کال کر دی اور اسے بتا دیا۔ وہ اپنی فور وھیل لے کر پارکنگ میں آگئے۔ وہ میرے نزدیک ہو گئے تھے۔
''تم..... اپنی کار نکال کر سیدھی کرلو، فور وھیل میں مہمان لے جائیں گے۔'' میں نے مقامی سے کہا تو وہ سمجھ گیا۔ ہم نے عرفان کے ساتھ سب طے کرلیا تھا کہ کس نے کس گاڑی میں جانا ہے۔
کچھ دیر بعد مانسی اور ندیم ڈانڈیا تیزی سے باہر نکلتے آرہے تھے۔ ندیم نے فون کان سے لگایا ہوا تھا۔ پارکنگ میں آکر اس نے فون کان سے ہٹایا اور اپنی کار کی جانب بڑھا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اس کی کمر پر پسٹل کی نال رکھ دی۔ وہ تڑپ کر مڑا تو مجھے دیکھ کر سہم گیا۔
''چلو اس سامنے والی فور وھیل میں.....'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔
اس وقت تک میرے ساتھی نے مانسی کے بھی پسٹل رکھ دیا تھا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ سیدھی فور وھیل میں جا بیٹھی۔ ندیم ڈانڈیا نے تھوڑا کسمسانے کی کوشش کی تو میں نے پسٹل کا دباؤ بڑھاتے ہوئے سختی سے کہا۔
''یہیں پر مرنا ہے تمہیں؟''
میری آواز سنتے ہی اس نے مزاحمت نہیں کی، وہ بھی فور وھیل میں جا بیٹھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی فور وھیل زن سے نکل پڑی۔

☆☆☆

وہ ایک حویلی نما عمارت تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اپنے شوق میں پرانی طرز پر وہ عمارت بنوائی ہو۔ ممکن ہے یہ کسی نے ہوٹل بنانے کا سوچا ہو اور پھر اس نے اسے ویسے ہی چھوڑ دیا ہو۔ مجھے اس کی بناوٹ کچھ ایسی ہی لگی تھی۔ اس میں کافی سارے کمرے تھے۔ اوپر کی منزل کے لیے لاؤنج ہی سے سیڑھیاں چڑھتی تھیں۔ ہم ان دونوں کو لے کر اوپر پہنچ گئے۔ ایک کمرا کافی حد تک صاف تھا۔ اس میں ایک بیڈ بھی پڑا ہوا تھا۔ میں اور عرفان ان دونوں کو..... وہاں لے گئے۔ میں نے مانسی کی طرف دیکھا وہ کافی خوف زدہ تھی۔ میں نے چند لمحے سوچا اور عرفان سے کہا۔
''اس لڑکی کو دوسرے کمرے میں لے جا، اس سے بعد میں بات کرتا ہوں، پہلے اس سے باتیں ہو جائیں۔''
''میرے یوں کہنے پر مانسی نے میری طرف یوں بے چارگی سے دیکھا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔ میں نے اس کی کیفیت کو نظر انداز کر دیا۔ عرفان اسے لے کر باہر نکل گیا۔ تب میں نے ندیم ڈانڈیا کی طرف دیکھا اور بڑے سکون سے کہا۔
''تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟''
''ہاں میں جانتا ہوں۔'' اس کے لہجے میں کافی حد تک گرمی تھی۔
''اور تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ مجھ سے جھوٹ بولو گے تو تمہارے ساتھ کیا ہو سکتا ہے؟'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔
''زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ تم مجھے قتل کر دو گے لیکن یہ یاد رکھنا علی زین، میرے قتل کے بعد تم بالکل بھی نہیں بچ پاؤ گے۔''
''میری چھوڑو، تم اپنی کہو.....'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو طنزیہ انداز میں بولا۔
''تم اپنی ہیرو گیری میں بہت بڑی غلطی کر چکے ہو، تم کیا سمجھتے ہو مجھے اغوا کرلو گے تو میں تمہارے سامنے فر فر سبق پڑھنا شروع کر دوں گا، تم ایسا کرو، مجھے مارو پیٹو، مجھ پر تشدد کرو۔ اگر ہمت ہے تو مجھ سے کوئی بھی بات اگلوا لو۔''
''نہیں میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا لیکن تم خود بولو گے۔'' میں نے سرد سے لہجے میں کہا۔
''نہ علی زین نہ..... ممکن ہے تم نے بہت کچھ کیا ہو، تم نے بڑی کامیابیاں بھی دیکھی ہوں لیکن مجھے اغوا کرنے کی تم غلطی کر چکے ہو۔'' اس نے پھر کہا تو مجھے ایک دم سے غصہ آگیا۔ میں اس کی جانب بڑھا اور بڑے سکون سے بولا۔
''کہو میں نے کیا غلطی کرلی؟''
''ابھی کچھ دیر بعد پتا چل جائے گا، دور کا پتا کھیلا ہے میں نے۔ جب تک تمہیں سمجھ آئے گا، تم اس دنیا میں بھی نہیں ہو گے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میرے اندر کی کیفیت بدلنے لگی۔ میں نے بہت سارے لوگوں کو بلوایا تھا لیکن یہ ندیم ڈانڈیا مجھے ذرا بھی پکڑائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور اس سے پوچھا۔
''تم کیا چاہتے ہو؟''
''کچھ بھی نہیں، بس مجھ پر تشدد کرو، مجھ سے کچھ معلومات اگلوانے کی کوشش کرو، وہ بھی ناکام کوشش.....'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا تو مجھے سمجھ آگئی۔ وہ مجھے غصہ دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ بڑے سے بڑا بہادر بھی موت کو سامنے دیکھ کر یوں بات نہیں کرتا، جب تک اسے کسی طرف سے کوئی اعتماد حاصل نہ ہو۔ ضرور اس کے

پیچھے کوئی نہ کوئی سہارا ضرور ہے۔ یا شاید وہ مجھے سمجھتے ہوئے میرے ساتھ ہی کھیل رہا تھا۔

”تم نے مانسی کو چارا بنا کر اچھا نہیں کیا۔ مجھے لگتا ہے تم کہیں نہ کہیں مجھے دھوکا دینے کی کوشش میں ہو۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اگر تم تشدد ہی سہنا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔“ میں نے کہا اور باہر نکل گیا۔ میں ابھی باہر ہی نکلا تھا کہ عرفان آتا ہوا دکھائی دیا، اس کے چہرے پر پریشانی بکھری ہوئی تھی، اس نے جلدی سے میرے قریب آ کر کہا۔

”جلدی جاؤ اور اس لڑکی کی بات سنو۔“

”خیر ہے، کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”تم جاؤ جلدی ...... میں اِسے دیکھتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”اسے صرف دیکھنا نہیں، اس کے تھوڑے پیچ بھی کسنے ہیں، مرتا ہے تو مر جائے، ساتھ کسی کو لے لو۔“ میں نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

میں اس کمرے میں پہنچا تو فرش پر بیٹھی ہوئی مانسی تیزی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے اپنے سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”علی زین، جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ۔ تم گھیرے میں آ چکے ہو۔“

”میں کس طرح مان لوں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ وقت ایسا نہیں ہے۔ تم میری بات مانو، ہمیں چاہے قتل کر کے یہاں سے نکل جاؤ مگر جلدی نکل جاؤ۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”تم اگر مجھے کچھ بتاؤ گی تو میں نکلوں گا۔“ میں نے سکون سے کہا۔

”دیکھو، یہ جو ندیم ڈانڈیا ہے، یہ اس وقت کسی بہت بڑے گیم میں ہے۔ یہ کئی دن سے تمہیں تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے کسی نے بہت بڑی آفر کی ہے۔ یہ دو دن سے اس بندے سے مل رہا تھا جس کا رابطہ تمہارے دیش میں کسی بڑے کے ساتھ ہے۔ یہ تمہیں ہر حال میں پکڑوانا چاہتا ہے۔“

”پھر تم اس کا ساتھ کیوں دے رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”تین دن سے اس نے مجھے اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے، اس نے پتا نہیں مجھے کیا کیا سمجھایا ہے۔ یہ جانتا تھا کہ تم مجھے کال کرو گے۔“ اس نے تیزی سے کہا تو مجھے کچھ کچھ کھیل سمجھ میں آنے لگا تب میں نے پوچھا۔

”کیا یہ کل سے مجھے تلاش کرنے میں تیز ہوا ... پرسوں سے؟“

”کل سے ...... یہ یہاں کی فورسز سے بھی رابطے ... ہے۔ انہیں شک ہے کہ تم کل سے اس شہر میں ہو۔ آج اس نے تمہاری تصویریں انہیں دی ہیں، تاکہ وہ تمہیں ... بھر میں تلاش کر کے پکڑ سکیں۔“ اس نے خوف زدہ لہجے ... کہا تو میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

”کیا یہ تصویریں تمہارے سامنے دی ہیں؟“

”ہاں، کہا نا تین دن سے......“

لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ میرا فون بج اٹھا۔ اس ... نمبر کافی حد تک اجنبی تھے۔ میں نے کال ریسیو کی تو دو... طرف سے ایک نسوانی آواز نے بڑی ترنگ میں ہیلو کہا۔ میرے لیے اجنبی آواز تھی۔

”کون بات کر رہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ارے اتنی جلدی مجھے بھول گئے، ابھی اتنا سمے تو ... ہوا جب تم میرے سامنے کھڑے مجھ سے تنہائی میں و... مانگ رہے تھے۔ میں نے تمہیں وقت دے بھی دیا تھا ... تم ہی وقت نہ لے سکے۔“

”سیدھی طرح بات کرو، کون ہو تم......“ میں نے ... لہجے میں کہا۔

”ارے ظالم، میں وہی ہوں جسے تم نے زندگی د... میں دے کر بڑا ظلم کیا، میں مرجاتی تو آج تمہیں گھیرنے ... تو نہ آ رہی ہوتی۔“ اس نے کہا تو مجھے شک پڑ گیا پھر بھی ... نے پوچھا۔

”کون ہو تم......؟“

”اپنی پوجا کو بھول گئے۔ ارے ہم تو آج تک تمہ... نہیں بھولے۔“ اس نے ایک سسکاری لیتے ہوئے کہا۔

”اوہ پوجا، کیا چاہتی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہاری جان لینا چاہتی ہوں۔ بس تھوڑی... دیر... پہنچ رہی ہوں تمہارے پاس......“ اس نے کہا اور فون بن... دیا۔ میں ایک دم سناٹے میں آ گیا۔ ندیم ڈانڈیا اپنا وا... گیا تھا۔ تیمور کے دیے ہوئے اس خاص نمبر پر پوجا کا فو... آ جانا ہی اس خطرے کی علامت تھی کہ جو کچھ پوجا کہہ ر... تھی، وہ سچ کہہ رہی تھی۔ بلاشبہ انہوں نے مجھے گھیر لیا تھا...

حالات کی تندو تیز آندھیوں کی زد می... آجانے والے نوجوان کی سنسنی خی... داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ پڑھیے

جال

جمال دستی

بظاہر بے لوث اور کھرے نظر آنے والے اندر سے کیا اصل حقیقت رکھتے ہیں... اس کا انکشاف بہ دیر ہو ہی جاتا ہے... بھائی کی ناگہانی موت نے اسے صدمے سے دوچار کر دیا تھا... ذہنی انتشار کی وجہ سے وہ مسلسل تذبذب کا شکار تھا... وہ چاہتا تھا کہ اس حقیقت تک پہنچ جائے کہ بھائی کی موت میں کس کس کا ہاتھ ہے...

گھٹن زدہ ماحول میں چھپی خون

آشنا جرتوں اور مجرموں کی روداد

ولی کوستا اپنے مقامی اسٹور میں کھڑا گڑیوں سے بھرے ریک کی طرف دیکھ رہا تھا جن کی نیلی آنکھوں میں حیرت انگیز کشش تھی۔ اس ہفتے اس کی پانچ سالہ بھتیجی کی سالگرہ تھی جو اس کے بھائی ٹومی کی سب سے چھوٹی اولاد تھی۔ کوستا اسے بہت چاہتا تھا۔ وہ اتنی پیاری تھی کہ ہر کوئی اس میں کشش محسوس کرتا اور کوستا کا تو وہ اپنا خون تھا۔ وہ اُسے کوئی منفرد اور قیمتی تحفہ دینا چاہ رہا تھا لیکن اس کی بھابی کونی کا کہنا تھا کہ باربی ڈول ہی ٹھیک رہے گی۔ کوستا کو بچوں کے لیے کھلونے خریدنے کا کوئی خاص تجربہ نہیں تھا۔ اس معاملے میں وہی اس کی رہنمائی کرتی تھی لیکن وہ صرف ایک گڑیا نہیں خرید سکتا تھا۔ صوفیہ کی سات سالہ بڑی بہن وکٹوریہ ناراض ہو جاتی اگر انکل ولی اس کے لیے بھی گڑیا نہ

خریدتا۔ ہر سالگرہ ان دونوں کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہوتی۔ اس چھوٹی سی عمر میں بھی وہ جانتی تھی کہ چچا کو کس طرح قابو کیا جاتا ہے۔

کوئی کومختصر اسکرٹ میں ملبوس یا بہت زیادہ سیکسی باربی پسند نہیں تھیں۔ لہٰذا کوستا نے دو ایسی گڑیاں خریدیں جنہوں نے پورا لباس پہنا ہوا تھا۔ ایک کے سنہرے بال سیدھے شانوں تک آرہے تھے جبکہ دوسری کے بالوں میں پونی بندھی ہوئی تھی۔ وہ پارکنگ لاٹ میں کھڑی کار کی طرف جارہا تھا جب اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے اسکرین پر دیکھا، وہ کوئی اجنبی نمبر تھا۔

''کوستا انویسٹی گیشن۔''

''کیا میں مسٹر کوستا سے مخاطب ہوں؟'' وہ ایک مردانہ جوان آواز تھی۔ وہ انگریزی میں بات کررہا تھا لیکن اس کا لہجہ کیریبین کے لوگوں جیسا تھا۔

''ہاں، میں کوستا ہی بول رہا ہوں۔''

''تم پرائیویٹ سراغ رساں ہو؟''

''بالکل۔''

''ایمل جونز نے مجھے کہا تھا کہ تمہیں فون کروں۔''

ایمل جونز کا تعلق جمیکا سے تھا۔ وہ میامی کے اوورٹاؤن ایریا میں ایک ریستوران چلا رہا تھا۔ اس علاقے میں سیاہ فام لوگوں کی اکثریت تھی۔ جب ولی، میامی پولیس کے پیٹرول ڈویژن میں کام کررہا تھا تو وہ اور اس کے ساتھی اس ریستوران میں کھانا کھانے جاتے تھے۔ وہ کوئی شاندار ریستوران نہیں تھا لیکن وہاں کا کھانا خوش ذائقہ اور سستا ہوتا تھا۔

''میں ایمل کو بہت عرصے سے جانتا ہوں۔'' کوستا نے کہا۔ ''میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں۔''

''یہ ایک نازک معاملہ ہے برادر۔'' اس شخص نے کہا۔ ''میں ٹیلی فون پر زیادہ بات کرنا نہیں چاہتا۔ کیا تم آدھا گھنٹے کے اندر ایمل کے ریستوران پر مجھ سے مل سکتے ہو؟''

ولی ایسا کرسکتا تھا لیکن پہلے اس نے اپنا یومیہ معاوضہ بتایا۔ وہ پہلے بلا معاوضہ ایک مختصر ابتدائی میٹنگ کرتا۔ اس کے بعد اس کا میٹر چلنا شروع ہوجاتا۔

''ٹھیک ہے برادر۔'' اس شخص نے کہا۔ ''میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟'' ولی نے پوچھا۔

''میرا نام نیول ہے، نیول اسپیئر۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔

☆☆☆

ولی کوستا نے لٹل ہوانا سے جہاں وہ رہتا تھا، مشرق کی طرف سفر شروع کیا اور تقریباً بیس منٹ میں اوورٹاؤن پہنچ گیا۔ اس علاقے میں کئی عشرے قبل امریکا کی جنوبی ریاستوں اور کیریبین سے سیاہ فام آکر آباد ہوئے تھے اور اب بھی یہاں کے لوگوں کے لہجے میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ علاقہ کئی برسوں تک غربت کا شکار رہا۔ اسی لیے میامی کے زیادہ تر رہائشی یہاں سے دور رہتے تھے۔ ولی پیٹرول آفیسر رہ چکا تھا۔ اس لیے اسے یہاں آنے میں کوئی وقت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ لوگوں کے ساتھ اچھی طرح پیش آتا تھا اس لیے پرائیویٹ سراغ رساں بننے کے بعد اسے کبھی کبھار یہاں آنے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی۔

ایمل کا کیفے ایک ناہموار سڑک پر تھا جس میں جگہ جگہ گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ وہاں ایک قطار سے دکانیں اور مکانات بنے ہوئے تھے جن کا زرد رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ ان کی مرمت کے ساتھ دوبارہ رنگ کرنے کی بھی ضرورت تھی۔ البتہ ایمل کا کیفے ان سے الگ تھا۔ ولی کو وہ دو بلاک دور سے ہی نظر آگیا۔ اس کی چھت سرخ ٹائلوں کی تھی اور دیواروں پر ہلکا سبز رنگ کیا گیا تھا۔ بیرونی دروازے کے باہر دونوں جانب پام کے درخت لگے ہوئے تھے۔ ایمل کو اس کاروبار سے معقول منافع ہورہا تھا۔ اس لیے وہ باقاعدگی سے عمارت پر رنگ و روغن اور اس کی دیکھ بھال پر پیسے خرچ کرتا تھا۔

ابھی لنچ ٹائم نہیں ہوا تھا اس لیے ولی نے فرنٹ ڈور کے سامنے کار کھڑی کردی۔ ایک بڑے ڈائننگ روم میں لکڑی کی میزیں اور کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے کے ہر کونے میں اسپیکر لگے ہوئے تھے جن سے موسیقی کی آواز آرہی تھی۔ ولی کے سامنے والی دیوار پر جمیکا کے موسیقار آنجہانی بوب مارلی کا بڑا سا پوسٹر لگا ہوا تھا۔ ولی نے کسی اور جمیکن ریستوران یا نائٹ کلب میں بوب کا پوسٹر نہیں دیکھا تھا۔

اس وقت ڈائننگ روم بالکل خالی تھا۔ ولی نے ایک ایسی نشست کا انتخاب کیا جس کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ میز پر رکھے ہوئے مینیو پر روسٹ چکن کی تصویر تھی اور پس منظر میں دو جھنڈے نظر آرہے تھے۔ ایک طرف

امریکی اور دوسری جانب سیاہ اور زرد رنگ والا جمیکا کا جھنڈا تھا۔ ولی جانتا تھا کہ ایمل اپنے کاروبار اور جمیکن چکن بنانے کی خفیہ ترکیب سے مخلص تھا۔ کچن سے آنے والی براؤن شوگر، پیاز، لہسن، مرچوں کی خوشبو سے اندازہ ہو گیا کہ کوئی خوش ذائقہ چیز تیار ہو رہی ہے۔

ایک خوش شکل اور نوجوان ویٹرس اس کی میز پر آئی۔ اس نے دھاری دار لہنگا اور چست لباس پہن رکھا تھا۔ ولی نے وقت گزاری کے لیے آئس ٹی کا آرڈر دے دیا۔

''کیا ایمل یہاں موجود ہے؟'' ولی نے پوچھا۔

''ابھی وہ یہاں نہیں ہے۔ تھوڑی دیر بعد آئے گا۔'' ویٹرس نے بڑے دلکش لہجے میں جواب دیا۔

چائے پینے کے دوران ولی کی نظریں دروازے پر تھیں۔ چند منٹ بعد ویٹرس دوبارہ آئی۔ ''اگر نیول اسپیئر کا انتظار کر رہے ہو تو وہ عقبی حصے میں موجود ہے۔''

ولی نے اپنا کپ اٹھایا اور اس کے ساتھ چلتا ہوا عقبی دروازے سے گزر کر کچن کے برابر ایک چھوٹے صحن میں پہنچا جو کیلے کے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ یہ ایک تنگ ڈائننگ ایریا تھا جہاں کچن ورکرز کھانا کھاتے تھے۔ اس میں ایک اونچا لکڑی کا گیٹ لگا ہوا تھا جو سڑک پر کھلتا تھا۔ اس نے وہاں ایک طویل قامت دبلے پتلے سیاہ فام کو دیکھا جس کے چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں۔ اس نے پھول دار قمیص اور جینز پہن رکھی تھی اور لمبے بال کندھوں تک لٹک رہے تھے اس نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں ہاتھ ملایا اور ولی کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں آمنے سامنے ایک میز پر بیٹھ گئے۔

''یہ جگہ مناسب ہے۔'' نیول اسپیئر نے کہا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ کوئی ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھے۔''

ویٹریس نے اس سے آرڈر لیا اور ایک منٹ بعد ہی وہ بیئر کا گلاس پکڑے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے بکرے کا سالن بھی منگوایا جو اس ریستوران کی خاص ڈش تھی۔

''کسی شخص نے تمہیں میرے بارے میں کچھ بتایا؟'' اس نے پوچھا۔

ولی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، کیونکہ میں نے کسی سے کچھ پوچھا ہی نہیں۔ ویسے وہ مجھے کیا بتاتے؟''

اس نے لمحہ بھر سوچا پھر آگے کی طرف جھکتے ہوئے نیچی آواز میں کہا۔ ''وہ تمہیں یہی بتائیں گے کہ میرا تعلق رین پوس سے ہے۔''

ولی چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے رک گیا۔ امریکا میں پوس، کے نام سے قانون پسند شہریوں کا گروپ مفرور مجرموں کا پیچھا کرنے پر مامور تھا لیکن جمیکا میں اس کے معنی مختلف تھے اور درحقیقت یہ جرائم پیشہ افراد کا گروہ تھا جو خاص طور پر منشیات کی اسمگلنگ اور اسلحے کی غیر قانونی تجارت کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا۔ یہ ادارہ چھوٹے بڑے کئی گروہوں پر مشتمل تھا جن میں سے کچھ کی شاخیں میامی میں بھی تھیں۔ ان میں سب سے بڑی اور خطرناک تنظیم رین پوس تھی۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اسے اس نام سے کیوں پکارا جاتا ہے۔

ولی اب نیول کو مختلف انداز سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اس لڑکے نے اپنی پھول دار قمیص کے نیچے کوئی گن تو نہیں چھپا رکھی۔ اس گروہ کے زیادہ تر ارکان ہمیشہ مسلح رہتے تھے تاکہ دوسرے گروہوں سے لڑنے کے لیے تیار رہیں لیکن اس لڑکے کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے ولی کو حیران کر دیا۔

''لوگ تمہارے بارے میں جو کہتے ہیں، کیا وہ سچ ہے؟ کیا تم رین پوس، کے رکن ہو؟''

نیول اسپیئر نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''میں ہوں...... اور نہیں بھی۔''

''اس کا کیا مطلب ہوا؟''

نیول نے مزید آگے جھکتے ہوئے کہا۔ ''دو سال قبل میرے سوتیلے بھائی میلکم جونز کو رین پوس کے ایک رکن نے گولی ماردی۔ ان کے درمیان کسی لڑکی کے حوالے سے تنازع چل رہا تھا۔ میرا بھائی مجھ سے بڑا تھا۔ وہ یہیں میامی میں رہتا تھا اور یہیں مر گیا۔ ان دنوں میں اپنی ماما کے ساتھ جمیکا کے شہر پورٹ انٹونیو میں رہ رہا تھا جو دارالحکومت کنگسٹن سے سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔''

ولی نے تائید میں سر ہلایا۔ وہ اپنی سابقہ بیوی کے ساتھ جمیکا میں چھٹیاں گزار چکا تھا۔ اس لیے اسے وہاں کے شہروں کے بارے میں واقفیت تھی۔ نیول نے بیئر کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''میری ماما کو جب میلکم کی موت کا پتا چلا تو وہ بہت روئی گو کہ وہ میرا سوتیلا بھائی تھا لیکن مجھے اس سے بہت محبت تھی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ کس نے اسے قتل کیا۔ پورٹ انٹونیو میں جمیکن کانسٹیبلری فورس کا ایک سراغ رساں

ریمنڈ نولیز میرے خاندان کو جانتا تھا۔ وہ میرے پاس آیا اور مجھ سے پوچھا۔ ’کیا تم اپنے بھائی کا بدلہ لینا چاہتے ہو۔‘ میں نے کہا۔ ’بالکل، میں بدلہ لوں گا۔‘‘

’’اس نے تمہیں کیا طریقہ بتایا؟‘‘ ولی نے پوچھا۔

’’اس نے مجھ سے کہا۔ ’’کنگسٹن میں لوگ نہیں جانتے کہ میلکم تمہارا بھائی تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم خفیہ طور پر رین پوس میں شامل ہو جاؤ اور معلوم کرو کہ کس نے تمہارے بھائی کو قتل کیا اور وہ اس کے علاوہ کتنے لوگوں کو مار چکا ہے پھر ہم ان سب لوگوں کو جیل میں بند کر دیں گے اور اس طرح تمہاری ماں کے آنسو تھم سکتے ہیں۔‘‘

’’اور اس نے تمہیں تنظیم میں داخل ہونے کا کیا طریقہ بتایا؟‘‘

’’اس نے مجھ سے کہا کہ وہ لوگ ہمیشہ نئے کاروبار کی تلاش میں رہتے ہیں۔ پورٹ انٹونیو میں تمام جزیروں کے علاوہ وینزویلا اور کولمبیا سے بھی کشتیاں آتی ہیں اور بعض اوقات ان میں کوکین اور ہیروئن بھی آتی ہے۔ میں پورٹ انٹونیو میں پوس کے لوگوں کے پاس جا کر انہیں بتاؤں کہ کشتیوں سے میرا مال آرہا ہے اور میں ان کے ساتھ کاروبار کرنا چاہتا ہوں پھر اس نے انہیں دکھانے کے لیے منشیات دیں تاکہ انہیں یقین ہو جائے کہ میرے پاس مال ہے اس طرح میں پوس، میں شامل ہو سکتا ہوں۔‘‘

’’کیا یہ ترکیب کامیاب رہی؟‘‘

نیول نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’بالکل، انہوں نے مجھے پوس میں شامل ہی نہیں کیا بلکہ کچھ عرصے بعد میں نے مزید منشیات سپلائی کیں تو وہ مجھے اپنے بڑوں سے ملوانے کنگسٹن لے گئے۔‘‘

اسی وقت ویٹریس اس کے لیے بکرے کا سالن لے کر آگئی۔ اس کی خوشبو بہت اچھی تھی لیکن اس نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔

’’ان بڑوں نے میرے سامنے شیخی بگھاری اور اپنے ان تمام جرائم کے بارے میں بتایا جو وہ کر چکے تھے یا کرنے والے تھے۔‘‘

’’اور میں سمجھتا ہوں کہ تم نے اس سراغ رساں نولیز کو سب بتا دیا ہوگا۔‘‘

’’ہاں، اور تم جانتے ہو کہ پھر کیا ہوا؟‘‘

’’مجھے بتاؤ۔‘‘

’’کچھ نہیں، کم از کم اُن کے ساتھ کچھ نہیں ہوا بلکہ مجھے بھگتنا پڑ گیا۔‘‘

’’تمہارے ساتھ کیا ہوا؟‘‘

’’نولیز نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔ اس نے انہیں بتا دیا کہ میں پولیس کا مخبر ہوں اور اس کے عوض ان سے بھاری رقم وصول کر لی۔‘‘

اس نے بیئر کا بڑا گھونٹ لیا اور بوتل میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ’’یہ اس کا شروع سے ہی منصوبہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ اس نے میرے سامنے چارا ڈالا اور باور کرایا کہ اس طرح میں اپنا مقصد حاصل کر سکتا ہوں۔ میں اس کی باتوں میں آگیا اور اس نے مجھے گروہ میں جانے کا راستہ بتایا۔ میں ان لوگوں میں گھل مل گیا اور ان کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر کے اسے سب کچھ بتا دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنے وعدے کے مطابق ان پر ہاتھ ڈالے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کے بجائے اس نے انہیں میرے بارے میں بتا کر اس کی قیمت وصول کر لی اور رین پوس کو میرے پیچھے لگا دیا۔‘‘

ولی نے کہا۔ ’’گویا اس نے تمہیں استعمال کیا۔ انہیں پکڑنے کے لیے نہیں بلکہ ان کے بارے میں ثبوت حاصل کرنے کے لیے اور اپنا مقصد حاصل ہونے کے بعد اس نے انہیں تمہاری حقیقت بتا دی تاکہ اس کے عوض وہ ان سے بھاری رقم وصول کر سکے۔‘‘

’’ہاں، بالکل ایسا ہی ہوا۔‘‘

منشیات میں بہت پیسا ہے۔ اس نے صرف امریکا میں ہی نہیں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی پولیس والوں کو رشوت خور بنا دیا ہے۔ ولی کو معلوم تھا کہ جمیکا کا نظام انصاف اپنے ایجنٹوں کو بھاری معاوضہ نہیں دے سکتا۔ اسی لیے وہ ناجائز آمدنی کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔

’’پھر تم یہاں تک کیسے پہنچے؟ انہوں نے تمہیں جمیکا میں ہی کیوں نہ مار دیا؟‘‘

لڑکے کے چہرے پر ایک شرمیلی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

’’کیونکہ ایک لڑکی مجھے پسند کرتی تھی اس کا رین پوس، سے قریبی تعلق تھا۔ تھریسا کو معلوم ہو گیا کہ وہ میرا پیچھا کر رہے ہیں اور اس نے مجھے بتا دیا۔ میں پورٹ انٹونیو میں ایک ایسے شخص کو جانتا تھا جس کے پاس ایک چھوٹا جہاز ہے۔ میں نے اسے منہ مانگا معاوضہ دیا اور یہاں آگیا۔‘‘

’’پھر اب کیا مسئلہ ہے؟ تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟‘‘

نیول اسپیئر نے کانٹے سے ایک گوشت کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھا اور بولا۔ ’’مجھے رین پوس کے لوگوں کی وجہ

سے آنا پڑا۔ انہیں ڈر ہے کہ میں امریکن ڈرگ پولیس کو ان کے بارے میں نہ بتا دوں۔"

"تمہارا اشارہ ڈی ای اے یعنی ڈرگ انفورسمنٹ ایڈمنسٹریشن کی جانب ہے۔"

"ہاں وہی' اب وہ نولیز سے کہہ رہے ہیں کہ مجھے تلاش کر کے ختم کر دیا جائے ورنہ وہ اسے مچھلیوں کی خوراک بننے کے لیے سمندر میں پھینک دیں گے۔ اسی لیے وہ میری تلاش میں یہاں آ گیا ہے۔"

"یہ بھی تمہیں تھریسا نے ہی بتایا ہے؟"

نیول نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پھر تم ڈی ای اے کے پاس کیوں نہیں جاتے؟ تم نے مجھ سے جو کچھ کہا، یہ انہیں بھی بتا دو۔ وہ تمہاری حفاظت کریں گے۔"

وہ لڑکا مسکراتے ہوئے بولا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ نولیز کے بجائے میری بات کا یقین کر لیں گے؟ وہ پہلے ہی اس کے ساتھ کام کر چکے ہیں اور انہیں معلوم ہے کہ وہ جمیکا میں ہے۔ وہ میرے بارے میں یہی سمجھتے ہیں کہ میرا تعلق رین بوس سے ہے۔ اس نے انہیں یہی بتایا ہے کہ وہ ایک گینگسٹر کی تلاش میں ہے اور انہوں نے اسے مدد کا یقین دلایا ہے۔"

ولی نے غور سے اس کی بات سنی اگر اس کی کہانی سچی ہے تو وہ یقیناً کسی بھی ملک سے تعلق رکھنے والے ایجنٹ پر بھروسا نہیں کر سکتا اور لگتا یہی ہے کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ اس کے لیے ڈی ای اے، کے لوگوں کو اس بات پر قائل کرنا مشکل ہو گا کہ ان کا ایک پرانا شریک کار بدعنوان ہو گیا ہے جبکہ وہ نیول کو ایک بہت بڑی تنظیم کا رکن سمجھتے ہیں۔

"تم جو کچھ مجھے بتا رہے ہو، میں اس پر کیوں یقین کر لوں؟" ولی نے کہا۔

اس لڑکے نے گوشت کا ایک اور ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھا اور بولا۔ "میں جس شخص کے بارے میں بتا رہا ہوں، تمہیں اس کو تلاش کرنا ہو گا۔ اس کی یہاں ایک بہن ہے۔ وہ اس کے پاس رہتا ہے۔ میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ وہ کہاں ہے۔ تم اس کا پیچھا کرو اور دیکھو کہ وہ کیا کرتا ہے۔ معلوم کرو کہ وہ کن لوگوں سے ملتا ہے۔ میں نے جو کچھ بتایا ہے، وہ تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ وہ گندہ شخص ہے۔"

اس نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کی موٹی گڈی نکالی۔ "میں تمہیں منہ مانگا معاوضہ دوں گا۔"

ولی نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ وہ لڑکا غیر محتاط نظر آ رہا تھا لیکن جب کوئی یہ محسوس کرے کہ کچھ خطرناک لوگ ایک جانور کی طرح اس کا شکار کرنا چاہتے ہیں تو اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ ولی کے یومیہ ریٹس مختلف تھے اور اس کا انحصار کام کی نوعیت اور ممکنہ خطرات پر تھا۔ وہ سراغ رساں یقیناً مسلح ہو گا اور اگر ولی اس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا تو وہ یقیناً خطرناک ہو سکتا ہے۔

لیکن اس لڑکے سے معاوضہ لینے میں بھی کچھ مسائل تھے جیسا کہ اس نے بتایا کہ اس کے پاس منشیات کا پیسا تھا اور اگر یہ اس ایجنٹ کو پھانسنے کی کوئی اسکیم تھی تو ولی بھی اس کا حصہ بن جاتا۔ پہلے اس نے سوچا کہ وہ انکار کر دے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ وہ جاننا چاہ رہا تھا کہ کیا نیول اسپیر سچ بول رہا ہے اور وہ واقعی ستم رسیدہ ہے جو صرف اپنے بھائی کا انتقام لینا چاہتا ہے۔

ولی نے اسے تین دن کا معاوضہ بتایا اور نیول نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر وہ رقم اس کے حوالے کر دی۔ ولی پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ یہاں سے سیدھا اپنی وکیل ایلس آرڈن کے دفتر جائے گا اور اسے اس کیس کی تمام تفصیل بتا کر یہ رقم بھی اس کے پاس رکھوا دے گا۔

"میں اس شخص ریمنڈ نولیز کو کہاں تلاش کروں؟"

نیول نے اسے ایک پتا بتایا اور ولی نے اسے اپنے پاس لکھ لیا۔ وہ میامی کے شمال میں ایک قصبہ ملامار تھا، ولی جانتا تھا کہ وہاں جمیکن لوگوں کی اکثریت ہے۔

"وہ موٹیگو بے، نامی کلب میں جاتا رہتا ہے۔" نیول نے کہا۔ "تم اسے فوراً پہچان لو گے۔ وہ دبلا پتلا طویل قامت شخص ہے۔ اس کی عمر زیادہ نہیں ہے لیکن سر کے تمام بال سفید ہو چکے ہیں۔"

نیول اٹھ کھڑا ہوا جیسے جانے والا ہو لیکن اس کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ "اس کا اصلی نام ریمنڈ نولیز ہے لیکن کوئی بھی اسے اس نام سے نہیں بلاتا۔ وہ مینتھول کے سگریٹ پیتا ہے اس لیے سب لوگ اسے مینتھول ہی کہتے ہیں۔"

"مینتھول؟"

"ہاں۔ تم مینتھول کو تلاش کر رہے ہو۔"

وہ مڑا، اور عقبی صحن پار کر کے لکڑی کے گیٹ سے باہر نکل گیا۔ ولی نے چند لمحے انتظار کیا پھر اس کے پیچھے چل دیا۔ اس نے دروازے اور چوکھٹ کے درمیان خلا سے جھانک کر دیکھا، وہ ایک کار میں سوار ہو رہا تھا جس میں تین اور.... نوجوان سیاہ فام بیٹھے ہوئے تھے اس سے پہلے کہ

ولی ان کی کار کا نمبر نوٹ کرتا، وہ دور جا چکی تھی۔
کار میں دوسرے لوگوں کی موجودگی سے ظاہر ہوتا تھا کہ نیول کو ان کی مدد حاصل ہے۔ وہ کون لوگ تھے؟ صرف مقامی دوست، رشتے دار یا وہ بھی رین بوس، کے ممبر تھے؟ کیا اس نے ولی کو جو کہانی سنائی، وہ سچ تھی یا اس جمیکن کانسٹیبلری فورس کے ایک رکن کو ولی کے ذریعے پھانسنے کے لیے یہ داستان گھڑی تھی؟ ولی کو اس معاملے میں آگے بڑھنے سے پہلے اس کا اندازہ لگانا تھا۔ اس نے چائے کے پیسے ادا کیے اور ایلس کے دفتر روانہ ہو گیا۔ وہ اس وقت عدالت میں تھی لیکن ولی نے معاوضے کے طور پر ملنے والی رقم اس کی سیکریٹری سیلما کے پاس رکھوا دی۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں جب ولی نے اسے بتایا کہ یہ منشیات کے اسمگلروں کا پیسا ہے۔ اس نے رقم سیف میں رکھ دی اور اس کا دروازہ اتنی زور سے بند کیا جیسے اس نے کسی بھوت کو قابو کر لیا ہو۔

ولی گھر چلا گیا۔ وہ لٹل ہوانا میں ایک مکان کی دوسری منزل پر رہتا تھا اور اسی میں اس نے اپنا دفتر بنایا ہوا تھا۔ وہ لیونگ روم میں رکھی میز پر گیا اور کمپیوٹر آن کر کے فون والی فائل کھولی اور اس میں سے انیتا برائن کا نمبر نکالا۔ وہ ڈی ای اے، میں ایجنٹ تھی اور ولی جن دنوں میامی پولیس کی انٹیلی جنس میں تھا تو اسے کئی مرتبہ انیتا کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ ولی کی ذمے داری یہ تھی کہ وہ غیر ملکی جرائم پیشہ افراد کا پیچھا کرے جو جنوبی فلوریڈا میں کاروبار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ کاروبار منشیات کی اسمگلنگ اور منی لانڈرنگ سے متعلق تھا۔ اس وجہ سے اس کے ڈی ای اے، میں کئی لوگوں سے تعلقات بن گئے تھے۔

انیتا، چھوٹے قد کی دبلی پتلی، سبز آنکھوں اور سیاہ بالوں والی لڑکی تھی۔ اسے اکثر خفیہ ایجنٹ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا کیونکہ خوش شکل ہونے کی وجہ سے وہ مشتبہ افراد کے قریب ہو جاتی تھی۔ خاص طور پر نائٹ کلب میں اس کی موجودگی بہت کارآمد ہوتی جہاں وہ ہیجان خیز میوزک اور میرینگو ڈانس کی بدولت ہر ایک کی توجہ کا مرکز بن جاتی تھی۔
انیتا نے اپنے مخصوص سرگوشی کے انداز میں اس کے فون کا جواب دیا۔ ”یہ تم ہو ولی؟ کیا ہو رہا ہے دوست؟“
”مجھے ایک کیس ملا ہے اور میرا خیال ہے کہ تم اس میں دلچسپی لوگی۔“
”مجھے تفصیل بتاؤ۔“

ولی نے فون پر ہی نیول اسپئیر کی کہانی سنا دی جس میں اس نے ریمنڈ نولیز پر الزام لگایا اور دعویٰ کیا تھا کہ وہ اسے قتل کرنا چاہتا ہے۔ ”کیا تم نے کبھی اس شخص کا نام سنا ہے؟“
”میں نے کبھی ریمنڈ نولیز کا نام نہیں سنا لیکن مجھے جمیکا سے متعلق کسی معاملے میں شامل نہیں کیا جاتا۔ یہ کام اُن مردوں اور لڑکیوں کے سپرد کیا جاتا ہے جو انگریزی بول سکیں۔ میں کولمبیا، میکسیکو، پیورٹوریکو، کیوبا وغیرہ کے معاملات دیکھتی ہوں جہاں ہسپانوی زبان بولی جاتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے تمہارے کیس میں دلچسپی نہیں ہے۔ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“
”تم اپنے دفتر کے لوگوں سے معلوم کرو شاید کوئی اسے جانتا ہو؟ انہوں نے اس کے بارے میں کیا سنا ہے۔ میں نے تم سے جو کچھ کہا ہے وہ انہیں بتا دو اور دیکھو کہ وہ کیا کہتے ہیں؟ میں یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ کیا واقعی وہ گندہ شخص ہے یا نیول اسپئیر اور اس کے دوست اسے پھنسانا چاہ رہے ہیں۔“
”پھر تم کیا کرو گے؟“
”اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ تمہیں کیا بتاتے ہیں۔ شاید میں تمہیں اپنے ساتھ موٹیکو بے، نامی نائٹ کلب لے جاؤں۔ وہ وہاں آتا رہتا ہے۔“
”اوہ، مجھے ریگی ڈانسنگ پسند ہے۔“
”اب ہم کل بات کریں گے۔“

☆☆☆

ولی دوبارہ اپنی کار میں سوار ہوا، اب اس کا رخ شمال کی جانب تھا۔ نیول اسپئیر نے اسے جو پتا دیا تھا، وہ وہاں سے آدھا گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ ولی پولیس کی ملازمت کے دوران میں وہاں کئی بار جا چکا تھا کہ ملامار کے قصبے میں اکثریت تارکین وطن کی ہے جن میں جمیکا سے آئے ہوئے لوگ بڑی تعداد میں شامل ہیں۔
وہ ہائی وے سے اتر کر شہر کی حدود میں داخل ہو گیا۔ وہاں کئی بلند و بالا رہائشی عمارتیں تھیں۔ ایک علاقے میں صرف سنگل اسٹوری مکانات تھے۔ ان میں سے کچھ پر کمیونٹی کے حوالے سے تختیاں لگی ہوئی تھیں جیسے ونڈسر، بالز، مونارک اسٹیٹ اور وکٹورین فاریسٹ وغیرہ۔
ولی کا مطلوبہ مکان ونڈسر اسٹریٹ پر تھا۔ اس علاقے میں نئے اور کشادہ دو منزلہ مکانات تھے۔ اگر نولیز واقعی گندہ تھا تو ممکن ہے کہ اس نے اپنی ناجائز آمدنی کا ایک

حصہ فلوریڈا ریئل اسٹیٹ میں لگا دیا ہو۔ ایک ایمان دار پولیس افسر اپنی جائز آمدنی سے ایسا مکان نہیں خرید سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ مکان اس کی بہن کی ملکیت ہو۔

اس مکان پر ہلکا نیلا رنگ کیا گیا تھا اور چھت پر سرخ ٹائلز لگے ہوئے تھے۔ ڈرائیووے میں دو نئی کاریں کھڑی تھیں۔ ولی آہستہ سے ان کے قریب سے گزرا اور دونوں کی لائسنس پلیٹ کے نمبر نوٹ کر لیے۔ اس نے اپنی کار ایک ایسے مکان کے سامنے کھڑی کی جو نولیز فیملی کے مکان سے تین گھر چھوڑ کر تھا۔ اس نے اپنی گاڑی کا عقبی شیشہ اور سائڈ مرر اس طرح سیٹ کیے کہ وہ کسی بھی آنے جانے والے شخص کو دیکھ سکے پھر اس نے اسپورٹس ریڈیو آن کیا اور انتظار کرنے لگا۔

وہ ریڈیو پر میامی ڈولفن کا انٹرویو سن رہا تھا کہ ایک سیاہ رنگ کی SUV کار نیلے مکان کے سامنے آ کر رکی۔ چند لمحوں بعد سامنے کا دروازہ کھلا اور ریمنڈ نولیز باہر آیا۔ اس کی عمر تقریباً چالیس سال، قد چھ فٹ، دبلا پتلا، گہری رنگت اور سر کے بال سفید تھے۔ اس نے سفید قمیص، کریم کلر کی پتلون اور سفید جوتے پہن رکھے تھے۔ اس کے ہونٹوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی جو یقیناً مینتھول کی ہی تھی۔

وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا کار تک گیا اور ڈرائیور سائڈ کی کھڑکی میں جھک کر اندر بیٹھے ہوئے لوگوں سے باتیں کرنے لگا۔ کئی منٹ کی گفتگو کے بعد وہ مڑا اور واپس مکان میں چلا گیا۔ اب اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ کا تھیلا بھی تھا۔ ممکن ہے کہ وہ اس کے لیے ڈونٹ لائے ہوں لیکن ولی کے خیال میں ایسا نہیں تھا۔

وہ سیاہ کار وہاں سے روانہ ہوئی اور ولی نے دیکھا کہ اس میں تین سیاہ فام افراد سوار تھے۔ نیول اسپیئر کے ساتھیوں کے برعکس ان کے چھوٹے بال تھے اور ان کی عمر بھی کچھ زیادہ تھی۔ یعنی نیول اور نولیز، دونوں کے ساتھ کچھ لوگ تھے کیونکہ انہیں ایسے دوستوں کی ضرورت تھی جو اُن کی مدد کر سکیں لیکن اہم سوال یہ تھا کہ کیوں؟

ولی نے اس کار کا نمبر بھی نوٹ کر لیا۔ اس نے کچھ دیر انتظار کیا اور جب وہ گاڑی تقریباً ایک بلاک دور چلی گئی تو اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ وہ کار مختلف راستوں سے گزرتی ہوئی ایک عمارت کے سامنے رکی جس پر کارن وال اسٹیٹ کی تختی لگی ہوئی تھی اور گیٹ پر باوردی گارڈ موجود تھا۔ ولی اس عمارت کے آگے سے گزرتا چلا گیا۔

گھر جانے سے پہلے اس نے گوگل سے موشیگو بے



شیر کی زرافے سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ زرافے نے ادب کے ساتھ شیر کے راستے سے ہٹنا چاہا، شیر کو جلال آ گیا۔ ”ٹھہرو۔“ اس نے دہاڑ کر زرافے کو حکم دیا، زرافہ رک گیا اور تھر تھر کانپنے لگا۔ شیر نے سوال کیا۔ ”بتاؤ، اس جنگل کا بادشاہ کون ہے؟“

زرافے نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”یہ آپ کیا پوچھ رہے ہیں جہاں پناہ! جنگل کے بادشاہ تو آپ ہی ہیں۔“ شیر نے حقارت سے زرافے کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔

کچھ دور چل کے شیر کی نظر ایک گدھے پر پڑی۔ گدھے نے اسے دیکھ کر فرار ہونا چاہا۔ شیر ایک زوردار دہاڑ کے ساتھ ایک جست میں گدھے کے سر پر پہنچ گیا۔ گدھے سے بھی اس نے یہی سوال کیا۔ ”بتاؤ، اس جنگل کا بادشاہ کون ہے؟“ گدھے نے سہم کے اعتراف کیا۔ ”آپ ہیں سرکار! جنگل کا بادشاہ آپ کے سوا کون ہو سکتا ہے۔“ شیر گردن اکڑا کر وہاں سے چل پڑا۔

کچھ دور چل کے شیر کا گزر ایک ایسے درخت کے نیچے سے ہوا جس پر درجنوں بندر اچھل رہے تھے۔ شیر کو بندروں سے سوال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، بندر اسے دیکھتے ہی خاموش ہو گئے اور اپنے ناسمجھ بچوں کو بھی خاموش رہنے کے اشارے کرنے لگے۔ شیر کی چال میں کچھ اور مستی آ گئی۔

کچھ دور چل کے شیر کی نظر ایک ہاتھی پر پڑی۔ شیر نے دہاڑ کر ہاتھی کو متوجہ کیا اور اپنا سوال دہرایا۔ ”بتاؤ، اس جنگل کا بادشاہ کون ہے؟“ ہاتھی نے جواباً شیر کو ایک دم اپنی سونڈ میں کس لیا اور پوری قوت سے زمین پر دے مارا، ساتھ ہی دو سات لاتیں رسید کر دیں۔ شیر اَدھ موا ہو گیا۔ ہاتھی دیر تک اس کی خبر لیتا رہا پھر اسے مردہ سمجھ کے چنگھاڑتا ہوا ایک طرف چل دیا۔

شیر ہانپتا کانپتا اٹھا۔ زرافے اور گدھے کے علاوہ کئی جانور دور سے شیر کی درگت بنتی دیکھ رہے تھے۔ شیر ان کے قریب سے گزرا تو جھینپ گیا۔ اس کے منہ سے نکلا۔ ”عجیب احمق ہاتھی تھا۔ اسے پتا ہی نہیں تھا کہ میں کون ہوں؟“

گلگت سے احمد سلیم سلیمی کا تعاون

نائٹ کلب کا پتا معلوم کیا۔ جی پی ایس کی مدد سے وہ شہر کے پرانے حصے کی سائڈ اسٹریٹ پر پہنچا۔ وہاں اسے ایک اسٹریپ مال نظر آئی جس میں ایک گل فروش، ٹریول ایجنسی، ایک چینی ریسٹوران نیوز اور نائٹ کلب تھا۔ اس وقت کلب بند تھا لیکن فرنٹ ڈور پر لگے ہوئے بورڈ سے معلوم ہوا کہ یہ کلب بدھ سے ہفتہ تک رات نو بجے سے صبح پانچ بجے تک کھلتا ہے۔

گھر جا کر ولی کمپیوٹر کھول کر بیٹھ گیا تا کہ گاڑیوں کے مالکان اور ان کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں معلومات مل سکیں۔ ڈرائیو وے میں کھڑی ہوئی دونوں گاڑیاں رینا نولیز کے نام پر رجسٹرڈ تھیں جو غالباً نولیز کی بہن تھی۔ اس کا کرمنل ریکارڈ بالکل صاف تھا پھر اس نے سیاہ SUV کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ وہ گاڑی ایک ستر سالہ عورت مسز آرتھر کے نام پر تھی۔ اس کا ریکارڈ بھی بالکل صاف تھا۔

اگلے روز صبح انیتا نے فون پر بتایا۔ ''میں نے جیکا کے لیے رابطہ افسر سے بات کی ہے۔ وہ ایک سفید فام نارمن بلیئر ہے۔ اس نے کبھی ریمنڈ نولیز کا نام نہیں سنا اور نہ ہی اسے یہ معلوم ہے کہ وہ گندہ ہے یا نہیں لیکن اس نے تمہارے کیس میں بہت دلچسپی لی۔ میں نے موہیگو بے نائٹ کلب کے بارے میں بتایا جہاں نولیز جاتا رہتا ہے اور نارمن آج رات اسے چیک کرنے کے لیے وہاں جا رہا ہے۔ یہ رین بوس کے لوگوں اور ان کے بدعنوان جیکا پولیس کے دوستوں پر ہاتھ ڈالنے کا اچھا موقع ہے اور نارمن اس بارے میں بہت پُرجوش ہے۔''

ولی چونک اٹھا۔ اسے یہ بات پسند نہیں آئی کہ ڈی ای اے، اس کے کیس میں مداخلت کرے لیکن اس نے انیتا سے کچھ نہیں کہا۔ اس نے وہی کیا جو اس سے کہا گیا تھا۔ ''تم بھی ان کے ساتھ کلب جا رہی ہو؟'' اس نے انیتا سے پوچھا۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ مجھے ریگی میوزک بہت پسند ہے۔''

ولی نے سلسلہ منقطع کر دیا اور اپنے کیس کے بارے میں سوچنے لگا۔ اب اسے تین افراد یعنی نیول، نولیز اور ڈی ای اے کے لوگوں سے نمٹنا ہوگا۔ وہ سب مسلح اور خطرناک لوگ تھے۔ ولی کو اندازہ نہیں تھا کہ اس مثلث میں کون اچھا اور کون برا ہے۔ یہ بہت ہی خراب صورت حال تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ اس کیس سے الگ ہو جائے لیکن اس سے پہلے ہی اس پر کافی کام کر چکا تھا اور اسے معلوم تھا کہ آگے کیا کرنا ہے۔ اسے ان لوگوں پر نظر رکھنا تھی جو نولیز کی پشت پر تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں تھا۔

اس کے بجائے اس نے ایک ہومی سائیڈ سراغ رساں ماریو ڈیاز کو فون کیا جس کے ساتھ اس نے پولیس کی ملازمت کے دوران کچھ عرصہ کام کیا تھا۔

''ہائے ولی بوائے، کیا ہو رہا ہے؟''

''تم لوگوں کے پاس چند ماہ پہلے قتل کا ایک کیس آیا تھا جو حل نہیں ہوا۔ مقتول کا نام میلکم جونز ہے وہ اوورٹاؤن میں رہتا تھا۔ میرا ایک کلائنٹ اس کا رشتے دار ہے۔ ممکن ہے کہ تم اس بارے میں میری مدد کر سکو اور شاید میں بھی تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔''

''تمہارے پاس کیا معلومات ہیں؟''

ولی نے وہ سب کچھ بتا دیا جو نیول نے اپنے بھائی کے قتل کے بارے میں کہا تھا۔

''میں وہ فائل دیکھنا چاہتا ہوں۔'' ولی نے کہا۔ ''میں وہ تمام تفصیلات جاننا چاہتا ہوں جو تحقیقات کے دوران میں سامنے آئیں۔ ممکن ہے کہ ان نکتوں کو جوڑ سکوں جو اس وقت واضح نہیں ہوئے تھے۔''

''یہ میرا کیس نہیں ہے لیکن میں معلوم کر سکتا ہوں کہ اسے کس نے ہینڈل کیا تھا۔ تم میرے پاس آ جاؤ۔''

ولی جب میامی پولیس ڈپارٹمنٹ پہنچا تو وہ فائل ماریو کی میز پر رکھی تھی۔ اگلے ایک گھنٹے کے دوران اس نے اصلی پولیس رپورٹ اور وہ انٹرویوز دیکھ لیے جو سراغ رسانوں نے مختلف لوگوں سے کیے تھے۔ اس واقعے کا کوئی عینی شاہد نہیں تھا۔ البتہ کچھ لوگوں نے گلی میں ہونے والی فائرنگ کی آواز ضرور سنی تھی اور کھڑکیوں سے قاتل کو دیکھنا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی۔ ولی نے یہ سب تفصیلات اپنے پاس لکھ لیں۔ ماریو کا شکریہ ادا کیا۔ وہاں سے کئی میل دور جائے واردات پر پہنچا۔ وہاں اس نے ایک گھنٹے تک پڑوسیوں سے بات کی اور واپس گھر آ گیا۔

☆☆☆

رات دس بجے اس نے اپنی کار موہیگو بے کی پارکنگ لاٹ میں کھڑی کی جو پہلے ہی بھر چکا تھا بہرحال ولی کو گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ مل گئی۔ وہ کلب کے داخلی دروازے کی طرف بڑھا تو اس کا سامنا غیر معمولی جسامت رکھنے والے دو آدمیوں سے ہوا۔ انہوں نے سیاہ سوٹ پہن رکھے تھے۔ ان میں سے ایک نے ولی سے پوچھا کہ کیا

کے پاس کوئی اسلحہ تو نہیں ہے جس کا جواب ولی نے نفی میں دیا جبکہ دوسرے آدمی نے کہا کہ وہ اپنے اطمینان کے لیے اس کی تلاشی لینا چاہتا ہے۔ ولی نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور مختصراً تلاشی کے بعد اسے اندر جانے کی اجازت مل گئی۔

کلب میں نیم تاریکی تھی۔ دروازے کے ساتھ ہی ایک بار اور اس کے پیچھے کشادہ ڈانس فلور تھا۔ اس کے آخری سرے پر اسٹیج تھا۔ اس پر ایک ڈی جے، موسیقی کے آلات کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ اسٹیج کے دونوں طرف بڑے، بڑے اسپیکرز لگے ہوئے تھے۔ عقبی دیوار پر باب مارلے کی ایک بڑی تصویر پینٹ کی گئی تھی۔ اس وقت ڈی جے، جمی کلف کا گانا بجا رہا تھا اور ڈانس فلور پر لوگ اس پر رقص کر رہے تھے۔

ولی بھی اس ہجوم میں شامل ہو گیا۔ اس کی نظریں میلتھول، انیتا اور نیول کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ کلب کے عقبی حصے میں پہنچا۔ وہاں اسے ایک دروازہ نظر آیا جو پرائیویٹ روم میں کھل رہا تھا۔ وہاں اسے وہ شخص مل گیا جس کی اسے تلاش تھی۔

ایک میز پر میلتھول اپنے تین دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ شاید یہ وہی لوگ تھے جنہیں وہ صبح SUV میں دیکھ چکا تھا۔ میلتھول اب بھی سفید کپڑے پہنے ہوئے تھا اور اس کی انگلیوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا...... اس کے سامنے دروازے کے ساتھ تین افراد کا گروپ کھڑا تھا۔ ان میں انیتا بھی شامل تھی۔ ولی نے اندازہ لگایا کہ دوسرے دو افراد انیتا کے ساتھی ایجنٹ ہو سکتے ہیں۔ ولی جیسے ہی اندر داخل ہوا، وہ سب مڑ کر اسے دیکھنے لگے۔

انیتا بولی۔ "مارٹن، یہ ولی کوسٹا ہے۔ پرائیویٹ سراغ رساں، ہم اس کے بارے میں تمہیں بتا چکے ہیں۔"

اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔ اسی وقت ولی کو محسوس ہوا کہ اس کے عقب میں کوئی اور بھی اندر داخل ہوا ہے۔ میلتھول اور اس کے ساتھیوں کا منہ بن گیا۔ ولی نے مڑ کر دیکھا اس کے پیچھے نیول اسپیئر کھڑا ہوا تھا۔ سب اپنی جگہ منجمد ہو گئے۔ بالآخر مارٹن نے سکوت توڑا۔

"یہ کون ہے؟"

ولی نے اسے نیول اسپیئر کے بارے میں بتایا کہ وہ اپنے بھائی میلکم جونز کے قتل کا بدلہ لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ "اسے مبینہ طور پر رین پوس، کے لوگوں نے میامی میں قتل کیا تھا۔"

نولیز کی بھویں تن گئیں۔ "مبینہ طور پر؟"

"ہاں جمیکا کے قانون نافذ کرنے والے ایجنٹ ریمنڈ نولیز نے نیول کو بھی بتایا تھا۔"

میلتھول کی نظریں ولی پر جم گئیں۔ "بالکل ایسا ہی ہوا تھا کوسٹا۔ انہوں نے اس لیے اسے قتل کیا کیونکہ وہ جان گیا تھا کہ وہ لوگ ایسے جرائم پیشہ گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو اس کے علاقے میں سرگرم تھا اور وہ ان کے بارے میں مقامی پولیس کو اطلاع دینے والا تھا۔"

ولی کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "میں نے اس کے پڑوسیوں سے بات کی ہے۔ ہر شخص جانتا تھا کہ رین پوس، سے کس کا تعلق ہے اور ان میں میلکم جونز بھی شامل تھا۔ اس گروہ کے ارکان اپنی سرگرمیوں کے بارے میں مقامی لوگوں سے بات نہیں کرتے تھے اور نہ ہی اس علاقے میں کوئی کاروبار کرتے تھے۔ ان کا مقامی لوگوں سے کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ سب لوگوں نے یہی بات بتائی۔"

میلتھول نے اسے گھورا۔ اور اس کی آواز تیز ہو گئی۔ "میلکم جونز کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا جب وہ مجھے یہاں ملا تو اس نے مجھے رین پوس سرگرمیوں مثلاً منشیات کی اسمگلنگ اور اسلحے کے ناجائز کاروبار کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔"

اس کا سگریٹ بجھ چکا تھا۔ اس نے اسے ایش ٹرے میں مسلا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر پیکٹ نکال لیا۔ یہ میلتھول کا سگریٹ تھا۔ اس نے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکالا اور اسے واپس جیب میں رکھنے والا تھا کہ ولی نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔

"اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں ایک سگریٹ لے لوں۔"

میلتھول نے منہ بنایا لیکن پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ولی نے اس میں سے ایک سگریٹ نکالا لیکن اسے جلانے کے بجائے انگلی میں پکڑ لیا۔ "جیسا کہ میں کہہ رہا تھا کہ اس علاقے کے لوگوں سے میری بات ہوئی۔ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے ایک طویل قامت دُبلے پتلے اور سانولے رنگ کے سیاہ فام شخص کو کبھی کبھار رین پوس، کے لوگوں کے پاس آتے دیکھا تھا۔ انہیں نہیں معلوم کہ وہ کون تھا لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ جمیکا کے قصبے پورٹ انٹونیو سے نہیں آئے تھے جہاں سے اس کا تعلق تھا۔ اس علاقے میں صرف میلکم کا تعلق ہی اس قصبے سے تھا اور اس نے اس شخص کو فوراً ہی پہچان لیا۔"

ولی نے اپنی نظریں میلتھول پر جما دیں اور بولا۔ "وہ جان گیا تھا مسٹر نولیز کہ تم ایک گندے شخص ہو اور تمہارا

تعلق منشیات فروشوں سے ہے۔ اس نے تم سے کہہ دیا کہ وہ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ دیکھ چکا ہے۔ تم نہیں چاہتے تھے کہ وہ کسی اور کو یہ بات بتائے اس لیے تم نے اسے جان سے مارنے کا فیصلہ کرلیا۔ تم نے اس کے اپارٹمنٹ کی نگرانی کی اور جیسے ہی وہ باہر آیا تم نے اپنی گن نکالی اور زبردستی اسے گلی میں لے جاکر اس کے سر میں گولی ماردی۔ جب اس کے سوتیلے بھائی نیول اسپیئر نے یہ جاننے کے لیے میامی پولیس کو فون کرنا شروع کیے کہ اس کے بھائی کو کس نے قتل کیا ہے تو تمہیں خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ تم تک نہ پہنچ جائے۔ لہٰذا تم نے اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ایک منصوبہ بنایا اور اسے یہ کہانی سنائی کہ میلکم کو رینا پوس، کے ایک بدمعاش نے قتل کیا ہے۔ ان کے درمیان کسی عورت کی وجہ سے جھگڑا چل رہا تھا پھر تم نے اسے مشورہ دیا کہ وہ رین پوس، میں شامل ہوکر اپنے بھائی کے قاتل کو تلاش کرے اور دوسری طرف گروہ کے بڑوں کو بتادیا کہ وہ پولیس کا مخبر ہے تاکہ وہ اسے جان سے ماردیں اور تم سکون سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکو۔"

طویل قامت شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم نے بڑی محنت سے یہ کہانی گھڑی ہے جبکہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت اور گواہ ہیں کہ میں نے میلکم جونز کو قتل کیا ہے؟"

اس نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پلاسٹک کی ایک چھوٹی تھیلی نکالی۔ اس میں سگریٹ کا ایک ٹکڑا تھا جس میں فلٹر لگا ہوتا ہے۔ اس نے اسے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"تم یہ دیکھ رہے ہو مسٹر مینتھول؟ میں آج میامی پولیس کے ہومی سائیڈ یونٹ بھی گیا تھا۔ وہاں میں نے لاکر میں اس کیس سے متعلق کئی چیزیں دیکھیں جنہیں ثبوت کے طور پر محفوظ کیا گیا تھا۔ انہی میں یہ سگریٹ کا ٹکڑا بھی تھا جو میلکم جونز کی لاش کے پاس سے ملا۔"

ولی نے تھیلی کو اوپر اٹھایا تاکہ اسے روشنی میں دیکھا جاسکے۔ "تم نے غور کیا کہ یہ کیا ہے۔" پھر اس نے سگریٹ اٹھایا جو اس نے تھوڑی دیر پہلے لولیز سے لیا تھا۔

"یہ تمہارا برانڈ ہے جو جمیکا میں کافی مقبول ہے لیکن یہاں بہت کم ملتا ہے۔ میں شرطیہ کہتا ہوں کہ ہم اس سگریٹ کے فلٹر کا ڈی این اے کرائیں گے تو وہ تمہارے سگریٹ سے میچ کرجائے گا۔"

مینتھول نے پلاسٹک کی تھیلی کو گھورا۔ دوسرے لوگوں کی نظریں بھی اسی پر تھیں پھر اس نے ایک احمقانہ حرکت کی۔ پولیس آفیسر ہونے کی وجہ سے اسے اپنا ہتھیار کلب میں لانے کی اجازت تھی۔ اس نے وہ نکال لیا۔ لیکن ڈی ای اے کے تینوں ایجنٹ بھی مسلح تھے۔ اینا پہلے ہی پرس میں سے اپنا ہتھیار نکال چکی تھی جب ولی نے مینتھول کے ہاتھ میں پستول دیکھا تو اینا نے فائرنگ شروع کردی۔ تین گولیاں اس گندے پولیس افسر کے سینے میں پیوست ہوگئیں۔ اس کا پستول فرش پر گر گیا۔

اس سے پہلے ہی ولی اپنے آپ کو بچانے کے لیے جھک گیا تھا لیکن اس کے بعد کوئی فائر نہیں ہوا۔ جب وہ اپنے پیروں پر سیدھا کھڑا ہوا تو اس نے دیکھا کہ مینتھول کے آدمیوں نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا رکھے تھے اور ڈی ای اے کے ایجنٹوں نے انہیں گن پوائنٹ پر لیا ہوا تھا۔ فائرنگ کی آواز سے کلب میں بھگدڑ مچ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سب لوگ وہاں سے چلے گئے۔

چند منٹ بعد مقامی پولیس اور ایمبولینس بھی وہاں پہنچ گئی۔ پولیس والوں نے اینا سے کچھ سوالات کیے اور اس کے بعد وہ ولی کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ وہ ابھی تک کپکپا رہی تھی۔ ولی نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اپنے قریب کرلیا تاکہ اس کی حالت اعتدال پر آجائے پھر اس نے اپنی جیب میں دوسرا ہاتھ ڈالا اور تھیلی میں سے سگریٹ کا ٹکڑا نکال کر کوڑے دان میں پھینک دیا۔

اینا نے اسے غصے سے دیکھا اور بولی۔ "یہ تم کیا کررہے ہو؟ یہ وہ ثبوت ہے جو تمہیں ہومی سائیڈ یونٹ سے ملا تھا۔"

ولی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں، میلکم کی لاش کے پاس سے کوئی سگریٹ کا ٹکڑا نہیں ملا تھا۔ یہ میرے گھر کے باہر سڑک پر پڑا ہوا تھا اور یہ مینتھول کا برانڈ بھی نہیں ہے۔"

اینا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "تمہارا بھی جواب نہیں ولی۔ کس طرح تم نے اسے اپنے جال میں پھانسا۔"

"اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ میں نے تو ایک تیر پھینکا تھا۔ وہ مجرم تھا اس لیے میرے جال میں پھنس گیا۔"

"اب کیا پروگرام ہے؟" اینا نے پوچھا۔

"تمہیں جو کرنا ہے، وہ کرو۔ میں تو گھر جاؤں گا۔"

"یہ ڈانس کرنے کا موقع نہیں ہے لیکن یہ مجھ پر ادھار رہا۔"

"ٹھیک ہے اپنا وعدہ یاد رکھنا۔" ولی نے کہا اور گھر روانہ ہوگیا۔

❖❖❖

"میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے چھوٹے ہو، شاید آٹھ برس چھوٹے ہو۔" اس نے کہا۔
"آٹھ نہیں، دس برس۔" میں نے تصحیح کی۔
"جو بھی ہے آٹھ برس، یا بارہ سال، تم بہرحال مجھ سے چھوٹے ہو۔" اس نے میری تصحیح کرنے کے بعد کہا۔
"تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں اس دنیا میں اکیلی ہوں۔" اس نے بات آگے بڑھائی۔
"شوہر کی وفات اور بیٹوں کے امریکا چلے جانے کے

چاہ درپیش

غلام قادر

انسانی فطرت ہے کہ خوب سے خوب تر کی چاہ میں بھٹکتا رہتا ہے... جنونِ شباب میں ہر روز ایک نیا عشق... ایک نئے محبوب کی چاہ بے کل رکھتی ہے... موسم کی طرح دل لگی اور دلداریاں بدلتی رہتی ہیں... عشق و محبت کی روایت کو ترک کرکے ہر روز دل فریب دھوکے کھانے کے لیے طبیعت تیار رہتی ہے... شہرِ بے وفا میں گھومتے پھرتے کرداروں کا روپ درروپ...

شیشے کے گھروں میں شب و روز ہونے والے تماشائے دل



بعد آپ واقعی اکیلی ہیں۔'' میں نے کہا۔
''تم یہ نہیں جانتے ہو گے کہ میری شادی اُس وقت ہو گئی تھی جب میں بمشکل سترہ برس کی تھی۔'' اس نے کہا اور میں حیرت سے اس کا چہرہ تکنے لگا کہ اس تمہید کے بعد وہ کہنا کیا چاہتی ہے۔
''میری شادی زبردستی کی شادی تھی۔ گوہر نے مجھے اس وقت پسند کیا تھا جب وہ ہمارے کالج میں مہمانِ خصوصی بن کر آئے تھے اور میں نے ان کے ہاتھوں اسٹوڈنٹ آف دی ایئر کی ٹرافی وصول کی تھی۔''
''بعد میں اس نے تمہیں ہی ٹرافی بنا دیا۔'' میں نے کہا اور اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔
''بڑھاپے کا عشق ایسا ہی ہوتا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور غالباً تم اس کی چوتھی ہم سفر تھیں؟''
''ہاں مجھے پسند کرنے اور رشتہ بھجوانے سے پہلے اس نے میرے بارے میں پوری تحقیقات کروائی تھیں۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میری منگنی ہو چکی ہے تو اس نے سب سے پہلے میرے منگیتر کو قتل کروایا۔'' یکدم ہی اس کا لہجہ افسردہ ہو گیا تھا جیسے ابھی ابھی اسے اپنے منگیتر کے قتل ہونے کی اطلاع ملی ہو۔
''تو تمہارے منگیتر کو قتل کرنے کے بعد اس نے رشتے کی بات کی؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔
''نہیں، اس سے پہلے اس نے میرے اکلوتے بھائی کو اغوا کروالیا تھا۔''
تمہارے والدین نے اس اغوا کی رپورٹ تو کروائی ہوگی؟'' میں نے سوال کیا۔
''اس سے پہلے ہی اس کا بندہ ابا سے ملنے آگیا تھا اور یہ پیغام لایا تھا کہ پولیس کے پاس گئے تو رپورٹ درج ہونے سے پہلے بیٹے کی لاش گھر پہنچ جائے گی۔''
''اور تمہارے والدین نے بیٹے کی جان بچانے کے لیے بیٹی قربان کردی۔'' میں نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔
''ہم پانچ بہنیں تھیں اور بھائی ایک ہی تھا۔'' اس کا جواب تھا۔
''بیٹے کی اہمیت ہمارے معاشرے میں بیٹی سے زیادہ ہے اور جب وہ اکلوتا ہو تو اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔''
''اب تم کچھ سمجھے ہو کہ میرے والدین کی مجبوری کیا تھی۔'' اس نے کہا۔
''یہاں تک تو بات سمجھ میں آگئی، یہ بتاؤ شادی کے بعد گوہر کا سلوک تمہارے ساتھ کیسا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔
''وہی رویّہ تھا جو ٹرافی جیتنے والے کا ٹرافی کے ساتھ ہوتا ہے۔'' اس نے جواب دینے میں دیر نہیں کی تھی۔
''میں سمجھا نہیں؟'' میں نے کہا۔
''جیتنے والا ٹرافی ہمیشہ ایسی جگہ سجاتا ہے کہ ہر آنے والے کی نظر سب سے پہلے ٹرافی پر پڑے اور وہ بتا سکے کہ ٹرافی جیتنے میں اسے کیا، کیا مشکلات آئی تھیں اور اس نے کس طرح اور کتنی محنت سے ٹرافی جیتی ہے۔'' اس کا جواب تھا۔
''گویا گوہر نے تم پر کوئی پابندیاں عائد نہیں کی تھیں؟'' میرا سوال تھا۔
''شادی بہت سادگی سے ہوئی تھی۔ اس نے جہیز کا مطالبہ بھی نہیں کیا تھا لیکن شادی کے بعد ہنی مون کے لیے یورپ لے گیا تھا۔'' اس نے کہا۔
''میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایک ساٹھ برس کا شخص کس طرح ایک سترہ سال کی لڑکی کی خواہشات پوری کر سکتا ہے؟'' میں نے کہا اور وہ مجھے اس طرح دیکھنے لگی جس طرح پولیس والا مجرم کو دیکھتا ہے۔
''میں اس وقت معصوم تھی، نہیں جانتی تھی کہ شادی کے بعد کیا ہوتا ہے اور کس طرح ہوتا ہے۔'' اس نے جواب میں کہا تھا۔ ''بس وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب کچھ سمجھ آتا چلا گیا۔ وہ بوڑھا اور کمزور آدمی تھا۔ کب تک دواؤں کے سہارے اپنی شان دکھاتا۔''
اس کی بات سن کے میں خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد میں نے ہی سوال کیا۔ ''یہ بتاؤ مجھ سے کیا چاہتی ہو؟''
''میں نے تمہیں جب پہلی بار دیکھا تھا تب ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنی زندگی کی محرومیاں میں تم سے دور کروں گی۔'' اس نے کھل کر بات کرنی شروع کی۔
''تمہارا مطلب ہے کہ میں تم سے شادی کرلوں؟'' میں نے سوال کیا لیکن سوال کرتے ہوئے میرا لہجہ سخت ہو گیا۔
''یہ کس طرح ممکن ہے؟'' میں نے پہلے سے بھی زیادہ سخت لہجے میں کہا۔
''بالکل ممکن ہے۔'' اس نے تیزی سے کہا پھر بولی۔ ''تمہارا اور میمی کا جو رشتہ ہے، اس کے بارے میں مجھے سب کچھ معلوم ہے۔''
''تمہارا اور میمونہ کا کیا موازنہ؟'' میں نے تلخ انداز

میں کہا۔

''تم اگر مجھے بیوہ ہونے کا طعنہ دے رہے ہو تو میمی بھی تم سے جب پہلی بار ملی تھی تو وہ کنواری تو نہیں تھی۔'' اس نے کہا۔

''اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ اس کے ایک ملازم نے جس پر اس کے گھر والے بہت بھروسا کرتے تھے، اس پر اس وقت حملہ کیا تھا جب اس کے گھر والے ملازم کے پاس چھوڑ کر اس کی ماں کے میکے گئے تھے کیونکہ اس کے نانا کا انتقال ہو گیا تھا۔''

''تو اس نے تمہیں بتا دیا تھا۔'' اس کا سوال تھا۔

''جو کچھ میمونہ کے ساتھ ان پانچ دنوں میں ہوا، وہ نوکر نے زبردستی کیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''جھوٹ بولتی ہے وہ۔'' اس نے یہ کہنے میں لمحہ بھر کی دیر نہیں کی۔

''اس میں کیا جھوٹ ہے؟'' میرا سوال تھا۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے والدین کو اپنی جوان ہوتی ہوئی بچی کو ایک ملازم کے حوالے کر کے نہیں جانا چاہیے تھا لیکن یہ جھوٹ ہے کہ شوفر نے کوئی زبردستی کی تھی۔'' وہ اتنا کہہ کر رک گئی۔

''کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟'' میں نے کہا۔

''میں تمہیں شوفر سے ملوا دوں گی اور وہی تمہیں پوری داستان سنا دے گا۔'' اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔ ''تم کہو تو ابھی ابھی ملوا سکتی ہوں۔'' اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

''تمہارے پاس کیا کر رہا ہے وہ؟'' میں نے سوال کیا۔

''میمی کے والد کی وفات کے بعد میں اسے لے آئی تھی۔ اس کی ایک وجہ تم بھی ہو۔'' وہ کہہ رہی تھی۔

''میں کس طرح وجہ ہوں؟'' میں نے سوال کیا۔

''جب سے تم میمی کی زندگی میں آئے ہو، اس کا کام گھر کی صفائی کرنے اور سودا لانے کے سوا کچھ نہیں رہا تھا۔ میمی کے ساتھ اس کا وہ رشتہ جو میمی کی مرضی سے شروع ہوا تھا، وہ بھی اختتام پر تھا تو اس نے یہی بہتر سمجھا کہ میری آفر قبول کر لے۔''

''یعنی وہ رشتہ جو اس نے میمونہ کے ساتھ قائم کر رکھا تھا اب تمہارے ساتھ قائم کر لیا ہے؟'' میں نے طنزیہ انداز میں سوال کیا۔

''شروع شروع میں ایک دو بار ایسا ہوا تھا لیکن اب بہت عرصے سے نہیں ہے۔''

''اسی لیے تم مجھے شادی کی آفر کر رہی ہو؟'' میں نے کہا۔

''کیا کمی ہے مجھ میں سوائے اس کے کہ میں بیوہ ہوں۔'' اس نے کہا اور میں طنزیہ انداز میں مسکرا کر رہ گیا۔

''کیا میں اس کلو سے بہتر نہیں ہوں؟'' اس نے میمونہ کی رنگت کے حوالے سے طنزیہ انداز میں سوال کیا۔

''میمونہ تمہیں پھوپی کہتی ہے بلکہ بھتیجی بھی ہے۔'' میں نے اپنا طنزیہ انداز جاری رکھا تھا۔

''پھوپی وہ مجھے کہتی ہے لیکن میں اس کی پھوپی ہوں نہیں بلکہ سچ پوچھو تو میں اس کی ماں ہوں۔'' اس نے کہا اور میرا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔

میں اس سے شادی کس طرح کر سکتا ہوں جبکہ یہ خود اعتراف کر رہی ہے کہ یہ اپنے شوہر کو دھوکا دیتی رہی ہے۔ مجھے اس کے کرتوت سن کر گھن آ رہی تھی۔

''کس سوچ میں کھو گئے؟'' اس نے اچانک سوال کیا۔

''سوچ رہا تھا کہ تم شوفر سے کب ملواؤ گی۔'' میں نے بہانہ بنایا۔

''ابھی ملواتی ہوں۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے اپنا موبائل اٹھا لیا اور اس پر نمبر ڈائل کرنے لگی اور ساتھ ہی مائک بھی اوپن کر دیا تاکہ میں بھی سن سکوں۔ کچھ دیر موبائل کو کانوں سے لگا کر سنتی رہی پھر جیسے ہی کال ریسیو ہوئی اور شوفر نے ہیلو کہا۔

''کہاں ہو؟'' آواز سنتے ہی اس نے کہا۔

''کوارٹر میں۔'' شوفر کی آواز آئی۔

''ذرا میرے کمرے تک آؤ۔'' اس نے کہا۔

''جی بی بی جی! ابھی آیا۔'' شوفر نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

پانچ منٹ کے اندر شوفر کمرے میں تھا۔ مجھے اور میں اسے اچھی طرح جانتے تھے۔

''کیسے ہو؟'' میں نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔

''ٹھیک ہوں جی، میڈم کی مہربانی سے زندگی گزار رہا ہوں۔'' اس کا جواب تھا۔

''یہ بتاؤ کہ تم نے میمونہ بی بی کے ساتھ زبردستی کی تھی؟'' اس نے سوال کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی شوفر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''میں نے آپ کو بتایا تو تھا۔'' شوفر نے اپنے اوسان

بحال کیے اور کہا۔

''مجھے تو بتایا تھا اب حماد صاحب کو بھی بتا دو۔'' اس نے کہا۔

''کیا آپ اُس سے شادی کر رہے ہیں؟'' شوفر نے مجھ سے سوال کیا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''میمونہ نے ان سے کہا ہے کہ جب اس کے والدین اسے تمہارے حوالے کر کے گئے تھے تو تم نے اس کے ساتھ زبردستی کی تھی۔''

شوفر کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ آگئی۔

''میں نے نہیں انہوں نے میرے ساتھ زبردستی کی تھی۔'' شوفر کا جواب تھا۔

''پہیلیاں نہ بجھواؤ۔'' شوفر کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''میں کوہاٹ کا رہنے والا ہوں۔'' اس نے اپنی بات شروع کی۔ ''ہماری وہاں دشمنیاں تھیں۔'' شوفر کہتے کہتے رکا تھا۔ ''اپنے پانچ دشمنوں کو قتل کر کے میں نے وہ علاقہ چھوڑ دیا اور سیدھا کراچی آ گیا۔ یہاں صفدر صاحب کے والد کے یہاں ہمارے گاؤں کا ایک چوکیدار تھا جو بہت عرصے سے گھر نہیں گیا تھا اس نے میرا تعارف صفدر صاحب کے والد سے کروایا اور ضمانت لی کہ انہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔

''صفدر صاحب اس وقت آرمی میں تھے کچھ عرصے بعد ان کی شادی کر دی گئی۔ میمونہ بی بی کی پیدائش میرے سامنے کی ہے اب میں صفدر صاحب کے گھر آ گیا تھا کیونکہ ان کے والد کی وفات ہو چکی تھی جس وقت کی بات آپ مجھ سے سننا چاہ رہے ہو میمونہ بی بی سولہ سال کی ہو چکی تھیں۔ ان کی کچھ دوست ایسی بھی تھیں جو گندی فلم دیکھنے کی عادی تھیں اور آہستہ آہستہ میمی بی بی بھی ان کے رنگ میں رنگ گئیں جس روز صفدر صاحب اپنے سسر کے جنازے میں جا رہے تھے انہوں نے الگ بلا کر مجھے تاکید کی کہ میمی بی بی کی کسی سہیلی کو گھر میں داخل نہ ہونے دوں بلکہ میمی بی بی کے کمرے میں کسی کو رات گزارنے تو بالکل نہ دوں۔ ان کی شام کی فلائٹ تھی۔ سات بجے جب ڈرائیور دونوں میاں بیوی کو چھوڑ کر واپس آیا تو میں گیٹ پر ہی تھا۔ ڈرائیور نے کہا۔ لو خان صاحب اپنی تو پانچ دن کی چھٹی ہو گئی پھر وہ فوراً ہی جانے لگا تب میمی بی بی نے اسے بلایا اور پیزا منگوایا اور میں بھی اپنے کوارٹر کی طرف چل دیا۔ ابھی چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ گیٹ پر ہارن سنائی دیا۔ وہ پیزا لے کر واپس آ گیا تھا۔ میمی بی بی نے اس سے پیزا لیا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیں اور ساتھ ہی مجھ سے کہا۔ ''شرف الدین دس منٹ بعد کمرے میں آ جانا۔'' دس منٹ بعد جب میں ان کے کمرے میں پہنچا تو پیزا سامنے میز پر رکھا تھا اور میمی بی بی...

''بی بی آپ...'' میں بوتل اور گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''کیوں تمہیں حیرت کیوں ہو رہی ہے؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ ''تم نے بابا کو پیتے ہوئے نہیں دیکھا؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''دیکھا ہے لیکن...'' میں پوری طرح جواب نہیں دے سکا۔

''وہ اگر پی سکتے ہیں تو میں بھی انہی کی بیٹی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ گلاس لے کر میرے قریب آ گئیں۔

''آج میں تمہیں وہ عیش کرواؤں گی جو زندگی بھر نہیں بھولو گے۔'' انہوں نے گلاس کو میرے منہ کے قریب لاتے ہوئے کہا۔

''بی بی میں نے کبھی نہیں پی۔'' میں نے گلاس اپنے منہ سے دور کرتے ہوئے کہا۔

''پھر اب یہ نہ کہنا کہ تم عورت کے قریب بھی نہیں گئے۔'' میمی بی بی نے کہا اور ساتھ ہی میری شرٹ کے بٹن کھولنے لگیں۔

''شرف الدین شیطان کے بہکانے میں مت آنا۔'' میرے ذہن میں کسی نے سرگوشی کی لیکن اتنی دیر میں میمی بی بی میری شرٹ اتار کر مجھ سے چپک چکی تھیں۔ میرا سانس اتھل پتھل ہونے لگا۔

''چلو بیڈ پر چلو۔'' میمی بی بی نے کہا اور میں بغیر کچھ کہے ان کی بات ماننے لگا۔

''میمی بی بی نے پہلے دروازہ بند کیا اور پھر بستر پر میرے قریب آ کر لیٹ گئیں۔ میں پوری طرح شیطان کے بہکاوے میں آ گیا تھا پھر صبح تک ہمارے درمیان وہی کچھ ہوتا رہا جو اس موقع پر ہو سکتا ہے۔ صبح میمی بی بی نے مجھے اٹھایا۔

''کیسا رہا یہ تجربہ؟'' میں اٹھ کر بیٹھا تو میمی بی بی نے سوال کیا۔

''آپ بتائیں؟'' میں نے الٹا سوال کیا اور وہ ہنسنے لگی۔

''بہت ظالم ہو تم۔'' انہوں نے جواب دیا۔

وہ تمام دن میں سوتا رہا۔ نہ ناشتا کیا نہ دوپہر کا کھانا کھایا۔ شام میں چائے کے وقت میمی بی بی نے اٹھایا۔

''کھانا نہیں کھایا چائے تو پی لو۔'' میمی بی بی نے پیزا کا ایک ٹکڑا میری جانب بڑھایا۔ پیزا باسی بھی تھا اور ٹھنڈا بھی لیکن مجھے بھوک اتنی تھی کہ میں نے اس پر غور کیے بغیر کھانا شروع کر دیا۔

''انجوائے تو کیا تھا رات میں؟'' انہوں نے مجھ سے سوال کیا۔

''بہت۔'' میرا جواب تھا۔

''آج ڈبل انجوائے کرو گے۔'' میمی بی بی نے کہا۔

''وہ کیسے؟'' میں سوال کیے بغیر نہ رہ سکا۔'' شوفر کہہ رہا تھا۔

''میں نے اپنی دوست سیما کو آنے کے لیے کہا۔'' میمی بی بی کا جواب تھا۔

''نہیں بی بی یہ نہ کریں۔'' میں نے کہا تو میمی بی بی کے چہرے پر حیرت آگئی۔

''سیما تجربہ کار ہے وہ زیادہ انجوائے کروائے گی۔'' میمی بی بی نے کہا۔

''نہیں رہنے دیں انہیں۔'' میں نے کہا۔

''کیوں کیا ہوا رات تو بڑے جوش میں تھے۔'' میمی بی بی نے طنز کیا۔

''نہیں بی بی آپ کے سوا نہیں۔'' میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''تم کہتے ہو تو میں منع کر دیتی ہوں۔'' میمی بی بی نے کہا اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

''چائے تو لو۔'' میمی نے چائے کا مگ میری جانب بڑھایا۔

''کس نے بنائی چائے؟'' میں نے سوال کیا۔ شوفر کی کہانی جاری تھی۔

''میں تمہارے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتی۔'' میمی بی بی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''تو بس یہ تھی ہماری کہانی۔'' شوفر نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اسے جانے کا اشارہ کر دیا۔

''یہ بات تو کلیئر ہوگئی اب تم بتاؤ کہ تمہارے شوہر، صفدر صاحب اور شوفر کے علاوہ اور کون کون تمہاری زندگی میں آیا؟''

''تفصیل تو نہیں بتا سکتی لیکن اتنا وعدہ کرتی ہوں کہ تم میری زندگی کے آخری مرد ہو گے۔''

''کب تک قائم رہ سکو گی اپنے وعدے پر؟'' میں نے سوال کیا۔

''کبھی مجھے بے وفائی کرتا پاؤ تو وہیں قتل کر دینا۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم چاہتی ہو کہ تمہیں قتل کر کے پھانسی چڑھ جاؤں؟'' میں نے کہا۔

''جرم صرف اس وقت ثابت ہوتا ہے جب شواہد اور گواہ آپ کے خلاف ہوں۔'' اس نے کہا۔

''تم وکیل ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں نے اپنے شوہر گوہر کا مرڈر کیا کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ سب یہی سمجھتے رہے کہ گوہر کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا بلکہ اب تک لوگ یہی کہتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''تو کیا انہیں ہارٹ اٹیک نہیں ہوا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہوا تو ہارٹ اٹیک تھا لیکن اس کی وجہ دو گولیاں تھیں جو وہ ہر رات کھاتا تھا میرے پاس آنے سے پہلے۔'' اس نے کہا۔

''یعنی تم نے ڈوز بڑھا دی تھی؟'' میں نے کہا۔

''میں نے ایک دفعہ گوہر اور حکیم کی بات سن لی تھی۔ حکیم اس سے کہہ رہا تھا کہ دو گولیوں سے زیادہ مت لینا بھی ورنہ دل پر اثر ہوگا اور تم مر بھی سکتے ہو۔'' اس نے کہا اور میں اسے دیکھنے لگا۔

''تم نے اپنے شوہر کو قتل کر دیا اور چاہتی ہو کہ میں تم سے شادی کر لوں؟'' میں نے کہا۔

''میمی مجھے بتا چکی ہے کہ تم کوئی گولی نہیں کھاتے ہو لیکن پھر بھی......'' اس نے میمونہ کا فقرہ دہرانے کی کوشش کی لیکن فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور میں الجھ گیا، پتا نہیں میمونہ نے کیا کہہ دیا ہو۔

''میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔'' میں نے ایک نتیجے پر پہنچتے ہوئے کہا۔

''وجہ بھی بتا دو۔'' اس کا سوال معقول تھا۔

''تم جانتی ہو کہ ابھی میرے شوبز کے کیریئر کا آغاز ہے۔'' میں نے وجہ بتانی شروع ہی کی تھی کہ اس نے بیچ میں سے بات اچک لی۔

''مجھ سے شادی کے بعد تمہیں ماڈلنگ اور ٹی وی ڈراموں میں کام کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔'' اس نے کہا۔

''کیوں ضرورت نہیں رہے گی؟'' میں سوال کیے بنا

نہیں رہ سکا۔

''تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے کہ میرے پاس کتنی دولت ہے۔'' اس نے عجیب سے پُرغرور لہجے میں کہا۔

''مجھے اندازہ ہے۔'' میں نے کہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہ جس فارماسوٹیکل کمپنی کے تم مارکیٹنگ منیجر ہو، اس کی بولی کیا لگائی تھی، ایک ملٹی نیشنل کمپنی نے۔'' اس نے کہا۔

''میں جانتا ہوں کیونکہ اس ڈیل میں شروع سے آخر تک میں شریک رہا ہوں۔'' میں نے اس کے جواب میں کہا۔

''اور تم ہی تو تھے جس نے مجھے ڈیل کرنے سے روکا تھا۔'' اس نے کہا۔

''میں نے تمہیں بتا دیا تھا طوبیٰ کہ میں کیوں تمہیں ڈیل سے روک رہا ہوں۔'' میں نے پہلی بار اسے اس کے نام سے مخاطب کیا تھا ورنہ اب تک وہ میری میڈم تھیں اور میں ان کا ملازم۔ گوہر صاحب کی وفات سے کچھ دن پہلے ہی طوبیٰ نے کمپنی کا سارا کاروبار سنبھال لیا تھا اور میں ان کا چیف ایڈوائزر تھا۔ وہ ہر بات میں مجھ سے مشورہ کرتی تھی اور میں اپنی بساط کے مطابق اسے ٹھیک مشورہ دیتا تھا۔ اس نے ہی مجھے اسسٹنٹ منیجر مارکیٹنگ سے منیجر مارکیٹنگ بنایا تھا۔ اس وقت میں نے سمجھا تھا کہ میڈم میرے کام سے خوش ہو کر پروموشن دے رہی ہے لیکن اب جا کر معلوم ہوا کہ وہ تو کچھ اور ہی سوچے ہوئے تھی۔ دو روز قبل اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اتوار کی صبح گھر آسکتے ہو۔ میں نے پوچھا کب تک پہنچ جاؤں تو اس نے کہا تھا۔ ناشتا میرے ساتھ ہی کرنا اور ویسا ہی ہوا تھا۔

میں ناشتے سے پہلے اس کے یہاں پہنچ گیا تھا اور ناشتے کے بعد ان کے وسیع ڈرائنگ روم میں اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔

''تم نے بتایا نہیں کہ تم شادی سے کیوں انکاری ہو، کیا اس بات سے ڈر گئے کہ میں نے گوہر کو قتل کر دیا تھا اور اس خوب صورتی سے قتل کیا تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔''

''یہ تو بعد کی بات ہے، پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے اسے قتل کیا کیوں؟'' میرا سوال سن کر وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔

''میں کوئی بھی وجہ بتا سکتی ہوں لیکن میں سچ کہوں گی۔'' اس نے کہا۔

''میں بھی سچ ہی سننا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اس تمام عرصے میں جب ہم میاں بیوی رہے، کوئی دن ایسا نہیں تھا کہ اس نے نہ کہا ہو کہ میرے بعد یہ سب کچھ تمہارا ہوگا۔ اس نے میری یہ فرمائش بھی پوری کر دی کہ مجھے اپنے آفس میں آنے دو۔ مجھے کوئی عہدہ دے دو تاکہ میں کاروبار کی اونچ نیچ سمجھ سکوں۔ اس نے مجھے ڈپٹی ایم ڈی بنا دیا اور دفتر میں جگہ بھی دی لیکن جب میں نے وکیل سے وصیت ڈرافٹ کروائی تو وہ بپھر گیا۔ اس نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ تینوں بیویوں اور ان کے بچوں کا کیا ہوگا۔

''تب میں نے اپنے منصوبے پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ بازار سے اسی رنگ کے خالی کیپسول لائی اور چھ کیپسولوں کو خالی کر کے دو کیپسول بنائے اور انہیں اس بوتل میں رکھ دیا جہاں حکیم کے کیپسول رکھے جاتے تھے۔ میں نے باقی کے کیپسول ضائع کر دیے اب اس بوتل میں وہی دو کیپسول تھے جو درا صل دو نہیں چھ کیپسول تھے۔

''اس رات وہ گھر آیا تو بہت تھکا ہوا تھا۔ میں نے اس روز بہت سیکسی لباس پہنا تھا اور شاندار میک اَپ کیا ہوا تھا۔

''میں نے کھانا لگایا اور اس نے کھانے کی میز پر ہی کہا۔'' طوبیٰ آج تمہیں بہت قریب سے دیکھنے کو دل کر رہا ہے۔'' اور میں نے مسکرا کر بظاہر رضامندی ظاہر کر دی۔

''وہ بیڈروم میں آیا تو میں قابلِ اعتراض حالت میں لیٹی تھی جیسے اسی کا انتظار کر رہی ہوں۔ میں اس کی سوچ پر قابض ہونا چاہ رہی تھی اور پھر ویسا ہی ہوا جیسا میں نے چاہا تھا۔

''گوہر نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور دراز کی طرف بڑھ گیا جہاں اس کی کیپسولوں کی بوتل ہوتی تھی، اس نے دونوں کیپسول دیکھے۔'' آخری کیپسول ہیں کل صبح حکیم صاحب سے ملنا پڑے گا۔''

''کیپسول نگلتے ہوئے اس نے کہا تھا اور اگلے پانچ منٹ میں اس کی طبیعت بگڑنے لگی۔ میں نے سب سے پہلے کپڑے تبدیل کیے اور ساتھ ہی چیخنا شروع کر دیا۔'' کوئی ڈاکٹر کو فون کرو ایمبولینس منگواؤ۔''

''میرا شور سن کے منٹوں میں لوگ ہمارے بیڈروم کی طرف بھاگے تھے جب تک ڈاکٹر آتا یا ایمبولینس آتی اس نے آخری ہچکی لی اور میں اس کا انگوٹھا وصیت نامے پر لگا چکی تھی۔ سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی کہ وہ ایسی مشین تیار کر سکے جیسے یہ تمیز ہو کہ انگوٹھا لگانے والا انگوٹھا لگاتے ہو۔

زندہ تھا یا مر چکا تھا۔

''پولیس نے کیس عدالت میں پہنچایا لیکن پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بھی ہارٹ اٹیک ہی آیا تھا۔ وکیل کو البتہ میں نے اپنے حق میں گواہی دینے کے لیے دس لاکھ دیے تھے اس نے جج کے سامنے گواہی دی کہ گوہر صاحب نے وصیت تیار کرنے کے لیے کہا تھا۔

''عدالت کا فیصلہ میرے حق میں آیا اور میں گوہر کی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائداد کی مالک بن گئی۔''

''تم بہت چالاک ہو تم نے کس ہوشیاری اور منصوبہ بندی سے اپنے شوہر کو قتل کیا یہ سب جان لینے کے باوجود کون شخص ہوگا جو تمہارا شوہر بننا پسند کرے گا؟''

''تم شاید ایسا نہ کرو کیونکہ تمہارے سامنے ابھی شوبز کا پورا کیریئر ہے لیکن جب میں تمہیں بتاؤں گی کہ تم اپنے ڈرامے تیار کر سکتے ہو تو تم بھی تیار ہو جاؤ گے۔''

''لوگوں کو جب یہ معلوم ہوگا کہ میں نے بارہ سال بڑی ایک بیوہ سے شادی کی ہے اور اس کے لیے اسے چھوڑ دیا ہے جو برسوں تک میری گرل فرینڈ رہی ہے تو میرا شوبز کیریئر شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گا۔''

''ماڈلنگ اور ڈراموں سے کتنا کما لو گے؟'' طوبیٰ نے سوال کیا۔

''تمہاری سوچ سے بھی بڑھ کر۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ماڈل جس کی چند روز قبل تعریف کر رہی تھیں کہ بہت عرصے بعد اتنی خوب صورت ماڈل آئی ہے اس کے گھر کے بارے میں جانتی ہو۔ اس کا گھر تمہارے گھر سے بڑا اور اس کی گاڑیاں تمہاری گاڑیوں سے زیادہ قیمتی ہیں۔'' میں نے کہا اور اس کا منہ بن گیا۔

''کیا یہ سب اس نے ماڈلنگ اور ڈراموں کی آمدنی سے بنایا ہے؟'' طوبیٰ نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''مشہور تو یہی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ذرا سی تحقیق کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس کے کتنے چکر خلیج کے ممالک کے لگتے ہیں اور کون سے شیخوں کے گھر اس کا قیام ہوتا ہے۔'' طوبیٰ نے کہا اور میں نے یوں گردن ہلائی جیسے میں اس کی بات سن کر قائل ہو رہا ہوں۔

''تمہارے لیے یہ معلوم کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے کیونکہ اگر تم اس کے گھر جا سکتے ہو تو بہت کچھ معلوم کر سکتے ہو۔'' طوبیٰ نے کہا اور اب میں نے باقاعدہ ہنسنا شروع کر دیا۔

''ہنس کیوں رہے ہو؟'' طوبیٰ نے اچانک سوال کیا اور میں نے مصرع پڑھ دیا۔

''دیر سے ہوا میں گو کہ ہاں کی کمی ہے۔'' میں نے کہا اور طوبیٰ نے یوں سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہو۔ ''مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' اور پھر اس تاثر کو اس نے لفظوں میں کہہ دیا۔

''مجھے کیا ضرورت ہے اس سے جلنے کی۔'' یہ کہتے ہوئے طوبیٰ کا لہجہ عجیب سا تھا۔

''اس نے جو کچھ حاصل کیا، اپنی محنت سے حاصل کیا اب اس کی محنت پر جو چاہو تبصرہ کرو لیکن یہ نہیں کہہ سکتیں کہ اس نے کسی کو قتل کر کے اس کی دولت پر قبضہ کیا ہے۔'' میرا انداز چڑانے والا تھا۔

''میں نے قتل نہیں کیا بلکہ بدلہ لیا ہے۔'' طوبیٰ نے کہا۔

''کس بات کا بدلہ؟'' میں نے سوال کیا۔

''اس نے میری زندگی تباہ کی، میرے جذبات کو قتل کیا۔ برسوں پہلے جو اس نے میری محبت کو اس جرم میں قتل کیا کہ اس نے مجھ سے منگنی کیوں کی، اس کا بدلہ.....'' طوبیٰ کی آواز بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔

ابھی وہ یہیں تک پہنچی تھی کہ میں نے دیکھا کہ میمونہ اور شوفر آگے پیچھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔

''میں نے حماد کے گھر فون کیا تو معلوم ہوا کہ اسے آپ نے ناشتے پر مدعو کیا ہے۔'' میمونہ نے اندر آتے ہی کہا۔ ''مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔'' میمونہ نے..... تیکھے لہجے میں طوبیٰ سے کہا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو۔'' طوبیٰ نے جوابی وار کرنے کے انداز میں کہا۔ ''کس کی امید نہیں تھی تمہیں مجھ سے؟''

''شرفو مجھے پانچ منٹ میں سب کچھ بتا چکا ہے۔'' میمونہ کا یہ وار بہت کاری تھا۔

''میں تمہارے جال سے اسے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔'' طوبیٰ نے کہا۔

''مجھ سے بچا کر اپنے جال میں پھنسانا چاہ رہی تھیں۔'' میمونہ نے اپنے لہجے میں کوئی کمی نہیں آنے دی تھی۔

''اگر ایسا بھی ہے تو کیا غلط ہے؟'' طوبیٰ نے بُرا نہ ماننے والے انداز میں کہا۔

''آج سے پہلے تو آپ کے دعوے کچھ اور تھے۔'' میمونہ نے ایک اور وار کیا۔

''کیا دعوے تھے میرے؟'' طوبیٰ نے پلٹ کر کہا۔

''یہی کہ میں تمہیں عمرانہ سے زیادہ چاہتی ہوں' یہ کہتی

تھیں آپ۔'' میمونہ نے اپنے ہتھیار نیچے نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور میں نے ایک لمحے کے لیے طوبیٰ کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھے۔

''تو کیا غلط تھا اس میں؟'' طوبیٰ نے کہا۔

''اپنی بیٹی کی غلطی کو چھپا کے آپ نے اسے ایک شریف آدمی کے سر منڈھ دیا۔'' میمونہ کے لہجے میں تیزی تھی۔

''میرے اور اپنے بیچ یہ عمرانہ کو کیوں لا رہی ہو؟'' طوبیٰ کے لہجے میں پسپائی صاف نظر آ رہی تھی۔

''اگر آپ نے میرا گھر بننے سے پہلے ہی اُجاڑنے کا فیصلہ کیا ہے تو اتنا میں بھی بتا دوں کہ آپ کی بیٹی کا گھر بھی آباد نہیں رہے گا۔'' میمونہ کے وار جاری تھے۔

''کیا کر لوگی تم؟'' طوبیٰ کی آواز بھی بلند ہو چکی تھی۔

''میں وہ کر سکتی ہوں جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں۔'' میمونہ نے غصے سے کہا۔

''زیادہ سے زیادہ......'' طوبیٰ کا انداز چیلنج کرنے والا تھا۔

''پھوپو مت بھولیں کہ جب آپ کی بیٹی اسپین سے واپس آئی تھی تو حاملہ تھی اور آپ اپنی سی کوشش کر لینے کے بعد کسی ڈاکٹر کو تلاش کرنے میں ناکام رہی تھیں کہ اس کا ابارشن کروا دیں مگر کوئی ڈاکٹر بھی یہ غیر قانونی کام کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔'' میمونہ نے ایک اور وار کیا تھا۔

''اس کا ثبوت کہاں سے لاؤ گی؟'' طوبیٰ نے بھی جوابی حملہ کیا۔

''وہ ڈاکٹر جس نے ابارشن کیا تھا، وہ میری دوست ہے۔'' میمونہ نے کہا اور طوبیٰ کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہوئی۔

''جس طرح آپ نے شرفو کی گواہی دلوائی ہے اسی طرح وہ میری ڈاکٹر دوست بھی گواہی دے گی لیکن اس کی نوبت شاید آئے بھی نہیں۔'' میمونہ اتنا کہہ کر رک گئی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' طوبیٰ، میمونہ کے ادھورے فقرے سے مزید پریشان ہو گئی۔

''ابارشن کے تمام اخراجات میں نے اٹھائے تھے اس کی رسیدیں اب تک میرے پاس ہیں۔'' میمونہ کا یہ وار بھرپور تھا۔

''میں جانتی تھی کہ تم عورت نہیں ناگن ہو اسی لیے میں نے تمام رسیدیں سنبھال کر رکھی تھیں۔'' میمونہ نے یہ کہا۔

''اور تم سے تو میں بعد میں نمٹوں گی بے شرم انسان۔'' اس بار میمونہ کا مخاطب شرفو تھا۔

''میں نے کیا، کیا ہے؟'' شرفو نے کانپتے لہجے میں کہا۔

'ایک بڑھیا کے چکر میں آ کر تو میرے سارے احسانات بھول گیا۔'' میمونہ نے شرفو سے کہا اور شرفو واقعی کانپنے لگا مجھے شرفو پر ترس آنے لگا۔

''اسے تو بخش دو۔'' میں نے شرفو کی سفارش کرنی چاہی۔

''تم تو خاموش ہی رہو۔'' اس بار اس کی توپوں کا رخ میری جانب تھا۔

''تم اس سے کم احسان فراموش نہیں ہو۔'' اس کے لہجے کی تپش میں نے محسوس کی تھی۔

''تم پر کیس بنے' میں نے پاپا سے کہہ کر وہ ختم کروائے۔'' وہ اپنے کیے گئے احسانات گنوانے پر اتر آئی تھی۔

''گوہر صاحب پاپا کے دوست تھے۔ میں نے پاپا سے تمہاری سفارش کی اور انہوں نے گوہر صاحب سے کہہ کر تمہیں نوکری دلوائی۔'' میمونہ بولے جا رہی تھی اور جو کچھ وہ کہہ رہی تھی، وہ غلط نہیں تھا۔

گوہر صاحب نے انٹرویو کے دوران ہی کہا تھا کہ ''تم صفدر صاحب کو کیسے جانتے ہو؟'' ان کا سوال تھا۔

''ان کی بیٹی میرے ساتھ پہلے یونیورسٹی اور پھر آئی بی اے میں تھی۔''

''وہ صرف تمہاری دوست ہے یا دوست سے بھی بڑھ کر کچھ ہے؟'' گوہر صاحب کا دوسرا سوال تھا۔

''صرف دوستی ہے اور وہ بھی آئی بی اے آنے کے بعد ہوئی ہے۔'' میں نے گوہر صاحب کو جواب دیا تھا۔

''صفدر صاحب تو کچھ اور کہہ رہے تھے۔'' گوہر صاحب نے کہا تھا۔

''مثلاً کیا کہہ رہے تھے؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ کہہ رہے تھے کہ تم میں وہ اپنا داماد دیکھ رہے ہیں۔'' گوہر صاحب نے کہا اور میں خاموش رہا تھا۔

''میں تمہاری خاموشی کو رضامندی سمجھوں؟'' گوہر صاحب کا اگلا سوال تھا۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں، شادی تو بہت دور کی بات ہے ابھی تو میں نوکری کی تلاش میں ہوں۔'' میں نے اقرار کیا تھا نہ انکار، میں نے گول مول سا جواب دیا تھا۔

''میمونہ میری بیٹی کی طرح ہے۔'' گوہر صاحب نے کہا تھا۔ ''اس سے شادی کر کے نقصان میں نہیں رہو گے بس تمہیں ان کے ماحول میں خود کو ایڈجسٹ کرنے میں کچھ

مشکلات آسکتی ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے مدھم لہجے میں کہا تھا۔

"وہ فیملی ذرا آزاد خیال ہے، باپ، بیٹی ایک ٹیبل پر جُوا کھیلتے ہیں۔" گوہر صاحب نے مجھے خبر دار کیا تھا۔

"میں واقف ہوں سر۔" میں نے کہا۔

"اتنا جانتے ہو تو تمہیں ایڈجسٹ کرنے میں مشکل نہیں ہوگی۔" گوہر صاحب نے کہا۔

"میں تو شاید ایڈجسٹ کر لوں لیکن میمونہ شاید میرے گھر کے ماحول میں ایڈجسٹ نہ کر سکے۔" میں نے یہ سوچا ضرور تھا مگر زبان سے ایک لفظ نہیں کہا۔ میں میمونہ اور ان کے والد کو اس غلط فہمی میں رکھنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے شکار کرنے میں کامیاب رہیں گے البتہ میمونہ کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ میرا خاندان دقیانوسی قسم کا ہے۔ میری بہنیں پردہ نہیں کرتی ہیں لیکن دوپٹا اوڑھتی ہیں۔ یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں۔ ایک ڈاکٹر بہن جس کی شادی ہوگئی تھی اس کی سسرال والے ہم سے بھی پرانے خیالات کے لوگ تھے۔ میری بہن پوسٹ گریجویشن کرنا چاہتی تھی لیکن اسے اس کی اجازت نہیں ملی۔ میں نے میمونہ پر واضح کر دیا تھا کہ اگر وہ میری شریکِ حیات بننا چاہتی ہے تو اسے اپنا یہ ماڈرن لباس، شراب اور جُوا چھوڑنا ہوگا۔ دوسری جانب میمونہ بھی میری نماز اور مذہبی کتابوں کے مطالعے سے شاکی تھی۔ ہم دو مختلف طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔ میں فریئر ہال کے اس طرف رہتا تھا جہاں ان باتوں کو اہمیت دی جاتی تھی جبکہ میمونہ فریئر ہال کے دوسری طرف کی رہائشی تھی جہاں مغربی تہذیب کا دور دورہ تھا۔

میمونہ کے والد بڑے فخر سے میرا تعارف اپنے دوستوں میں بیٹی کے بوائے فرینڈ کے طور پر کرواتے تھے، انہیں اس پر بھی اعتراض نہیں تھا کہ میں ہر ہفتے کی رات ان کے گھر کیوں آجاتا ہوں اور آدھی رات کے قریب ان کی بیٹی کے برابر کے کمرے میں کیوں چلا جاتا ہوں۔ انہوں نے کبھی مجھ سے ناشتے کی میز پر یہ نہیں پوچھا کہ رات کہاں گزاری اور کس کے ساتھ گزاری۔ ان کے حلقے میں یہ سوال معیوب سمجھے جاتے تھے بلکہ اسے ذاتی آزادی میں مداخلت تصور کیا جاتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر انہوں نے اس طرح کا کوئی سوال کیا تو میرے بجائے ان کی بیٹی جواب دے گی۔

میری اپنی فیملی کو البتہ اس پر اعتراض تھا کہ ہر ہفتے کی رات میں کہاں جاتا ہوں اور پھر دوپہر میں گھر آتا ہوں۔

اماں کا ہر ہفتے ایک ہی سوال ہوتا تھا اور میں ہر بار کوئی نیا بہانہ تراش لیتا تھا مگر یہ راز بہت عرصہ تک راز نہیں رہ سکا تھا۔

"بھائی کل میریٹ کی ہائی ٹی پر وہ سانولی سی لڑکی آپ کے ساتھ کون تھی؟" میری بہن نے ایک اتوار کی صبح پوچھ ہی لیا۔

"میریٹ میں تم کیا کر رہی تھیں؟" میں نے جواب دینے کے بجائے سوال کر ڈالا۔

"میری کلاس کی ایک لڑکی کی سالگرہ تھی۔ اس نے بلایا تھا۔" اس کا جواب تھا۔

"دیکھ لیا تھا تو وہیں ہماری ٹیبل پر آجاتیں، میں تعارف کروا دیتا۔" میں نے کہا۔

"میری دوست بھی ساتھ تھیں اور مجھے ان کے ساتھ یہ کہتے ہوئے شرم آرہی تھی کہ میرا بھائی ایک الٹرا ماڈرن لڑکی کے ساتھ میریٹ میں ڈیٹ کر رہا ہے۔" بہن نے کہا تھا۔

"میں ڈیٹ نہیں کر رہا تھا بلکہ اسے ٹریٹ دینے لے گیا تھا اس کی وجہ سے ہی تمہارے بھائی کو نوکری ملی ہے۔"

"میرے سوال کا اب بھی جواب نہیں دیا آپ نے۔" اس نے سوال کیا۔

"وہ آئی بی اے میں میرے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ اس کے ابا شہر کے بڑے آدمی ہیں۔ میمونہ نام ہے اُس کا۔"

"نام تو گھسا پٹا ہے مگر وہ خود تو بہت ماڈرن تھی۔ جینز اور بغیر آستینوں کی شرٹ میں تھی اور آپ سے چپک کر بیٹھی ہوئی تھی۔" بہن نے کہا اور میں خاموش رہا۔

"بھائی سچ بتانا کہیں تم اسے ہماری بھابی بنانے کا تو نہیں سوچ رہے؟" اس نے براہِ راست سوال کیا۔

"پاگل ہوگئی ہو۔" میں نے تقریباً ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔

"اب اس بات کو اپنے تک رکھنا۔ اماں یا ابا کو بتایا تو ایک ہنگامہ ہو جاتا ہے۔" میں نے اسے خبردار کرنا ضروری سمجھا تھا۔

"پاگل ہوئے ہو کیا۔" اس نے کہا اور بات آئی گئی ہوگئی۔ اس وقت میرا یہی خیال تھا کہ بات ختم ہوئی لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ اگلا طوفان ابھی آنا ہے۔ میمونہ کے والد کا انتقال ہوا تو میں نے گھر پر سرسری سا ذکر کیا تو اماں جانے کے لیے تیار ہوگئیں۔ ان کا ساتھ ابا نے بھی دیا اور ہم سب میمونہ کے گھر پہنچ گئے۔ اماں اور بہنیں خواتین میں چلی

گئیں، میں اور ابا مردوں میں آ گئے۔ جب تک ہم وہاں رہے۔ اس وقت تک امن رہا لیکن گھر پہنچتے ہی گولہ باری شروع ہو گئی۔ سب سے پہلے گولہ اماں کی توپ نے فائر کیا۔
''تم ہر ہفتے بہانے بناتے رہے لیکن آج معلوم ہوا کہ ہفتے کی رات تم کہاں گزارتے تھے۔ جس خاتون سے بھی میں نے تعارف کروایا کہ میں حماد کی ماں ہوں، اس نے یہی کہا کہ کب کر رہی ہیں آپ بیٹے کی شادی۔ میں حیران ہوتی رہی کہ جس لڑکی کو میں پہلی بار دیکھ رہی ہوں، اسے بہو کیسے بنا سکتی ہوں۔'' اماں کا لہجہ ماتمی تھا۔ اماں نے بات شروع کی تو ابا کیسے پیچھے رہ جاتے۔
''مردوں میں یہی سوال مجھ سے کیے جاتے رہے اور میرا ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ ''حماد نے تو کبھی گھر پر ذکر نہیں کیا۔'' ابا نے کہا اور ابا کی بات ختم ہوتے ہی اماں نے دوبارہ سے مورچا سنبھال لیا۔
''کچھ بھی ہو جائے میں اتنی ماڈرن بہو کو برداشت نہیں کروں گی۔ یہ تو اس کلموہی نے مجھے راستے میں بتایا کہ بھیا اس کے ساتھ ڈیٹ پر جاتے رہے ہیں۔'' اماں کا رخ اچانک بہن کی طرف ہو گیا۔ میں نے بہن کو گھورا تو اس نے فوراً اپنی بے گناہی میں کہنا شروع کیا۔
''میں نے تو اس کے بعد کہا تھا جب اس کی پھوپی نے کہا تھا کہ ''ہمارے خاندان میں ہر شخص کی بچپن سے خواہش تھی کہ میمونہ کو اپنی بہو بنائیں، سوچا تھا کہ گھر کی لڑکی ہے گھر میں ہی رہے گی مگر جب میں نے بھائی سے ذکر کیا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ وہ تو اپنا شریک حیات پہلے ہی چن چکی ہے اور اس کے ساتھ ہی ہماری ملاقات ان کے بیٹے سے کروائی تھی۔ میں نے کہا بھی کہ بھیا فیصلے کا اختیار تو آپ کے پاس ہونا چاہیے لیکن وہ مسکرا کر چپ ہو رہے۔ بہن آپ پرانے زمانے میں رہ رہی ہیں آج کل لڑکے لڑکیاں اپنی پسند کے آگے کسی کی نہیں سنتے ہیں۔'' انہوں نے کہا تھا اور میں خاموش ہو گئی تھی کہ جوڑے تو آسمان پر بنتے ہیں اب اگر میرے بیٹے کے نصیب میں میری بھتیجی نہیں ہے تو نہ سہی حالانکہ کوئی کمی نہیں ہے میرے بیٹے میں ماشاء اللہ زمینیں سنبھالتا ہے، گھر میں روپے پیسے کی ریل پیل ہے مگر بھائی تو اپنی ماڈرن بیٹی کے آگے بات کرنے کو بھی تیار نہیں تھے۔'' اماں میمونہ کی پھوپی کی باتیں دہرا رہی تھیں اور ساتھ ہی آنسو بہا رہی تھیں۔
''انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ ان کا بیٹا میٹرک میں تین بار فیل ہو چکا ہے اور جن زمینوں کی وہ بات کر رہی تھیں وہ صفدر صاحب کی ہی زمینیں ہیں۔ وہ صرف ان کی نگہبانی کرتا ہے اور اپنا حصہ رکھ کر باقی کی رقم ماموں کو پہنچاتا ہے۔'' میں نے دخل دیا تو اماں نے دوبارہ سے مجھ پر گولہ باری شروع کر دی۔
''تو بڑا حمایتی بن رہا ہے۔'' اماں کا لہجہ ذلیل کرنے والا تھا۔ ''ارے جس لڑکی نے باپ کی موت پر نئے کپڑے پہنے ہوئے ہوں ایک آنسو نہ بہایا ہو وہ ہماری موت پر کیا روئے گی۔'' اماں نے ایک دوسرے زاویے سے حملہ کیا لیکن اس بار ابا میری مدد کو آئے۔
''تم اپنی ہی بات کیے جاؤ گی یا اس کی بھی کچھ سنو گی۔'' ابا نے اماں کو مخاطب کیا۔
''میں نے اس سے پوچھا تھا کہ معاملہ کیا ہے لیکن اس نے صاف انکار کر دیا کہ ابا یہ سب ان لوگوں کی اختراع ہے میں نے کبھی ان سے رشتے کی بات نہیں کی۔'' ابا کا فقرہ ختم ہوا تو اماں پھر سے شروع ہو گئیں۔
''اس نے کچھ تو اشارہ دیا ہوگا کہ بات اتنی آگے بڑھ گئی کہ انہوں نے اپنے تمام رشتے داروں اور احباب میں یہ مشہور کر دیا۔''
''وہ لاکھ بار مشہور کرتے رہیں فیصلہ تو ہمیں کرنا ہے۔'' ابا نے اس انداز میں کہا جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچ چکے ہیں۔
''تم سب کان کھول کر سن لو خاص طور پر تم حماد اس گھر میں میری بہو بن کر اگر آئے گی تو وہ صرف طاہرہ ہوگی، میری بہن کی بیٹی۔'' اماں نے بھی گویا فیصلہ کر لیا تھا۔
''کیا کہہ رہی ہیں اماں؟'' میری بہن نے سب سے پہلے صدائے احتجاج بلند کیا۔
''اپنے اتنے تعلیم یافتہ بیٹے کے لیے وہ انٹر فیل لڑکی۔'' بہن نے کہا اور ابا فوراً ہی اس کی تائید کے لیے آگے بڑھ آئے۔
''تمہاری ماں اپنی بہن کی محبت میں بیٹے کی زندگی برباد کرنے سے گریز نہیں کرے گی۔'' ابا نے کہا۔
''جو میں نے کہنا تھا کہہ چکی، اب تمہاری مرضی ہے کہ اسے بہو بنا کر لے آؤ لیکن اس سے پہلے مجھے کہہ دینا میں اپنا ٹھکانا کہیں اور کر لوں گی۔'' اماں نے کہا۔
''کہاں جاؤ گی بہن کے گھر۔'' ابا نے تفریح لینے والے انداز میں کہا۔
''اماں سیالکوٹ بھی جا سکتی ہیں۔ مرحوم صفدر صاحب کی بہن کے گھر۔'' بہن نے باپ کی بات آگے

بڑھائی۔

''چند گھنٹوں میں بات اتنی آگے بڑھ گئی ہے۔'' ابا کا تفریح لینے والا انداز جاری تھا۔

''وہی تو ایک عورت تھی جو بھائی کے مرنے پر رو رہی تھی۔'' اماں نے اس کی تعریف کی۔

وہ رات میں نے بڑے کرب میں گزاری۔ کبھی طوبیٰ یاد آتی کبھی شرفو کا چہرہ میرے سامنے آجاتا اور کبھی خود میمونہ آجاتی۔ میمونہ کے الفاظ یاد آتے اور میں کروٹیں لیتا رہا۔

صبح آنکھ کھلی تو اذانیں ہو رہی تھیں۔ میں نے نماز پڑھی، ابھی پہلی رکعت میں تھا کہ موبائل کی گھنٹی بجنی شروع ہوئی اور پھر بجتی چلی گئی۔ میں نے نماز ختم کر کے موبائل اٹھایا تو دیکھا میمونہ کال کرتی رہی تھی۔ میں نے اسے ڈائل کیا تو اس کی ناراض آواز میرے کانوں میں آئی۔

''کتنی دیر سے فون کر رہی ہوں اٹھایا کیوں نہیں؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔

''نماز پڑھ رہا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تم اتنی صبح کیسے اٹھ گئیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں تو رات بھر سو نہیں سکی۔'' اس کا لہجہ بھرایا ہوا تھا اور میں ذہنی طور پر اس کے کسی نئے جھوٹ کے لیے تیار ہو گیا جو اس نے بولنے میں دیر نہیں کی۔

''پاپا یاد آرہے تھے۔'' اس نے کہا اور میں اس کے جھوٹ پر مسکرا دیا۔ ''جو لڑکی باپ کے جنازے پر نہ روئی ہو وہ باپ کو یاد کیسے کر سکتی ہے؟'' میرے ذہن میں سرگوشی ہوئی پھر فوراً ہی وہ مطلب پر آگئی۔

''حماد اب میرا دنیا میں تمہارے سوا کوئی نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

''کیوں شرفو بھی تمہیں چھوڑ گیا؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں سوال کیا۔

''وہ مجھے بتا چکا ہے کہ بیگم صاحبہ نے مجھے پانچ ہزار روپے دیے تھے اور پوری کہانی بھی بتائی تھی کہ حماد کے سامنے یہ دہرانا ہے۔'' اس نے کہا اور میں ہنسنے لگا۔

''تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے؟'' اس نے کہا اور میری ہنسی اور تیز ہو گئی۔

''تو رات بھر تم اس کہانی کا توڑ یاد کرتی رہی تھیں؟'' میں نے کہا۔

''حماد اس لہجے میں بات کرو گے تو نقصان میں رہو گے۔'' اس کے لہجے میں دھمکی آگئی۔

''اگر طوبیٰ نے پانچ ہزار دے کر یہ کہانی یاد کروائی تھی تو تم دس ہزار میں اپنی کہانی یاد کروا دینا۔'' میں نے کہا۔

''حماد تمہیں کیا ہو گیا ہے، یہ کس انداز میں بات کر رہے ہو؟'' اس نے احتجاج کیا۔ ''مجھ پر رحم کھاؤ حماد۔'' اس کی اچانک بھرائی ہوئی آواز آئی۔

''کس بات پر رحم کھاؤں؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں نے آج تک جتنے جھوٹ بولے ہیں، تمہاری محبت میں بولے ہیں۔'' میمونہ نے کہا۔ ''میں اپنا سب کچھ تمہارے حوالے کر چکی ہوں اب تم نے ٹھکرا دیا تو میں کہیں کی نہیں رہوں گی۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے رونا شروع کر دیا۔ میرا دل چاہا کہ میں اسے تسلی دوں لیکن میں خاموش رہا۔

''تم کچھ بولتے کیوں نہیں؟'' اس نے کچھ دیر انتظار کے بعد کہا۔

''تم نے جو کچھ میرے حوالے کیا ہے، وہ اس سے پہلے نہ جانے کتنوں کے حوالے کر چکی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے باسی کھانا کھلاتی رہیں اور اس کا بھی احسان جتا رہی ہو۔''

''حماد خدا کے لیے مجھے یوں اکیلا نہ چھوڑو۔'' میمونہ کے لہجے میں التجا تھی۔

''اس کی کیا گارنٹی ہے کہ اس بار میں معاف بھی کر دوں تو کوئی نیا شرفو تمہاری زندگی میں نہیں آئے گا؟''

''تم کیا گارنٹی چاہتے ہو؟'' اس نے سوال کیا۔

''صرف اتنی کہ تم اپنا تمام کاروبار، منقولہ اور غیر منقولہ جائداد میرے نام کر دو۔'' میں نے کہا اور میمونہ خاموش ہو گئی۔

''ابھی تو میرے نام کوئی جائداد نہیں۔'' کافی دیر بعد اس نے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ صفدر صاحب کی تم واحد وارث ہو لیکن جائداد کے ٹرانسفر میں وقت لگتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''پاپا کچھ جائداد پھوپی کے نام کر چکے ہیں۔'' میمونہ نے کہا لیکن مجھے اس میں بہانہ بازی کی جھلک نظر آئی تھی۔

''ہو سکتا ہے کہ تم صحیح کہہ رہی ہو لیکن میں صرف اس حصے کی بات کر رہا ہوں جو تمہارے نام پر ہے یا ورثے میں تمہیں مل سکتا ہے۔''

''آج پاپا کا سوم ہے۔ تم آؤ گے تو ہمارے وکیل سے مل لینا پھر جیسا وکیل صاحب کہیں۔''

''طوبیٰ تو فوری طور پر اپنی تمام جائداد میرے نام کرنے کو تیار ہے۔'' میں نے کہا۔

''تم اس ناگن کو نہیں جانتے، وہ کتنی بڑی جھوٹی ہے۔ ناگن ہے وہ پوری ناگن۔'' میمونہ نے کہا تھا۔

''یہ دولت اس کی دولت نہیں ہے، یہ دولت اس نے اپنے شوہر کو قتل کر کے حاصل کی ہے۔'' میمونہ نے کہا۔

''وہ یہ بتا چکی ہے۔'' میں نے کہا تو میمونہ کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

''اس نے یہ بھی بتایا کہ اس نے اپنے شوہر کو قتل کس طرح سے کیا کہ اس پر کوئی الزام بھی نہ آ سکا۔'' میں نے کہا اور میمونہ کو جیسے سکتہ ہو گیا۔ وہ بہت دیر تک خاموش رہی۔

''اس نے یہ نہیں بتایا ہوگا کہ اس نے گوہر کو جو اس سے تین گنا زیادہ عمر کا تھا، گھیرا کس طرح سے تھا؟'' میمونہ بہت دیر کی خاموشی کے بعد بولی۔

''اس نے کہا تھا کہ کالج کے سالانہ فنکشن میں گوہر نے اسے دیکھا تھا اور پہلے اس نے اس کے منگیتر کو قتل کروایا اور پھر اس کے بھائی کو اغوا کروالیا اور رشتہ یہ کہہ کر بھجوایا کہ رشتہ منظور نہ کیا یا پولیس سے رابطہ کیا تو وہ اس کے بھائی کو قتل کروا کر لاش بھجوا دے گا۔'' میں نے وہی کہا جو طوبیٰ نے بتایا تھا۔

''یہاں تک صحیح ہے کہ اس کی ملاقات گوہر سے کالج کے سالانہ فنکشن میں ہوئی تھی۔'' میمونہ نے کہنا شروع کیا۔ ''اس کے بعد اس نے جو کہا، وہ سب فکشن ہے۔'' میمونہ نے کہا۔

''حقیقت کیا ہے اگر یہ جھوٹ ہے تو؟'' میں نے سوال کیا۔

''اس کا منگیتر صرف منگیتر نہیں تھا بلکہ اس کا چچا زاد بھی تھا، کوئی چھوٹی موٹی سرکاری نوکری کرتا تھا۔ وہ بے چارہ اس ناگن کا پہلا شکار تھا۔'' میمونہ نے کہا۔

''میں سمجھا نہیں، تم کیا کہہ رہی ہو؟'' میں نے کہا۔

''گوہر سے ملنے سے پہلے وہ اپنے منگیتر کے ساتھ گھومتی پھرتی تھی۔'' میمونہ نے کہنا شروع کیا۔

''تمہیں یہ بات کس نے بتائی؟'' میرا اگلا سوال تھا۔

''اس کالج کی پرنسپل نے۔'' میمونہ نے کہا تھا۔

''جس کالج سے میں نے انٹر کیا تھا، یہ ناگن بھی اسی کالج سے پڑھی تھی اور پرنسپل اس زمانے میں لیکچرار ہونے کے ساتھ طوبیٰ کی رازدار سہیلی بھی تھی۔ ''اسٹوڈنٹ آف دی ایئر بنوانے میں بھی اسی کا ہاتھ تھا۔'' میمونہ کہتی چلی گئی۔

''گوہر نے جب اسے ٹرافی دی تو اس نے بہت آہستگی سے کہا تھا کہ ''اس عمر میں آپ اتنے اسمارٹ ہیں، تو جوانی میں کتنے اسمارٹ ہوں گے۔'' اور گوہر جو بنیادی طور پر ایک حسن پرست آدمی تھا، اس فقرے پر لٹو ہو گیا۔'' میمونہ نے کہا اور میں اس کی آواز سننے کے لیے بے چین ہو گیا۔

''طوبیٰ کے والد کسی سرکاری محکمے میں نائب قاصد تھے مگر اعلیٰ درجے کے راشی تھے اسی لیے ان کے گھر میں پیسے کی تنگی نہیں تھی لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ کھلے ہاتھوں جو چاہیں خرچ کر سکیں۔ اپنے بھتیجے کو انہوں نے... اپنے محکمے میں کہہ سن کر کلرک بھرتی کروا دیا تھا۔ امتیاز کی نوکری لگی تو اس کی ماں کو بہو کی تلاش شروع ہوئی مگر امتیاز نے گھر پر کہہ دیا کہ وہ شادی کرے گا تو طوبیٰ سے۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ خاندان کی لڑکی تھی۔ پوری طرح دیکھی بھالی تھی اور صحیح بات یہ ہے کہ اس زمانے میں طوبیٰ خوب صورت بھی بہت تھی اب ڈھلتی عمر کے ساتھ بھی وہ اتنی بُری نہیں ہے۔ اپنی جوانی کو سنبھالنے کے لیے وہ چہرے کے دو آپریشن کروا چکی ہے۔ کریموں کا استعمال اس کے علاوہ ہے۔'' میمونہ اس کے بھانڈے پھوڑ رہی تھی جسے وہ پھوپی کہتے تھکتی نہیں تھی۔

''کھنڈرات بتاتے ہیں کہ عمارت تھی شاندار۔'' میں نے کہا اور فون پر میمونہ کی ہنسی کی آواز آئی۔

''شاید اسی لیے تم اسے شریکِ حیات بنانے پر غور کر رہے ہو۔'' اس نے کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''تم اور شرفو جب اس ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے ہو اس سے چند لمحے پہلے میں اس کی آفر ٹھکرا چکا تھا۔''

''یہ تم نے بہت اچھا کیا۔'' میمونہ نے کہا۔

''اسے ٹھکرانے کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ تمہارا راستہ صاف ہو گیا۔'' میں نے کہا اور میمونہ کی آواز آنی بند ہو گئی۔

''کیا کوئی اور بھی تمہاری نظر میں ہے؟'' میمونہ کی آواز کافی دیر بعد میرے کانوں میں آئی۔

''میری والدہ نے اپنی بھانجی کو میری دلہن بنانے کی بات کی تھی۔'' میں نے کہا۔

''اور تم نے اسے بھی منع کر دیا تھا۔'' میمونہ کا سوال تھا۔

''مجھ سے پہلے ہی میرے والد اور بہنوں نے سختی سے منع کر دیا۔''

''اور وجہ کیا تھی؟'' میمونہ نے یہ پوچھنا اپنا فرض سمجھا

تھا شاید۔

''بہنوں کا کہنا تھا کہ جولڑکی شلوار پر جوگر پہنتی ہے وہ ہماری بھابی نہیں بن سکتی۔''

''تمہارے گھر والے بھی عجیب ہیں جسے فیشن کی تمیز ہوتی ہے اسے بھی مسترد کرتے ہیں اور جسے تمیز نہیں ہوتی ہے وہ بھی مسترد ہوجاتی ہے۔'' میمونہ نے کہا۔

''شکر کرو کہ انہیں تمہارے ماڈرن کپڑوں پر اعتراض ہے ورنہ اگر انہیں تمہارے اور شرفو جیسے لوگوں کے بارے میں معلوم ہوجائے تو وہ تمہیں منہ بھی لگانا پسند نہ کریں۔'' میں نے کہا۔

''ان لوگوں میں تو تم بھی شامل ہو۔'' میمونہ نے جواب دینے میں دیر نہ لگائی۔

''شامل ہوں لیکن ان تعلقات کی ابتدا تم نے کی تھی۔'' میرا جواب بھی فوری تھا جس کے بعد اس نے کوئی جواب دیے بغیر لائن کاٹ دی۔

''اگر واقعی یہ گھر تک پہنچ گئی اور اس نے ہمارے تعلقات کی تفصیل بتا دی تو ابا مجھے گھر سے نکال دیں گے۔'' میرے دماغ کے کسی حصے نے سرگوشی کی لیکن میں نے اسے جھٹک دیا۔

☆☆☆

دن پوری طرح نکل آیا تھا۔ میں اپنے کمرے سے باہر نکلا تو ناشتے کی میز سجی ہوئی تھی۔ دونوں بہنیں میز پر تھیں اور اماں ناشتا سجا رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اماں نے کہا۔ ''اچھا ہوا کہ تم آگئے۔ یہ جب سے شور مچا رہی تھی کہ میرا ٹیسٹ ہے اور مجھے ناشتے میں دیر ہوجائے گی۔'' اماں نے اس بہن کی جانب اشارہ کیا جو یونیورسٹی میں ایم اے کی طالبہ تھی۔

''آرام سے ناشتا کرو، میں چھوڑ دوں گا۔'' میں نے اسے اطمینان دلایا۔

''راستے سے میری دوست کو بھی پک کرنا ہوگا۔'' اس نے فرمائش آگے بڑھائی۔

''اب یہ نئی دوست کہاں سے آگئی؟'' میں نے سوال کیا۔

''چار سال سے ہم ایک ہی کلاس میں ہیں۔ وہ میری دوست ضرور ہے لیکن نہ ہی میں اس کے گھر کبھی گئی نہ وہ میرے گھر آئی۔'' میری بہن بول رہی تھی اور میں سن رہا تھا۔

''یہ کیسی دوستی ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''میری تو دوستی ہے لیکن وہ آپ کو بھی جانتی ہے۔'' بہن نے کہا۔

''مجھے وہ کس طرح جانتی ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''کل اسے ایک ڈرامے کی آفر ہوئی تھی تو اس نے میل لیڈ میں آپ کا نام لیا تھا لیکن پرابلم یہ ہوئی کہ ہدایت کار نے کہا۔ ''حماد دن میں کام نہیں کرتا اور تم رات میں کام کرنے کو تیار نہیں ہو اس طرح تو ہماری سیریل لٹک جائے گی۔''

''کون ہے یہ ذات شریف؟'' میں نے سوال کیا۔

''ابھی چند منٹ میں آپ کی ملاقات اس سے ہو جائے گی اتنے بے چین کیوں ہو رہے ہیں؟'' بہن کا جواب تھا۔

''اس کا نام ہی بتا دو۔'' میں نے کہا۔

''نام بھی آپ اس سے ہی پوچھ لینا۔'' اس نے نام بتانے سے بھی گریز کیا۔

اسی طرح کی باتیں کرتے ہوئے ہم اس کے گھر پہنچ

چٹکلا

ایک نیا شادی شدہ جوڑا کسی تفریحی مقام پر ہنی مون منانے گیا۔ منیجر نے جب پوچھے بغیر ان کا نام رجسٹر میں لکھ لیا تو بیوی بہت حیران ہوئی، اس نے منیجر سے پوچھا۔ ''آپ کو میرے شوہر کا نام کیسے معلوم؟''

منیجر نے جواب دیا۔ ''یہ ہمارے پرانے کرم فرما ہیں۔ ہر سال ہنی مون منانے کے لیے ہمارے ہوٹل میں ہی تشریف لاتے ہیں۔''

☆☆

ایک لڑکا رشتے کے سلسلے میں لڑکی دیکھنے گیا۔ لڑکے کو لڑکی پسند آگئی تو اس نے لڑکی سے پوچھا۔ ''کیا آپ کے والد کی حیثیت اتنی ہے کہ وہ مجھے سلامی میں کار دے سکیں؟''

لڑکی نے جواب دیا۔ ''میرے ابا کی حیثیت تو ہوائی جہاز دینے کی ہے لیکن کیا آپ کے ابا کی حیثیت ائر پورٹ بنانے کی ہے؟''

انتخاب، سید اکبر شاہ، مانسہرہ

گئے۔

پھر جو لڑکی ہماری گاڑی کی طرف آئی تھی اسے میں بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ نسرین تھی۔ ٹی وی ڈراموں کی ابھرتی ہوئی اداکارہ تھی لیکن اکثر ڈائریکٹر اس لیے اسے کاسٹ نہیں کرتے تھے کہ وہ رات کی شفٹ سے معذرت کر لیتی تھی۔ ''مجھے گھر سے اجازت نہیں ہے۔'' ایک بار ایک پروڈیوسر کے دفتر میں، میں موجود تھا جب اس نے یہ کہہ کر معذرت کر لی تھی لیکن جب وہ چلی گئی تو ڈائریکٹر نے کہا۔

''طوائف کی بیٹی ہے اور نخرے شریف زادیوں والے کرتی ہے کہ ''گھر سے اجازت نہیں ہے'' اس نے کہا اور میں اس سے الجھ پڑا تھا۔

''آپ کیا چاہتے ہیں؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''یہ جو بہت سی ہیں جو شریف گھرانوں سے آئی ہیں لیکن ان کی حرکتیں طوائفوں سے بڑھ کر ہیں، آپ یہ چاہتے ہیں کہ یہ بھی اُن جیسی ہو جائے۔'' میرا انداز کچھ زیادہ ہی تلخ تھا شاید اسی لیے ڈائریکٹر نے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا اور بات وہیں پر ختم ہو گئی تھی۔

''خیر تو ہے آج حماد صاحب میرے غریب خانے پر آئے ہیں؟'' اس نے پچھلی سیٹ پر دوسری بہن کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔ بڑی بہن پسنجر سیٹ پر تھی۔

''یہ ہمیں یونیورسٹی ڈراپ کرنے جا رہے تھے تو میں نے کہا راستے سے میری دوست کو بھی لینا ہے۔'' بڑی بہن نے اگلی سیٹ سے جواب دیا۔

''چلو اسی بہانے یہ آ تو گئے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بھی اسی بہانے ان کا شکریہ ادا کرنے کا موقع مل گیا۔''

''کیسا شکریہ؟'' میں نے سوال کیا۔

''چند دن قبل آپ میری وجہ سے ندیم صاحب سے اُلجھ گئے تھے۔'' نسرین نے کہا۔

''تو وہ بات آپ تک پہنچ گئی؟'' میں نے کہا اور وہ مسکرانے لگی۔

''ایسی باتیں کب چھپی رہ سکتی ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہمارے درمیان اکثر اس پر بحث ہوتی رہی ہے کہ اتنی خوب صورت لڑکی ہے لیکن اب تک اس کا نہ کوئی افیئر سامنے آیا ہے نہ ہی اس نے شادی کی ہے۔'' میں نے کار کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''افیئر تو اس لیے سامنے نہیں آیا کہ میں ضرورت سے زیادہ محتاط ہوں اور شادی اس لیے نہیں ہو سکی کہ جیسے ہی انہیں معلوم ہوتا ہے کہ میری ماں کون تھی، وہ پلٹ کر بھی نہیں آتے۔''

''تمہاری والدہ تھیں۔ اب تو نہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔

اس فقرے کا مطلب کیا میں یہ لے سکتی ہوں کہ میری والدہ کے بارے میں جاننے کے باوجود آپ مجھے اپنی زندگی میں شامل کر سکتے ہیں؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا تھا۔

''میری حد تک تو تم صحیح کہہ رہی ہو لیکن میرے گھر میں میرے علاوہ چار افراد اور ہیں۔'' میں نے کہا۔

''وہ کون ہیں؟'' اس نے سوال کیا۔

''والد اور والدہ کے علاوہ دو یہ ہیں جو کار میں بیٹھی ہیں اور ان سے بڑی ایک شادی شدہ بہن جو اپنے سسرال میں ہوتی ہیں۔''

''ان دو میں سے ایک ووٹ تو میرا ہے۔'' نسرین نے کہا۔

ابھی اس کا فقرہ مکمل ہی ہوا تھا کہ پسنجر سیٹ سے آواز آئی۔

''میں چھ برس سے نسرین کو جانتی ہوں۔ دو سال کالج کے اور چار برس یونیورسٹی کے، میں نے اس کے کردار میں کبھی کوئی خرابی نہیں دیکھی بلکہ یونیورسٹی میں تو یہ مس ہتھ چھوٹ کے نام سے مشہور ہیں اور تو اور اس نے تو ہمارے ایک ٹیچر کو بھی ہاتھ مار دیا تھا۔ یاد ہے تمہیں اظہر صاحب۔'' اس کا رخ اچانک نسرین کی طرف ہو گیا۔

''آپ فیصلہ کریں حماد۔'' اس نے کچھ بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔ ''وہ اظہر صاحب چالیس کے تو ہوں گے۔ ان کی بیوی ہے دو بچے ہیں وہ اگر ایک بار نہیں بار، بار پرپوز کرے تو مجھے کیا کرنا چاہیے تھا۔''

''اس سے ملتی جلتی پوزیشن کا سامنا مجھے بھی تھا۔'' میں نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''وہ کیا تھا؟'' نسرین اور میری دونوں بہنوں نے ایک ساتھ سوال کیا تھا۔

''ہماری کمپنی کی جو باس ہیں۔ وہ بیوہ ہیں۔ کمپنی ان کے شوہر کی تھی جس کی مالک اب وہ ہیں۔ دو روز قبل انہوں نے کہا تھا کہ تم مجھ سے شادی کر لو میں آدھی جائداد تمہارے نام کر دوں گی۔ میں نے انکار کیا تو وہ ساری جائداد لکھنے کو تیار ہو گئیں۔'' میں نے کہا۔

"یہ فیصلہ تو صحیح نہیں کیا آپ نے۔" نسرین نے کہا۔
"میں کچھ مختلف انداز سے سوچنے کا عادی ہوں۔"
میں نے کہا مگر بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی اس لیے مجھے وضاحت کرنی پڑی۔ "بات صرف ان کے بیوہ ہونے کی نہیں بلکہ یہ بات بھی نہیں کہ وہ مجھ سے بارہ برس بڑی ہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ شوہر کی زندگی اور اس کی موت کے بعد ان کے اور لوگوں سے بھی تعلقات رہے ہیں۔" میں نے وضاحت کی۔

"بھائی نسرین کے بارے میں آپ کا فیصلہ اپنی جگہ لیکن اماں ایک روایتی خاتون ہیں، وہ اس کے لیے کبھی تیار نہیں ہوں گی۔" میری اس بہن نے کہا جو پسنجر سیٹ پر بیٹھی تھی۔

"یہ بات تو ہے۔" پچھلی سیٹ سے میری دوسری بہن بولی۔

"اب آپ دونوں کے پاس ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے کورٹ میرج۔" چھوٹی بہن نے راہ دکھائی۔
"اور اس کے لیے میں کبھی بھی تیار نہیں ہوں گی۔"
نسرین صاف انکاری تھی۔
"اب باجی ہی کوئی راستہ نکال سکتی ہیں۔" چھوٹی بہن نے بڑی بہن کے کاندھوں پر ذمے داری ڈال دی۔
"میں یہ ذمے داری لینے کے لیے تیار ہوں لیکن کام بہت آہستہ ہوگا کہ انہیں پتا بھی نہ چلے اور وہ تیار ہو جائیں۔"

ان تینوں کو یونیورسٹی اتار کر میں نے کار کا رخ اپنے دفتر یعنی طوبیٰ کے دفتر کا رکھا۔ طوبیٰ کی مرسڈیز دفتر کے باہر ہی کھڑی تھی میں خاموشی سے دفتر میں داخل ہوا۔ ایک کمپیوٹر پر بیٹھ کر میں نے استعفیٰ ٹائپ کیا اور طوبیٰ کے دفتر میں پہنچا طوبیٰ اس وقت دفتر میں اکیلی تھی مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا۔ "آؤ حماد۔" اور میں نے جواب میں استعفیٰ اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے ایک نظر اس پر ڈالی۔
"میں سمجھتی ہوں کہ تم غلطی کر رہے ہو۔" اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔
"کل جو کچھ ہوا، اس کے بعد میرا استعفیٰ ناگزیر تھا۔"
میرا انداز روکھا تھا۔
"اس کا مطلب میں یہ لوں کہ تم میمونہ سے شادی کر رہے ہو؟"
"آپ دونوں کے علاوہ بھی دنیا میں بہت سی خواتین ہیں۔" میں نے یہ کہا اور کار کی چابیاں اس کی میز پر رکھ دیں۔
"یہ کیا ہے؟"
"جب ایک احسان اتار دیا تو دوسرا احسان کیوں رکھوں۔" یہ کہتے ہوئے میں واپس ہوا اور اپنے دفتر میں آ کر سامان سمیٹنے لگا۔ طوبیٰ بھی میرے پیچھے میرے دفتر تک آئی تھی۔
"تو تم نے کمپنی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا؟"
"میرا فیصلہ تم سے پیچھا چھڑانے کا ہے۔" میں نے اسے جواب دیا اور ساتھ اپنا سامان سمیٹتا رہا۔
"مجھے چھوڑ دو مگر کمپنی نہ چھوڑو۔" اس کے لہجے میں درخواست تھی لیکن میرا فیصلہ حتمی تھا۔
دفتر سے نکل کر میں باہر آیا۔ کچھ ہی دور گیا تھا کہ طوبیٰ اپنی مرسڈیز میں پیچھے آ گئی۔
"تم چاہو تو میں تمہیں کہیں ڈراپ کر سکتی ہوں۔"
اس نے آفر کی لیکن میں کوئی جواب دیے بغیر پیدل چلتا رہا۔ کچھ دور جا کر مجھے ٹیکسی مل گئی اور میں نے اسے اپنے گھر کا پتا بتا دیا۔
میں گھر پہنچا تو مجھ سے پہلے میری نوکری چھوڑ دینے کی خبر پہنچ گئی تھی۔ طوبیٰ نے گھر فون کر کے بتا دیا تھا۔ توقع کے مطابق اماں نے باتیں سنانی شروع کیں۔
"تمہاری مالکن کہہ رہی تھی کہ حماد جذباتی ہو رہا ہے اس لیے میں نے بحث نہیں کی۔ اسے میری طرف سے کہہ دینا کہ وہ جب چاہے نوکری پر واپس آ سکتا ہے۔" اماں نے مجھ تک طوبیٰ کا پیغام پہنچایا۔
"اس کی بھی تو سن لو کہ اس نے اتنی اچھی نوکری کیوں چھوڑی۔" ابا نے اماں کو ڈانٹا۔
"میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔" میں نے ابا سے کہا۔
"مگر اس کی وجہ کیا تھی؟" ابا کا لہجہ نرم تھا۔
"وہ آپ کی بہو بننا چاہتی تھی۔" میں نے ابا سے کہا لیکن میرے لفظ اماں کے کانوں تک پہنچ گئے۔
"وہ باؤلی ہوئی ہے کیا؟" اماں نے کہا۔ "اپنی عمر دیکھی ہے اُس نے۔" اماں کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔
طوبیٰ سے پیچھا چھڑانے کے بعد میرا موڈ میمونہ سے بھی دو، دو ہاتھ کرنے کا تھا اور اس کے لیے مجھے شام کا انتظار تھا۔ میں نے اپنے دوست کو فون کیا کہ وہ اپنی گاڑی لے کر آ جائے۔

''میں نے اسے جو وقت دیا تھا، اس سے پہلے ہی میمونہ کا فون میرے موبائل پر آ گیا۔
''تم نے اس کی نوکری چھوڑ دی؟'' رابطہ ہوتے ہی میمونہ نے سوال کیا۔
''میں نے اس کی نوکری چھوڑ کر تمہارا بھی احسان اتار دیا۔'' میں نے جواب دیا۔
''تم شام میں تو آ رہے ہو نا پاپا کے سوم میں؟'' اس نے سوال کیا۔
''میں نے اپنے دوست کو فون کر دیا ہے، اس کے ساتھ آ جاؤں گا۔'' میرا جواب تھا۔
''تم نے کار بھی واپس کر دی؟'' میمونہ نے سوال کیا۔
''کار کمپنی کی تھی۔ کمپنی چھوڑی تو کار تو چھوڑنی ہی تھی۔''
''تم کہو تو میں تمہیں پک کر لوں۔'' اس نے کہا اور میں مسکرا دیا۔
''میں ماضی سے تعلق ختم کرنے پر نکلا ہوں اور تم مجھے ماضی میں گھسیٹنا چاہ رہی ہو۔'' میرا لہجہ کسی حد تک تلخ تھا۔ جو میں چاہتا نہیں تھا لیکن ایسا ہوتا چلا گیا۔
''کیا کوئی نئی تلاش کر لی ہے؟'' اس نے براہِ راست سوال کیا۔
''شاید ایسا ہی ہے۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔
''حماد میرا یقین کرو مجھ جیسی لڑکی اور کہیں نہیں مل سکتی۔'' اس نے کہا تھا۔
''شاید یہ بھی تم صحیح کہہ رہی ہو۔'' میرا جواب پہلے سے زیادہ تلخ تھا۔ ''ایسی لڑکی شاید ہی کوئی دوسری ہو جو ملازم کے خود گلے پڑے اور پھر اسی کے سر الزام لگا دے کہ ملازم نے مجھ سے زبردستی یہ سب کیا ہے۔'' میرا لہجہ پہلے سے زیادہ تلخ تھا اور اس کے جواب میں میمونہ بہت دیر خاموش رہی تھی۔
''تم اپنے بارے میں کیا کہتے ہو؟'' اس نے کافی دیر گزرنے کے بعد سوال کیا۔
''تم شکار کرنے آئی تھیں اور خود شکار ہو گئیں۔'' میرا جواب تھا۔
''میں نے اپنے وکیل کو بھی بلوایا ہے باقی باتیں تمہارے آنے پر ہوں گی۔''
میں اپنے دوست اور اس کی گاڑی کا انتظار کر رہا تھا کہ نسرین کا فون میرے موبائل پر آ گیا۔
''آپ شام میں ندیم کے دفتر آ سکتے ہیں؟'' اس نے سوال کیا۔ وہ نمبر میرے لیے انجان تھا لیکن میں نے ریسیو کر لیا تھا۔
''مجھے شام میں ایک سوم میں جانا ہے وہاں سے فارغ ہو کر ہی آ سکتا ہوں لیکن وہ کیوں بلا رہا ہے۔''
''یہ نمبر میں نے تمہاری بہن سے لیا ہے۔'' نسرین بولی۔ ''اسی نے بتایا کہ تم نے نوکری چھوڑ دی ہے اور اب تم شاید پوری طرح سے شوبز میں آنا چاہتے ہو۔''
''میرے نوکری چھوڑنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہی ہے۔'' میں نے سوچا۔
''لیکن یہ شاید بہتر ہی ہو۔'' میری سوچ کا دھارا دوسری جانب مڑ گیا۔
میں دوست کے ساتھ میمونہ کے گھر پہنچا تو وہاں میرا انتظار ہو رہا تھا پھر جب میں میمونہ اور اس کے وکیل کے ساتھ معاملات فائنل کر رہا تھا مجھے پہلے نسرین اور پھر ندیم کے فون آنے لگے۔ ''کہاں رہ گئے ہو؟'' ندیم نے چوتھے فون پر کہا تھا۔
''یہاں سے فارغ ہوتے ہی آپ کی طرف آؤں گا۔'' میں نے جواب میں کہا تھا۔
''کب تک فارغ ہو جاؤ گے؟'' ندیم نے غیر مطمئن انداز میں کہا تھا۔
''بس چند منٹ اور۔'' میں نے کہا۔
''یہاں سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' ندیم نے کہا۔ ''دیر کر دی تو یہ سنہری موقع تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔'' ندیم نے کہا۔
''میں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' میرا جواب تھا۔
''کون ہے یہ؟'' میمونہ کے وکیل نے سوال کیا تھا۔
''اس سیریل کا ڈائریکٹر ہے جو مجھے آفر ہوئی ہے۔'' میں نے جواب دیا لیکن میرا رخ میمونہ کی جانب تھا جس نے کچھ دیر پہلے سوال کیا تھا۔ نوکری تم چھوڑ چکے ہو مجھ سے قطع تعلق کا اعلان بھی کر رہے ہو۔ اب کرو گے کیا لیکن اس وقت میں نے جواب دینے سے گریز کیا تھا۔
''وِش یو بیسٹ آف لک۔'' وکیل نے کہا۔
''وہ بھی یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ میں صفدر صاحب کی وصیت سے کچھ بھی لینے کے لیے تیار کیوں نہیں تھا۔
جبکہ میرا خیال تھا کہ یہ سونے کا پنجرہ مجھے قید کرنے کے لیے بنایا گیا تھا لیکن میں اس کے لیے تیار نہیں تھا۔

میں ندیم کے پروڈکشن آفس پہنچا تو وہاں سیریل کی پوری کاسٹ موجود تھی۔ نسرین کے برابر کی کرسی خالی تھی اور اس نے مجھے اشارہ کیا تو میں اس کے برابر جا کر بیٹھ گیا۔

اسکرپٹ بانٹا جا چکا تھا۔ میرا اسکرپٹ نسرین کے پاس تھا جو اس نے میرے بیٹھتے ہی پکڑا دیا تھا۔

''آپ کے پاس دو دن ہیں۔'' ندیم نے سب کو مخاطب کیا۔ ''دو دن بعد سے ریہرسل شروع ہوگی اور اس کے بعد باقاعدہ شوٹنگ ہوگی۔ ہمیں کم سے کم وقت میں یہ سیریل مکمل کر کے آن ایئر کروانا ہے۔ ایک بڑے چینل سے بات ہو چکی ہے اور وہی نشر کرے گا۔''

میں نے دستخط کرنے سے پہلے معاہدہ پڑھا اور اس میں بھی اپنے معاوضے والا پورشن بار بار پڑھا تھا۔ معاوضہ اتنا زیادہ تھا کہ میں نے اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

''تین مہینے دن رات شوٹنگ ہوتی رہی اور تین ماہ بعد پہلی قسط نے آن ایئر جانا تھا۔ نسرین نے پہلی قسط والی رات پوری کاسٹ کو اپنے گھر مدعو کیا تھا۔ کاسٹ کے باہر صرف میرے گھر والے مدعو تھے۔ ان تین مہینوں میں ہمارے وہ خدشات جو اماں کے تھے وہ غلط ثابت ہو رہے تھے۔ نسرین کبھی میرے ساتھ اور کبھی میری بہن کے ساتھ گھر آتی رہی تھی۔ اماں نے اسے کچن تک رسائی بھی دے دی تھی اور نسرین نے بھی وہ ڈشیں کھلائی تھیں کہ اماں سمیت سب نے اس کی تعریفیں کی تھیں۔ اب ایک آخری مرحلہ تھا جس کے لیے ہم سب دعا گو تھے کہ اماں نسرین کو قبول کر لیں اور یہ نظر انداز کر دیں کہ اس کی ماں کیا تھی۔

جس شام ہم نسرین کے گھر مدعو تھے، اس روز صبح سے ہی نسرین اپنے کچن میں مصروف تھی۔ اس نے مدد کے لیے میری دونوں بہنوں کو بھی بلا لیا تھا۔ شام میں ہم اس کے گھر پہنچے تو کھانے کی تیاریاں آخری مراحل میں تھیں۔ ہم سب نے قسط دیکھی اور کھانے کی میز پر پہنچ گئے۔

اماں نسرین کی ماں سے ملیں تو نتیجہ وہ نہیں تھا جس کی ہم سب توقع کر رہے تھے۔ ''میں تو آپ کی پرانی فین ہوں، مجھے نہیں معلوم تھا کہ نسرین آپ کی بیٹی ہے۔'' اماں نے کہا تھا اور ہم سب نے سکھ کا سانس لیا کہ اماں نے ان کے ماضی کے حوالے سے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

نسرین اپنی ماں کو میرے حوالے سے بہت کچھ بتا چکی تھی۔ یہ بھی کہ مجھے شادی کے بعد اس کے شوبز میں کام کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

ڈائننگ ٹیبل انواع واقسام کے کھانوں سے سجی ہوئی تھی اور یہ سب گھر پر تیار ہوئی تھیں اور اس کا اعلان نسرین کھانا شروع کرنے سے پہلے ہی کر چکی تھی۔ ''جسے کھانا پسند آئے اس کا کریڈٹ آپ مجھے دیں گے اور جسے پسند نہ آئے اس کا الزام ان دونوں کو دیجیے گا۔'' اس پر ایک ہلکا سا قہقہہ پڑا اور سب کھانے کی جانب متوجہ ہو گئے۔

''ماشاء اللہ بہت زبردست تربیت کی ہے آپ نے اپنی بیٹی کی۔'' اماں نے نسرین کی ماں سے کہا۔

''خوب صورتی تو خیر اللہ کی دین ہے لیکن پڑھائی کے ساتھ گھر کے کام میں طاق ہونا ماں کی تربیت ظاہر کرتی ہے۔'' اماں نے ایک بار پھر کہا۔

''یہ سب آپ کا حسن نظر ہے۔'' نسرین کی ماں نے کہا۔

''اماں ایک اور شے اب تک آپ کی نظروں میں نہیں آسکی۔'' میری بڑی بہن نے لقمہ دیا۔

''نسرین کو گارڈننگ کا بھی شوق ہے۔'' اس نے کہا اور نسرین شرما گئی۔ ''یہ جو لان میں آپ نے کیاریاں دیکھی ہیں یہ سب نسرین کے ہاتھوں کا کمال ہے۔''

''بھئی میں تو کہتی ہوں کہ یہ بچی جس گھر میں بھی جائے گی اس گھر کو سنوار دے گی۔'' اماں نے کہا۔

''کسی گھر میں کیوں آپ اپنے گھر کیوں نہیں لے جاتیں؟'' ندیم نے سیدھا شاٹ کھیلا تھا لیکن اماں خاموش رہی تھیں۔

''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' ابا نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔

''ہمیں بھی نہیں ہے۔'' میری دونوں بہنوں نے ایک ساتھ کہا تھا۔

''میں تو برسوں سے یہ خواب دیکھ رہی ہوں کہ میری سب سے اچھی سہیلی میری بھابی بن جائے۔'' میری بہن نے کہا تھا۔

''اس معاملے کا جو اصل اسٹیک ہولڈر ہے اس سے کوئی پوچھ لے۔'' ابا نے دوبارہ سے زبان کھولی۔

''ان تین مہینوں میں جو میں نے ان دونوں کی انڈر اسٹینڈنگ دیکھی ہے، اس کے بعد ہی میں نے یہ تجویز رکھی تھی۔'' ندیم نے کہا اور میں جھینپ گیا۔

''تم بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گئے۔'' میں نے ندیم کو خاموش کرنے کی غرض سے کہا۔

''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں کہ اگر ایک کی شوٹنگ ختم ہو گئی تو وہ اس وقت تک کچھ نہ کھاتا تھا جب تک دوسرا فارغ نہ ہو جائے۔'' ندیم نے کہا اور نسرین باقاعدہ شرما گئی۔

’’میری طرف سے یہ اعلان ہے کہ اگلی قسط میرے گھر پر دیکھی جائے گی اور اسی میں ان دونوں کی منگنی بھی ہو گی اور دھوم دھام سے ہوگی۔‘‘ ندیم کے اس اعلان کے ساتھ ہی سب نے تالیاں بجائیں اور تالی بجانے والوں میں اماں اور ابا دونوں شامل تھے۔

’’ندیم اپنی سیریل کی مارکیٹنگ کے لیے ہمیں پھنسا رہا ہے۔‘‘ میں نے کہا اور سب مجھے دیکھنے لگے۔

’’آج تک کبھی ایسا ہوا ہے کہ سیریل کے شروع میں ہی ہیرو اور ہیروئن کی منگنی ہو۔‘‘ میں نے کہا اور وہ سب ہنس دیے۔

’’ہے نا آخر مارکیٹنگ کا بندہ اپنا فائدہ سوچنے کے بجائے میرا فائدہ سوچ رہا ہے۔‘‘ ندیم نے کہا۔

’’ایک ہفتہ تیاری کے لیے بہت کم ہے۔‘‘ اماں نے اعتراض کیا۔

’’کم نہیں، بہت زیادہ ہے۔‘‘ ندیم نے اماں کا اعتراض مسترد کر دیا۔

’’آپ کو کچھ نہیں کرنا تمام خرچ ہمارا پروڈکشن ہاؤس اٹھائے گا۔‘‘ ندیم نے اماں کی پریشانی دور کر دی تھی۔

ہمارے جوڑے بھی پروڈکشن ہاؤس کے ڈیزائنر نے تیار کیے تھے۔ ایک ہفتہ پلک جھپکتے ہی گزر گیا۔ منگنی بہت شاندار طریقے سے ہوئی۔ ہر بار جب کیمرے کی لائٹ چمکتی تو میں یہ سوچتا کہ ان تصویروں کو دیکھ کر طوبیٰ اور میمونہ پر کیا بیتے گی۔

منگنی کے اگلے روز خبر ملی کہ میمونہ انگلینڈ چلی گئی اور طوبیٰ اپنے بیٹوں کے پاس امریکا روانہ ہوگئی۔ نکاح کے لیے آخری قسط والی تاریخ مقرر کی گئی تھی۔

سیریل سپرہٹ ثابت ہوئی تھی۔ کہانی نسرین کی اپنی کہانی تھی اور تحریر بھی اسی کی تھی کہ کس طرح ایک طوائف کی بیٹی اپنے خاندان سے لڑ کر تعلیم حاصل کرتی ہے جہاں قدم قدم پر اسے اس کی ماں کے حوالے سے طعنے سننے پڑتے ہیں لیکن وہ ثابت قدم رہتی ہے۔

شادی ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ہوئی تھی اور اس کے دعوت نامے کے لیے منتظمین پر بہت دباؤ تھا لیکن مجھے اس وقت حیرت ہوئی کہ میمونہ نے شادی کے دعوت نامے کے لیے فون کیا تھا۔

’’صحیح ہے کہ تم نے میرے بجائے اسے منتخب کیا لیکن اتنی اجازت تو دو کہ میں تمہاری شادی میں ایک مہمان کی حیثیت سے شامل ہو سکوں۔‘‘ میں نے نسرین سے مشورہ کیا لیکن اسے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔

’’تم جانتی نہیں ہو کہ وہ کس طرح کی سازشی خاتون ہے۔‘‘ میں نے نسرین کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانی۔ میمونہ بطور خاص ہماری شادی میں شرکت کے لیے آئی تھی اور اس نے لندن کے دو ٹکٹ یہ کہہ کر پکڑائے تھے کہ ہنی مون کے لیے لندن آنا اور میرے یہاں رہنا۔

نسرین تو اس پر تیار تھی لیکن میں نے انکار کر دیا۔

’’میں نے کہا تھا نا کہ وہ سازشی خاتون ہے۔‘‘ نسرین نے ضد کی تو مجھے سختی کرنی پڑی۔

اس سلسلے میں نسرین کی ماں نے بھی میری بہت مدد کی۔

’’جب تمہارے شوہر نے تمہاری ہر بات مان لی تب تم ایک بات نہ ماننے کی ضد کیوں کر رہی ہو۔‘‘ اس نے سمجھایا تھا۔

آج ہماری شادی کو پانچ برس ہو گئے ہیں۔ ہم سب اس گھر میں شفٹ ہو گئے ہیں جو کبھی نسرین کا گھر ہوتا تھا اور جسے اس کی ماں نے بیٹی کے جہیز میں دے دیا تھا۔

’’شوبز میں ہماری جوڑی کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ ہم دونوں ہی مصروف ہیں صرف اتوار کا ایک دن ایسا ہوتا ہے کہ ہم دونوں کوئی شوٹنگ نہیں کرتے۔ نسرین کو البتہ اس روز بھی آرام نہ ملتا، وہ سویرے سے کچن میں گھس جاتی اور شام تک مصروف رہتی۔

اماں اور ابا کو ہم نے کھیلنے کے لیے دو کھلونے دے دیے تھے۔ وہ سارا دن اس میں مصروف رہتے تھے۔ پوتا پوتی بھی ہم سے زیادہ دادا دادی کے پاس رہتے تھے۔ ابا ریٹائر ہو چکے ہیں لیکن نسرین کے ساتھ ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ میمونہ اور طوبیٰ قصۂ پارینہ ہو چکی ہیں۔ میمونہ سے ایک بار ملاقات ہوئی تھی جب ہم شوٹنگ کے لیے لندن گئے تھے لیکن ہم نے اس کے گھر میں قیام نہیں کیا تھا۔ ایک ہفتے کے دوران ایک دن بھی ایسا نہیں ہوا کہ میمونہ ہم سے ملنے نہ آئی ہو۔ ہم رخصت ہونے لگے تو اُس نے ڈھیروں تحفے دیے۔ ہیتھرو پر ہمیں رخصت کرنے آئی تو کہا۔ ’’سچ ہے جوڑے آسمان پر بنتے ہیں۔ میں نے کیا کچھ نہیں کیا لیکن حماد میرے نصیب میں ہی نہیں تھا اس لیے میں نے صبر کر لیا۔

طوبیٰ نے البتہ امریکا میں کسی نیگرو سے شادی کر لی ہے اور بقول میمونہ بہت خوش ہے۔ اس کی ٹریولنگ ایجنسی خوب چل رہی ہے۔ میمونہ نے ہی بتایا تھا کہ میں نے اس سے پوچھا کہ حماد یاد آتا ہے تو اس نے کہا تھا۔ ’’روز صبح اٹھتے ہی اسے بھول جاتی ہوں۔‘‘

❖❖❖

بے گناہ

سیرینا راض

مُدھر سُروں میں بجتی موسیقی کانوں میں رس گھولتی ہے... اور سننے والوں کو سرمستی کی کیفیات میں مبتلا کر دیتی ہے... آلاتِ موسیقی سے جنون کی حد تک عقیدت رکھنے والے کردار... ایک سالوں پرانے گٹار نے تمام سُروں کو بکھیر دیا تھا... سازوخیال کے موتی اور تار خون کے چھینٹوں سے تر ہوتے چلے گئے...

ناکردہ جرم کی پاداش میں گرفتار ہونے والے بے گناہ کی کتھا ......

دفتر کا دروازہ کھلا اور مڈل سیکس کاؤنٹی کا جج فرینکلن ایڈم اندر داخل ہوا۔ وہ دراز قد اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس وقت اس نے گاؤن کے بجائے بزنس سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ اس سے پہلے میں دو مرتبہ جج سے مل چکا تھا اور مجھے اس میں ملنساری نظر آئی لیکن آج اس کا رویہ قدرے مختلف تھا۔

میں نے اپنی ساتھی مس جینی کی طرف دیکھا۔ وہ میرے بائیں جانب بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بھی جج کے برتاؤ



میں تبدیلی محسوس کی۔ میں احتراماً اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ ’’صبح بخیر، یور آنر۔‘‘ میں نے کہا۔
’’مسٹر ہوٹنگ۔‘‘ اس نے کہا اور میرے بائیں جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’مس جینی۔‘‘
’’ہیلو جج۔‘‘ جینی نے جواب میں کہا۔ ’’ہم حیران ہو رہے ہیں کہ تم نے یہ میٹنگ کیوں بلائی؟ کیا کوئی مسئلہ ہے؟‘‘
اس نے براہِ راست کوئی جواب نہیں دیا بلکہ میرے بیٹھنے کا انتظار کرنے لگا پھر اس نے اپنی کرسی سنبھالی اور بولا۔ ’’میں تمہارے کاروبار کو جانتا ہوں مسٹر ہوٹنگ، تم اپنی گزر اوقات کے لیے لوگوں کے سوالوں کے جواب دیتے ہو، کیا یہ درست ہے؟‘‘
وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اور میں نے سر کے اشارے سے اس کا اعتراف کیا۔ مجھے حیرت تھی کہ جج میرے کام کے بارے میں سوال کیوں کر رہا ہے کیونکہ بہت سے لوگ میری وضاحت کے بعد بھی یہی پوچھتے کہ میرا اصل کام کیا ہے۔
’’میرا خیال ہے کہ شاید مجھے تمہاری خدمات حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئے۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’لیکن میں تم سے تنہائی میں اپنا سوال کرنا چاہوں گا۔‘‘ اس کا اشارہ جینی کی جانب تھا۔
مجھے یہ کچھ عجیب لگا اور میں نے پوچھا۔ ’’کیا اس سوال کا تعلق ہفتے کو ہونے والی تقریب سے ہے؟‘‘
’’نہیں لیکن احتیاط ضروری ہے۔‘‘
میں نے جینی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’تم جینی کی موجودگی میں بھی مجھ سے وہ سوال کر سکتے ہو۔‘‘
’’اس بار نہیں، اس میں قانونی پیچیدگی ہے اور میں اس معاملے میں کسی دوسرے کو شامل نہیں کرنا چاہتا۔‘‘
’’ٹھیک ہے سیموئل۔‘‘ جینی کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ’’مجھے یقین ہے کہ جج کے پاس اس کی کوئی وجہ ہوگی۔‘‘ غالباً وہ جانتی تھی کہ میں بعد میں اسے سب بتا دوں گا۔ وہ کمرے سے باہر چلی گئی اور دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔
’’مجھے یقین نہیں کہ ایسا کرنا ضروری تھا۔‘‘ جینی کے جانے کے بعد میں نے کہا۔
’’میں اسے اس معاملے کے ممکنہ نتائج سے بچا رہا ہوں۔‘‘ جج نے کہا۔ ’’تم جانتے ہو کہ میں تم سے جو سوال کرنے والا ہوں، وہ ہم دونوں کو ایک بڑی مشکل میں ڈال سکتا ہے، اگر تم اس سے زیادہ نہیں سننا چاہتے تو میں سمجھ جاؤں گا۔‘‘
جج کا یہ انداز دیکھ کر میری دلچسپی بڑھ گئی اور میں پوری بات جاننے کے لیے بے چین ہو گیا۔
’’تمہارا سوال کیا ہے؟‘‘
’’مسٹر ہوٹنگ، میں تم سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ کیا جورڈن پراکٹر قتل کا مجرم ہے؟‘‘
میں نے اس شخص کے بارے میں اخبارات میں پڑھا تھا لیکن جج کا سوال پریشان کن تھا۔
’’یور آنر، کیا تم اس مقدمے کی سماعت نہیں کر رہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’میں ہی یہ مقدمہ سن رہا ہوں۔‘‘ اس نے کہا۔
’’اور اگر میں غلطی پر نہیں تو یہ مقدمہ اپنے اختتام پر ہے۔‘‘ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ’’آج جمعرات ہے۔ کل بحث کا اختتام ہوگا اور سوموار کو اس کا فیصلہ متوقع ہے۔‘‘
یہ بات سمجھ سے بالاتر تھی کہ جج ایک باہر کے آدمی سے اس کیس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔
’’کیا تمہیں یہ نہیں بتایا گیا کہ استغاثہ اور صفائی کے وکلا کے دلائل کو سامنے رکھ کر مقدمے کا فیصلہ کرو۔‘‘ میں نے پوچھا۔
’’ہاں۔‘‘ جج نے جواب دیا۔ ’’مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے لیکن اس کیس میں مجھے یقین ہے کہ سزا میں کمی کا جواز پیدا کرنے والے حالات ہیں جنہیں صفائی کا وکیل پیش کرنے میں ناکام رہا ہے اور میرا خیال ہے کہ کوئی بھی غلط فیصلے کی وجہ سے ایک بے گناہ کو باقی ساری زندگی جیل میں گزارنی پڑے گی۔ میں یہ اپنی ذمے داری سمجھتا ہوں کہ اس امکان کی تحقیقات کرائی جائے۔‘‘
’’تم نظام انصاف سے باہر رہ کر کام کر رہے ہو اور مجھ سے بھی یہی چاہتے ہو۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’اس کے نتیجے میں ہم دونوں کے خلاف قانونی کارروائی ہو سکتی ہے اور تمہیں مقدمے سے الگ کیا جا سکتا ہے۔‘‘
’’ہاں۔ میں اسی لیے تمہیں اختیار دے رہا ہوں کہ تم اس سوال کا جواب دینے سے انکار کر دو اگرچہ میں یہ بھی کہوں گا کہ تم اس گفتگو کی تفصیلات کسی اور پر ظاہر نہیں کرو گے یہاں تک کہ مس جینی کو بھی کچھ نہیں بتاؤ گے اور تم پولیس یا پراسیکیوٹر آفس کو بھی اس معاملے کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ تم سرکاری طور پر اسے نہیں دیکھ رہے۔‘‘
’’لیکن میں ہی کیوں؟‘‘ میں نے کہا۔ ’’یقیناً یہاں ایسے پرائیویٹ سراغ رساں ادارے ہیں جو بہتر طور پر تمہارے سوال کا جواب دے سکتے ہیں۔‘‘

''مجھے یقین ہے کہ تم اس تحقیقات میں کوئی خاص بات شامل کر سکتے ہو۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''پراکٹر براہِ راست سوالوں کے جواب نہیں دیتا۔ وہ صرف سازوں کے بارے میں بات کرنے کو ترجیح دیتا ہے اور کسی سے نظریں نہیں ملاتا۔''

میں جج کی بات کا مطلب سمجھ گیا۔ ''تمہیں یقین ہے کہ وہ خیالات کی دنیا میں کھویا رہتا ہے اور تم جانتے ہو کہ میں بھی ایسا ہی کرتا ہوں لہٰذا تمہارا خیال ہے کہ میں اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھ جاؤں گا لیکن میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ اس بیماری میں مبتلا سب لوگ ایک ہی طرح کا رویہ اختیار نہیں کرتے یا ایک ہی انداز میں نہیں سوچتے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ بات سمجھتا ہوں لیکن اس سے تمہیں جلدی سمجھنے میں مدد ملے گی کیونکہ اس معاملے میں وقت کی بڑی اہمیت ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ تم میری فیس ادا نہیں کر سکتے کیونکہ یہ سرکاری فنڈ کا غلط استعمال ہوگا۔''

''ہاں یہ سچ ہے لیکن اس فیس کے عوض میں تمہاری شادی کی تقریب کی صدارت کر سکتا ہوں۔''

''ہماری شادی ہفتے کو طے ہے۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''اس کام میں تمہیں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔'' جج نے کہا۔ ''اگر تم چاہتے ہو کہ میں تم دونوں کی شادی کرواؤں تو بہتر ہے کہ فوراً یہ کام شروع کر دو۔''

جب میں راہداری میں جینی سے ملا تو وہ مجھے بہت زیادہ بے چین نظر آئی۔ ''وہ کیا بات کر رہا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ جج ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے اس ریسرچ میں تمہیں شامل نہیں کرنا چاہیے۔ بہتر یہی ہے کہ تمہیں اس معاملے میں کم سے کم معلوم ہونا چاہیے۔''

''کیوں؟'' اس نے پوچھا۔

''کیونکہ بہتر یہی ہے کہ تم جیل سے دور رہو۔'' میں نے کہا۔

''سیموئل......''

''کیا تم مجھے واپس دفتر چھوڑ دو گی؟'' میں نے کہا۔ ''میرے پاس بہت تھوڑا وقت ہے اور کافی کام کرنا ہے۔''

میں نے تحقیق کی ابتدا آن لائن کی۔ جج نے مجھے ایک فائل ای میل کر دی تھی لیکن اس سے مجھے کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوئی۔ جارڈن پراکٹر کو تین مہینے پہلے رتگرز یونیورسٹی کے اسسٹنٹ پروفیسر لیام میک کے گھر سے گرفتار کیا گیا تھا جو لیونگ روم کے فرش پر مردہ حالت میں پڑا ہوا تھا۔ اس کے سر پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ جارڈن پراکٹر کے ہاتھ میں ایک لوہے کی سلاخ تھی جس پر مسٹر میک کے خون کے دھبے اور اس کی کھوپڑی کی ہڈی کے ریزے لگے ہوئے تھے۔ پراکٹر کو فوراً ہی گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیا اور اس کے بجائے وہ اس گم شدہ ہوفنر الیکٹرک گٹار کے بارے میں بات کرنے پر اصرار کرتا رہا جو کبھی پال میک کارٹنی کی ملکیت تھا۔ مجھے بیٹلز کا میوزک بہت پسند تھا اس لیے میری توجہ اس جانب مبذول ہوگئی۔

آنے والے مہینوں میں جارڈن پراکٹر نے صرف گٹار اور دا گریٹ برٹش بیکنگ شو، کے بارے میں بات کی۔ میں نے یہ پروگرام نہیں دیکھا تھا اور اس قتل کے کیس میں اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

پولیس اسی نکتے پر غور کر رہی تھی کہ بظاہر جارڈن پراکٹر نے ہی لوہے کی سلاخ سے لیام میک کو قتل کیا ہے جبکہ میں جانتا تھا کہ جو دکھائی دیتا ہے اکثر ویسا نہیں ہوتا لیکن ماضی میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان کسی قسم کی دشمنی تھی۔

میک نے میوزک ہسٹری کی کلاس کے دوران بتایا کہ روم کے بادشاہ نیرو کے بارے میں یہ کہانی درست نہیں کہ جب روم جل رہا تھا تو اس وقت وہ وائلن بجا رہا تھا کیونکہ وائلن گیارھویں صدی عیسوی تک ایجاد ہی نہیں ہوا تھا۔ میک نے خیال ظاہر کیا کہ نیرو ستار بجا رہا تھا جس کے چار سے سات تار ہوتے ہیں۔

یہ سن کر جارڈن پراکٹر مشتعل ہوگیا۔ اس نے اصرار کیا کہ جب روم میں آگ لگی تو نیرو کوئی ساز نہیں بجا رہا تھا اور وہ شہر سے پینتیس میل دور تھا۔ تاریخ داں بھی جارڈن کے دعوے کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نیرو روم واپس آیا اور اس نے آگ بجھانے کے اقدامات کیے۔

اس بحث میں اتنی شدت آگئی کہ جارڈن چبوترے کی طرف بڑھا اور اس نے مسٹر میک کو دھکا دینے کی کوشش کی۔ اس واقعے کے بعد مسٹر میک نے کیمپس سیکیورٹی فورس کو اطلاع دی کہ جارڈن پراکٹر نے انہیں دھمکی آمیز ای میل اور پیغامات بھیجے تھے جن میں اصرار کیا گیا تھا کہ مسٹر میک ستار کے ساتھ انصاف کریں لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔

قتل والے روز جارڈن پراکٹر، میوزک ہسٹری کی

کلاس میں نہیں آیا۔ وہ اکثر کلاس سے غیر حاضر ہو جاتا کیونکہ وہ ایک میوزک شاپ میں کام کرتا تھا اور اس کی کلاس کا بھی یہی وقت تھا۔ دکان کے مالک اسٹیفن مارکر نے بتایا کہ جارڈن اس روز کام پر بھی نہیں آیا حالانکہ اس کی شفٹ ڈیوٹی تھی۔

میں نے جج ایڈم کو موبائل کے ذریعے پیغام بھیجا کہ وہ کوئی ایسا راستہ نکالے کہ میں جیل جا کر جارڈن پراکٹر سے بات کر سکوں۔ چند منٹ بعد جج کا جواب آ گیا۔ اس نے جیل حکام سے بات کر لی ہے کہ میں قیدی کا رشتے دار ہوں اور مجھے اس سے ایک مختصر ملاقات کی اجازت دی جائے۔

میں نے جینی کو زحمت دینے کے بجائے اپنے ایک ٹیکسی ڈرائیور دوست مائیک سے رابطہ کیا۔ اس نے مجھے جیل لے جانے پر آمادگی ظاہر کی گو کہ جینی مجھے متجسس نگاہوں سے دیکھ رہی تھی لیکن میں اس کی پروا کیے بغیر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم جیل پہنچ گئے۔ اس نے داخلی دروازے کے باہر ٹیکسی کھڑی کی اور بولا کہ وہ میرے واپس آنے کا انتظار کرے گا۔

رسمی کارروائی کے بعد مجھے ایک چھوٹے کمرے میں بٹھا دیا گیا جس میں ایک میز اور دو پلاسٹک کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد جارڈن پراکٹر کو وہاں لایا گیا۔ اس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان ہوگی۔ اس کے بال بے ترتیب اور چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔ اس نے قیدیوں والا زرد رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی۔ جیسے ہی وہ کرسی پر بیٹھا تو گارڈ نے اس کی ہتھکڑی کو میز پر لگے ہوئے رنگ سے باندھ دیا۔

''کیا یہ ضروری ہے؟'' میں نے گارڈ سے پوچھا۔

''جارڈن کبھی کبھی مشتعل ہو جاتا ہے۔'' گارڈ نے کہا اور ایک کونے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے جارڈن کی آنکھوں میں جھانکا۔ میں کبھی کسی دوسرے شخص کے چہرے کو دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ اس طرح میرا ذہن منتشر ہو جاتا ہے۔ میں اس کیس میں اس شخص سے لیام میک کے قتل کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا جس پر اس قتل کا الزام تھا۔ میں نے پہلے سے نہیں سوچ رکھا تھا کہ وہ مجرم ہے یا بے گناہ لیکن کچھ نکات کی وضاحت ضروری تھی جن پر صرف وہی روشنی ڈال سکتا تھا۔

''مجھے اجازت دو کہ اپنا تعارف کرواؤں۔'' میں نے کہا۔ ''میرا نام سیموئل ہوٹنگ ہے۔''

''پال میک کاؤنٹی کا اور یجنل ہوفنر وائلن 1969ء میں کھو گیا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''یہ افواہ سننے میں آئی کہ وہ 2016ء میں اوٹارہ میں مل گیا تھا لیکن بعد میں یہ خبر غلط نکلی۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اس وقت میں تم سے لیام میک کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''وہ اوریجنل ساز تھا جو اس نے بیٹلز کی پہلی دو البم اور پہلے سنگل میں استعمال کیا۔'' جارڈن پراکٹر نے کہا۔ ''اس نے خاص طور پر اسے آرڈر دے کر بنوایا تھا کیونکہ وہ بائیں ہاتھ سے ساز بجاتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے وہ ساز اس لیے خریدا کیونکہ وہ سستا تھا۔''

خود تسکینی میں مبتلا ایسے لوگ کسی اور موضوع کے بجائے اپنی دلچسپی کے بارے میں بات کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ میں خود بھی اس کی ایک مثال ہوں لیکن یہاں معاملہ مختلف تھا۔ جارڈن پراکٹر محض اپنی دلچسپی پر بات نہیں کر رہا تھا بلکہ وہ اس موضوع کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہا تھا جس پر میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔ اس نے موضوع بدلنے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ سرے سے انکار کر رہا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں جس پر گفتگو کی جائے۔

وہ خوف زدہ تھا کہ کہیں اس کی زبان سے نکلا ہوا کوئی لفظ اس کے خلاف استعمال نہ ہو جائے۔ میں نے فوراً موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا پسندیدہ بیٹلز کا گانا کون سا ہے؟''

میں لوگوں کے کردار کا اندازہ لگانے کے لیے یہ تکنیک استعمال کیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ میرے ذہن میں ایک مقصد اور تھا کہ اسے اپنی مرضی کی بات کہنے سے روکا جائے اور میں جو پوچھ رہا ہوں وہ اس کا جواب دے۔

میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ جارڈن رک گیا اور اس نے میری طرف دیکھ کر سوچتے ہوئے کہا۔ ''I will'' اس نے جس گانے کا نام لیا اس پر مجھے حیرت ہوئی۔

''کیونکہ اس گانے میں پال نے ساز بالکل نہیں بجایا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، اس نے ساز کے بغیر ہی یہ گانا گایا ہے۔'' اب جارڈن پراکٹر باتوں میں لگ گیا تھا اور مجھے اس گفتگو کا رخ لیام میک کے قتل کی جانب موڑنا تھا۔

''بہت خوب! کیا ایسے گانے بھی ہیں جن میں دوسرے بیٹلز نے بھی ساز بجایا ہو یا اس نے ہی ہمیشہ یہ رول ادا کیا؟'' میں اس سوال کا جواب جانتا تھا لیکن اسے باتوں

ں لگانا ضروری تھا۔

"ہاں۔" اس نے کہا۔ "جان لینن اور جارج ہیریسن نے کچھ گانوں میں ساز بجایا ہے جن میں میکسویل سلور ہیمر بھی شامل ہے۔"

"ہاں، یہ ایک عجیب گانا ہے۔ کیا تم ایسا نہیں سمجھتے؟" ں نے کہا۔

"کیوں؟" اس نے پوچھا۔ یہ اچھی بات تھی کہ اب وہ سوال کررہا تھا۔

"کیونکہ یہ گانا ایک ایسے شخص کے بارے میں ہے جو کسی وجہ کے بغیر ایک کند اوزار سے سر پر ضرب لگا کر تین آدمیوں کو قتل کرتا ہے۔ کیا تم نہیں سمجھتے کہ اس پر یقین کرنا مشکل ہے۔"

جارڈن پراکٹر کا سر نیچے کی جانب جھک گیا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ اس پر یقین کرنا مشکل ہے۔ وہ تینوں اس کے ساتھ برا سلوک کررہے تھے۔"

"سب نہیں۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ "ان میں ایک عورت تھی جس کے ساتھ اس کی ڈیٹ تھی، وہ اس سے ملنے گھر آیا اور اسے قتل کردیا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی، تمہارا کیا خیال ہے؟"

جارڈن نے لمحہ بھر کے لیے فرش کی طرف دیکھا پھر اس کی نظریں ہتھکڑی پر گئیں۔ وہ میرے چہرے کے علاوہ کمرے کی ہر چیز کو دیکھ رہا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کسی جھوٹ کا سہارا لینے کی کوشش کررہا تھا یا اس کے لیے سچ کا سامنا کرنا مشکل ہورہا تھا۔

"ممکن ہے کہ اس عورت نے کوئی غلط حرکت کی ہو؟" اس نے کہا۔

"مثلاً؟" میں نے پوچھا۔ مجھے احساس تھا کہ ملاقات کا وقت ختم ہونے والا ہے۔ کونے میں کھڑا ہوا گارڈ بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ "اس نے ایسا کیا کردیا جس کی اسے یہ سزا ملی؟"

"میں نہیں جانتا۔" جارڈن نے کہا۔ "کیونکہ میں وہاں موجود نہیں تھا۔ ویسے بھی یہ میرا پسندیدہ گانا نہیں ہے۔"

گارڈ چند قدم ہماری طرف بڑھا۔ اب میرے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ "جب لیام میک کا قتل ہوا تو کیا تم وہاں موجود تھے؟" میں نے پوچھا۔

اس کا سر ایک بار پھر جھک گیا اور آنکھیں بند ہوگئیں۔

"پرانے زمانے کا بربط انگلیوں کے بجائے مضراب سے بجایا جاتا تھا۔ اس میں چار، سات یا دس تار ہوسکتے ہیں۔"

میں بالکل ناامید ہوگیا کہ مجھے جارڈن پراکٹر سے لیام میک کی موت کے بارے میں مزید معلومات نہیں ملیں گی۔

جب گارڈ اسے لے جانے لگا تو اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "برامت منانا یہ گٹار، ستار اور بربط کے علاوہ کوئی اور بات نہیں کرتا۔"

"کیا اس کے علاوہ اس نے کبھی کوئی اور بات کی؟"

"ایک دفعہ یہ کسی عورت کا نام لے کر چلایا تھا۔ غالباً وہ ٹینا تھی۔ یہ نام سنتے ہی جارڈن پراکٹر چونک اٹھا تاہم میں نے اس کے بجائے گارڈ سے پوچھا۔ "یہ ٹینا کون ہے؟"

لیکن گارڈ نے صرف اتنا کہا۔ "یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔" اور پراکٹر کو لے کر چلا گیا۔

میں نے ٹیکسی میں بیٹھ کر مائیک کو پراکٹر سے ہونے والی گفتگو کا سوال سنایا۔ وہ بعض اوقات بڑے اچھے مشورہ دیا کرتا تھا۔ "تم سمجھ رہے ہو کہ ٹینا وہ عورت ہے جسے لیام نے جارڈن سے چھین لیا تھا؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا کیونکہ جج نے جو فائل مجھے بھیجی، اس میں کسی عورت کا ذکر نہیں تھا۔ "جب تک یہ معلوم نہیں ہوجاتا کہ وہ کون ہے، اس واقعے میں اس کے رول کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔"

"یہ تم کس طرح معلوم کرو گے کہ وہ کون ہے؟" مائیک نے ٹیکسی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ جارڈن پراکٹر کے کسی ساتھی کارکن سے بات کروں۔ کیا تم مجھے اس کے میوزک اسٹور تک لے جاؤ گے؟"

"تم خوش قسمت ہو کہ آج میری نائٹ شفٹ ہے۔" مائیک نے کہا۔ "اس لیے مجھے تمہارے ساتھ کہیں جانے پر کوئی اعتراض نہیں۔"

وہ ایک معروف ہائی وے کے مال میں واقع چھوٹا سا اسٹور تھا جس میں موسیقی کے آلات بھرے ہوئے تھے۔ ان میں اکثریت الیکٹرک گٹار کی تھی۔ دکان کا مالک اینٹھن مارکر ایک تیس سالہ شخص تھا۔ اسے یہ جان کر بڑی مایوسی ہوئی کہ میں ممکنہ گاہک نہیں ہوں۔ جب میں نے اسے اپنے کام کی نوعیت کے بارے میں بتایا تو دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی غلط فہمی میں مبتلا ہوگیا۔

"کیا تم سراغ رساں ہو؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، میں سوالوں کے جواب دیتا ہوں اور اس وقت میں جس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کررہا ہوں وہ یہ کہ کیا جارڈن پراکٹر نے لیام میک کا قتل کیا ہے؟"

"یہ میں کیسے جان سکتا ہوں؟"

"میں تم سے یہ جاننے کی توقع نہیں کررہا۔" میں نے اسے یقین دلایا۔ "میں یہ صرف اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ جارڈن پراکٹر کے کردار کے حوالے سے ایک مکمل تصویر سامنے آجائے۔ کیا وہ قابلِ اعتماد ملازم تھا؟"

"ہاں۔" مارکر نے دکان میں دیکھتے ہوئے کہا جہاں دو افراد مختلف چیزیں دیکھ رہے تھے۔

"کیا دوسرے ملازمین کے ساتھ اس کے اچھے تعلقات تھے؟"

"میرا اندازہ ہے۔" مارکر نے مبہم سا جواب دیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے پاس اس بارے میں مکمل معلومات نہیں ہیں۔ "وہ کچھ پُراسرار سا شخص ہے۔" میں نے اس تبصرے کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

"کیا یہاں ٹینا نام کی کوئی عورت کام کرتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

مارکر کی آنکھیں لحہ بھر کے لیے پھیل گئیں اور اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "وہ دکان کا حساب کتاب رکھتی ہے۔"

"کیا میں اس سے بات کرسکتا ہوں؟"

"وہ یہاں نہیں ہے۔" اس نے کہا اور ایک نوجوان شخص کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ وہ مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتا لیکن میں بھی اتنی آسانی سے اس کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔

"وہ کب آئے گی؟" مارکر نے ایک بار پھر ٹینا کے بارے میں کچھ کہنے سے گریز کیا جس سے مجھے یقین ہوگیا کہ اس کے پاس کچھ اہم معلومات ہیں اور مجھے ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔ "کیا میں اس سے بات کرسکوں گا؟ یہ بہت اہم ہے۔"

"وہ آج نہیں آئے گی۔" اس نے گویا بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو، دکان میں گاہک موجود ہیں۔ مجھے ان کو بھی دیکھنا ہے۔"

"اس وقت دکان میں صرف دو افراد ہیں۔ ان میں سے ایک اِدھر اُدھر ٹہل رہا ہے اور لگتا نہیں کہ اس کا ارادہ کچھ خریدنے کا ہے جبکہ دوسرا تمہارے کلرک سے باتیں کررہا ہے اس لیے فی الحال تمہاری کوئی مصروفیت نہیں ہے۔ تم ٹینا کے بارے میں بات کرنا کیوں نہیں چاہتے؟"

"میں نہیں جانتا کہ تم کس بارے میں بات کررہے ہو۔ تم چلے کیوں نہیں جاتے؟ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

"یہ بہت اہم ہے کہ میں جلد از جلد ٹینا کو تلاش کروں۔" میں نے اصرار کیا۔ "کم از کم تم مجھے اس کا پورا نام تو بتا سکتے ہو؟"

"مارکر۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ "ٹینا مارکر، وہ میری بیوی ہے۔"

مارکر کا اصرار تھا کہ میک کے قتل میں اس کی بیوی کا کوئی رول نہیں ہے اور وہ جارڈن پراکٹر کو بھی بہت کم جانتی ہے۔ میں نے تجویز پیش کی کہ بہتر ہوگا میں یہی بات تمہاری بیوی کی زبان سے سنوں۔ اس پر وہ آپے سے باہر ہوگیا اور بولا۔ "اس کے لیے تمہیں وارنٹ حاصل کرنا ہوگا، اب تم جا سکتے ہو۔"

"میں تمہاری بیوی کو کسی غلط معاملے میں الجھانے کی کوشش نہیں کررہا۔" میں نے اسے یقین دلایا۔ "میرے پاس اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے بہت کم وقت ہے اور اگر ناکام ہوگیا تو میری اپنی شادی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔"

"تم کسی اور کو ملوث کرنا چاہ رہے ہو؟" لگ رہا تھا کہ وہ میری بات نہیں سمجھ پایا۔

"کیا میک کو ہی ملوث کرنا چاہ رہے ہو؟ میں نے اس کے بارے میں پڑھا ہے کہ وہ ایک بے وقوف شخص تھا اور اس نے کئی لوگوں کو ناراض کیا۔"

یہ ایک نئی اطلاع تھی جس کا ذکر جج کی بھیجی ہوئی فائل میں نہیں تھا لیکن یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ پولیس کی رپورٹس کسی شخص کے کردار کا تعین نہیں کرتیں لیکن جارڈن پراکٹر اتنا غصے میں تھا کہ وہ کلاس کے دوران ہی مسٹر میک پر حملہ آور ہوگیا۔

جب ہم ٹیکسی میں بیٹھے تو مائیک نے پوچھا کہ کیا لیام میک شادی شدہ تھا لیکن جج کی بھیجی ہوئی فائل سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ اس کی کسی کے ساتھ رومانی وابستگی تھی یا نہیں۔

"میرا خیال ہے کہ ٹینا مارکر کو تلاش کرنا بہت ضروری ہے۔" مائیک نے کہا۔ "اب کہاں جانا ہے؟"

"کوپچن آکورڈ کے دفتر۔"

جب ہم دفتر پہنچے تو مس جینی نے گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ مائیکل نے اپنے مخصوص انداز میں جینی سے کہا کہ وہ مجھے اس کے حوالے کر کے جارہا ہے کیونکہ اس کی شفٹ شروع ہونے والی ہے۔ اس کے جانے کے بعد جینی

نے مجھ سے پوچھا۔ ”تم نے جارڈن پراکٹر کے بارے میں کیا معلوم کیا؟“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں کیا ریسرچ کر رہا ہوں؟“ میں نے پوچھا۔

”تم نے جج ایڈم سے خفیہ گفتگو کی جو پراکٹر کے مقدمے کی سماعت کر رہا ہے اور بہت جلد اس کا فیصلہ سنانے والا ہے پھر تم بائیک کے ہمراہ لوگوں سے انٹرویو کرنے چلے گئے۔ تمہاری قمیص پر لگا ہوا نشان بتا رہا ہے کہ تم پراکٹر سے ملنے جیل گئے تھے لیکن تمہاری واپسی کافی دیر میں ہوئی۔ اس کا مطلب ہے کہ تم راستے میں کسی اور جگہ بھی رکے تھے۔“

میں نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم نے یہاں رہ کر کافی کچھ سیکھ لیا ہے۔“

”مجھے ہمیشہ اچھے استاد ملے۔ اب ہم جج کے سوال کا جواب دینے کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟“ میں نے اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو پورے دن میں معلوم کیا تھا۔ اس نے میری بات غور سے سنی اور تائید میں سر ہلاتی رہی۔

”میرا خیال ہے کہ ہمیں مارکر کی بیوی ٹینا کو تلاش کرنے اور اس سے پوچھ گچھ کرنے کی ضرورت ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن مجھے شبہ ہے کہ اس وقت وہ اپنے گھر میں رہائش پذیر نہیں ہے۔ وہ اپنی بیوی کا نام سن کر کافی پریشان ہو گیا تھا اور جب میں نے پوچھا کہ وہ کہاں مل سکتی ہے تو اسے ایک جھٹکا لگا۔“

مس جینی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں بھی لوگوں کے تاثرات پڑھنے کی کافی مشق ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں مل کر ایک اچھی ٹیم بنا سکتے ہیں۔“

”میں سمجھتا ہوں کہ ہماری ٹیم بنی ہوئی ہے لہٰذا اب ہمیں جج کے سوال کا جواب دینا چاہیے تاکہ وہ ہفتے کے روز ہماری شادی کروا سکے۔“

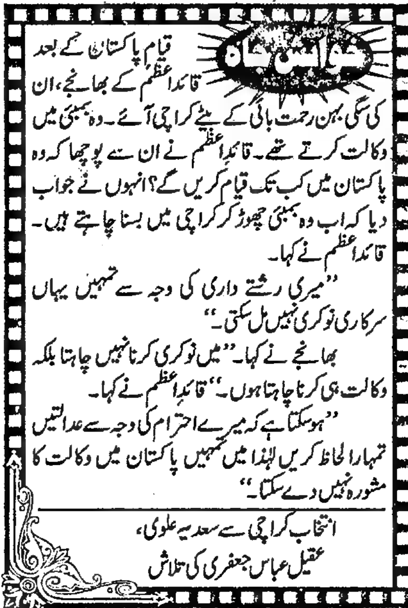
وہ مسکرائی اور کمپیوٹر پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔

”ہمیں ٹینا کے والدین کے بارے میں معلوم کرنا چاہیے لیکن اس کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ شادی سے پہلے اس کا کیا نام تھا۔“

”اس کے والدین کا اس معاملے سے کیا تعلق؟“ میں نے پوچھا۔

”کیونکہ ہر عورت شوہر کا گھر چھوڑنے کے بعد والدین کے پاس ہی جاتی ہے۔“

”میں یہ بات اپنے ذہن میں رکھوں گا۔“ میں نے مذاقاً کہا۔



قیامِ پاکستان کے بعد قائداعظم کے بھانجے، ان کی سگی بہن رحمت بائی کے بیٹے کراچی آئے۔ وہ بمبئی میں وکالت کرتے تھے۔ قائداعظم نے ان سے پوچھا کہ وہ پاکستان میں کب تک قیام کریں گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اب وہ بمبئی چھوڑ کر کراچی میں بسنا چاہتے ہیں۔ قائداعظم نے کہا۔

”میری رشتے داری کی وجہ سے تمہیں یہاں سرکاری نوکری نہیں مل سکتی۔“

بھانجے نے کہا۔ ”میں نوکری کرنا نہیں چاہتا بلکہ وکالت ہی کرنا چاہتا ہوں۔“ قائداعظم نے کہا۔

”ہو سکتا ہے کہ میرے احترام کی وجہ سے عدالتیں تمہارا لحاظ کریں لہٰذا میں تمہیں پاکستان میں وکالت کا مشورہ نہیں دے سکتا۔“

انتخاب کراچی سے سعدیہ علوی،
عقیل عباس جعفری کی تلاش

”میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جا رہی۔“ اس نے اسکرین پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

”ٹینا مارکر کا پیدائشی نام کرسٹینا وان ڈائنک تھا۔ اس کے والدین ٹری روڈ پر ایڈیسن میں رہتے ہیں۔“ وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ”ہم وہیں چلتے ہیں۔“

”ہمیں چاہیے کہ پہلے انہیں آمد کے بارے میں مطلع کر دیں۔“ میں نے کہا۔ ”اس طرح اچانک جانا ٹھیک نہیں۔ اگر وہ گھر پر نہیں ہوئے تو؟“

”اگر وہ وہاں چھپی ہوئی ہے اور ہم اسے ہوشیار کر دیں کہ لیام میک کے قتل کے بارے میں پوچھنے کے لیے آ رہے ہیں تو کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ ہمارا انتظار کرے گی؟“

اس کی بات معقول تھی۔ ہم نقشے کی مدد سے رابرٹ اور لارا وان ڈائنک کے گھر سولہ منٹ میں پہنچ گئے۔ مس جینی نے گھنٹی بجائی اور تیرہ سیکنڈ بعد ایک ساٹھ سالہ شخص نے دروازہ کھولا۔ اس نے باری باری ہم دونوں کو دیکھا اور جینی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

جینی نے جواب دینے کے بجائے میری طرف دیکھا۔ میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میرا نام سیموئل ہوٹنگ اور یہ میری ساتھی مس جینی

ہے۔ ہم ٹینا مارکر کو تلاش کر رہے ہیں۔ کیا تم جانتے ہو کہ وہ ہمیں کہاں ملے گی؟''

اس نے میری طرف الجھے ہوئے انداز میں دیکھا اور بولا۔ ''میری بیٹی یہاں نہیں ہے۔''

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں ہے؟'' جینی نے پوچھا۔ ''ہم پولیس والے نہیں ہیں اور نہ ہی کسی کو پریشان کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں صرف ایک سوال کا جواب چاہیے۔''

''میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے؟'' وان نے کہا۔ ''وہ اور اس کا شوہر سائرول میں رہتے ہیں۔ وہاں جا کر معلوم کرو۔''

''کیا ہمیں اس کا پتا مل سکتا ہے؟'' میں نے کہا۔

''نہیں۔'' وان نے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔ جینی نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ بات ختم ہو گئی۔''

''میں ایسا نہیں سمجھتا۔'' میں نے یہ کہہ کر دوبارہ گھنٹی بجائی۔

وان ڈائک نے دروازہ کھولا۔ اس بار وہ کافی غصے میں تھا۔ ''اگر تم یہاں سے نہ گئے تو مجھے پولیس کو فون کرنا ہو گا۔'' اس نے کہا۔ ''میری بیٹی یہاں نہیں ہے اور اگر ہوتی تب بھی میں تمہیں اس سے بات نہ کرنے دیتا۔ اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ اسے تنہا چھوڑ دو۔''

یہ کہہ کر اس نے زور سے دروازہ بند کر دیا۔ ''ایک آدمی کی زندگی خطرے میں ہے۔'' میں چلایا۔ گو کہ تکنیکی طور پر یہ بات درست نہیں تھی کیونکہ نیوجرسی میں 1963ء کے بعد کسی قیدی کو موت کی سزا نہیں دی گئی لیکن جیل میں عمر قید کی سزا کاٹنا بھی کوئی اچھی بات نہیں تھی اور اگر جج ایڈم نے جارڈن پراکٹر کو مجرم قرار دے دیا تو اسے ساری زندگی جیل میں رہنا ہو گا۔

ہم واپس دفتر کے لیے روانہ ہوئے۔ سارے راستے ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی پھر جینی نے کار سڑک کے کنارے روکی اور بولی۔ ''شاید ہم غلط راستے پر جا رہے ہیں۔ تم نے بتایا کہ جارڈن پراکٹر صرف پال میک کارٹنی کے گمشدہ گٹار کے بارے میں بات کرتا رہا جبکہ تم نے اس کے سامنے بیٹلز کا بھی تذکرہ کیا۔ کیا وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ ایک ہی چیز کے بارے میں بات کرتا ہے؟''

''جارڈن پراکٹر خود تسکینی میں مبتلا ہے اور خیالات کی دنیا میں کھویا رہتا ہے۔ اس کی ساری دلچسپی ان سازوں تک محدود ہے جن میں تار لگے ہوتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور جب وہ ذہنی دباؤ میں ہوتا ہے تو اس کی پوری توجہ ان سازوں پر ہوتی ہے۔''

''لیکن صرف ایک ہی ساز کیوں؟ مجھے یقین ہے کہ وہ ستار اور وائلن کے بارے میں بھی سوچ سکتا ہے۔ تم نے بتایا کہ لیام میک سے اس نے ستار کے بارے میں ہی بحث کی تھی پھر وہ اس کے بارے میں کیوں نہیں سوچ رہا تھا؟''

میں نے اس کے سوال پر غور کیا لیکن اس کا ہماری ریسرچ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔'' وہ بہت ہی مشہور ساز ہے اور گزشتہ پچاس برس سے گمشدہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ ممکن ہے کہ پراکٹر نے لیام میک کو ستار پر بحث کی وجہ سے قتل کیا ہو اور اسے نظر انداز کرنے کے لیے میک کارٹنی کے گٹار کا استعمال کر رہا ہو۔''

مس جینی نے مجھے مشکوک انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم نہیں سمجھتے کہ جارڈن نے میک کو ستار کہنے پر قتل کر دیا ہو؟''

''نہیں، میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میں ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچا لیکن میرے خیال میں یہ بعد از قیاس ہے کہ جارڈن پراکٹر نے یہ قتل کیا ہو۔''

''پھر وہ میک کارٹنی کے گٹار پر کیوں توجہ مرکوز کیے ہوئے ہے؟ وہ ٹینا کا نام لے کر کیوں چلایا جبکہ ہمیں یہ بھی یقین نہیں کہ وہ ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟''

''برائے مہربانی دفتر واپس چلو۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے تو میں اپنے آئی فون پر بھی ریسرچ کر سکتا ہوں لیکن تم جانتی ہو کہ میں سڑک پر سے نظریں ہٹانا نہیں چاہتا۔''

ہم دفتر پہنچے اور میں فوراً ہی اپنے کمپیوٹر پر بیٹھ گیا۔ جینی میرے پیچھے آتے ہوئے بولی۔

''کیا میں تمہاری کوئی مدد کر سکتی ہوں؟''

''ہاں، اگر ہو سکے تو لیام میک کے دادا کا نام معلوم کر اور یہ کہ اس کا خاندان کب اور کہاں سے امریکا آیا؟''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔ وہ کچھ حیران دکھائی دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی اس نے اپنی ریسرچ کا نتیجہ مجھے سنا دیا۔ ''لیام میک اپنے خاندان کا پہلا فرد تھا جو امریکا میں پیدا ہوا۔ یہ خاندان 1980ء میں نیویارک آیا اور وہ تین سال قبل نیوجرسی شفٹ ہو گیا۔ وہ میوزک کلاسز پڑھانے کے علاوہ نیویارک کے ایک میوزک پبلشر ٹو پبلشنگ کے لیے مشیر کے طور پر بھی کام کرتا تھا۔ اس کا دادا سین میک، ڈبلن میں پیدا ہوا لیکن 1961ء میں لندن آ گیا۔ اس نے فیملی کے ساتھ امریکا ہجرت نہیں کی اور چار ماہ قبل انگلستان میں انتقال کر گیا۔''

صورت حال آہستہ آہستہ واضح ہو رہی تھی لیکن ابھی ایک اہم بات معلوم کرنا باقی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا کبھی سین میک نے ایبے روڈ اسٹوڈیوز یا لندن کے گٹار وزارڈ، کے لیے کام کیا؟“

جینی نے میری طرف سوالیہ انداز میں دیکھا اور دوبارہ کمپیوٹر پر انگلیاں چلانے لگی۔ کافی دیر بعد اس نے جواب دیا۔ ”نہیں، کبھی نہیں۔“

مجھے لگا کہ میرا نظریہ غلط تھا اور اب مجھے نئے سرے سے ریسرچ کرنی پڑے گی جبکہ میرے پاس جج کے سوال کا جواب دینے کے لیے صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا لیکن جینی نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ”البتہ اس کی دادی آئرین میک نے ان کے لیے کام کیا تھا لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

میرے پاس اس کی وضاحت کے لیے وقت نہیں تھا۔ اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی اور ایک پینتیس سالہ عورت دفتر میں داخل ہوئی۔ اس نے جینی سے پوچھا۔ ”کیا یہی کوئسچن آنسورڈ... کا دفتر ہے؟“

”ہاں۔“ جینی نے کہا۔ ”کیا تمہیں کسی سوال کا جواب معلوم کرنا ہے؟“

”نہیں۔“ اس عورت نے کہا۔ ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم لوگ مجھے تلاش کر رہے تھے۔ میں ٹینا مارک ہوں۔“

”میرا نام سیموئل ہوننگ ہے اور یہ میری مددگار مس جینی ہے۔“

جینی نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ تم ہم سے ملنے آگئیں۔“

”میرا آنے کا ارادہ نہیں تھا۔“ ٹینا نے کہا۔ ”میں اس وقت گھر میں تھی جب تم لوگ میرے باپ سے باتیں کر رہے تھے۔ جب تم نے کہا کہ ایک آدمی کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی ہے تو میں سمجھ گئی کہ اس کا کیا مطلب ہے تاہم میں اس وقت تمہیں جواب نہ دے سکی۔“

جینی نے کہا۔ ”مسٹر ہوننگ آج تمہارے شوہر سے ملے تھے اور انہیں یہ اندازہ ہوا کہ تم دونوں کے تعلقات ٹھیک نہیں ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ تم کہاں ٹھہری ہوئی ہو۔“

ٹینا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”وہ جانتا ہے کہ میں کہاں ٹھہری ہوئی ہوں۔ کاش اسے یہ معلوم نہ ہوتا۔ شاید میں بہت جلد کہیں اور چلی جاؤں۔“

”کیا اس کی وجہ وہ رقم ہے جو وہ تمہارے بزنس اکاؤنٹ سے نکال رہا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”تم اس بارے میں کیسے جانتے ہو؟“ ٹینا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ جینی کے چہرے پر بھی حیرانی نظر آرہی تھی۔

”یہ میرا اندازہ تھا۔“

ٹینا نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”وہ چھوٹی موٹی رقم نہیں بلکہ تین لاکھ ڈالر تھے یہی نہیں بلکہ اس نے مزید رقم حاصل کرنے کے لیے ہمارے گھر اور کاروبار کو بھی گروی رکھا ہوا تھا۔“ اس نے مس جینی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کے علاوہ بھی وہ کچھ کر رہا تھا جس کے بارے میں اس نے مجھے نہیں بتایا اور تبھی مجھے لیام میک کا پتا چلا۔“

اب میں پوری بات سمجھ گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”تمہارا شوہر مسٹر میک کو کس طرح جانتا تھا؟“

”پہلی بار جارڈن کے ذریعے اس کا تعارف ہوا۔“ ٹینا نے جواب دیا۔

”جارڈن پراکٹر۔“ مس جینی نے تصدیق چاہی۔

ٹینا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”رڈن ہمارے اسٹور میں کام کرتا ہے۔ ہم دونوں میں تھوڑی بہت دوستی ہوگئی تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ اس نے مسٹر میک کو بتایا ہوگا کہ ہم نایاب سازوں کا سودا بھی کرتے ہیں۔“

”اور لیام میک کے پاس ایک بہت ہی نایاب ساز تھا؟“

”اس نے یہی بتایا تھا لیکن میں نے وہ کبھی نہیں دیکھا۔“

”لیام میک کے پاس پال میک کارنٹی کا گمشدہ گٹار تھا۔“ جینی نے کہا۔

”بالکل۔“ میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ”اور وہ اسے تمہارے شوہر کو فروخت کرنا چاہ رہا تھا۔ کیا یہ سچ نہیں ہے ٹینا؟“

”بالکل نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس نے ایتھن کو اس بارے میں بتایا تھا کیونکہ وہ اسے متاثر کرنا چاہ رہا تھا کہ اس کے پاس دنیا کا مشہور گمشدہ ساز ہے لیکن جب ایتھن نے اسے خریدنا چاہا تو پروفیسر نے اس کی قیمت بڑھا دی۔“

”میں سمجھی نہیں۔“ مس جینی نے کہا۔ ”اگر لیام کے پاس وہ ساز پہلے سے تھا تو اب وہ اسے کیوں بیچنا چاہ رہا تھا۔ اسے گم ہوئے پچاس سال ہو چکے ہیں۔ اس کے پاس وہ ساز کہاں سے آیا؟“

”ابھی تم نے اپنی ریسرچ میں جو معلوم کیا اس پر غور

کرو۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’تمہارے پاس تمام معلومات ہیں۔‘‘
’’تمہارا مطلب ہے کہ لیام کو وہ ساز اس کی دادی سے ملا؟ جو اس نے کئی برس پہلے چوری کیا تھا؟‘‘
’’یہی حقیقت ہے۔‘‘ میں نے جواب دیا۔ ’’آئرین، 1960ء میں لندن کی ایک فرم گٹار ویز ارڈ میں کام کرتی تھی جہاں بیٹلز اور خاص طور پر پال میک کارٹنی اپنے سازوں کی مرمت کرواتے تھے۔ پال نے 1969ء میں اپنا ساز مرمت کی غرض سے دیا گو کہ وہ اسے ہر وقت استعمال نہیں کرتا تھا لیکن اسے ٹھیک حالت میں رکھنا ضروری تھا۔‘‘
’’میں سمجھی نہیں۔‘‘ ٹینا نے کہا۔ ’’اس کی دادی نے اسے پال کا گٹار دیا؟ کیا کسی کو شبہ نہیں ہوا کہ اس فرم سے کوئی ساز غائب ہے؟‘‘
’’نہیں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ وہ گٹار مرمت کے بعد واپس کر دیا گیا تھا لیکن مسز میک اپیسے روڈ اسٹوڈیو میں بھی کام کرتی تھی جہاں بیٹلز اپنے گانے ریکارڈ کرواتے تھے لیکن 1969ء میں انہوں نے اسٹوڈیو تبدیل کر لیا جہاں حفاظتی انتظامات برائے نام تھے۔ اس لیے مسز میک کی بہ آسانی اس گٹار تک رسائی ہوگئی۔‘‘
’’لیکن وہ گٹار لیام کو کیسے ملا؟‘‘ ٹینا نے پوچھا۔
مس جینی اس سوال کا جواب دینے کے لیے تیار تھی۔
’’لیام کے دادا کا انتقال چار ماہ قبل ہوا جبکہ آئرین 2004ء میں مر چکی تھی لیکن لیام کا دادا لندن میں ہی رہتا رہا۔ آئرین نے کئی سال قبل یہ سوچ کر گٹار اسے دیا تھا کہ اسے اچھی قیمت پر بیچ دیں گے لیکن جب اس کی گمشدگی کا چرچا ہوا تو وہ اسے منظر عام پر نہ لا سکے۔ سین کے مرنے کے بعد وہ گٹار اس کی وصیت کے مطابق لیام کو مل گیا۔‘‘
میں نے ٹینا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ’’اس رات کیا ہوا تھا جب لیام کا قتل ہوا؟ کیا تم وہاں موجود تھیں؟‘‘
’’مسز ہوننگ، میں کسی کے لیے مشکل پیدا کرنا نہیں چاہتی۔ میں اس وقت وہاں نہیں تھی جب لیام کی موت واقع ہوئی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اس رات ایتھن سے ملنے اور اسے پہلی بار وہ گٹار دکھانے والا تھا لیکن میں نہیں جانتی کہ وہاں کیا ہوا؟‘‘
’’جارڈن پراکٹر وہاں کیوں گیا تھا؟‘‘ مس جینی نے پوچھا۔
’’مجھے نہیں معلوم۔‘‘
’’کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس نے جیل میں کئی بار تمہارا نام لے کر پکارا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

ٹینا تھوڑی سی پریشان نظر آئی۔ ’’شاید میں اس کی واحد دوست تھی۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’گو کہ میں اسے اچھی طرح نہیں جانتی تھی۔ شاید اس نے میرا نام اس لیے پکارا ہو کہ میں اس کی مدد کر سکوں۔‘‘
’’لیکن تمہارا شوہر گٹار کے بغیر ہی واپس آ گیا۔ کیا یہ درست ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’میں نے وہ گٹار نہیں دیکھا۔‘‘ ٹینا نے کہا۔ ’’ایتھن نے اس رات کے بعد مجھ سے زیادہ بات نہیں کی لیکن وہ لیام کے بارے میں بڑبڑاتا رہا۔‘‘
میں نے پوچھا۔ ’’کیا تم اپنے شوہر سے خوف زدہ ہو؟‘‘
ٹینا نے اس سوال کا جواب نہیں دیا لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ’’ٹھیک ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’کیا تمہارے والدین کے گھر کے علاوہ کوئی جگہ ہے جہاں تم رہ سکو؟‘‘
’’نہیں۔‘‘
میں نے مس جینی کی طرف دیکھا اور اس نے سر ہلا دیا۔ ’’میں ایک ایسی جگہ سے واقف ہوں۔‘‘ میں نے کہا گو کہ میرے والدین اس کے لیے تیار نہیں تھے کہ ہم ڈنر پر ایک مہمان کو لے کر آئیں لیکن ٹینا کی حالت دیکھ کر مان گئے کہ وہ چند روز کے لیے میرے اپارٹمنٹ میں رہ سکتی ہے۔ میں مس جینی کے ٹاؤن ہوم میں شفٹ ہو گیا جس میں ایک کمرا خالی تھا۔ ٹینا نے اپنے باپ کو فون کر کے بتا دیا کہ وہ کچھ عرصہ کسی اور جگہ رہے گی اور وہ اس کے لیے پریشان نہ ہو۔ رابرٹ وان ڈائنک اس پروگرام سے متفق نہیں تھا لیکن بالآخر مان گیا۔
’’تم اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔‘‘ میری ماں نے ٹینا سے کہا۔ ’’تم وہی کرو جو عام طور پر کرتی ہو اگر اوپر کی منزل میں سیموئل کے کمرے میں رہنا چاہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔‘‘
’’شکریہ۔ مسز ہوننگ۔‘‘ ٹینا نے کہا۔
’’مجھے ڈر ہے کہ شاید جینی اور میں ڈنر کے لیے نہ رک سکیں۔‘‘ میں نے ماں سے کہا۔
اس نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔ ’’تم کہاں جا رہے ہو؟‘‘
’’جیل۔‘‘ میں نے مختصر جواب دیا۔
اس ملاقات کے لیے مجھے ایک بار پھر جج ایڈم سے جیل حکام کو فون کروانا پڑا۔ اس بار میں مائیک کی ٹیکسی کے بجائے جینی کی کار میں سفر کر رہا تھا۔ وہ بھی مائیک کی طرح

جیل کے باہر اپنی کار میں بیٹھی رہی اور میں ملاقاتی کمرے میں چلا گیا۔ جارڈن پراکٹر وہاں پہلے سے موجود تھا۔

''پال میک کارٹنی کا گٹار گم ہو گیا ہے۔'' اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ لیام میک کے پاس تھا جسے وہ ایتھن مارکر کو فروخت کرنے والا تھا۔ میرے پاس بہت کم وقت ہے۔ مجھے بتاؤ کہ جس رات مسٹر میک کی موت واقع ہوئی تم وہاں کیا کر رہے تھے؟''

''وہ گٹار 1969ء سے غائب ہے۔'' جارڈن پراکٹر نے کہا۔

''نہیں، وہ لیام میک کے دادا کے پاس تھا اور چند ماہ قبل ہی مسٹر میک نے اسے وصول کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں یہ بات معلوم تھی۔ لہٰذا مجھے بتاؤ کہ اس رات تم مسٹر میک کے گھر کیوں گئے تھے جب اس کا قتل ہوا؟''

''وہ گٹار مرمت کے لیے گٹار ویزارڈ، لایا گیا تھا۔ مرمت کے بعد اسے واپس کر دیا گیا پھر وہ غائب ہو گیا۔''

''وہ میرے پاس ہے۔'' میں نے ایک اور حربہ آزمایا۔

جارڈن پراکٹر حیرت سے مجھے دیکھنے لگا پھر بولا۔ ''نہیں، وہ تمہارے پاس نہیں ہے۔''

''وہ میرے پاس ہی ہے۔'' میں نے اصرار کیا اور میں اسے واپس پال کو بھیج رہا ہوں لیکن تمہیں بتانا ہوگا کہ لیام میک کی موت کیسے ہوئی اور تم وہاں کیوں گئے تھے؟''

''وہ گٹار تمہارے پاس کیسے آیا؟''

''مسٹر میک نے مرنے سے پہلے مجھے دیا تھا۔'' میں نے جھوٹ بولا۔ ''وہ چاہتا تھا کہ میں اسے حفاظت سے رکھوں لیکن میں نہیں جانتا کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ اب تم مجھے بتاؤ کہ اس رات وہاں کیوں گئے تھے؟''

''نہیں، وہ گٹار تمہارے پاس نہیں ہے۔ وہ پچاس سال پہلے کھو گیا تھا۔''

میں بھی اپنی بات پر قائم رہا۔ ''وہ میرے پاس ہی ہے اور میں تمہیں دکھا دوں گا۔''

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟''

''ہاں لیکن تمہیں پہلے یہ بتانا ہوگا۔ کیا تم اسی لیے اس کے گھر گئے تھے کیونکہ وہ تمہیں گٹار دکھانے والا تھا۔''

''مسٹر مارکر نے کہا تھا کہ وہ مسٹر میک سے پال کا گمشدہ گٹار خریدنے جا رہا ہے۔'' جارڈن پراکٹر بولا۔ ''اس نے کہا کہ اگر میں اس کے ساتھ چلوں تو وہ گٹار دیکھ سکوں گا۔''

''بے شک، کیا وہ اپنی کار سے ٹائر راڈ لے کر آیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔''

''جھگڑا کیسے شروع ہوا؟''

''پیسوں پر۔ لیام ساٹھ لاکھ ڈالر مانگ رہا تھا۔ مسٹر مارکر کے پاس اتنی رقم نہیں تھی۔ اس پر مسٹر میک نے کہا کہ وہ گٹار فروخت کرنا نہیں چاہتا اور اسے اپنے پاس ہی رکھے گا۔ اس پر مسٹر مارکر کو غصہ آ گیا۔''

''اور اس نے ٹائر راڈ سے مسٹر میک کے سر پر ضرب لگائی۔''

''جب پولیس آئی تو وہ راڈ تمہارے ہاتھ میں تھی۔ یہ کیسے ہوا؟''

''مسٹر مارکر نے کہا کہ میں نو گیارہ فون کر کے بتاؤں کہ ایک آدمی مر گیا ہے۔ میں ڈر کے مارے زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ اگر میں فون نہیں کروں گا تو وہ مجھے مار دے گا۔ لہٰذا مجھے اس کا کہنا ماننا پڑا پھر اس نے مجھے راڈ پکڑائی اور وہاں سے چلا گیا۔ میں پولیس کے آنے تک وہیں بیٹھا رہا۔''

''اگر تم وہ گٹار دیکھنا چاہتے ہو تو تمہیں ایک وعدہ کرنا ہوگا۔''

''وہ کیا؟''

''کچھ اور پولیس والے رات کو تم سے بات کرنے آئیں گے۔ تم انہیں سب کچھ سچ بتا دینا۔''

''پھر میں وہ گٹار دیکھ سکوں گا؟'' جارڈن نے کہا۔

''ہاں۔'' مجھے جھوٹ بولتے ہوئے شرم آ رہی تھی لیکن میں یہ سب کچھ اسے بچانے کے لیے کر رہا تھا۔

میں نے جیل سے باہر آتے ہی پولیس کو فون کیا اور ہم واپس گھر آ گئے۔ اس وقت تک ہمیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ایتھن مارکر گرفتار ہو گیا ہے اور پولیس جارڈن سے تفتیش کر رہی ہے۔

اگلے روز جارڈن کے خلاف مقدمہ واپس لے لیا گیا۔ جج ایڈم نے اپنا وعدہ نبھایا اور ہفتے کے روز میری شادی میں شرکت کے لیے پہنچ گیا۔ اس نے روایتی انداز میں ہم دونوں سے عہد و پیمان لیے اور ہم شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ جج نے مجھے جو کام سونپا تھا، اس میں مجھے کامیابی ہوئی اور ایک بے گناہ سزا سے بچ گیا۔

❖❖❖

تیرہویں قسط

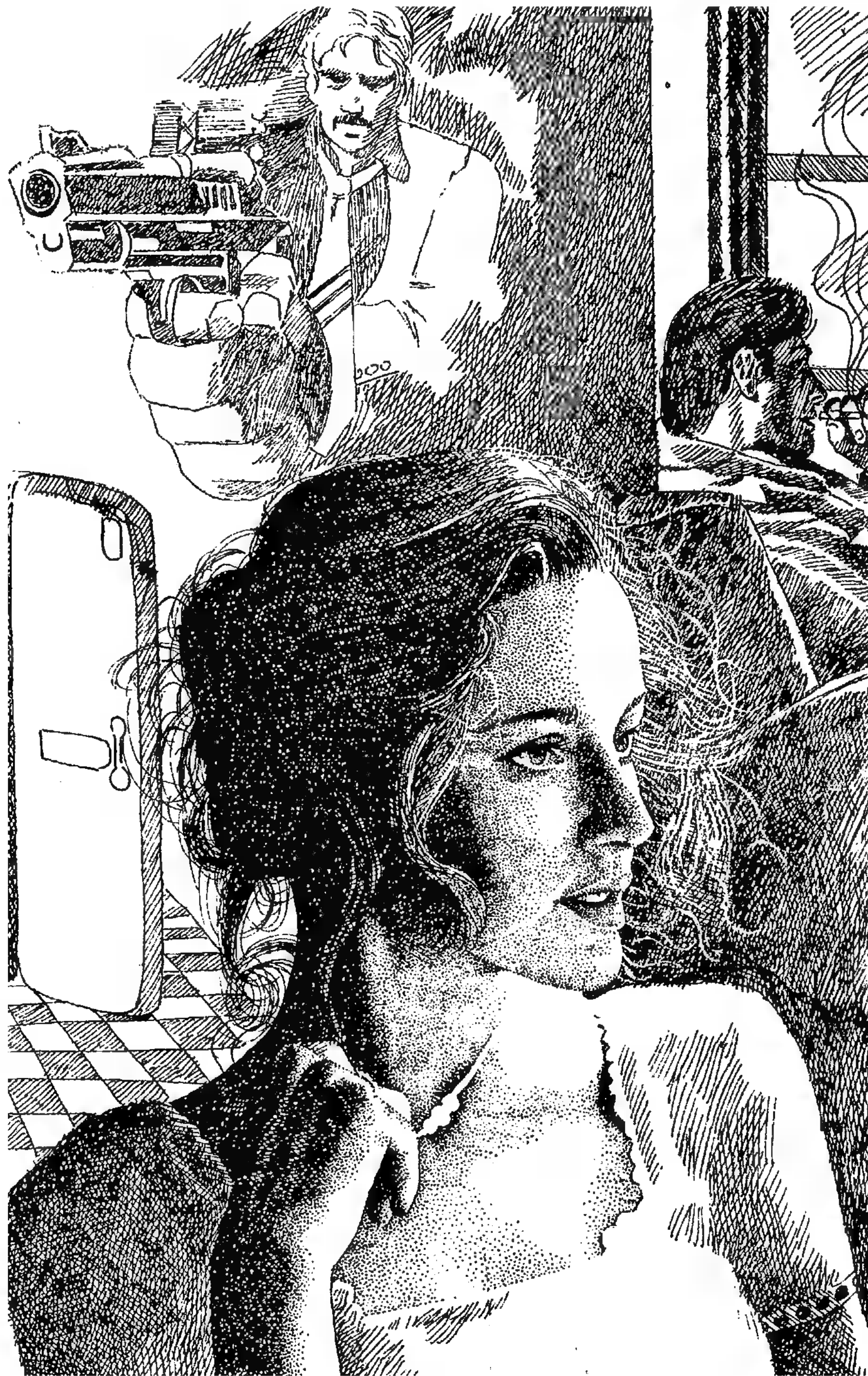
الاؤ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

الاؤ... مرحوم کاشف زبیر کی آخری سلسلے وار تحریر ہے... جو انہوں نے ... قارئین کے لیے تحریر کرنا شروع کی تھی... لیکن دستِ قضا نے ان کو اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ چند سنسنی خیز اقساط لکھنے کے بعد اسے اختتام تک پہنچاتے... کسی بھی مصنف کی تحریر کو اسی کے رنگ و آہنگ میں لکھنا کڑا امتحان ہوتا ہے... الاؤ کو آگے بڑھانے کا فریضہ اب ڈاکٹر عبدالرب بھٹی انجام دیں گے... الاؤ ایکشن، تھرل اور سسپنس سے بھرپور داستان ہے... ایک مسیحا کو لوگوں کی مسیحائی سے دور کر کے درندگی کے گھناؤنے کھیل میں ایسا الجھایا کہ وہ زندگی کی ہر رنگینی کو بُھلا بیٹھا... اب اس کا مقصد صرف اور صرف ان دشمنوں کی کھوج تھی جو سامنے ہوتے ہوئے بھی نگاہوں سے اوجھل تھے...

انسان نما درندوں کی داستان وہ جیتے جاگتے ہم نفسوں کو بھی بازار کی جنس بنا دیتے ہیں





وہ مجھے شناسا محسوس ہوا تھا لیکن مجھے یاد نہیں پڑ رہا تھا کہ میں نے اسے کب اور کہاں دیکھا تھا؟ ذہن پر اس وقت زور نہ دے پایا کیونکہ ہم ان ''صاحب'' کے استقبال اور تعارف وغیرہ میں لگ گئے تھے۔

میں اب بھی کن انکھیوں سے اسے دیکھتا رہا، اس دھیان کے ساتھ کہ کہیں کوئی میری اس ''حرکت'' کو دیکھ نہ رہا ہو بلکہ خود کہیں ان ''صاحب'' کو بھی بُری نہ لگ جائے۔

البتہ رومی میری اس ''حرکت'' کو تاڑ چکی تھی۔ اس کی مجھے پروا نہ تھی وہ اپنی ''بچی'' تھی۔

بے شک مجھے اعتراف تھا کہ میں اس پولیس آفیسر ابومعد کو پہچاننے کے باوجود بھی نہیں پہچان پا رہا ہوں لیکن میری چھٹی حس تھی یا پھر میرے لاشعور کا کرشمہ کہ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں نے اس آدمی کو ایسے لمحات یا ماحول میں ضرور دیکھا ہے جو بہر حال ''خوشگوار'' نہ تھے۔ ایک بات اور مجھے پریشان کرنے لگی کہ اسے ان ساری باتوں کا علم ہو جائے گا جو میں کم از کم اسے اچھی طرح پہچان لینے کے بعد گوش گزار نہیں کروانا چاہتا تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اسے یہاں بُلوایا گیا تھا اور اب میں یہ نشست نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

اسی سبب میں نے جلدی جلدی اپنے ذہن کو کھنگالنا شروع کر دیا اور اچانک ہی میرے اندر ایک جھماکا سا ہوا، اس قدر کہ میں بے اختیار اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

اس قدر اہم باتوں کے درمیان میرا یوں اُٹھنا ان سب کو حیران کر گیا مگر میں نے باتھ روم کی ضرورت کا کہہ کر ان کی حیرانی دور کر دی۔

زوہریہ نے ایک ملازم کو بُلوا کر مجھے وہاں تک گائڈ کر دیا۔ ایک شاندار سے باتھ روم میں گھسنے کے بعد میں نے سب سے پہلے اپنے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے اور دونوں ہاتھ واش بیسن پر ٹکا کر اپنے سامنے آئینے کو گھورنے لگا۔

مجھے پورا یقین تھا کہ اگر میں فوراً ہی وہاں سے اُٹھ کر نہ چلا آتا تو وہ سب میری یک دم بدلتی ہوئی حالتِ زار پر ضرور چونک جاتے، کیونکہ اس وقت بھی جو تاثرات میں اپنے چہرے پر دیکھ رہا تھا، وہ کچھ ایسے ہی تھے کہ آئینے پر نظر پڑتے ہی خود میں بھی حیران سا ہوا تھا۔

میری سانسیں چڑھی ہوئی تھیں، چہرہ سرخ ہو رہا تھا، اعصاب زدگی کے آثار واضح تھے اور آنکھوں میں سرخی تھی۔

''یہ...... وہی ہے...... یہ وہی ہے...... بہت بُرا ہوا...... اسے سب کچھ بتا دیا گیا......''

میں نے آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد میں دوبارہ اپنے چہرے پر چھینٹے مارنے لگا، حتیٰ کے سر بھی گیلا کر ڈالا۔

اچانک واش روم کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی...... میں چونکا۔

''کون؟'' میں نے دروازے کی طرف منہ کر کے کہا۔

''میں ہوں، رومی۔'' اس کی سرگوشی نما آواز پر میں دروازے کے قریب آ گیا۔ مجھے الجھن آمیز حیرت ہوئی، اسے بھلا میرے پیچھے اس طرح آنے کی کیا ضرورت تھی۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے تھوڑا دروازہ کھول کر اس سے پوچھا۔

''آر یو او کے......؟'' اس نے پوچھا۔

''واپس جاؤ، میں آتا ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ وہ پلٹ گئی۔

میں نے جلدی جلدی اپنی حالت بہتر کی اور باتھ روم سے نکلا اور دوبارہ نشست گاہ آ کر ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔

اب میں کافی حد تک خود کو پُرسکون کر چکا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ میں نے خود کو سمجھا لیا تھا۔ کچھ تسلی دے دی تھی کہ اگر یہ راز کھل ہی رہا ہے تو ساتھ میں ایک اور اہم راز سے بھی تو میں واقف ہونے جا رہا ہوں۔

باتیں ہوتی رہیں، ظاہر ہے میں بھی شاملِ گفتگو رہا۔ اس دوران میں نے ابومعد کے چہرے سے کچھ بھانپنے کی کوشش بھی چاہی تھی لیکن مجھے یہ دیکھ کر ایک اُلجھن آمیز حیرت بھی ہوئی تھی کہ اس کے بشرے سے ابھی تک مجھے دیکھ کر کوئی ایسے چونکنے کے آثار یا کسی قسم کے جذبۂ شناسائی یا...... بالکل بھی نمودار نہیں ہونے پائے تھے۔

تب پھر میں اس کے بارے میں یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ مضبوط اعصاب کا مالک اور ہوشیار و چالاک آدمی تھا۔

ایک مبہم خیال یہ بھی تھا کہ ممکن ہے وہ مجھے پہچانا ہی نہ ہو، خیر، یہ اس کے لیے کیا کم بات تھی کہ وہ ان ساری چیزوں سے باخبر ہو رہا تھا۔

شاید میں ہی غلط سوچ رہا تھا، مگر نہیں...... میں کیسے غلط ہو سکتا تھا؟ یا میری نظریں کیسے دھوکا کھا سکتی تھیں؟ کچھ تو تھا اس درمیان میں...... جی تو چاہا کہ اس کا بھانڈا ادھر ہی پھوڑ ڈالوں، پھر ارادہ بدل دیا۔ اس سے دشمن چوکنا ہو

جاتا۔ چوکنا تو خیر وہ اب بھی ہوگیا ہوگا۔ دوسری طرف میں ابومعد کی جانب سے ایک ابہام کا بھی شکار تھا کہ ضروری تو نہیں کہ آنکھوں دیکھا منظر سچا ہو۔ اس کے پیچھے میں کوئی اور بھید ہو۔

”یہ پولیس آفیسر خونی سوداگروں سے ملا ہوا ہے۔“ واپسی پر جب میں اور رومی اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہنچے تو رومی سے میں چھوٹتے ہی بولا۔

میرا خیال تھا کہ رومی اس دھماکے دار انکشاف پر اُچھل پڑے گی مگر بڑے اطمینان سے مسکرا کر اس نے کہا۔ ”میں پہلے ہی تمہاری کیفیات تاڑ چکی تھی جس سے مجھے اندازہ ہو چلا تھا کہ تمہیں ابومعد کو دیکھ کر کوئی شاک لگا ہے۔“

”یہ بہت بُرا ہوگیا۔“ میں جھلّا کر بڑبڑایا۔

”اس کا فیصلہ بعد میں ہوگا، پہلے یہ بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے؟“ رومی میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کے چہرے پر اب تجسس پھیلا ہوا تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور بتانے لگا۔ ”یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں یہاں جاب کرتا تھا اور جب میرا اور رمیش کا اتفاق سے اسپتال کے پندرھویں فلور پر سامنا ہوگیا۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا، یہ فلور ٹرانسپلانٹ کے لیے مخصوص تھا اور وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی مگر ہوا یہ کہ لفٹ میں کوئی مسئلہ ہوا اور میں نے دوسرے فلور کا بٹن دبایا مگر وہ پندرھویں فلور پر جا کر رکی اور اس کے بعد ٹس سے مس نہیں ہوئی تھی۔ اس سے اوپر شاید اس لیے نہیں جا سکی کہ یہ آخری منزل تھی۔ میں نے اسے روکنے کے لیے متعدد بار اس کے تمام بٹن دبائے مگر اس نے آخری فلور پر آ کر دم لیا تھا۔

وہ رکی تو اسے دوبارہ حرکت میں لانے کے لیے بٹن دبائے لیکن ایسا لگ رہا تھا وہ قطعی جام ہوگئی ہے۔

میں نے انٹرکام کی مدد سے اسپتال کی سیکیورٹی سے رابطہ کرنا چاہا تو انٹرکام بھی ڈیڈ نکلا۔ شاید اس لفٹ کے بجلی کے سسٹم میں کوئی مسئلہ ہوا تھا اس لیے وہ رک گئی تھی۔ مجبوراً میں نے اس کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی نہیں کھلے گا مگر حیرت انگیز طور پر وہ کھل گیا اور میں باہر آ گیا۔

میں نے پہلی دفعہ پندرھواں فلور دیکھا تھا۔ ویسے تو پورا اسپتال ہی نہایت صاف ستھرا اور چمکتا دمکتا تھا۔ وہاں معمولی سی گندگی یا آلودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہر فلور پر جا بجا اوزون جنریٹر تھے جو ہوا کو آلودگی سے صاف رکھتے تھے۔ جراثیم کش ادویات کا مسلسل استعمال کیا جاتا تھا۔ یہاں پانی، ہوا اور ہر اس چیز کی صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا جو مریض استعمال کرتے تھے۔

مگر اس فلور کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ یہ اتنا صاف تھا کہ میں فرش میں اپنی شکل دیکھ سکتا تھا۔ دیواریں کسی ایسے میٹریل کی بنی تھیں جس پر معمولی سا دھبّا بھی فوراً نمایاں ہو جاتا تھا۔ یعنی کوئی اس پر صاف ہاتھ بھی رکھتا تو اس کا پرنٹ آ جاتا۔ یہاں مخصوص الٹراوائلٹ روشنی کے حامل بلب تھے جن کی روشنی ہوا میں موجود جراثیم ہلاک کر دیتی ہے۔ بالکل سورج کی روشنی کی طرح۔ یہ جگہ اتنی صاف تھی کہ یہاں اپنا وجود مجھے گراں لگ رہا تھا۔

ابھی میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں کہ ایک طرف سے ایک سیکیورٹی گارڈ نمودار ہوا۔ اس نے عام وردی کے بجائے ایک پلاسٹک نما لباس پہن رکھا تھا جس نے اسے سر سے پاؤں تک ڈھانپ رکھا تھا۔ حد یہ کہ اس کے چہرے پر مخصوص نقاب بھی تھا۔ صرف ایک ٹیزر گن، ڈنڈے اور واکی ٹاکی سے پتا چل رہا تھا کہ وہ سیکیورٹی گارڈ ہے۔ اس نے میرا کوٹ اور اس پر لٹکا ہوا کارڈ دیکھ لیا اس کے باوجود للکار کر بولا۔

”تم یہاں کیوں آئے، واپس جاؤ۔“

”کیسے؟“ میں نے سوال کیا۔ ”لفٹ اسی فلور پر جام ہوگئی ہے اور میں اندر بند تھا، ابھی دروازہ کھول کر نکلا ہوں۔“

”لفٹ میں واپس جاؤ۔“ اس نے پھر للکار کر کہا۔ وہ لمبا تڑنگا سیاہ فام تھا مگر بہترین انگریزی بول رہا تھا۔

اس نے میری طرف آتے ہوئے ٹیزر گن نکالی تو میں بوکھلا کر جلدی سے لفٹ کے پاس ہوگیا۔ ایسا لگ رہا تھا یہاں آنے والوں سے نمٹنے کا خاص حکم تھا، قطع نظر اس کے کہ وہ کون ہیں۔ وہ حکم کی لفظ بہ لفظ تعمیل کا عادی لگ رہا تھا۔

”میں جان کر نہیں آیا ہوں۔“ میں نے کہا مگر وہ کچھ سنے بغیر میری طرف آ رہا تھا کہ اچانک برابر والی لفٹ کا دروازہ کھلا اور اس سے سب سے پہلے رمیش باہر آیا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکا اور پھر تیزی سے میری طرف آیا۔ اس نے بھی وہی مخصوص لباس پہنا ہوا تھا۔ اس نے نفرت زدہ لہجے میں کہا۔

”تم یہاں کیسے؟“

میرا موڈ آف ہوگیا۔ ”اگر تمہاری آنکھیں سلامت

ہیں تو تم دیکھ سکتے ہو لفٹ خراب ہوئی ہے اور میں اس کا دروازہ کھول کر باہر آیا ہوں۔''

''تم یہاں نہیں آسکتے۔ تمھیں لفٹ میں رہنا چاہیے تھا۔''

''تاعمر؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

وہ مجھے گھورنے لگا، تب ہی میری نظر اس لفٹ پر پڑی جس سے یہ ملعون نکلا تھا۔ وہاں میں نے اسی آدمی (ابومعد) کو سادہ لباس میں باہر نکلتے اور اندر کی طرف جاتے دیکھا تھا اور پھر رمیش بھی جلدی جلدی اس کے عقب میں ہولیا تھا۔ پہلے اس پر شاید میری سرسری نگاہ پڑی تھی، کیونکہ میں نے رمیش کو ہی نکلتے دیکھا تو میں اسی کی طرف متوجہ رہا اور اس کے ساتھ میری تلخ کلامی بھی ہوئی، اسی دوران ہی وہ آدمی یعنی ابومعد بھی لفٹ سے نکل کر راہداری کی جانب مڑا تو رمیش بھی اس کی جانب ہولیا۔

''بس اسی لیے مجھے وہ آدمی سرسری سا یاد رہا اور ذہن کے خانے سے نکل گیا، لیکن آج دوبارہ اسے دیکھا تو میرے لاشعور میں ایک جھما کا ہوا تھا۔''

''ضروری تو نہیں کہ تم نے اگر ابومعد کو رمیش کے ساتھ دیکھ لیا تھا تو وہ بھی اسی کے ساتھ ملا ہوا ہو؟'' رومی نے ساری بات سننے کے بعد خیال ظاہر کیا۔

''یہی سمجھ کر تو میں نے اس پر خاص توجہ نہ دی تھی نہ ہی اپنی یادداشت میں اسے رکھا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن بعض چیزیں ہمارے لاشعور میں موجود رہتی ہیں۔'' میں نے توجیہہ پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بالکل ایسے ہی جیسے ہم کسی کھلے مقام پر کسی ایک خاص فرد کی کیمرے سے تصویر لیں اور اس میں کسی دوسرے فرد کی بھی شبیہہ آجائے...... یہ بھی ایسے ہی ہوا تھا، رہی بات یہ کہ ضروری نہیں ابومعد، رمیش کا ساتھی ہی ہو، تو یہ تم کس بنا پر کہہ سکتی ہو؟''

''تم کس بنا پر کہہ رہے ہو پھر؟'' رومی نے الٹا سوال داغا۔

''اس بنا پر کہ میں نے جس طرح رمیش کو اس کے پیچھے جاتے دیکھا تھا وہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی ماتحت اپنے باس کے پیچھے لپکا ہو، ورنہ رمیش تو مجھے وہاں دیکھتے ہی ایسا بدکا تھا کہ میری اس سے ابھی مزید تلخ کلامی ہونا تھی، وہ اتنی جلدی مجھے چھوڑنے والا نہیں تھا اور پھر ذرا سوچو رومی! اس فلور پر ایک آؤٹ سائڈر فرد کا کیا کام بھلا؟ جہاں غیر متعلقہ اسٹاف کو بھی آنے کی اجازت نہیں تھی۔''

''تمھیں نظر کا بھی تو دھوکا ہوسکتا ہے۔ یعنی ملتے جلتے چہرے......'' وہ بولی۔

''بالکل ہوسکتا ہے یہ......'' میں نے اس کا خیال رد نہیں کیا۔ ''لیکن بعض لوگ اپنے مخصوص حلیے اور چال ڈھال کی وجہ سے صاف پہچان لیے جاتے ہیں۔ ان کی باڈی لینگویج باور کرادیتی ہے۔ تمہارے جاسوسی کے محکمے میں اسے ''آئی ڈینٹی فکیشن'' کہتے ہیں۔''

''اوہ......! تم تو ڈاکٹر سے زیروز یرو سیون ہوتے جارہے ہو۔'' رومی ہنس کر بولی۔ میں سنجیدہ رہا تو وہ بولی۔

''اس سلسلے میں طارق سے بات کرکے دیکھ لیتے ہیں۔'' میں نے اس کے مشورے پر صاد کیا تھا، لیکن میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ میری بات سے کچھ خاص متفق ہوتی نظر نہیں آرہی تھی۔

طارق سے اسکائپ پر بات ہوئی تو اسے میں نے اپنے خیالات سے سو فیصد متفق پایا اور وہ یہ یک ترنت بولا۔

''تم دونوں کو اب از حد محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ابومعد ان سے ملا ہوا ہو اور درپردہ ان کی قانونی سپورٹ کررہا ہو۔ سب آفیسر خالد کی طرح نہیں ہوتے، کالی بھڑیں بھی ان میں ہوتی ہیں۔ کیا خبر خالد اور اس کی فیملی کو کریش کرنے کا ماسٹر مائنڈ بھی یہی ابومعد ہو۔''

یہ پہلا موقع تھا شاید کہ رومی کے بجائے طارق نے میری بات کی بھرپور تائید کی تھی۔ یہی نہیں اس نے جس آخری الذکر بات کا خدشہ ظاہر کیا تھا وہ بھی درست ہی معلوم ہوتی تھی۔

''تم اب اس نئی صورت حال میں کیا کرنا چاہتے ہو؟'' اس نے آخر میں میری رائے جاننا چاہی۔ میں نے کہا۔

''میں سوچ رہا ہوں زوہریہ کے علم میں یہ بات لے آؤں۔ وہ ایک پُرجوش اور باعزم لڑکی ہے۔''

''ہمم......'' طارق نے ہونٹ بھینچے۔ پھر بولا۔ ''کہیں چچا بھتیجی کے درمیان کوئی جذباتی کمزوری آڑے نہ آجائے، معاملہ اُلٹ جائے گا۔''

''میرا خیال ہے کہ ان دونوں کا آپس میں سگا رشتہ نہیں ہے۔ وہ اس کے باپ یعقوب ترمذی کا دوست ہے۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک'' طارق بولا۔ ''تم نے انہیں یا زوہریہ کو اپنے ہوٹل کا پتا تو نہیں دیا؟''

''دیا ہے۔''

''فوراً سے پیشتر یہ ہوٹل چھوڑ کر دوسرے ہوٹل کا رخ

کرو۔‘‘ اس نے مشورہ دیا۔

اس کی بات سُن کر میں اور رومی ایک دم نامعلوم سی تشویش کا شکار ہو گئے اور ہمارے دل تیزی سے دھڑکنے لگے۔

اس وقت رات کا ایک بجا تھا۔ طارق نے چند اور باتیں کیں اور باقی ہماری صوابدید پر چھوڑ دیا۔

’’کیا کہتی ہو؟‘‘ میں نے رومی کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

’’اتنی جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ پہلے دیکھتے ہیں کہ ابومعد نے جو کہا ہے وہ کہاں تک اور کیا کرتا ہے؟‘‘ اس نے جواب دیا۔

اس کے بعد ہم آرام کرنے لیٹ گئے۔ رومی تو جلد ہی خراٹے لینے لگی، میں البتہ بیڈ پر پڑا ابومعد کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔

ہمارے رخصت ہوتے وقت اس نے یہی کہا تھا کہ وہ سرجن امرناگ اور رمیش کے خلاف کل سے ہی اپنے کچھ جاسوس لگا دے گا۔ جو وہاں جاب کی آڑ میں ان دونوں پر نگاہ رکھیں گے اور جیسے ہی ان کی طرف سے کوئی گرین سگنل ملا، وہ ڈائریکٹ ایکشن لینے میں ذرا بھی تامل سے کام نہیں لے گا۔ گویا اس نے معاملے کو کچھ طول دے دیا تھا۔ تب تک کیا خبر وہ انہیں ہوشیار کر دیتا۔

رومی کا خیال تھا کہ پہلے ہمیں ابومعد کے بارے میں تسلی کر لینی چاہیے۔ اس سلسلے میں اس نے کہا تھا کہ ہم کل زوہریہ سے مل لیتے ہیں۔ اس سے کہیں گے کہ وہ اپنے انکل سے یہ بات پوچھے کہ کیا وہ کبھی رمیش سے ملے ہیں یہاں مذکورہ اسپتال کے اس پندرھویں فلور پر انہیں جانے کا موقع کبھی ملا تھا۔ اگر وہ انکار کر دیتا ہے تو سمجھو اس کے اس جھوٹ پر میری بات درست ہوگی، بہ صورتِ دیگر کوئی کھوج لگانے کی کوشش کریں گے۔

یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میری آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

اگلے دن ہم نے زوہریہ کو اپنے ہوٹل روم میں فون کر کے بُلا لیا۔ وہ فوراً ہی آ گئی۔ تب میں نے اسے ساری بات بتا دی۔ اسے بھی یہ سن کر حیرت کا جھٹکا لگا۔ تاہم بولی۔

’’میرا نہیں خیال کہ انکل معد ان لوگوں سے ملے ہوئے ہوں۔‘‘ وہ بولی۔ ’’لیکن میں ان سے کسی بہانے سے پوچھ لوں گی۔‘‘ پھر ذرا تھم کر کچھ سوچنے لگی پھر بولی۔ ’’اگر وہ انکار کر دیں تو مجھے کیا کہنا چاہیے؟‘‘

’’تم ان سے صاف کہہ دینا کہ ڈاکٹر سیف نے انہیں وہاں دیکھا تھا جب وہ بھی اس اسپتال میں جاب کرتے تھے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’ہمم..... ٹھیک ہے۔‘‘

’’پھر دیکھو، وہ کیا جواب دیتا ہے۔‘‘

میں نے محسوس کیا تھا کہ زوہریہ بھی اس نئی صورتِ حالات سے کچھ اُلجھی ہوئی اور پریشان نظر آ رہی تھی۔ لیکن یہ بھی تھا کہ اس کے چہرے پر ایک جوش بھی کروٹیں لیتا محسوس ہوتا تھا۔ وہ ایک دم بولی۔

’’ٹھہرو، میں ابھی انکل سے بات کر کے پوچھ لیتی ہوں، لیکن میں انہیں یہ نہیں بتاؤں گی کہ میں یہاں ہوں، اس لیے تم دونوں بھی کوئی آواز نہ نکالنا۔‘‘

ہم نے اسے اجازت دے دی، لیکن اسے اسپیکر وائڈ کرنے کا کہہ دیا۔ اس نے اپنے سیل پر ابومعد کا نمبر ملایا ... رومی اور میری دھڑکتی نظریں زوہریہ کے چہرے پر جم گئیں۔

’’ہیلو، انکل! میں زوہریہ، کیسے ہیں؟ آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟‘‘

’’بالکل نہیں، تم کیسی ہو؟‘‘ اس کی بھاری آواز سنائی دی۔

’’میں ٹھیک ہوں، آپ سے ایک بات پوچھنا تھی اگر آپ زیادہ مصروف نہیں ہیں تو۔‘‘

’’ہمم...... پوچھ لو۔‘‘

’’انکل! آپ اس اسپتال میں پہلے بھی کبھی گئے ہیں؟‘‘

’’بہت بار گیا ہوں۔‘‘

’’میرا مطلب ہے پندرھویں فلور پر اور...... کیا ڈاکٹر رمیش اگروال سے آپ پہلے بھی مل چکے ہیں؟‘‘

اس کی بات پر دوسری جانب اچانک خاموشی طاری ہو گئی۔ میں اور رومی جیسے سانس روکے ہوئے زوہریہ کی طرف تکے جا رہے تھے۔

چند لمحوں بعد ہی ابومعد کی آواز اُبھری۔ اس نے ہلکے انداز میں پوچھا۔ ’’یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ کیا کسی نے بتایا ہے تمہیں؟‘‘

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ زوہریہ بھی میری جانب تکنے لگی، میں نے اسے مخصوص اثباتی اشارہ کر ڈالا۔ تب وہ ابومعد سے بولی۔

’’مجھے...... ڈاکٹر سیف نے ہی بتایا ہے انکل! وہ اُن

دنوں اس اسپتال میں جاب کرتے تھے۔ غلطی سے وہ پندرھویں فلور پر چلے گئے تھے اور وہاں ان کی ڈاکٹر رمیش اگروال سے منہ ماری ہوگئی تھی اور آپ اس وقت اسی لفٹ سے نکلے تھے جس سے رمیش برآمد ہوا تھا بعد میں وہ آپ کے پیچھے ہولیا تھا۔''

بالآخر میری ہدایت کے مطابق زوہریہ نے اسے سچ بتا دیا۔ دوسری جانب سے ابومعد کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ خاصے لمحات بیت چلے۔ کمرے میں اعصاب چٹخا دینے والی خاموشی طاری ہوگئی۔ یوں لگا جیسے ابھی کچھ ان ہونی ہونے والی ہو۔

ایسے میں سیل فون کے وائڈ اسپیکر سے ابومعد کی اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح لگتی آواز اُبھری۔

''ممکن ہے دیکھا ہو...... اس وقت میں...... کسی مریض کی عیادت کے لیے گیا ہوں۔''

''لیکن وہاں تو کسی ایسے مریض کو نہیں رکھا جاتا تھا جہاں کوئی ان سے ملنے یا عیادت کے لیے آسکے۔'' زوہریہ بولی۔ ''کیونکہ پندرھواں اور چودھواں فلور تو صرف...... اعضا کی سرجری اور ٹرانسپلانٹیشن کے لیے مخصوص ہے۔ بعد میں کوئی ایسا مریض ہو تو اسے وہاں سے کسی اور فلور میں شفٹ کیا جاتا ہے۔''

''ہوسکتا ہے، میرے عہدے کی وجہ سے مجھے جانے دیا گیا ہو۔ تاہم مجھے یاد نہیں آرہا ہے کہ میں وہاں کبھی گیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے انکل! بس یہی پوچھنا تھا۔ تو آپ کب سرجن امرناگ اور ڈاکٹر رمیش اگروال کے خلاف کارروائی کا ارادہ رکھتے ہیں؟''

''بہت جلد...... بلکہ آج ہی سے......''

''ایک گزارش ہے۔''

''بولو......''

''بلکہ یہ ڈاکٹر سیف کی گزارش ہے کہ وہ اور اس کی ساتھی رومی کو اگر آپ اپنے جاسوسوں کی جگہ پر وہاں رکھوا دیں تو......''

''ہرگز نہیں۔'' اس نے بات کاٹ دی۔ ''ہمارے مخبر، خاص تربیت یافتہ ہوتے ہیں......'' وہ فوراً بولا۔ ''ان سے کہو کہ ذرا انتظار کریں۔ بہت جلد خوش خبری مل سکتی ہے۔ او کے بائی زوہریہ بیٹی، اپنے ڈیڈی کو سلام کہنا پھر بات کرتے ہیں۔''

یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ زوہریہ ابومعد کے اس طرح اچانک کال منقطع کرنے پر کچھ خجل سی نظر آنے لگی۔ پھر ایک گہری سانس لے کر اس نے سیل آف کر دیا اور ہماری جانب متوجہ ہوکے بولی۔

''سن لی آپ لوگوں نے ان کی باتیں؟ کیا نتیجہ نکلتا ہے؟''

میں نے رومی کی طرف دیکھا پھر بولا۔ ''تم بتاؤ پہلے رومی؟''

وہ بولی۔ ''اسی فیصد امکان ہے کہ ابومعد سچ بول رہا ہے۔''

''اور آپ کیا کہتی ہیں؟'' میں نے مستفسرانہ نظروں سے زوہریہ کی طرف دیکھا۔

''سو فیصد امکان بلکہ مجھے یقین ہے کہ...... انکل سچ بول رہے ہیں۔''

میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔

''تم اپنا اظہار کرو۔'' رومی نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

''مجھے سو فیصد یقین ہے اس بات کا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔''

''لیکن یہاں دو افراد نے ابومعد کے حق میں ووٹ دیا ہے۔'' زوہریہ حیرانی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''بے شک، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔

''تو اب آپ کا کیا خیال ہے کہ ہمیں انکل معد کی جاسوسی کرنی پڑے گی؟'' زوہریہ اپنی گہری اور دلکش آنکھیں پھیلا کر میری طرف گھورتے ہوئے بولی۔

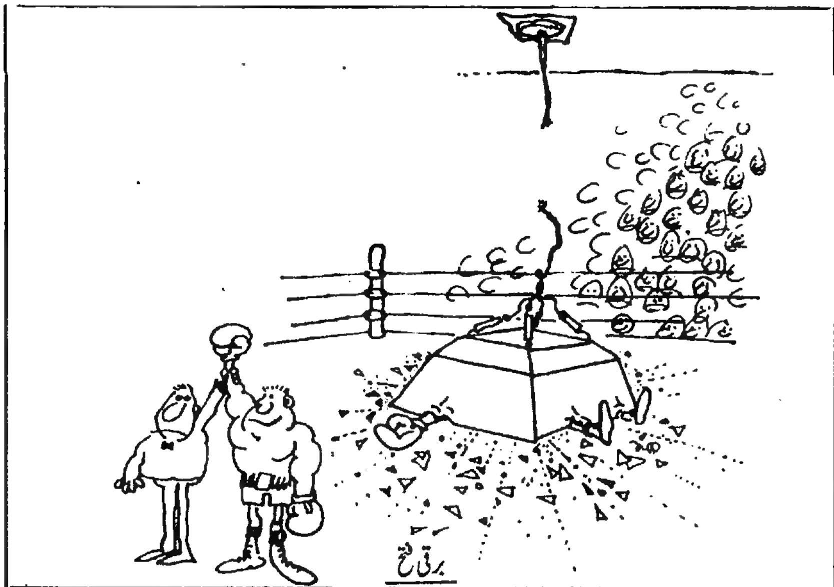
''یہ بھی کرنا پڑا تو کوئی قباحت نہیں۔'' میں بولا۔

''لیکن...... ہمیں اب بھی وہی کرنا پڑے گا جو ہم کرنا چاہتے ہیں۔''

''کیا؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔

''اپنی مدد آپ۔'' میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔ پھر بولا۔ ''تم فقط اتنا کام کرسکتی ہو کہ اپنے انکل معد کی ایک ایک بات جو وہ تم سے کریں یا پوچھیں، اس سے ہمیں آگاہ کرتی رہو اور اب ہماری اجازت کے بغیر اسے ہمارے کسی پروگرام کے بارے میں کچھ نہ بتاؤ۔''

''تمہارا کیا پروگرام ہے؟'' اس نے تجسس سے پوچھا۔



''ابھی نہیں پتا، وہ ہم طے کریں گے۔'' میں نے اسے پھر ٹالنے کی کوشش میں کہا۔

تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہ چلی گئی۔

''کیا ارادے ہیں اب ہمارے زیرو زیرو سیون کے؟'' اس کے جانے کے بعد رومی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

''میں کہاں کا زیرو زیرو سیون بن گیا، اپنا یہ جاسوس تو پاکستان میں بیٹھا ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں سمجھ گئی تمہارا مطلب۔'' کہتے ہوئے رومی نے اپنا آئی فون نکالا اور اسکائپ پر طارق سے رابطہ کیا۔ اسے اب تک کی تازہ صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں تبادلۂ خیال کرنے لگی۔

''اپنے ڈاکٹر صاحب کیا کہتے ہیں؟'' طارق نے جیسے گیند میری جانب اُچھال دی۔ میں بھی قریب ہی بیٹھا تھا۔ بولا۔

''انتظار کے سوا اور کیا چارہ رہ جاتا ہے! دیکھیں زوہریہ کیا کرتی ہے؟''

''وہ کچھ نہیں کرے گی۔'' اگلے ہی لمحے طارق نے بہ یک جنبش کہا۔ ''جو کرنا ہے وہ تم دونوں کو ہی کرنا ہے۔''

''مثلاً؟'' میں نے کہا۔

''ناگ وِلا جا کر اس کی گردن ناپو......'' اس نے کہا۔

''کس کی، امر ناگ کی؟'' رومی بولی۔

''ہاں!''

''اس سے کیا ہوگا؟ وہ سچ اُگل دے گا یا پولیس کے آگے اپنے مکروہ کرتوتوں کا بیان دے دے گا؟''

''دے نہ دے...... مگر تمہیں اپنی کارروائی کرنی چاہیے۔ اس کے پاس ضرور ایسے تحریری ثبوت ہوں گے جو تمہارے ہاتھ لگ سکتے ہیں، ضروری نہیں کہ تم ناگ وِلا جاتے ہی اس کی گردن ناپو، وہاں تم دونوں کو چوروں کی طرح داخل ہونا پڑے گا اور جاسوسوں کی طرح کام کرنا ہو گا۔''

''میں سمجھ رہی ہوں تمہاری بات......'' رومی نے کہا۔

''تم کیا کہتے ہو سیف؟'' طارق نے میری رائے لی۔

''میں بھی یہی چاہتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''گڈ، پھر دیر کس بات کی ہے، بعد میں مجھے بتانا۔''

''وہاں کیا رہا؟'' میں نے پوچھا۔

''گوہر شاہ بدستور روپوش ہے۔ میں ادھر سہراب مجوٹہ کے خلاف کچھ ٹھوس ثبوت حاصل کرنے کی تگ و دو میں ہوں۔''

''کیسے ثبوت؟'' رومی نے پوچھا۔

''گوہر شاہ کو بینکاک یا انڈیا فرار کروانے کے

ثبوت۔'' اس نے کہا۔ ''ساتھ ہی جبار ماہی بھی اپنی ضمانت کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے لیکن گل بادشاہ اور محترمہ ڈالی، اس کی کوششوں کو ناکام بنائے ہوئے ہیں۔ یہ کام نمٹاتے ہی میں بھی تم لوگوں کے پاس چلا آؤں گا۔''

''آہی جاتے تو اچھا تھا، کیونکہ یہاں کی مہم کسی نتیجہ خیز موڑ پر ہے۔'' رومی بولی۔

''مجھے اندازہ ہے۔'' طارق بولا۔ ''لیکن میں یہ جانے بغیر پاکستان سے ہل بھی نہیں سکتا کہ گوہر شاہ کو اس مردود.... سہراب نے کون سے ملک فرار کروایا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' رومی بولی... پھر اسکائپ آف کر دیا۔

''اس کا فیصلہ کچھ جذباتی سا نہیں لگ رہا؟'' رومی نے طارق کے بارے میں میری رائے لینی چاہی تھی۔ آگے بولی۔ ''ابھی ہمیں یہ دیکھ لینا چاہیے تھا کہ آخر یہ ابومعد کا اُونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔''

وہ طارق کے مشورے پر شاید میری مرضی جاننا چاہ رہی تھی، حالانکہ یہاں کے معاملات اس نے پہلے ہی ہماری صوابدید پر چھوڑ رکھے تھے۔

میں نے کہا۔ ''وہ صحیح کہہ رہا ہے۔ ہمیں خود اپنی عملی کارروائی کو آگے بڑھاتے رہنا چاہیے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ بے چارے اس ایمان دار اور فرض شناس بہادر پولیس آفیسر خالد کا کیا حشر کیا گیا؟ اور اب یہ ابومعد...... میں اس پر ہرگز بھروسا نہیں کرسکتا، یہ ہمارے سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اب بھی درپردہ ہماری قبر کھودنے کے درپے ہوگا اور ہم اونٹ کی کروٹیں بدلنے کا انتظار کرتے رہیں گے، وہ ہمیں ایک کروٹ پر قبر تک پہنچا دے گا۔''

''طارق کو آجانا چاہیے تھا۔'' رومی مشورہ دینے کے انداز میں بڑبڑائی۔ یہ الگ بات تھی کہ اس کا لہجہ کمزور سا تھا۔

''یہ ضروری نہیں، وہاں بھی بہت اہم کام اسے انجام دینے ہیں۔'' میں نے کہا۔

رات ہوتے ہی ہم اپنے مخصوص کیل کانٹوں سے لیس ہو کے امرناگ وِلا کی جانب چل دیے۔

رومی نے آخر تک مجھ سے کہا تھا کہ پہلے امرناگ کی وہاں موجودگی کی تسلی کرلی جائے، لیکن میں نے اس کی پروا نہ کی، کیونکہ مجھے یقین تھا کہ وہ وہیں ہوگا اور رات کو بھلا کدھر جاتا ہوگا۔ نہ بھی ہوا تو اس کے گھر کی تلاشی لیں گے اور کوئی کارآمد شے تو ہاتھ لگ ہی جائے گی، جسے ہم اسے ثبوت کے طور پر دکھا سکیں۔

فضا میں ٹھنڈ سی اُتری ہوئی تھی۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک رواں دواں تھی۔ ہم نے مزید ایک گھنٹا ضائع کیا اور ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے لگے۔

رات کے اب ایک بجے کا عمل رہا ہوگا۔ ہم ٹیکسی میں روانہ ہوگئے۔ ٹیکسی کو ہم نے ذرا فاصلے پر روک دیا، کیونکہ اس بار ہم اس متمول سوسائٹی کے گارڈز سے مڈبھیڑ نہیں کرنا چاہتے تھے، مبادا وہ امرناگ کو فون ہی نہ کھڑکا دیتا۔

اتنے وسیع رقبے پر یہ متمول سوسائٹی پھیلی ہوئی تھی کہ اس کے تین گیٹ تھے، دو سامنے کے رخ پر اور تیسرا فرنٹ رو سے کافی دور شمالی سمت کی جانب تھا۔ وہ بند تھا۔ ہم نے اسی طرف کا رخ کیا تھا اور پیدل ہی تاریکی کا حصہ بنے وہاں تک پہنچے تھے۔ کہیں کہیں اسٹریٹ لائٹس روشن تھیں۔ ہم دونوں نے سیاہ چست لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ ہاتھوں پر دستانے اور چہروں پر نقاب چڑھا لیے تھے۔

میں کچھ گھبرا بھی رہا تھا لیکن رومی کا حوصلہ اور اس کی نارمل کیفیات دیکھتے ہوئے میں نے بھی خود پر قابو پانے کی کوشش کی تھی۔

مذکورہ گیٹ بند تھا اور وہاں نظر ایسا ہی آتا تھا کہ اسے محض بوقتِ ضرورت ہی کھولا جاتا ہوگا، کم ازکم اس کے گرد اُگی ہوئی خودرو جھاڑیوں سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا۔

''اسے پھلانگا جاسکتا ہے۔'' رومی نے سوچنے والے انداز میں کہا۔

''خفیہ کیمروں کی آنکھ یہاں نگراں ہوسکتی ہے۔'' میں نے کہا۔

رومی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اطراف کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ پھر قدم بڑھاتے کے ساتھ ہی بولی۔

''اس طرف آؤ۔'' میں اس کے پیچھے ہولیا۔ ہر سو تاریک سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ ہم دونوں مدھم روشنی میں چند قدم چلنے کے بعد رک گئے۔ یہاں دیوار سیل زدہ تھی۔ کچھ پائپ اُوپر جاتے نظر آئے۔ وہاں سے مسلسل پانی کی وجہ سے ہی باؤنڈری وال کا یہ حشر ہوا تھا۔ دیوار آٹھ فٹ اُونچی تھی، اس طرف کچھ کم گھنے اور کچھ ٹنڈ منڈ درخت بھی تھے مگر ان کی بے برگ و بار شاخیں نقب کے لیے کارآمد نہیں تھیں، شاید یہ کبھی آرائش کے لیے لگائے گئے ہوں مگر دیکھ بھال نہ ہونے کے سبب ان کا یہ حال ہوگیا تھا، تاہم یہی بہت تھا کہ ہمیں ان کی آڑ میسر آگئی تھی اور ہم نے ان پائپوں کے سہارے ہی باؤنڈری وال پر چڑھنے کا ارادہ کرلیا۔

اگرچہ رومی کے پاس ''اسپائیڈر گن'' موجود تھی، جس سے ہم بہ آسانی نقب لگا کر بھی دیوار پھلانگ سکتے تھے لیکن اس طرح ہمیں وہ آڑ صحیح طرح میسر نہیں آسکتی تھی جو ان پائپوں اور درخت کی سنگت میں دکھائی دے رہی تھی۔

یوں بھی بقول رومی کے اس گن کو اشد ضرورت کے وقت ہی استعمال کیا کرتی تھی وہ۔

سب سے پہلے رومی نے مشق کی اور کامیاب رہی، وہ مجھے بھی آنے کا اشارہ کر کے دوسری جانب اُتر گئی، خود کو تنہا پاتے ہی میرے اندر کی دبی دبی گھبراہٹ پھر عود کر آنے لگی مگر میں نے اسے ذہن سے جھٹک دیا اور رومی ہی کی تقلید میں اسی طرح پائپ کے ذریعے چڑھ کر اُوپر منڈیر تک جا پہنچا، پھر رومی ہی کی طرح جلدی سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ بلندی سے دیکھ لیے جانے کا احتمال تھا۔

نیچے رومی میری منتظر تھی۔ شکر تھا کہ ہم جہاں پھلانگے تھے وہاں کوئی باغیچہ یا اسی طرح کا جھاڑ جھنکاڑ سا تھا جس میں ہم دبک کر چند لمحوں تک اطراف کی سُن گُن لیتے رہے، پھر خطرہ نہ پا کر رومی نے مجھے سرگوشی میں پیش قدمی جاری رکھنے کا کہتے ہوئے قدم بڑھائے۔

''اسی دیوار کے ساتھ ساتھ ہی چلنا ہوگا ہمیں۔'' وہ بولی۔ ''ناگ ولا'' کے عقب میں ہم بہ حفاظت پہنچ جائیں گے۔''

ایسا ہی ہوا۔ چند منٹوں کی تگ ودو کے بعد ہم ناگ ولا کی عقبی دیوار کے پیچھے کھڑے تھے۔ اس پر میں رومی کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

اس نے بالکل ٹھیک کیلکولیشن کی تھی۔ اس طرح پرفیکٹ وے اختیار کرنے پر اس نے بہ آسانی منزلِ مقصود تک پہنچا دیا تھا۔

ناگ ولا پر گہرا سکوت طاری تھا۔ کوئی آواز تک نہ سنائی دیتی تھی۔ اس کی عقبی دیوار سے بھی نکاسِ آب کے پائپ اُوپر جاتے دکھائی دیے۔ یہ دیوار بالکل سپاٹ تھی۔

''کیا یہاں بھی پائپوں پر طبع آزمائی کرنا پڑے گی؟'' رومی کو انہیں بہ غور دیکھتا پا کر میں نے نیچی آواز میں کہا۔

''شاید۔''

''کیا تمہیں نظر نہیں آرہا ہے کہ یہ دیوار بالکل سپاٹ ہے۔ جو دو تین کھڑکیاں بھی نظر آرہی ہیں' وہ بند ہیں اور پائپوں سے خاصے فاصلے پر بھی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''وہ تو ہیں لیکن ایک کھڑکی اس والے پائپ کے قریب ہے، وہاں تک پہنچ کر ہم اسے کھولنے کی کوشش تو کر

گاڑی کا مالک۔ ''یہ ٹائر پنکچر کیسے ہوا؟''
ڈرائیور۔ ''جناب ایک شیشی پر چڑھ گیا تھا۔''
مالک۔ ''کیا تم نے شیشی دیکھی نہیں تھی؟''
ڈرائیور۔ ''نہیں، وہ شیشی اس آدمی کی جیب میں تھی جو گاڑی کے نیچے آیا تھا۔''

ذاکم علی گورچانی، داجل

ہی سکتے ہیں۔'' رومی بولی لیکن مجھے اس کے لہجے کی کمزوری سے اندازہ ہوا کہ وہ بھی اس پر زیادہ مطمئن نہ تھی۔

''یہ اندھا جوا کھیلنے کے مترادف ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''اول تو پائپ پر چڑھنا اور اپنا توازن اس پر برقرار کیے رکھنا ہی مشکل ہے اس پر مستزاد ہم بند کھڑکی بھی کھولنے کی کوشش کریں۔ یہاں تو تمہاری اسپائڈر گن بھی کام نہیں کرے گی۔''

''چلو، پھر اس طرف گھومتے ہیں، شاید وہاں اندر داخلے کا کوئی راستہ دکھائی دے جائے۔'' رومی نے ہار مان لی۔ ہم آگے بڑھ گئے۔ عقبی دیوار سے لگے ہم جنوبی سمت کی طرف طلوع ہوئے تو یہاں سے ہمیں باغیچہ اور چوکیدار کا چھوٹا سا کیبن نظر آیا، جو گیٹ کے اندر ستون کے عقب سے متصل تھا۔ وہاں ہلکی روشنی ہو رہی تھی، شاید چوکیدار اُونگھ رہا تھا۔

''راستہ صاف لگ رہا ہے۔'' رومی نے ہلکی سرگوشی کی۔

''کسی کتے کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' میں بھی دھیمی آواز میں بولا۔

''وہ ہوسکتا ہے۔'' رومی میرا مطلب سمجھ کر بولی۔

''کہاں؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''یہیں کہیں۔''

''مجھے تو نظر نہیں آرہا، پہلے ہمیں اس کی موجودگی یا غیر موجودگی کی تسلی کر لینی چاہیے ورنہ ہماری عین کامیابی کو ناکامی میں بدل سکتا ہے وہ۔'' میں نے باور کرایا۔

''پھر تم ادھر ہی رکو، میں ذرا آگے جا کر کوئی ڈاگ ہوم دیکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔'' رومی بولی اور آگے بڑھنے لگی تو میں نے اسے روک لیا۔

''ٹھہرو، ڈاگ ہوم تمہیں کہاں ملے گا، اپنی کارروائی آگے بڑھاتے ہیں، دیکھا جائے گا۔''

اس نے میری بات پر صاد کیا اور ہم دبے پاؤں داخلی دروازے کی مشرقی دیوار پر بنی ایک غیر معمولی سی

چوڑی کھڑکی کے قریب آ گئے۔
یہ شیشے کی تھی اور اس پر اندر بھاری پردہ گرا ہوا تھا۔
یہ شاید ہواداری کے لیے بنائی گئی تھی۔
''اب کیا کریں؟'' میں نے پوچھا۔
''ششش...... یہاں بہت آہستہ بات کرو۔'' رومی نے مجھے سرگوشی میں ٹوکا۔
''کہو تو آئندہ اشاروں میں ہی بات کر لیا کروں؟'' میں نے جل کر کہا۔
''ہشت..... میں کچھ کرتی ہوں۔'' کہتے ہوئے رومی نے اپنی اسپائی کٹ سے ایک قلم نکالا۔
میں نیم تاریکی میں آنکھیں پھاڑے کبھی اس کے قلم کو دیکھتا اور کبھی اس کی ہدایت کے مطابق گردوجوار میں۔
رومی نے بڑی صفائی کے ساتھ گلاس کٹر پن سے شیشے کا ایک کونا کاٹا اور پھر اندر ہاتھ ڈال کر اس کی چٹخنی کھول دی۔ کھڑکی میں لکڑی نفیس قسم کی تھی۔ بے آواز اس کا ایک پٹ سلائڈ ہوا اور اگلے چند ثانیوں میں ہم دونوں ایک مدھم گندھی ہوئی روشنی کا حصہ بنے وسیع لاؤنج میں تھے، جس کا فرنیچر دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اسے نشست گاہ کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہو۔
ہم چند ثانیے ایک کونے میں دُبکے گردوپیش کا جائزہ لیتے رہے۔
''میرا خیال ہے، انسپکشن ہو گئی اب پیش قدمی بھی ضروری ہے۔'' میں نے رومی کے کان میں ہولے سے کہا۔
رومی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ہنوز کوئی سُن گُن لینے کی کوشش میں تھی کہ دو چار لمحے کے بعد نیچی آواز میں بولی۔
''تم یہ آواز سُن رہے ہو؟''
''کوشش کرتا ہوں سماعت فرمانے کی......'' کہتے ہوئے میں نے کان پر یوں ہاتھ رکھا جیسے کان پر ایک اور کان نکل آیا ہو۔
دفعتاً میں چونکا اور رومی کو ایک بار پھر داد دینے کو جی چاہا، اگرچہ یہ موقع نہ تھا اسی لیے دبے دبے جوش اور دبی دبی آواز میں اثبات میں سر ہلا کے بولا۔
''یقینی طور پر سُن رہا ہوں، یہ کم از کم کسی انسانوں کے باتیں کرنے کی آوازیں نہیں ہو سکتیں۔''
''جانور کب باتیں کرتے ہیں۔'' وہ جیسے جل کر بولی۔ ''ٹھہرو، مجھے مزید سننے دو اور تم بھی ذرا غور کرو اس کا مخرج تلاشنے کی......''
میں ایسا ہی کرنے لگا۔ یہ بڑی عجیب اور پُراسراری آواز تھی، یوں جیسے...... یا تو کوئی ایسا انسان اپنے حلق سے نکال رہا تھا، جسے صرف غوں غاں ہی کرنا آتا ہو یا پھر کوئی مشین رک رک کر چل رہی ہو۔
ناگ وِلا میں آتے ہی معاملات ایک دم اسراریت کے پردے میں لپٹتے محسوس ہونے لگے مجھے......
''کیا چکر ہے آخر یہ......'' رومی نے کہتے ہوئے ہونٹ بھینچے۔
''ارے...... ے......'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔
''کیا ہوا؟'' رومی نے قدرے چونک کر کہا۔
''یہ...... یہ رذیل طینت امرناگ بدھسٹ ہے۔'' میں نے کہا اور ساتھ ہی سامنے کے رخ پر تھوڑا دائیں جانب اشارہ کیا۔ ''وہ دیکھو، اس طرف ایک بڑے سے فیملی صوفے کے قریب تپائی کے پاس ایک فینسی اسٹینڈ کی جانب......''
''اوہو......'' وہ بھی اس طرف تکتے ہوئے چونکی۔
وہاں ایک سفید رنگ کا بیش قیمت بدھا کا ہاتھ باندھے ہوئے مجسمہ ایستادہ تھا۔
''مجھے آواز کا مخرج بھی اسی طرف سے محسوس ہو رہا ہے، تم بھی ذرا غور کرو تو پیش قدمی کی جائے۔'' میں نے کہا۔
''چلو۔'' رومی جیسے تیار تھی۔ ہم دبے پاؤں مذکورہ سمت کی جانب بڑھنے لگے۔ جیسے ہی ہم مجسمے کے قریب پہنچے وہ پُراسراری آواز کچھ کچھ واضح ہونے لگی۔
ایسے ہی وقت میں میری غیرارادی نظریں مجسمے پر پڑیں۔ وہ سفید اور ہلکے سرمئی رنگ کی آمیزش میں انسانی ہاتھوں کا تیار کردہ ایک شاہکار ہی نظر آتا تھا۔ اسٹینڈ پر ہونے کے باوجود اس کی لمبائی تین فٹ سے کم نہ تھی اور چوڑائی بھی دو فٹ کے لگ بھگ ہی محسوس ہوتی تھی۔
ابھی ہم وہاں رکے ہی تھے کہ اچانک بدھا کا مجسمہ کسی بلب کی طرح روشن ہوا اور پھر جلنے بجھنے لگا۔ کبھی اس میں نیلا رنگ آتا، کبھی سیاہ اور کبھی سرخ، وہ رنگ بدلتا رہا۔
''اسے کیا ہو گیا؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔
''کہیں اس کے اندر گرگٹ کی روح تو نہیں حلول کر گئی ہے؟''
ابھی میں نے یہ کہا ہی تھا کہ اچانک اس مجسمے نے شور مچانا شروع کر دیا۔
''چور...... چور...... چور......''
میں اور رومی پہلے تو اس اچانک اُفتاد پر سکتے میں

آ گئے پھر اسی جانب کو لپکے جہاں سے آئے تھے۔

رومی نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کھولی اور باہر کود ی، اسی وقت سائرن بجنے لگا، ساتھ ہی ایک سے زائد کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی اُبھریں۔

میں اور رومی تب تک کھڑکی سے باہر چھلانگیں لگا کر دوبارہ پلک جھپکتے میں وہاں جا پہنچے تھے جدھر سے ہم نے نقب زنی کی ابتدا کی تھی۔ گویا پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

وہاں پہنچتے ہی رومی رک گئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنی اسپائی کٹ سے اسپائڈر گن نکالے گی جو ایسے نازک وقت کے لیے اس کے پاس ہمیشہ موجود رہتی تھی۔

"اندر سے..... بھاگم دوڑ کی آوازیں آرہی تھیں۔

رومی کے سوچنے کا بس ایک مرحلہ ہی طے ہوا تھے کہ اس نے جلدی سے اسپائڈر گن نکال لی اور اس کا رخ اُوپر کسی بالکونی کی منڈیر کی جانب کر کے ٹریگر دبا دیا۔ گن کی شاٹ نال سے ہلکی سی "زٹ" کی آواز اُبھری اور ایک باریک، مشکل سے نظر آنے والا تار نکل کر بالکونی منڈیر سے جالگا۔

اگلے لمحے میں اور رومی ایک دوسرے سے لپٹ چکے تھے اور دونوں ہاتھوں سے گن کو پکڑے اُوپر اُٹھتے چلے گئے۔

نیچے جب تک بھونکتے ہوئے کتے اور دیگر لوگ آتے، ہم دونوں بالکونی کے فرش پر قدم رنجہ فرما چکے تھے۔

اگرچہ یہاں بھی ہمیں کسی کے دیکھ لیے جانے کا خطرہ موجود تھا، مگر ہم رکے کہاں تھے، فرش پر پاؤں ٹکاتے ہی ایک جانب کو لپکے۔

ایک نیچی چھت والے ہال میں خاصی تاریکی تھی۔ روشنی بہت مدھم تھی جو شاید کسی قریبی ہال یا کمرے کی رہین منت تھی۔

ہم نے اس طرف کا رخ کیا۔ یہ اُوپری منزل تھی اور یہاں سے نیچے والوں کے شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس ہڑبونگ سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں کم لوگ نہیں تھے۔

"ہمیں باہر نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی، یہ جگہ اب ہمارے لیے کسی بھی وقت چوہے دان ثابت ہوسکتی ہے۔" میں نے رومی کو ٹوکا۔

"خاموش رہو، میں مشن پورا کیے بغیر بالکل بھی واپس نہیں پلٹوں گی۔" رومی کا لہجہ اٹل اور آواز پُرعزم تھی۔

"مگر اب اس کا کیا فائدہ۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہماری اس وقت ڈھنڈیا پڑ چکی ہے۔ ہم دھر لیے جائیں گے اور یہ ہمارے لیے بہت ہی خطرناک بات ہوگی۔" میرے لہجے میں تشویش اور فکرمندی تھی۔

"کیا ہوگیا ہے تمہیں سیف؟" رومی متحیر ہوئی۔ "تم اتنے بزدل اور تھڑدلے تو نہیں تھے پہلے......"

"وہ میں اب بھی نہیں ہوں۔" میں نے پورے سکون سے جواب دیا۔ "میں یہ چاہ رہا ہوں کہ ہم بے نقاب نہ ہوجائیں، جو فائدہ ہم چھپ کر اُٹھا چکے ہیں، وہ ہمارے لیے کارآمد بن سکتا ہے۔ اسی طرح چھپ کر ہم اپنے مشن کو سودمند بنا سکتے ہیں۔"

"ہم بے نقاب ہوچکے ہیں، سیف!" وہ بولی۔

"ابھی یہ ایک ڈاؤٹ ہے۔" میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔

وہ کسی زینے سے اپنے کتوں سمیت اُوپر آرہے تھے۔ کیونکہ ان کے ساتھ ایک سے زائد افراد کے بولنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔

"انہیں ہماری بھنک پڑ چکی ہے۔" میں نے پھر رومی کو دہلایا، لیکن وہ باز نہ آئی۔ اس نے مجھے اسی جگہ دبکے رہنے کا کہا اور خود ایک طرف کو رینگ گئی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ ان کا مقابلہ کرنے گئی ہے اور چونکہ میں واپس جانے پر مُصر تھا اسی لیے وہ مجھے یہاں بٹھا گئی۔

مجھے یہ اچھا نہ لگا اور اگلے دوتین پل کے اندر میں نے بھی اس کے عقب میں پیش قدمی کر ڈالی کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

میرا خیال درست تھا، وہ زینے کی جانب ہی بڑھی تھی جہاں سے یہ آوازیں آرہی تھیں، یہی نہیں میں نے اسے ایک آدمی پر حملہ آور بھی ہوتے دیکھا، جس نے ایک ہاتھ میں سیاہ لمبی نال والا پستول اور دوسرے ہاتھ میں کسی کتے کی زنجیر پکڑی ہوئی تھی۔

کتے کی زنجیر تھامے مسلح آدمی کے لیے رومی کا یہ ہلا اگر غیر متوقع نہیں تو اچانک ضرور ثابت ہوا تھا۔

نتیجے میں پستول رومی کے ہاتھ میں تھا اور اس نے اسی پر بڑی دیدہ دلیری سے تلے اُوپر دوتین خاموش فائر بھی جھونک ڈالے۔ لمبی نال سائلنسر ہی تھا۔ بیک وقت دو آدمیوں کی کریہہ ناک چیخیں اور ایک سے زائد کتوں کے غرانے کی آواز اُبھری تھی اور رومی نے ایک کتے کے حملے سے بچنے کے لیے جھکائی بھی دی اور ایک جانب ہٹتے ہی

ایک سیاہ رنگ کے جسیم اور جھبرے کتے پر گولی چلادی۔
کتا ایک نیم مردہ سی غراہٹ کے ساتھ وہیں ڈھیر ہو گیا اور دوسرا کتا زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا تھا۔ اس نے رومی کو خود پر گولی چلانے کا موقع ہی نہ دیا اور خوف ناک انداز میں اس پر جھپٹا۔ رومی اس کے نرغے میں آگئی۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا اور وہ جسیم کتے کے ساتھ گتھم گتھا ہوگئی۔

میں ہک دک سا کھڑا انہیں دیکھتا رہ گیا، پھر جلدی سے لپک کر گرا ہوا پستول اُٹھالیا مگر گولی چلانے سے قاصر ہی رہا۔ ادھر کتا رومی کی شہ رگ بھنبھوڑنے کی کوشش میں تھا اور رومی اس سے حتی الامکان بچنے کے لیے کوشاں تھی۔ مجھے فوراً کچھ کرنا تھا، رومی خطرے میں تھی اور دیگر مسلح لوگ بھی یہاں آسکتے تھے۔

پستول ہاتھ میں پکڑے میں ہونق سا لگ رہا تھا کہ اچانک میں نے بھی جھپٹا مارا اور جھک کر کتے کی ایک ٹانگ پکڑ کر کھینچنے لگا، مگر اس بدبخت نے رومی کو اپنے اگلے دو پنجوں سے جکڑ.... رکھا تھا، کتے کی پچھلی ٹانگ میرے ہاتھ میں تھی اور رومی کی کراہیں بتارہی تھیں کہ وہ زیادہ دیر تک اس جسیم کتے کے خونخوار تھوتھنے اور شکاری نکیلے دانتوں سے اپنی گردن نہیں بچاسکتی تھی۔ تب ہی میں نے کوئی راہ نہ دیکھتے ہوئے ایک عجیب سی حرکت کرڈالی۔
کتے کی ٹانگ میرے ایک ہاتھ میں تھی اور وہ اس قدر ڈھیٹ ہڈی بنا ہوا تھا کہ اسے پروا ہی نہ تھی، وہ بدستور رومی کو بھنبھوڑنے کی کوشش میں تھا کہ میں نے اپنے دوسرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی نال اس کی ٹانگ کے ساتھ یوں لگا دی جیسے میں نے کورونا کی کوئی نایاب ویکسین تیار کرلی ہو اور بڑے فخر سے اس کا تجربہ پہلے کتے پر کرنے لگا ہوں، کیونکہ انداز میرا انجکشن لگانے والا ہی تھا اور اگلے ہی لمحے میں نے ٹریگر دبادیا۔
گولی چلی اور کتے کی ٹانگ میں گھس کر شاید آر پار بھی ہوگئی۔ گویا "انجکشن" لگتے ہی کتے کے حلق سے ایک تیز غراہٹ بلند ہوئی اور اس نے رومی کو چھوڑ دیا۔
رومی سے الگ ہوتے ہی میں نے اس کے جھبرے وجود میں دوسرا فائر کردیا۔ وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر رومی کو سنبھالا۔
"بلیک اسمیشر......" رومی کے حلق سے غراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔ اس کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے چہرے کا نقاب بھی درست کیا۔

"کون؟" میں نے پوچھا۔ میں سمجھا ایک بے زبان کو اس بیدردی سے گولی مارنے پر وہ شاید اس عجیب نام سے مجھے پکار رہی تھی۔
"وہی کتے کا بچہ!" رومی نے دانت پیس کر مردہ کتے پر نفرت بھری نگاہ ڈالی۔
"تم ٹھیک ہو نا، میرا مطلب کوئی بائٹ وغیرہ تو نہیں کیا؟" میں اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولا اور ساتھ ہی اسے بازو سے تھامے ایک طرف تاریک گوشے میں لے آیا۔ اس کے بازو، کندھوں اور سینے پر تھوڑی بہت خراشیں آئی تھیں۔
"ٹھیک ہوں میں...... یہاں کہاں آگئے ہو، نیچے چلو۔" اس نے کہا اور فوراً دوبارہ زینے کی جانب لپکی۔ غیر ارادی طور پر میں نے بھی اس کی تقلید کرڈالی۔
ہم نے لاشوں کے ہتھیار قبضے میں کر رکھے تھے۔ ان کے پستولوں پر سائلنسر فٹ تھے۔ ہم تیزی سے زینے طے کرتے نیچے پہنچے، تو اچانک ٹھٹک کر رکے۔
ایک ہال سی جگہ پر روشنی پھیلی ہوئی تھی اور وہاں تین افراد مضطرب الحال سے کھڑے دکھائی دیے۔ ایک سلیپنگ گاؤن میں تھا اور باقی دو عام لباسوں میں تھے۔ سلیپنگ گاؤن والے کو دیکھتے ہی میری کنپٹیاں سلگ اُٹھیں۔ وہ ہمارا شکار......سرجن امرناگ تھا۔
وہ تینوں ہمیں دیکھتے ہی بُری طرح چونکے، یوں جیسے انہوں نے کوئی بھوت دیکھ لیے ہوں۔ انہیں شاید اپنے آدمیوں پر یقین تھا کہ وہ ہمارا قلع قمع کرچکے ہیں۔ امرناگ ایک دم اندر کی جانب کہیں دوڑا، رومی نے اسے للکارا اور گولی بھی داغ دی، جو اس کی ٹانگ پر لگی اور وہ چیخ مار کے چکنے فرش پر گرا، باقی دو نے حرکت کی اور اپنے لباسوں سے کوئی ہتھیار نکالنے کی جسارت کی ہی تھی کہ میرے خاموش پستول سے تلے اُوپر دو چنگاریاں پھوٹیں دونوں ہی چیخیں مار کے گرے۔
باہر سے دوڑتے قدموں کی آوازیں اُبھریں۔ رومی سرجن امرناگ کی جانب لپکی اور اسے ٹانگوں سے گھسیٹتے ہوئے، جس کمرے کی جانب وہ بڑھنا چاہتا تھا، اسی طرف کھینچ کر لے جانے کی کوشش کرنے لگی اور ساتھ ہی مجھ سے بولی۔
"باہر جو بھی نظر آئے، اسے قابو کرو یا فنا کے گھاٹ اُتار دو۔" رومی کا آج میں پہلی بار ایسا جارحانہ اور جنگ جو سا روپ دیکھ رہا تھا۔ میں اسی جانب لپکا جدھر سے دوڑتے قدموں کی آوازیں آرہی تھیں۔

وہاں دو گارڈ ٹائپ آدمی دکھائی دیے۔ ان میں صرف ایک ہی مسلح تھا جس کے ہاتھ میں ماؤزر تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ کا نشانہ لے کر گولی داغی۔ وہ گرا، دوسرا بھاگنے لگا میں نے اس کی ٹانگ پر گولی چلادی۔ وہ بھی چیخ مار کے گرا۔ میں دونوں کو کسی طرح گھسیٹ کر اندر وسیع لاؤنج میں لے آیا اور اپنی کٹ سے نائلون کی رسی نکال کر ان دونوں کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے ساتھ ہی پہلے دو افراد کا بھی جائزہ لیا۔ رومی کی گولیاں انہیں چاٹ چکی تھیں۔ پھر میں اسی کمرے کی جانب لپکا جدھر رومی زخمی امرناگ کو بیدردی سے گھسیٹتی ہوئی اندر لے گئی تھی۔

''دروازہ بند کر دو۔'' رومی نے میرے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔ میں اس کی آواز پر چونک پڑا۔

وہ آواز ہی نہیں لہجہ بھی بدل کر مجھ سے مخاطب ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ احتیاط کو وہ بھی ملحوظ رکھے ہوئے تھی۔ میں بھی محتاط ہو گیا۔ اب ہم ایک دوسرے کو ناموں سے نہیں پکار سکتے تھے۔

''امرناگ! تمہاری موت سر پر کھڑی ہے۔'' رومی زخمی بلی کی طرح غرائی۔ ''اپنے کالے کرتوتوں کا حساب دو گے یا ادھر ہی تمہیں بھی جہنم واصل کر کے ایک فتنے کا خاتمہ کر دیا جائے۔''

امرناگ کی حالت اس وقت نہایت دگرگوں ہو رہی تھی۔ اس کی زخمی ٹانگ سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ چہرے پر خوف کی پیلاہٹ اُتری ہوئی تھی اور موٹا بھدا جسم کانپ رہا تھا۔

''مم...... میں نے کیا کیا ہے؟'' وہ بہ مشکل بولا۔ مجھے اس کے معصوم بننے پر طیش آ گیا۔ میں دانت پیستے ہوئے بولا۔

''ہمارے پاس وقت کم ہے، شکار ہماری گرفت میں ہے، اسے ختم کر ڈالو، ابھی اس کے ساتھی ڈاکٹر رمیش اگروال کو بھی نشانہ عبرت بنانا ہے ہمیں۔''

رومی ایک دم پرے ہٹ گئی، میں نے سائلنسر لگے پستول کی نال امرناگ کی کنپٹی سے لگا دی۔

میرا یہ نفسیاتی حربہ کارگر ثابت ہوا۔ اس نے فوراً منتیں شروع کر دیں۔ ''مم...... مجھے نہ مارو، بھگوان کا واسطہ ہے تمہیں......''

''تب پھر وقت ضائع کیے بغیر ہمارے سوالات کے جواب دو۔'' میں نے خونخوار غراہٹ کے ساتھ اسے گھور کر کہا۔

''پپ...... پوچھو۔'' اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''اس کوٹھی کے خفیہ تہ خانے کا راستہ بتاؤ؟'' میں نے پوچھا۔ ایک لمحے کو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ میرے اس سوال پر رومی کے چہرے پر بھی ایک ذرا اُلجھن آمیز تاثر اُبھرا تھا۔

''تت...... تمہیں کیسے پتا چلا......'' امرناگ ہکلا کر بولا۔

''ہمیں اور بھی بہت کچھ پتا ہے اسی لیے کہہ رہا ہوں، وقت ضائع مت کرو اور تہ خانے کا راستہ بتاؤ بلکہ ہمارے ساتھ چلو، اُٹھو۔'' کہتے ہوئے میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اُٹھانے کی کوشش کی تو وہ ایک دم کراہ کر بولا۔

''پپ...... پہلے میرے زخم پر کوئی پٹی وغیرہ......''

''شٹ اپ......'' میں نے غصے سے اسے گھورتے ہوئے جھڑک دیا۔ ''ہم تمہارے باپ کے نوکر نہیں ہیں، چلو اُٹھو، پٹی وٹی بعد میں دیکھیں گے۔''

ساتھ ہی میں نے رومی کو بھی اشارہ کیا۔ وہ بھی آگے بڑھی اور پھر ہم اس کے بتائے راستے پر ایک طرف کو چل دیے۔

سامنے ایک کمرے کا دروازہ تھا۔ میں نے لات مار کے اسے کھولا۔ پستول ہمارے ہاتھوں میں تھے جن کی نال سامنے اُٹھی رہیں۔

جیسے ہی ہم اسے لیے اندر داخل ہوئے، ہم پر عقب سے کسی نے جست لگائی۔ میں تو سنبھلتے سنبھلتے رہ گیا، البتہ رومی نے بروقت حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے سائے پر جھپٹا مارا۔ دونوں گتھم گتھا ہو کر کمرے کے فرش پر بچھے ہوئے قالین پر گرے۔

میں آنکھیں پھاڑے یہ منظر دیکھتا رہا۔ وہ کوئی جوان سی عورت تھی اور شاید کہیں کونے میں چھپی ہوئی تھی اور ہمارے اندر داخل ہوتے ہی اس نے لپک کر چھلانگتے ہوئے دروازے سے باہر بھاگنے کی کوشش کی تھی کہ رومی نے اسے چھاپ لیا تھا۔

اب رومی اس پر قابو پا چکی تھی۔ پستول ہنوز اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کی نال عورت کی کنپٹی سے لگا رکھی تھی۔ وہ شاید اس کی بیوی تھی اور خاصی جوان اور حسین بھی۔

''میں نے تم سے تہ خانے جانے کا کہا تھا اپنے بیڈ روم پہنچانے کا نہیں۔'' میں نے دانت پیس کر امرناگ سے کہا۔

’’راستہ میرے بیڈروم سے ہی جاتا ہے۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’خوب......! دکھاؤ پھر آگے اس کا دروازہ...... بھی......‘‘ میں نے پستول تولا۔

’’اس طرف...... مجھے جانے دو......‘‘ اس نے کہا۔

’’چلو۔‘‘ میں بھی اس کے ساتھ آگے بڑھا۔

’’دھیان رکھنا یہ بڈھا گدھ کوئی چالاکی نہ کرنے پائے۔‘‘ رومی نے مجھے ہوشیار کیا اور ساتھ ہی عورت کو بھی تھوڑا زدوکوب کیا۔ وہ اس کے شکنجے سے خود چھڑانے کی کوشش کررہی تھی۔ ہلکی کراہ سے اب وہ چپکی ہورہی۔

’’بےفکر رہو۔‘‘ میں نے رومی سے کہا۔ ’’مجھے ذرا بھی اس پر ایسا کوئی شبہ ہوا تو اسے گولی مارنے سے دریغ نہیں کروں گا۔‘‘

وہ ایک بڑی سی دیوارگیر الماری کی جانب بڑھا اور اس کا دروازہ کھول کر اندر ہاتھ لے گیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے مجھے دھکا دیا، میں نے بھی غیر ارادی طور پر ٹریگر دبا دیا۔ مگر کوئی آواز نہ اُبھری۔ میرا پستول شاید خالی ہو چکا تھا، لیکن تب تک امرناگ اس لمبی چوڑی الماری کے اندر روپوش ہوگیا۔

ایک ہلکی سی سرسراتی آواز مجھے سنائی دی تھی اور پھر آؤ دیکھا نہ تاؤ جوشِ غیظ تلے میں بھی اندر کودا، مگر اگلے ہی لمحے کسی سخت اور پختہ دیوار سے ٹکرا کر باہر کو آن گرا...... خالی پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

’’دکھا گیا نہ ہاتھ......‘‘ رومی بولی۔ میں نے کوئی توجہ نہ دی اور دیوانہ وار الماری کے پٹ کھولتا چلا گیا۔ اندر تختے بھی لگے ہوئے تھے اور کپڑے، نجانے کیا الا بلا جھول رہا تھا مگر ایک آدم گزار گوشہ بالکل سپاٹ اور خالی تھا۔

مجھے پورا یقین تھا کہ وہ اسی راستے سے ہی اندر کہیں کودا ہے۔ میں اس کی دیوار کو مکے مارنے لگا۔ وہ ٹھوس تھی۔

ہاتھ آئے شکار کے اس طرح پلک جھپکتے ہی نکل جانے پر میں بُری طرح جھنجلا گیا تھا حالانکہ رومی نے مجھے خبردار بھی کیا تھا، مگر میں شاید اوور کانفیڈنس کا شکار ہوا تھا۔

’’کوئی فائدہ نہیں، وہ اپنے خفیہ تہ خانے میں جا کر محفوظ ہو گیا ہے اور کوئی بعید نہیں اب یا تو اس کے مزید ساتھی یہاں کا رُخ کریں گے یا پھر پولیس......‘‘ رومی نے کہا۔

میں پلٹا اور اس حسین عورت کو خوں ناک نظروں سے گھورنے لگا پھر اس کی جانب چند قدم بڑھا۔

وہ اپنی پھیلی ہوئی دلکش آنکھوں میں خوف لیے میری جانب تکے جارہی تھی۔

’’تم اب اس تہ خانے کا راستہ بتاؤ گی۔‘‘ میں نے دانت پیس کر کہا۔ رومی کے پستول کی نال اس کی کنپٹی سے لگی ہوئی تھی۔

’’مم...... مجھے کچھ نہیں معلوم۔‘‘ وہ خوف سے ہکلائی اور اپنا جملہ بھی پورا نہ کرپائی۔

’’ہمم...... تو کچھ نہیں جانتی، اس کے بیڈروم میں سوتی ہے، اس کی بیوی ہے اور......‘‘

’’میں اس کی بیوی نہیں ہوں۔‘‘ عورت نے چیخ کر کہا۔

’’شٹ اَپ۔‘‘ رومی نے اسے اس طرح چلانے پر جھڑک دیا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کے بولی۔

’’اب نکل چلو اور اسے بھی ساتھ لے چلو، انکار کرے تو گولی مار دو۔‘‘ رومی نے آخر میں دانستہ اپنے لہجے میں سفاکی گھولنے کی کوشش کی تھی۔

’’چلو ہمارے ساتھ......‘‘ میں نے عورت کا نرم و نازک بازو پکڑا۔ وہ اس وقت نائٹ ڈریس میں تھی مگر حالات بگڑنے کا اندازہ ہوتے ہی اس نے اُوپر ایک اور سلکی فراک سا چڑھا لیا تھا جس سے مہین سلیپنگ گاؤن کی نیم برہنگی چھپ گئی تھی۔

’’فف...... فار گاڈ سیک...... مم...... مجھے یہیں چھوڑ دو۔ میرا اس سارے معاملے میں کوئی قصور نہیں ہے۔‘‘ وہ گھگیائی۔ میں نے پستول کی نال دوبارہ اس کی پیشانی پر لگا دی۔ وہ خوف زدہ ہو کے مان گئی۔

ہم اسے لے کر باہر کو لپکے، اسی وقت پولیس سائرن کی آوازیں گونجنے لگیں۔ سویا ہوا علاقہ جیسے ایک دم جاگ پڑا۔ رات کا سناٹا اور ایسے میں پولیس سائرن کی آواز پر بھلا کس کم بخت کی نیندوں میں خلل نہ پڑا ہوگا۔

’’اب کیا کریں؟‘‘ میں نے رومی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا، جبکہ وہ اس حسین عورت کی طرف متوجہ ہوئی۔

’’تم یہاں کی رازداں ہو۔ بتاؤ ہمیں کوئی ایسا خفیہ مقام جہاں ہم چھپ سکیں یا بہ آسانی نکل سکیں، بہ صورتِ دیگر تم اب ہمارے لیے ایک بوجھ بن چکی ہو...... خطرناک بوجھ...... ہم گولی ماردیں گے تمہیں۔‘‘

رومی کی یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ یہ جوان اور حسین و جمیل عورت جو مقامی ہی محسوس ہوتی تھی، امرناگ کی کوئی رکھیل ہوگی۔ میری طرح رومی کو بھی اس

بات کا ادراک ہو چکا ہوگا کہ وہ امرناگ کے بہت سے رازوں سے واقف حال و ماضی، بلکہ مستقبل بھی ہوگی لیکن تھی بڑی تھڑدلی، یوں بھی امرناگ کون سا بہادر تھا۔ البتہ چالاک اور مکار ضرور ثابت ہوا تھا، اسی لیے ہمیں جُل دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور غائب بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہوا تھا، یوں جیسے گدھے کے سر سے سینگ غائب ہوتے ہیں۔

''اس...... طرف چلو۔'' وہ ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ وہاں ایک مختصر کوریڈور تھا۔ ''اُدھر ایک راستہ باہر کی طرف جاتا ہے۔''

''یاد رکھنا، اگر ہم پولیس کے گھیرے میں آ گئے تو تمہیں سب سے پہلے گولی ماریں گے۔'' میں نے لہجے میں سفاکی سموتے ہوئے اسے دھمکی دی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔''

''چلو پھر آگے بڑھو۔'' میں نے کہا۔ اس کے بعد تیزی سے کوریڈور کی جانب بھاگے۔

غالب امکان یہی تھا کہ اس مردود ...... امرناگ نے اپنے کسی خفیہ کمرے میں جاتے ہی پولیس کو فون کر دیا تھا یا پھر اب تک کی کھڑبڑ سے کسی کو یہاں کوٹھی میں ہونے والی گڑبڑ کا احساس ہوا ہوگا اور اس نے پولیس کو فون کھڑکا دیا ہو۔

جس راستے کی جانب عورت نے نشاندہی کی تھی وہ واقعی سہل اور محفوظ ثابت ہوا تھا۔

وہاں سے ایک سنگل پٹ والے چور دروازے سے ہم باہر تاریکی میں آ گئے اور پولیس کے سائرن کی آوازیں ہمیں کوٹھی کے فرنٹ کی جانب سے آتی سنائی دینے لگیں۔

ہم تینوں تاریکی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے وہاں سے نکلے اور دیگر بنگلوں اور کوٹھیوں کی آڑ لیتے ہوئے اسی دیوار کے قریب آ گئے جدھر سے ہم نے نقب لگائی تھی۔

اس نازک موقع پر رومی کی اسپائیڈر گن کام میں آئی۔ پہلے میں لپکا اور منڈیر پر چڑھ گیا اور دوسری جانب کا جائزہ لینے کے بعد بلا تاخیر دوسری جانب کود گیا۔

دوسری طرف رومی نے بھی وقت ضائع نہیں کیا تھا، وہ تو عورت سمیت ہی آن کودی تھی۔

شاید جلد بازی کے سبب یا پھر کودنے کی ٹریننگ نہ ہونے کی وجہ سے وہ عورت کودنے کے دوران گری، رومی نے اسے سنبھالنے کی کوشش بھی کی تھی مگر پھر بھی اس کے نازک پاؤں میں شاید موچ آ گئی اور اس کے حلق سے چیخ نکل گئی اور لگی ہائے، ہائے کرنے۔

میں گھبرا سا گیا اور اس کا جائزہ لینے لگا تو رومی نے یقیناً دانت پیسے ہوں گے اور ساتھ ہی مجھے ٹوکا۔ ''وقت ضائع مت کرواؤ اور اسے اُٹھاؤ، نکلو یہاں سے جلدی۔''

اس اکھاڑ پچھاڑ میں عورت کا اُوپر والا جلدی میں پہنا جانے والا فراک نما سا گاؤن کہیں اُتر چکا تھا، اندر سیاہ مہین کلر کا سلیپنگ سوٹ بھی جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ تاریکی میں بھی اس کی برہنگی واضح محسوس ہو رہی تھی۔ تاہم میں نے جی کڑا کر کے اسے 'لوازماتِ آوارہ' سمیت اُٹھا کر کاندھے پر ڈال لیا۔

سامنے کچھ درختوں کا سلسلہ تھا ہم دونوں دوڑتے ہوئے اسی جانب بڑھے۔ متمول سوسائٹی سے ہم کافی دور نکل آئے تو درختوں کا یہ مختصر جنگل تمام ہوا، یہ دراصل ایک پارک تھا۔ ہم اس کے دوسرے راستے سے باہر آئے تو سامنے ایک ذیلی سڑک تھی۔

''اب کیا کریں؟ ہمارے پاس تو سواری بھی نہیں اور اس مصیبت کو کدھر اُٹھائے پھریں؟'' میں رک کر بولا۔ میری سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ یہاں ہر طرف تاریک سناٹا پھیلا ہوا تھا۔

''ہم...... مجھے ادھر ہی چھوڑ دو...... جو پوچھنا چاہتے ہو پوچھ لو۔'' میں نے اسے اُتار دیا، پاؤں میں موچ کی وجہ سے وہ لڑکھڑانے لگی۔

''پوچھنا تو ہمیں تم سے بہت کچھ ہے، مگر یہاں نہیں پوچھ سکتے۔'' رومی نے سانسیں بحال کرنے کے درمیان قدرے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''ہم تمہیں پیدل ہی اپنے ٹھکانے تک لے چلیں گے، خواہ اس کے لیے ہمیں تمہیں باری باری ہی کیوں نہ اُٹھانا پڑے۔''

''لیکن اگر میں تمہارے ساتھ چلی گئی تو میری واپسی ناممکن ہو جائے گی، وہ ظالم مجھے ہلاک کر ڈالے گا۔ مجھے کہیں پناہ نہیں ملے گی۔'' وہ سسکنے لگی۔

''تم پھر ہماری پناہ میں آ جاؤ، کیوں اس درندے صفت آدمی کی رکھیل بنی ہوئی ہو۔'' میں نے کہا۔

''شٹ اَپ۔'' وہ چیخی اور میں بدک سا گیا۔ ''تمہیں شرم نہیں آتی ایک شریف اور عزت دار عورت کے لیے ایسے گندے الفاظ استعمال کرتے ہوئے۔'' اس نے مجھے کوسا اور مجھے خود پر شرمندگی سی ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے بھی تڑ سے جواب دیا۔

''مگر تم نے ہی تو کہا تھا کہ تم اس کی بیوی نہیں ہو۔ پھر

اس کے بیڈ روم میں یہ شریف اور عزت دار عورت کیا کر رہی تھی؟'' میرے لہجے میں بھی طنز اُتر آیا۔

میری بات پر وہ رو پڑی...... اور ساتھ ہی بُری طرح سسکیاں لینے لگی۔ میں نے گھبرا کر رومی کی جانب دیکھا اور اس سے کہا۔ ''یہ تو ایک نیا پینڈورا بکس کھولنے کے چکروں میں ہے۔ آگے بڑھو۔''

رومی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے عورت سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''محترمہ! اب یہ رونا دھونا چھوڑو اور اگر چل سکتی ہو تو آگے بڑھو ورنہ مجھے ہی اُٹھانا پڑے گا۔''

''تمہارا ٹھکانا کتنی دور ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''دور تو ہے مگر چلنا تو پڑے گا۔''

''میرا ٹھکانا نزدیک ہی ہے مگر......'' وہ کہتے کہتے رکی۔ ہمیں اس کی بات پر حیرانی سی ہونے لگی۔ گویا یہ عورت بھی ادھر ہی کہیں اپنا ٹھور ٹھکانا رکھتی تھی۔

''مگر کیا؟ آگے بولو...... ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔''

''کک...... کچھ نہیں، چلو، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ میں اور رومی اس چیستاں پر اُلجھ سے گئے۔

''یہ کیا چیز ہے؟ کھل ہی نہیں رہی۔'' میں نے جھلا کر رومی سے کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' عورت نے اپنے نیم برہنہ سراپا... پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے میری بات پر گھورتے ہوئے کہا۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا، تم اُلجھی اُلجھی باتیں کر رہی ہو آخر کہنا کیا چاہ رہی ہو۔'' میں بولا۔ ''تمہارا ٹھکانا قریب میں کہیں ہے، تم وہاں جانا بھی چاہتی ہو لیکن ویکن بھی کر رہی ہو اور اب کہتی ہو کہ چلو دیکھا جائے گا۔ تم آخر ہو کون......؟''

''میں ایک بدنصیب عورت ہوں اور......''

''اچھا، اچھا...... چلو اپنے ٹھکانے پر ہی، مگر وہاں تمہارے کتنے ساتھی ہوں گے؟'' رومی نے وقت کے زیاں سے بچنے کے لیے کہا۔

''وہاں فقط میرا ایک سولہ سالہ بیٹا ہے...... اور کوئی نہیں۔''

''کیا؟ بیٹا؟'' میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''ہاں! وہ میرا بیٹا ہے۔''

''اور یقیناً تمہارا کوئی شوہرِ نامدار بھی ہوگا، وہ کہاں ہے؟''

''اوہو...... تم نے یہاں کیا اس کا انٹرویو لینا شروع کر دیا۔ چلو جلدی، ہم ابھی تک خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔'' رومی نے کلس کر مجھے ٹوکا۔

ہم اس کے ساتھ ہو لیے۔ اب وہ سہارے سے چل رہی تھی۔ ''ہمارے چہروں پر ہنوز نقاب چڑھے ہوئے تھے۔ جب تک اس پُراسرار عورت کی اصل حقیقت نہیں کھل جاتی ہم اسے اپنا چہرہ نہیں دکھا سکتے تھے۔

اس کی رہائش گاہ تک پہنچنے میں ہمیں نصف گھنٹا لگ گیا۔ جو امرناگ کے ٹھکانے سے زیادہ دور نہ تھی، اگر ہمارے پاس کوئی کنوینس ہوتی تو ہم بہ مشکل دس منٹوں میں پہنچ سکتے تھے۔

ایک عام سی مگر صاحبِ ثروت نظر آنے والی ایک کالونی میں اس کا بنگلا نما گھر تھا جو باہر سے دیکھنے میں ون یونٹ لگتا تھا۔

''تمہارے پاس چابی تو ہوگی اُس لیے کال بیل بجانے کی ضرورت نہیں۔'' مذکورہ گھر کے قریب پہنچ کر میں نے کہا۔

''چابی اُٹھانے کا مجھے کب موقع دیا تھا تم نے۔'' وہ بولی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' رومی نے اچانک اس سے پوچھا اور مجھے اس کے بے تکے سوال کرنے پر غصہ آ گیا، گھور کر اس سے بولا۔

''بڑی جلدی خیال آ گیا اس کا نام پوچھنے کا۔ پہلے اندر تو چلو۔'' رومی نے منہ بنایا۔

''مجھے کال بیل دبانا پڑے گی۔'' عورت نے کہا۔

''اور مجھے تمہارا گلا دبانا پڑے گا۔ ارے جلدی کرو محترمہ!'' میں نے جل کر کہا۔

''ویسے میرا نام...... مارگریٹ ہے۔'' اس نے کال بیل پر اُنگلی رکھی۔

''مارگریٹ تھیچر؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''کیا بکواس ہے۔'' رومی ہولے سے بڑبڑائی۔

''مارگریٹ چاوڈز۔'' اس نے تصحیح کی پھر بیل بجا دی۔ جس کی آواز ہمیں نہیں سنائی دی، شاید اندر ہی کہیں ہولے سے بجی ہو۔

''چاوڈز کون ہے تمہارا۔ باپ یا شوہر؟'' میں نے پوچھا۔

''توبہ ہی ہے۔'' رومی پھر جھلا کر بولی۔

''شوہر۔''

''وہ اس وقت کہاں ہے؟'' میں نے اگلا سوال کیا، میرا تجسس ہی نہیں ختم ہو رہا تھا۔

''بس، اب باقی اندر.....'' رومی بگڑ گئی۔

دوسری بیل پر دروازہ کھلا۔ میں اور رومی ایک دم ہوشیار ہو گئے۔ ممکن تھا اس کا کوئی اندر چھپا ہوا مسلح ساتھی برآمد ہو جاتا، لیکن ایک ٹین ایجر بوائے کو دیکھ کر ہم نے اطمینان کی سانس لی۔

وہ ایک معصوم صورت اور اسمارٹ سا لڑکا تھا۔ وہ دو نقاب پوش افراد کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ پھر عورت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ماما! آپ! یہ کون ہیں؟''

''اندر چلو جونی!'' مارگریٹ نے بڑی عجلت میں اس سے کہا اور وہ اندر آ گئی۔ لڑکا ابھی تک حیران پریشان نظر آ رہا تھا۔ وجہ ہمارے چہروں پر چڑھے نقاب ہی تھے۔

ہم اندر آ گئے۔ جونی نے کوئی سوئچ دبا کر روشنی کر دی۔ یہ کشادہ لاؤنج تھا اور شاید نشست گاہ کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا، کیونکہ اعلیٰ درجے کا فرنیچر بچھا ہوا تھا۔

مارگریٹ تھکی ہاری سی ایک صوفے پر گر گئی اور ہمیں بھی بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔

''ماما...! ایوری تھنگ او کے......؟'' جونی نے ایک بار پھر رومی اور مجھ پر تشکیک بھری نظر ڈال کر اپنی ماں سے پوچھا۔ عقدہ کھل چکا تھا کہ یہ ایک کرسچن فیملی تھی۔

''جونی! تم اپنے کمرے میں جاؤ شاباش! اور سو جاؤ۔'' مارگریٹ نے بیٹے کو جیسے پچکارا۔

''ماما، آپ پاپا سے ملنے گئی تھیں نا، وہ کیسے ہیں اب......؟'' جونی نے پوچھا۔ وہ اب بھی رومی اور میری طرف عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''وہ ویسے ہی ہیں جیسے تھے، ان کا علاج ہو رہا ہے، تم اندر جاؤ اب......''

''ماما! یہ کون ہیں؟'' لڑکے نے دوبارہ پوچھا۔ وہ بھی کوئی ڈھیٹ تھا۔ ماں کو بھی غصہ آ گیا۔

''جونی'' وہ ہذیانی انداز میں چلائی اور جونی وہاں سے چلا گیا۔ میں اور رومی چونکے تھے کہ اس عورت کا شوہر یعنی جاوز بیمار اور کسی اسپتال میں داخل تھا اور یہ جونی کی ماں مارگریٹ اسے ''پاپا'' سے ملنے کا کہہ کر گھر سے رات کو نکلی تھی مگر اسپتال جانے کے بجائے وہ اس خونی درندے امرناگ کے بیڈروم سے برآمد ہوئی تھی۔

میرا جی تو چاہا کہ اس لڑکے جونی کو یہ سب بتا دوں، لیکن کچھ اخلاقیات مانع آتی تھیں اسی لیے چپ رہا۔

''تم دونوں کو نقاب میں دیکھ کر جونی گھبرا گیا ہے۔ کیا یہ تم اُتار نہیں سکتے؟'' بیٹے کو ڈانٹ کر کمرے سے بھگانے کے بعد وہ ہم سے مخاطب ہوئی۔

''نہیں۔'' رومی سے پہلے میں نے کہتے ہوئے نفی میں بھی سر ہلا دیا۔ اس نے ایک دو ثانیے کے لیے ہونٹ بھینچ لیے پھر بولی۔

''اگر اجازت دو تو میں کچھ کھانے پینے کا بندوبست کر لوں؟''

بھوک پیاس کا کسے ہوش تھا، تاہم میں تو خاموش رہا مگر رومی نے کسی خیال سے اسے اجازت دے دی۔

وہ اُٹھ کر پاس بنے کچن کی طرف بڑھ گئی، رومی خاموش بیٹھی اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے لگی۔ میں بے نام سی اُلجھن محسوس کرنے لگا۔ مارگریٹ کو کچن میں گئے پانچ منٹ ہوئے تھے۔

میری نظریں بار بار کچن کی طرف اُٹھ رہی تھیں، پھر کچھ سوچ کر میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور کچن کی طرف ہولیا۔ عقب سے مجھے رومی کے کچھ پوچھنے کی آواز آئی تھی، میں کوئی جواب دیے بغیر آگے بڑھ گیا اور کچن کے دروازے سے اندر جھانکا، پھر اگلے ہی لمحے بُری طرح ٹھٹکا۔ مارگریٹ کچن میں نہیں تھی۔

''یہ کہاں چلی گئی؟'' میں وہیں سے زور سے بڑبڑایا کہ رومی نے بھی سن لیا اور فوراً میری جانب لپکی۔

''دھوکا'' اس کے منہ سے برآمد ہوا۔

''وہ ہمیں دھوکا دے چکی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مگر گئی کہاں اور کدھر سے؟''

ہم دونوں کچن کے اندر آ گئے اور ایک کونے میں ہمیں ایک جالی دار شٹر نما دروازہ نظر آ گیا۔ میں اس کی جانب لپکا۔ اسے کھولنا چاہا تو وہ نہ کھلا۔ دوسری جانب سے اسے کنڈی لگا دی گئی تھی، مگر کیوں؟ میرے ذہن میں ابھرا۔ مارگریٹ کو یہ دھوکا دینے کی کیا ضرورت تھی؟

میں نے ایک ریک پر ترتیب وار رکھے چاقوؤں میں سے ایک بڑے چاقو کا انتخاب کیا اور کنڈی کی طرف کی جالی کاٹ کر ہاتھ گزارا، پھر کنڈی کھول دی۔ چاقو میں نے پھینکا اور کنڈی کھول دی۔ دوسری جانب ایک مختصر سی راہداری تھی۔ وہ ایک بند گلی کا منظر پیش کرتی تھی، کیونکہ سامنے ہی ایک کمرے کا دروازہ نظر آ رہا تھا جو بند تھا۔

یکبارگی میرے جی میں کیا آئی کہ میں ایک جوش

تلے دوڑتا ہوا گیا اور اُچھل کر ایک لات دروازے کو رسید کر دی۔ دروازہ زوردار دھڑاکے سے کھلا اور دوسرے ہی لمحے میں اندر تھا۔

سامنے مارگریٹ ایک بیڈ کے کنارے بیٹھی تھی، بیڈ سائڈ ٹیبل پر ایک سبز رنگ کا ٹیلی فون سیٹ رکھا ہوا تھا اور وہ ریسیور کان سے لگائے کسی سے بڑے عجلت بھرے انداز میں باتیں کر رہی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی خوف کے سبب اس کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ کر گر پڑا۔

میں دانت پیستے ہوئے اس پر جھپٹا، وہ چیخی اور میں نے اسے دبوچ لیا۔ میرے پیچھے رومی بھی چلی آئی تھی۔ اس نے جلدی سے جھولتا ہوا ریسیور اُٹھا کر دوبارہ کریڈل پر رکھ دیا۔

''کس کو فون کر رہی تھیں؟ سچ سچ بتاؤ، ورنہ ادھر ہی گردن دبا کر ہلاک کر ڈالوں گا۔'' کہتے ہوئے میں نے اس کی نرم و نازک گردن دبوچ لی۔ مگر زیادہ دباؤ نہ ڈال سکا، کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ وہ ختم ہی نہ ہو جائے۔

''کک...... کسی کو بھی نہیں......'' اس نے گھٹی گھٹی آواز میں جواب دیا۔

''تو کیا فون پر فرشتوں سے باتیں کر رہی تھیں؟ سچ بتاؤ ورنہ ابھی دباتا ہوں تمہاری گردن۔'' میں نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا اور اس کی گردن پر واقعی تھوڑا دباؤ ڈالا تو اس کا حسین گورا چٹا چہرہ ایک دم سرخ ہونے لگا اور گہری کشادہ آنکھیں باہر اُبلتی محسوس ہوئیں، میں ڈر گیا کہیں مر ہی نہ جائے تو دباؤ کم کر دیا۔

''وہ...... وہ...... روڈی کو فون کر رہی تھی۔'' اس نے بتایا۔

''کون روڈی؟'' میں اُلجھ گیا۔

''جھوٹ بول رہی ہے یہ کمینی!'' رومی طیش زدہ لہجے میں اسے گھور کر بولی۔

''تم اس کمینی کو چھوڑو میں اس سے نمٹ رہا ہوں۔'' میں نے رومی سے کہا۔ ''اور باہر جا کر نگاہ رکھو، اس کا بیٹا جونی بھی ماں کی طرح کہیں کوئی گل نہ کھلا رہا ہو۔''

رومی میری بات سن کر فوراً باہر چلی گئی۔

''روڈی کون ہے؟'' میں پھر مارگریٹ کی طرف متوجہ ہوا۔

''وہ...... میرے شوہر کا دوست ہے۔''

''کہاں رہتا ہے وہ؟''

''اسی شہر میں رہتا ہے مگر بہت دور۔''

''کتنا دور......؟''

''بہت دور، ساحلِ سمندر کے قریب البحر نامی علاقے کے ایک جنگلاتی کاٹیج میں......''

البحر نامی علاقے سے میں اور رومی شناسا تھے۔

''تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تم نے امرناگ کو فون پر سب کچھ بتا دیا ہوگا کہ ہم اس وقت کہاں ہیں۔'' میں نے غصے سے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا اور اس کی گردن چھوڑ کر بازو سے پکڑ کر کھینچا تاکہ دوبارہ اسے اسی کمرے میں لے جاؤں۔

''میں اس بے رحم اور سنگ دل انسان سے خود اب بہت خوف زدہ ہو رہی ہوں۔'' اس نے میرے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم اسے نہیں جانتے، وہ کس قدر وہمی اور خطرناک حد تک محتاط پسند ہے۔ اپنے سائے پر بھی اسے شبہ ہو جائے تو اس کا بس چلے وہ اسے بھی گولی مار دے۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہے؟'' معاً رومی کی آواز سنائی دی۔

''اس نے کسی روڈی نامی شخص کو مدد کے لیے فون کیا ہے۔'' میں نے بتایا۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ہم تینوں چونک پڑے۔

''ی یہ...... یہ اسی کا فون ہوگا......'' مارگریٹ ہکلائی۔ ''فار گاڈ سیک، مجھے اس سے بات کر لینے دو، امرناگ بہت خطرناک آدمی ہے۔'' اس نے منت کی۔ اس کے لہجے میں واقعی جانا انجانا خوف تھا۔

''کر لو بات...... اگر وہی ہے تو۔'' میں نے اسے اجازت دے دی۔

''مجھے یقین ہے وہی ہے، بات ادھوری ہونے کے سبب وہ فکرمند ہو گیا ہوگا۔'' کہتے ہوئے اس نے لپک کر کال اٹینڈ کی اور ریسیور کان سے لگا کر ماؤتھ پیس پر 'ہیلو' کہا۔ پھر بولنا شروع ہو گئی۔ میں اور رومی کھڑے غور سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔

''یس...... روڈی! میں اور جونی اس وقت خیریت سے ہی ہیں۔'' وہ اسے بتانے لگی۔ ''اور...... وہ دونوں بھی میرے دشمن نہیں لگتے۔'' یہ اس نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ''مجھے یقین ہے نا بس...... تم چھوڑو اسے یہ بتاؤ، اب کیا کرنا ہے، ہم...... مجھے تو چاوز کی فکر ہو رہی ہے، وہ اسے نقصان پہنچا سکتا ہے...... نہیں...... نہیں...... یہ بھی

اسی کے دشمن ہیں، تم ان کی فکر نہ کرو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے پھر ہماری طرف دیکھا۔

"تم...... تم بالکل ٹھیک مشورہ دے رہے ہو، مجھے اور جونی کو ابھی کے ساتھ یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے...... مگر چاووز......؟ اچھا...... اچھا ٹھیک ہے۔"

کہتے ہوئے اس نے فون رکھا اور ہراساں ہو کے ہم سے بولی۔ "روڈی نے بالکل صحیح کہا ہے۔" کہتے ہوئے وہ گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

"کیا کہا ہے اس کم بخت روڈی نے...... بتاؤ؟" میں نے دانت پیس کر کہا۔

"وہ بہت ذہین ہے، اس نے پہلے ہی سے اندازہ لگا لیا ہے کہ امرناگ اپنے بدمعاشوں کو یہاں بھی ہماری تصدیق کے لیے بھیج سکتا ہے۔"

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ ہم سب ایک دم ٹھٹک گئے۔ روڈی کی پیش گوئی شاید پوری ہونے والی تھی۔

"دشش...... شاید...... وہ آگئے...... جونی...... جونی مائی سن......" کہتے ہوئے مارگریٹ باہر کو لپکی۔ ہم بھی اس کے پیچھے دوڑے۔

جونی بھی چابک دست اور ہوشیار لڑکا ثابت ہوا، وہ بھی گاڑی کی آواز سنتے ہی اپنے کمرے سے نکلا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی گن تھی۔ اس کے کسی چیمبر سے دھوئیں کی لکیریں سی اُٹھتی دکھائی دیں، یہ کوئی کھلونا گن محسوس ہو رہی تھی، جس کے اُوپر موٹا سا سلنڈر لگا ہوا تھا، یہ ایسی ہی گن تھی جیسی کہ بچپن میں ایک دوسرے پر پانی کی دھاریں فائر کر کے کھیلا کرتے ہیں۔ مگر دھواں...... یہ میری سمجھ میں نہ آسکا۔

ابھی ہم چاروں ایک جگہ اکٹھے ہوئے ہی تھے کہ اچانک دھڑ سے دروازہ کھلا اور تین مسلح افراد اندر داخل ہوئے۔ ہمیں بچاؤ کا موقع ہی نہ مل سکا۔

اگلے ہی لمحے ہمارے ساتھ کھڑے جونی کی کھلونا گن سے پانی کی دھواں اُگلتی موٹی دھار نکلی اور گن کو حرکت دینے سے وہ ان تینوں پر پڑی۔ تب ہی اس کی افادیت سمجھ آئی کہ جونی نے کیا چالاکی کی تھی۔

اپنی کھلونا گن میں اس نے کھولتا ہوا پانی بھر رکھا تھا، یہی وجہ تھی کہ گرم گرم پانی کی دھاریں کسی تیزاب جیسی کاٹ کے ساتھ ان تینوں مسلح حملہ آور دراندازوں کے چہروں پر پڑیں اور چیخیں مارتے ہوئے غیر ارادی طور پر کئی قدم پیچھے کی جانب لڑکھڑا گئے، پھر اگلے ہی لمحے ایک خطرہ بھانپتے

ہوئے رومی اور میں نے بیک وقت اپنی جگہ سے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کی اور جونی اور اس کی ماں کو ساتھ لیتے ہوئے دوسری جانب جا پڑے۔
یہی وہ وقت تھا جب ان تینوں نے اپنی رائفلوں کی لبلبیاں دبا دی تھیں، یہ ان کا متوقع ردِعمل ہو سکتا تھا۔
گولیاں چلنے کی گھن گرج اُبھری تھی جو قالین، ماربل کے فرش اور ایک آدھ صوفے کو چاٹ گئیں۔
رومی نے جونی کو اور میں نے مارگریٹ کو جھپٹ کر گھسیٹ لیا تھا۔ اُن تینوں حملہ آوروں کے چہرے بُری طرح جھلس گئے تھے، اس سے پہلے کہ انہیں سنبھلنے کا موقع ملتا، رومی اور میں نے ایک بار پھر بیک وقت اپنی جگہ سے حرکت کی اور اُچھل کر ان تینوں پر جا پڑے۔ یوں کہ اگر دوبارہ یہ لبلبی دبائیں تو ہم نشانے پر نہ آسکیں۔
ان تینوں کو رگیدتے ہوئے ہم ان سمیت ہی نیچے گرے تھے اور سنبھلنے میں بھی ہم نے دیر نہیں لگائی تھی، ساتھ ہی ایک کی رومی نے اور دوسرے کی گن پر میں نے جھپٹا مارا۔ گن ہاتھ میں آتے ہی میں نے اس کا کندا اپنے مدِمقابل کی ٹھوڑی پر مارا، قریب کی یہ ضرب زوردار ثابت ہوئی۔ اس کی کراہ بڑی اذیت ناک تھی اور منہ سے عجیب سی آواز بھی آئی تھی۔ اندر اس کے شاید زبان اور دانت بری طرح مضروب ہوئے تھے اور شاید نچلا جبڑا بھی کام آگیا تھا۔ وہ وہیں گرا اور پھر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔
ادھر رومی نے بھی گن کی نال کو لٹھ کی طرح استعمال کیا تھا۔ وار مدِمقابل کی کنپٹی پر کیا تھا۔ وہ بھی ڈھیر ہو گیا، تیسرے کی گن ذرا دور گری تھی۔ وہ لڑھکتا ہوا اسے اُٹھانے کے لیے لپکا تھا کہ جونی نے دوڑ کر اس کی گن کو اپنی لات کی ٹھوکر لگا دی، جو حملہ آور کی دسترس سے اور دور چلی گئی۔
ہمارے لیے یہی موقع کافی تھا اور جب اس نے پھیلی ہوئی آنکھوں سے بیک وقت مجھے اور رومی کو اپنی گنیں لٹھ کی طرح خود پر اُٹھاتے دیکھا تو اس کی جان قبل از وقت ہی نکل گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں مگر نہیں یہ ہماری بھول تھی، وہ کم بخت چکنے پر فرش پر ماہیِ بے آب کی طرح پھسلا اور ایک خاص ٹرک سے ان متوقع ضربات کے نشانے سے دور چلا گیا اور نہ صرف یہ بلکہ اسی سرعت کے ساتھ اُٹھ کر جونی کی طرف غراتا ہوا لپکا بھی مگر جونی بھی محتاط تھا، اس کے چہرے پر اپنی ماں کی طرح ذرا بھی خوف و ڈر کا تاثر تک نہ تھا بلکہ ایک جوش کی سی کیفیت لرزاں تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کھلونا گن سے گرم اُبلتے پانی کی پچکاری اس پر ماری۔
تیسرا مدِمقابل بُری طرح چیختا ہوا اپنا جلتا ہوا چہرہ، پہلے ہی جھلسا ہوا تھا، دونوں ہاتھوں سے پکڑے درد و تکلیف سے ناچنے لگا تو رومی اور میں نے بالآخر اپنی حسرت پوری کر ڈالی۔ دونوں کی گنز کے کندے اس کے سر پر وجے تھے اور وہ بغیر آواز نکالے وہیں ڈھیر ہو گیا۔
”اب نکل چلو یہاں سے جلدی...... یہ امرناگ کے ہی بدمعاش ساتھی تھے۔“ مارگریٹ نے جیسے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں جلدی سے اپنا کچھ ضروری سامان سمیٹتی ہوں۔“
”وقت بالکل نہیں ہے، فائرنگ کی آواز سنتے ہی آس پاس سے کسی نے اب تک پولیس کو فون کر دیا ہوگا۔ جلدی نکل چلو یہاں سے......“ رومی نے متنبہ کیا۔
”تم پھر باہر نکلو، میں گاڑی کی چابی لاتی ہوں۔ جونی جاؤ ان کے ساتھ......“
جونی ہمارے ساتھ آگیا۔ ہم تینوں باہر نکلے تو جونی نے قریب ہی ایک گیراج کی جانب دوڑ لگا دی اور پھر کوئی بٹن دبا کر اس کا دروازہ اُونچا کیا، تب تک مارگریٹ چابیاں لیے برآمد ہوئی، اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا شولڈر بیگ بھی لہرا رہا تھا۔ ہمارے منع کرنے کے باوجود وہ جلدی میں کچھ نہ کچھ سمیٹ ہی لائی تھی۔
ہم تیزی سے گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ مارگریٹ نے سنبھالی تھی۔ میں اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔ رومی، جونی کے ساتھ عقبی نشست پر تھی۔
یہ جیپ نما کار تھی، جو صحرائی علاقوں میں بھی بہ آسانی چل سکتی تھی۔ مارگریٹ کو گاڑی چلانے کا خاصا تجربہ تھا۔ اس نے مین شاہراہ پر آنے میں ذرا دیر نہیں لگائی تھی۔ اس کے بعد جیسے گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔
اسی وقت اس کا سیل فون گنگنایا۔ اس نے سیل نکالا اور کان سے لگا لیا۔ اس کا ایک ہاتھ ہنوز اسٹیئرنگ سے کھیل رہا تھا۔ رات کے اس پہر سناٹے میں سڑک دور تک چمکتی ہوئی اور ویران نظر آتی تھی۔ موسم صاف تھا اور آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔
”یس، روڈی! ہم نکل گئے ہیں اور ہاں...... تمہارا خیال سو فیصد درست ثابت ہوا، اس رذیل امرناگ کو فوراً اندازہ ہو گیا تھا، خیر...... کیا؟...... ہاں...... وہ دونوں بھی میرے ساتھ ہی ہیں اور جونی بھی......، ہاں......بس ہم چل

پڑے ہیں اور ہم نے بہادری سے ان کا مقابلہ کیا ہے، او کے...... ہمیں آدھا پونا گھنٹا لگ جائے گا، ڈونٹ وری......''

سیل پر روڈی سے بات کرنے کے بعد جب وہ خاموش ہوئی تو میرا دھیان روڈی کی طرف چلا گیا جو مبینہ طور پر مارگریٹ کے صاحبِ فراش شوہر چاوز کا کوئی دوست تھا مگر اس کے زیادہ مراسم مجھے مارگریٹ کے ساتھ ہی نظر آرہے تھے۔

گاڑی طوفانی رفتار سے دوڑ رہی تھی اور میں مارگریٹ کو ٹوکے بغیر نہ رہ سکا۔ ''اس قدر تیز اسپیڈ کی ضرورت نہیں، کوئی ہمارے تعاقب میں نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہیں توازن ہی نہ کھو بیٹھو۔'' میں نے کہا۔

''میں اسی طرح ہی ڈرائیونگ کرتی ہوں۔'' مارگریٹ نے کہا اور اس وقت اس کی پوری توجہ ڈرائیونگ پر تھی مگر مجھے اس کے چہرے پر ایک اسرار بھری گمبھیر تا بھی محسوس ہوئی تھی۔

سڑک اب سیدھی تھی لیکن مجھے اب بھی ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں گاڑی بے قابو ہو کر اُلٹ ہی نہ جائے، یہ ڈر مجھے اس کی کیفیات کے سبب تھا، وہ اپنے آپے میں نہیں لگتی تھی اور جوش اور خوف کے ملے جلے تاثرات انسان کو اس بری طرح اعصاب زدہ بنا ڈالتے ہیں کہ وہ اپنے بدن کی کپکپاہٹ پر بھی قابو نہیں پا سکتا یہ تو پھر آندھی طوفان کی طرح بھاگتی ہوئی گاڑی تھی اور جس کا اسٹیئرنگ مارگریٹ کے ہاتھ میں تھا۔ میں بہرحال خاموش رہا۔

پھر ہم جلد ہی شہری آبادی سے دور صحرائی مضافات میں آگئے۔ ہم یہاں پہلے بھی مقتول، بدنصیب اور سابقہ پولیس افسر خالد سے ملنے اس کے کاٹیج میں آچکے تھے۔ یہ علاقہ نیم صحرائی اور قدرے نخلستانی جنگلات پر مشتمل تھا۔ درمیان میں بل کھاتا ہوا سخت مٹی کا راستہ بنا ہوا تھا اور چند میل بعد ایک نہر کراس کر کے پختہ سڑک میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ غیر معمولی رفتار کے سبب ہم جلد اس علاقے میں داخل ہو گئے جہاں لکڑی کے دیدہ زیب اور شاندار کاٹیج بنے ہوئے تھے، مگر گاڑی کہیں نہیں رکی۔ خالد کا کاٹیج بھی انہی کے درمیان تھا۔ وہ تو بے چارہ اب دنیا میں نہیں رہا تھا، لیکن اب نجانے مارگریٹ کہاں لے جا رہی تھی، شاید آگے بھی کہیں آبادی تھی۔

کاٹیجز کا سلسلہ پیچھے رہ گیا، اب دور و نزدیک اِکا دُکا ہی کاٹیجز اور جھونپڑا نما مکان نظر آرہے تھے مگر ان میں جدت تھی اور قدیم و جدید کے امتزاج نے انہیں اور بھی خوش نما بنا دیا تھا۔

جلد ہی ہم ساحل کے قریب نکل آئے، یہاں الگ تھلگ حصے میں ریت اور خشک مٹی کے قدرے بلند ٹیلے پر ایک جھونپڑ ٹائپ مکان بنا ہوا تھا۔

ہماری بھاگتی دوڑتی گاڑی نے گویا اس کے دروازے پر پہنچ کر ہی دم لیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق کوئی ساٹھ گز کا یہ مکان گراؤنڈ ون پلس ہوگا۔ وہاں گیٹ پر دو گلوب نصب تھے، ایک تاریک تھا اور دوسرا روشن، جس سے اطراف کا منظر دروازے سمیت واضح نظر آتا تھا۔

مارگریٹ نے ہارن بجایا اور پھر ہم سب نیچے اُتر آئے۔ گلوب کی روشنی میں دروازے سے جو بھی نمودار ہوتا دکھائی دیا، اس کے برآمد ہونے کا انداز لڑھکنے جیسا ہی کہا جا سکتا تھا، وہ ایک انسان کے قریب قریب کی شے تو ضرور محسوس ہوا، مگر پورا انسان نہیں، ایک تو اسے دیکھنے کے لیے مجھے اپنی آنکھیں تھوڑا اسکیڑنا پڑی تھیں، دوسرے یہ کہ اس قدر غور سے دیکھنے کے باوصف بھی وہ واضح نظر نہیں آتا تھا۔

اس کا قد ہی بہ مشکل چار ساڑھے چار فٹ ہوگا، اس پر مستزاد باہر کو نکلی ہوئی توند نے ایک آدھ فٹ یوں بھی نگل لیا تھا، اس کے موٹے جسم کے اوپر اس کا چھوٹا سا سر رکھا ہوا نظر آتا تھا کہ ابھی ایک ٹھوکر لگی اور وہ گویا ہمالیہ سے نیچے لُڑھک جائے گا۔ تربوز کے اُوپر خوبانی رکھے سر کا منظر پیش کرتا یہ آدمی مجھے کہیں سے بھی 'انکل روڈی' نہیں معلوم ہوتا تھا کیونکہ جس انداز میں ان دونوں ماں بیٹے نے اس کی مدد چاہی تھی اور وہ ہمیں بھی بلا رہا تھا، اس سے میں یہی سمجھا تھا کہ انکل روڈی کوئی دبنگ شخصیت ہوگا۔ ممکن تھا یہ اس کا کوئی ملازم وغیرہ ہو۔

اس کے منہ سے دھوئیں کی لکیر بھی اُٹھتی نظر آرہی تھی، مزید غور کیا تو معلوم ہوا موصوف نے پائپ بھی منہ میں لگا رکھا تھا۔ اس کے بونے سے جسم پر سیاہ لفافہ پینٹ تھی اور اُوپر شرٹ، نیچے کھسکتی محسوس ہوتی پینٹ پر اس نے 'گیلس' باندھ رکھے تھے کہ شمالاً جنوباً پھیلی ہوئی توند پر بیلٹ کا باندھنا امرِ محال ہی تھا۔ اس کے مسخرے حلیے پر میرا بے اختیار ایک قہقہہ اُگلنے کو بھی جی چاہا تھا جسے میں نے بہ مشکل روکا اور ساتھ ہی کن انکھیوں سے رومی کے چہرے کو بھی ایک نگاہ دیکھا۔

جونی ''انکل روڈی'' کہتا ہوا اس کی جانب دوڑا تو

میرا دل جو اندر ہی اندر یہی دعا مانگ رہا تھا کہ کاش، یہ ''انکل روڈی'' نہ ہو، آشکارا ہوتے ہی میرا اپنا سر پیٹنے کو جی چاہا۔

میں نے اپنے ہونٹ بھنیچتے ہوئے رومی کی طرف دُزدیدہ نظروں سے دیکھا تو مجھے پہلے اس کی آنکھیں سکیڑتی ہوئی اور بعد میں پھیلی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔ دہن بھی تھوڑا سا کھل گیا تھا جس کے ''کھلنے'' کی وجہ میں جان سکتا تھا۔

مارگریٹ آگے بڑھی اور ناچار رومی اور میں نے بھی دروازے کی جانب قدم بڑھا دیے اور قریب پہنچ کر میں متلاشی نظروں سے اس مختصر الوجود اور عجیب الخلقت شے کو جونی کے عقب میں دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ پندرہ سولہ سالہ جونی سے بھی قد میں بُری طرح مار کھا رہا تھا۔

جونی ہٹا تو وہ برآمد ہو گیا۔ اس کے چھوٹے سے سر کا چہرہ پھولا ہوا نظر آرہا تھا، جس کی رنگت سرخ و سپید تھی۔ آنکھیں چنی چنی سی تھیں۔ وہ ہر قسم کے جذبات سے عاری محسوس ہو رہا تھا، حتیٰ کہ نہ اس میں اضطراب اور نہ ہی تفکیر کے آثار تھے۔

بس ایک عام سے سپاٹ انداز میں اس نے ہمارا استقبال کیا اور پھر ہمیں اپنے عقب میں آنے کا کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

اگلے چند سیکنڈوں بعد ہم ایک صاف ستھری سی نشست گاہ میں براجمان تھے۔ وہ ایک الگ تھلگ صوفے پر ہمارے سامنے بیٹھ گیا تھا۔ پائپ کے کش وہ بدستور لگا رہا تھا۔

میرے دل میں ابھی تک پچھتاوا ہو رہا تھا کہ یہاں آکر ہم نے وقت کے زیاں کے علاوہ غلطی بھی کی تھی۔ یہ آدمی تو خود ہمیں مدد کا طلب گار نظر آرہا تھا۔ میں اور رومی اپنا تعارف کروا چکے تھے۔

اچانک ایک بھاری اور گونجدار آواز اُبھری تو میں جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، مگر کوئی دکھائی نہیں دیا، تو معلوم ہوا کہ یہ آواز اسی عجیب الخلقت آدمی کی تھی۔ وہ ہم سے مخاطب تھا اور ہماری خیریت پوچھ رہا تھا۔

''ہم ٹھیک ہیں مگر خطرات ہمارے سر پر منڈلا رہے ہیں۔'' میں نے رومی کو کہتے سنا۔

''کیا مطلب؟'' انکل روڈی نے پوچھا۔ مجھے وہ جسمانی نقائص کے ساتھ ذہنی طور بھی سوچ وبچار جسے عام فہم میں عقل کہا جائے، اس سے عاری ہی لگا، حالانکہ اسے مارگریٹ نے بتا دیا تھا کہ ہم کیسے خطرناک حالات میں یہاں پہنچے ہیں۔

''مطلب یہ کہ انکل روڈی...! او...... سوری انکل روڈی!'' میں نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''دشمن ہمارے تعاقب میں ہیں۔'' میرا اس سے زیادہ بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا، فقط یہی چاہتا تھا کہ مارگریٹ سے امرناگ کے بارے میں تفصیل وغیرہ معلوم کرنا۔

''بے فکر رہو، دشمن یہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔'' بڑے گمبھیر سے لہجے میں کہنے کے بعد وہ مارگریٹ کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم نے اس کے ساتھ جادوز کے سلسلے میں کیا ڈیل کی تھی؟''

اس کے سوال پر رومی اور میری بھی سوالیہ نظریں مارگریٹ کے مضطرب سے چہرے پر جم گئیں۔

اس نے جواب دینے سے پہلے اپنے بیٹے جونی کو اندر کمرے میں بھیج دیا، جہاں اس کے لیے کچھ دلچسپی کا سامان تھا۔ شاید وہ یہاں آتا رہتا تھا، وہ اندر چلا گیا۔ وہ شاید بیٹے کے سامنے ایسی کوئی بات کرنے سے اعراض برتتے ہوئے تھی جو ایک بیٹے کی نظر میں ماں کے مقام کو متاثر کرتی ہو لیکن لگتا ایسا ہی تھا کہ مارگریٹ اور انکل روڈی کے درمیان کچھ بھی مخفی نہ تھا۔

''میں اس حرام زادے کو منانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔'' وہ بتانے لگی۔ ''مگر اس دوران وہ بدبخت مجھ پر ہی عاشق ہو گیا، ایک حد تک اسے بے وقوف بنا کر اپنا کام نکالنے کے لیے مجھے یہ بھی قبول تھا۔ ابھی یہ معاملات چل ہی رہے تھے کہ یہ لوگ آن دھمکے.....'' اس نے آخر میں ہماری جانب اشارہ کر دیا۔

مجھے اس کا انداز شکایتی لگا۔ یوں جیسے کہہ رہی ہو ان دونوں نے میرا سارا کام بگاڑ دیا۔ تاہم یہ ایک... حقیقت بھی تھی کہ وہ اپنی کسی مجبوری کے سبب اپنا ''سب کچھ'' امرناگ کو سونپ چکی تھی جیسا کہ میں نے اسے امرناگ کے بیڈ روم میں ایک مہین سے سیاہ سلیپنگ ڈریس میں دیکھا تھا۔

''تم دونوں نے یہ ایک فاش غلطی کر ڈالی۔ اس بے چاری کا بنا بنایا کام تم دونوں نے بگاڑ کر رکھ دیا۔'' اپنی ہوتی سوتی مارگریٹ کی بات سن کر اس نے براہِ راست اور بلا سوچے سمجھے ہم سے کہا تو مجھے اس کے جسمانی حدود اربع پر ماتم کرنے سے زیادہ اس کی عقل پر افسوس ہوا۔

میں ابھی میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ رومی نے اس

سے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ”تمہارا جو بھی معاملہ یا مجبوری رہی ہو، لیکن ہمارا کاز مارگریٹ کی مجبوری سے زیادہ اہم تھا۔ لہٰذا اب لکیر پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور ہمیں بتایا جائے کہ آخر تمہاری ایسی کیا مجبوری تھی کہ تم ہمیں امرناگ جیسے شیطان اور ظالم درندہ صفت انسان کے بیڈ روم سے ملیں؟“

آخری الفاظ اس نے مارگریٹ کی جانب دیکھتے ہوئے کہے تھے اور میں سمجھ سکتا تھا کہ رومی نے اپنے دل کی بھڑاس ہی نکالی تھی۔

میرا خیال تھا کہ مارگریٹ شرم سے سرخ ہو جائے گی اور کم از کم یہ انکل روڈی تو ضرور اسے غصے یا تنبیہ آمیز نظروں سے گھورے گا ہی مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ اس کے برعکس مارگریٹ ہماری طرف دیکھ کر برہمی سے بولی۔

”ہر کسی کو اپنے اپنے کاز سے ہی دلچسپی ہوتی ہے اور اس کی نظر میں وہی اہم ہوتا ہے، لیکن تم دونوں نے مجھے اب ایک نئی مصیبت سے دوچار کر دیا ہے۔ نہ صرف میرے شوہر کی زندگی... خطرے میں پڑ چکی ہے بلکہ اب تم دونوں کی وجہ سے خود میری اور میرے بیٹے جونی کی زندگیاں بھی داؤ پر لگ گئی ہیں۔“

مارگریٹ کا یہاں آتے ہی رویہ ایک دم بدل گیا تھا اور اس کی وجہ بھی سمجھ میں آتی تھی۔ اگر وہ انکل روڈی کی گود میں خود کو سمجھتے ہوئے ہمیں کمزور سمجھنے لگی تھی تو یہ اس بے وقوف عورت کی سنگین غلطی تھی۔

میں جو، ان دونوں کے خود غرضانہ رویوں پر بھرا بیٹھا تھا، جی تو کیا کہ ان دونوں کو کھری کھری سنا دوں کہ وہ ایک اجتماعی اور عظیم مقصد کو اپنی ذاتی اور انفرادی غرض پر فوقیت دیے ہوئے تھے، مگر مصلحت آڑے آ گئی جس کی تلقین اکثر رومی بھی مجھے کرتی رہتی تھی۔ اسی لیے اپنا اُبال دباتے ہوئے میں نے مصالحانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھو، مقصد ہم سب کا ایک ہی ہے، اگر ہم اس طرح آپس میں اُلجھتے رہیں گے تو ہمارا خطرناک مشترکہ دشمن ہم پر وار کرنے میں کامیاب ہو جائے گا، لہٰذا اب ہمیں مل کر ایک پلان بنانا ہوگا جس کے تحت ان حالات کو فیس کیا جا سکے۔ اس کے لیے بہتر ہوگا مارگریٹ......“ میں نے آخر میں اس کی جانب دیکھا۔

”کہ مجھے تم اپنی وہ مجبوری بتاؤ اور امرناگ کے ان خونی رازوں سے بھی ہمیں آگاہ کرو جو اب تک تم یقیناً جان چکی ہو۔ تاکہ ہماری آئندہ کی منصوبہ بندی اور لائحہ عمل مربوط ہو سکے۔“

مارگریٹ نے کچھ کہنے کے لیے اپنا منہ کھولا ہی تھا کہ درمیان میں انکل روڈی نے اسے بولنے سے منع کر دیا اور پائپ کا ایک کش لیتے ہوئے اسے اپنی مٹھی میں دبوچ کر ہم سے مخاطب ہو کر بولا۔

”تم اپنا راستہ لو...... ہم خود اس معاملے کو ڈیل کر لیں گے جسے ہم تمہارے ساتھ مل کر مزید سنگین نہیں کرنا چاہتے۔“

اس کے رُوکھے انداز تخاطب پر مجھے اپنے اندر کے اُبال پر قابو پانا دشوار محسوس ہونے لگا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مارگریٹ یہاں آ کر دلیر ہو گئی تھی۔ جونی اندر کہیں کمرے میں تھا۔

رومی کے چہرے پر ایک گمبھیر تا سوچ کے تاثرات تھے۔ گویا وہ کچھ ”کرنے“ کے موڈ میں نظر نہیں آ رہی تھی، تب ہی میں ایک دم اپنی جگہ سے اُٹھا اور مارگریٹ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

”دیکھو مارگریٹ! تم نے ہمیں دھوکا دیا ہے، تمہاری وجہ سے ہمارا مشن ادھورا رہ گیا۔ اب تم ہمیں اپنے اور امرناگ کے بارے میں بتاؤ گی کہ یہ سارا کیا چکر ہے؟“

”یہ تمہیں بتانے کی کسی طرح بھی مجاز نہیں ہے، سمجھے تم مسٹر! اینڈ ناؤ گیٹ آؤٹ۔“ ایک بار پھر اس کے بجائے انکل روڈی نے مجھ سے برہم ہو کر کہا اور ساتھ ہی وہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں طیش میں آ گیا اور غصے سے دانت پیستے ہوئے اس کی جانب لپکا ہی تھا کہ اچانک ایک 'پٹاک' کی آواز اُبھری، یوں جیسے کوئی موٹی تازی چھپکلی چکنے فرش پر گری ہو۔ میری پیشانی پر کوئی شے بڑے زور سے آ کر لگی اور ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں تلے اندھیرا سا آ گیا، اگلے لمحے ایسی ہی ایک اور آواز کے ساتھ ہی مجھے رومی کی بھی کراہ سے مُشابہ آواز سنائی دی۔

کچھ دیکھنے کے قابل ہوئے تو دیکھا کہ میری پیشانی پر کسی سوفٹ ایئر گن کا تیر پیوست تھا، جس کے سرے پر ربر لگا ہوتا ہے اور وہ ہدف سے ویکیوم بنا کر چپک جاتا ہے۔ ایسا ہی تیر رومی کی پیشانی کے بجائے گال پر چپکا ہوا تھا۔ ہم دونوں اس اچانک اور عجیب حملے سے بوکھلا سے گئے تھے۔ انکل روڈی نے ہماری حالت پر ایک قہقہہ اُگلا۔

اِدھر ابھی ہم سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ تلے اُوپر ایسے ہی سوفٹ ربر ایر، ہم پر برسنا شروع ہو گئے اور جگہ جگہ ہمارے وجود سے چپکتے رہے۔ میں اور رومی ان سے بچنے

کے لیے اُچھل کود کرنے لگے۔
جان تو گئے تھے ہم کہ یہ ’نکے‘ مارے جونی کی شرارت تھی، وہ کمبخت اس وقت ہمارے لیے ’’ہوم الون‘‘ کی مووی کا ’میکولی کارسن‘ بنا ہوا تھا اور وہ شاید رومی کو کسی کونے کھدرے میں دبکا بیٹھا نظر بھی آ گیا تھا، یہی وجہ تھی کہ اس نے فوراً ہی ایک کمرے کی کھڑکی کی جانب جست لگائی تھی۔
اس طرف جست لگاتے وقت میری غیر اختیاری نظریں رومی کی ’’پشتک‘‘ پر پڑی۔ اس نے ٹائٹ جینز پہن رکھی تھی اور دو عدد سوفٹ ایرو وہاں بھی کسی انٹینا کی طرح چپکے ہوئے مجھے نظر آئے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں منہ اور دل کھول کر ہنستا۔
اچانک ایک ایرو میری دائیں آنکھ پر لگا اور چپک گیا۔ عارضی طور پر ایک آنکھ سے ’کانا‘ ہو گیا تو میرے اندر طوفانی اُبال نے سر اُٹھایا۔
میں نے ایک ہاتھ سے اپنی آنکھ سے وہ ایرو کھینچنے کی ناکام کوشش چاہی تھی کہ اسی وقت میں نے انکل روڈی کو سیل فون پر کسی کے نمبر پنچ کرتے دیکھا اور سمجھ گیا وہ کم بخت کسی کو مطلع کرنے کی کوشش میں ہے۔
یہی وہ وقت تھا جب اپنی کانی آنکھ لیے اس کی جانب لپکا تو وہ بھاگ کر صوفے کے عقب میں لڑھکا، میں اس قدر بھرا ہوا تھا کہ غیظ جوش تلے صوفے پر جست لگا دی اور اسی سمیت نیچے آ رہا۔ نتیجے میں قریب کھڑی مارگریٹ نے اضطراری سی چیخ ماری۔
میرے ساتھ لڑھکتے ہوئے صوفے سے انکل روڈی بھی ٹکرا گیا تھا اور ہم دونوں زمین بوس ہو گئے تھے۔
دوسری طرف رومی کو شاید وہ ’’میکولی کارسن‘‘ کی اولاد جونی نے ناک میں دم کیا ہوا تھا، کیونکہ وہ ابھی تک اس کی گرفت میں نہیں آیا تھا اور اندر کمرے میں ان دونوں کے درمیان ہونے والی دھما چوکڑیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، جبکہ میں ادھر اپنا ’معاملہ‘ نمٹانے کی جستجو میں تھا۔
سیل فون انکل روڈی کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر چکا تھا اور وہ اسے دوبارہ اُٹھانے کے لیے لڑھک رہا تھا کہ میں نے سنبھلتے ہی اس کے ایک لات رسید کر ڈالی، جو اس کے منحنی وجود میں کہیں لگی تھی۔ وہ چیخا اور وہیں بے دم ہو گیا۔
میں نے حرکت کی، اسی وقت کوئی شے میرے قریب آ کر گری اور ٹوٹی۔ وہ ایک بھاری گلدان تھا، اس کا ہدف میرا سر ہی ہو سکتا تھا۔
یہ نازیبا حرکت مارگریٹ کی تھی۔ میں اُٹھ کر اس کی جانب غراتا ہوا لپکا کہ اسی وقت اندر کہیں سے جونی تیز رفتاری کے ساتھ دوڑتا ہوا میرے قریب سے گزرا۔ اس کم بخت نے کوئی رسی دبوچی ہوئی تھی اور میں اسی سے اُلجھ کر اُوندھے منہ گرا...... مگر میری پھرتیاں اس وقت عروج پر تھیں، گرتے ہی میں نے اُٹھنے کی کوشش کی تھی کہ اسی وقت رومی، جو جونی کے عقب میں اسے دبوچنے کے لیے اندھا دھند بھاگی آ رہی تھی، مجھ سے اُلجھ کر گری۔ اس کے حلق سے ایک چیخ برآمد ہوئی تھی۔
میں دوبارہ مارگریٹ کے قدموں پر تھا۔ اس نے گویا یہ سنہری موقع تاک کر اپنی نکیلی سینڈل میرے چہرے پر رسید کرنا چاہی تھی کہ میں نے اپنا چہرہ بچاتے ہوئے اس کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لی۔ وہ نیچے آ رہی، اس کا سر کسی شے سے ٹکرایا تھا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔
اپنی آنکھ پر لگا ربر کا سوفٹ ایرو میں، مشکل سے کھینچ کر نکال چکا تھا۔
’’خبردار! کوئی حرکت نہیں کرے گا۔‘‘ اچانک مجھے جونی کی آواز سنائی دی۔ میں ادھر ہی رک گیا۔
وہ میرے آگے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ایک پستول پکڑ رکھا تھا۔ رومی بھی سنبھل کر اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
’’یہ اصلی ہے اور مجھے چلانا بھی آتا ہے۔‘‘ اس نے اپنی طرف سے مطلع کرنا ضروری سمجھا۔ میں اور رومی اُٹھ کھڑے ہوئے تو اس نے ٹریگر چلا دیا۔
’’دھائیں‘‘ سے فائر ہوا اور رومی اور میں اُچھلے۔ گولی ہمارے قدموں میں پیوست ہو گئی۔
’’دیکھ لیا تم دونوں نے۔‘‘ جونی بولا۔ ’’یہ نشانہ تمہارے پیروں پر بھی پڑ سکتا تھا۔‘‘
رومی اس پر بری طرح خار کھائی ہوئی نظر آ رہی تھی، صاف لگتا تھا جونی نے اسے خاصا پریشان کیا تھا۔
’’دیکھو جونی! یہ...... یہ کھلونا نہیں ہے۔‘‘ میں نے قدرے ہانپتی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے پورے سکون کے ساتھ اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔
’’میں نے کب کہا یہ کھلونا ہے؟‘‘ جونی نے جیسے میرا تمسخر اُڑایا۔
’’اچھی بات ہے۔‘‘ میں نے خالص معلمانہ انداز میں کہا۔ ’’مگر یہ غلطی سے بھی چل جاتا ہے اور انسان کا مرڈر ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد گولی چلانے والے کو پھانسی لگ

جاتی ہے۔''
''مجھے یہ بھی معلوم ہے۔'' وہ سکون سے بولا۔ ''مگر مجرموں کو گولی لگنا کوئی جرم نہیں ہوتا۔ اب فضول باتیں بند۔'' اس نے گویا متنبہ کیا۔ میں اندر ہی اندر خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔
''دیکھو، جونی۔'' اس بار رومی نے اسے سمجھانے کی غرض سے کہا۔ ''تمہاری مما اور انکل روڈی ایک بھیانک اور سنگین غلطی کر رہے ہیں۔ تم جانتے نہیں ہو کہ تمہاری مما...... کو ہم نے آدھی رات کو کہاں سے دریافت کیا تھا؟ امرناگ کے بیڈروم سے...... جبکہ تمہیں مما نے یہ بتایا تھا کہ وہ اسپتال جارہی ہیں جہاں تمہارے پاپا ایڈمٹ ہیں۔ اسی سے اندازہ لگالو کہ تمہاری ماں کس کیریکٹر کی......''
''شٹ۔'' میں نے رومی کو ٹوکا۔ ''ایک نوعمر لڑکے سے اس کی ماں کے بارے میں ایسی نازیبا گفتگو نہیں کرتے۔ اس کی سائیکی خراب ہوگی۔''
''بھاڑ میں گئی اس کی سائیکی۔'' رومی بپھر کر بولی۔ لگتا تھا وہ ہوم الون ٹائپ کے اس لڑکے پر زیادہ ہی اُدھار کھائے بیٹھی تھی۔ ''اسے حقیقت کا علم ہونا چاہیے کہ......''
اسی وقت گولی چلنے کا دوسرا دھماکا ہوا اور رومی اپنی جگہ سے مینڈک کی طرح اُچھلی۔ میں بھی بدکا۔ اس کم بخت ...... جونی نے دوسرا فائر جھونک مارا تھا اور شاید اپنا 'سچا' نشانہ دکھانے کی غرض سے اس بار رومی کے پاؤں کے درمیان ... گولی داغی تھی۔
''تم دونوں اپنا منہ بند کرو اور جو میں کہوں وہی کرو۔'' جونی نے ساتھ ہی تہدید بھی کرڈالی۔
ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک دروازہ ایک زوردار دھڑاکے سے کھلا اور آن واحد میں تین مسلح سیاہ پوش اندر داخل ہوئے۔
''خبردار! جہاں ہو وہیں جام ہوجاؤ۔'' ان میں سے ایک نے کرخت اور بلند آواز میں کہا۔
ہم تو پہلے ہی ساکت و جامد تھے۔ ان تینوں کو دیکھ کر مزید جہاں کے تہاں ہو کر رہ گئے۔ یہی نہیں جونی بھی پریشان نظر آنے لگا۔
''پستول پھینک دو لڑکے!'' اسی نے جونی سے بھی تحکمانہ درشتی سے کہا۔
اس کے دونوں ساتھی چوکس کھڑے تھے اور ان کے آتشیں ہتھیاروں کی نالیں بدستور ہم پر اُٹھی ہوئی تھیں۔

'' یہ بھی ایک قسم ہے ڈانس کی''

جونی پریشان نظر آرہا تھا۔ مجھے ڈر لگا کہیں یہ لوگ اس معصوم پر گولی نہ چلادیں۔ لہٰذا میں نے اسے پچکارا۔
''جونی! پستول پھینک دو، اور جیسا یہ کہہ رہے ہیں ویسا ہی کرو۔''
جونی نے پستول پھینک دیا۔ میں نے سکون کی سانس لی، لیکن اس نئی اُفتاد نے مجھے ہی نہیں رومی کو بھی تشویش زدہ کردیا تھا۔
''کون ہو تم لوگ؟ اور کیا چاہتے ہو؟'' میں نے ہمت کر کے ان سے کہا۔
''شٹ اپ۔'' سیاہ پوش نے مجھے جھڑک دیا۔ وہ اب نقاب کے سوراخوں سے اپنے ڈیلوں کو گیند کی طرح گھما گھما کر گردوپیش کا جائزہ لے رہا تھا۔ کسی گڑبڑ کا اسے اندازہ ہوا۔ پھر میری اور رومی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے بولا۔
''ان دونوں کو قابو کرو۔'' پھر جونی کو گھور کر دیکھتے ہوئے غرا کر اسے اپنی جانب آنے کا اشارہ کردیا۔
جونی سزا کھائے اسکول بوائے کی طرح منہ لٹکائے اس کی جانب بڑھنے لگا۔ ادھر وہ دونوں ہماری جانب بڑھے۔ ایک نے اپنے سیاہ لباس کے اندر سے باریک مگر مضبوط ڈوری کا گچھا سا نکال لیا تھا۔
''تم دونوں دوسری جانب منہ کر کے کھڑے ہوجاؤ

اور اپنے دونوں ہاتھ پشت کی طرف موڑ لو، ہری اَپ۔''
ان دونوں میں سے ایک نے ہمیں حکم دیا۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ کوئی چارۂ کار نظر نہیں آرہا تھا ماسوائے ان کے حکم کی تعمیل کرنے کے۔
''اوہ..... یہاں تو مادام بھی موجود ہیں۔'' ان میں سے ایک نے قدرے چونک کر اپنے سرغنہ کو مطلع کیا۔ 'مادام' کے ذکر پر میں چونکا۔ اس نے یقینا مارگریٹ کے بارے میں ہی ایسا کہا تھا۔ اس پر سرغنہ بھی آگے بڑھا تھا۔ قریب پہنچ کر بولا۔
''مجھے یقین تھا یہ لوگ ہمارے ساتھیوں کو مار کے ادھر کا ہی رخ کریں گے۔'' وہ بڑبڑایا۔ انکل روڈی بھی انہیں ایک طرف لڑھکا ہوا بے ہوش پڑا نظر آگیا تھا۔
جب ہمیں رسن بستہ کر دیا گیا تو پھر دوبارہ ان کی جانب گھومنے کا حکم ملا۔ اب وہ تینوں مطمئن نظر آرہے تھے۔ جونی کو بھی پہلے والے سیاہ پوش نے باندھ دیا تھا۔ وہ شاید اپنے دونوں ساتھیوں کو 'لیڈ' کر رہا تھا۔ ایک سے تحکمانہ بولا۔
''باس کو انفارم کر دو، مجھے بھی یہاں ایک نئی کھچڑی پکی ہوئی نظر آرہی ہے۔''
ایک نے اپنے سیل فون پر کسی باس ٹائپ آدمی سے مؤدبانہ انداز میں رابطہ کر کے اسے بتا دیا۔
ہم تینوں کو سامنے صوفے پر بٹھا دیا گیا تھا اور وہ تینوں بھی اب ڈھیلے ڈھالے اور بے فکرے نظر آرہے تھے۔
انکل روڈی اور مارگریٹ کو صوفوں کے درمیان بچھے قالین پر لٹا دیا گیا تھا۔ سیاہ پوش سرغنہ نے اپنے دونوں ساتھیوں سے انہیں ہوش میں لانے کا کہا۔ وہ اس تگ و دو میں لگ گئے۔ مارگریٹ اور روڈی ہوش میں آنے لگے۔
میرا ذہن ایک ہلچل کی زد میں تھا۔ اگرچہ مارگریٹ کے گھر سے یہ بات ابھی پوری طرح واضح نہیں ہو پائی تھی کہ آخر وہاں اور یہاں حملہ کرنے والے امرناگ کے زرخریدوں سے متعلق تھے یا کوئی اور..... تاہم ان کی باتوں اور حالات و واقعات سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ یہ اسی کے ... حواری تھے۔ کیونکہ ڈاکٹر رمیش اور سرجن امرناگ جیسے خونی درندوں سے کے پاس ایسے لوگوں کا ہونا بعید از قیاس نہیں تھا۔
تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ باہر کسی گاڑی کے رکنے اور پھر اس کے دروازے کھلنے کی آوازیں ابھریں۔ شاید ان کا 'باس' آچکا تھا۔

گاڑی کی آواز سنتے ہی سرغنہ نے اپنے دونوں ساتھیوں کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ دونوں اُٹھ کر باہر کو لپکے۔ ایک تو نکل گیا جبکہ دوسرا..... اپنے سرغنہ سے بولا۔ ''باس آگئے ہیں۔''
میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ باس کے روپ میں کون برآمد ہوتا ہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ امرناگ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

میرا خیال صحیح ثابت ہوا۔ آنے والا سرجن امرناگ ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ڈاکٹر رمیش اگروال بھی تھا۔ دو ساتھی بھی ان رذیلوں کے ہمراہ اندر داخل ہوئے تھے۔ ان دونوں شیطان ابنِ شیطان کو دیکھتے ہی میرے اندر ایکا ایک وہی کیفیت پیدا ہونے لگی جو ایسے خاص مواقع... پر میری ہوا کرتی تھی۔ ان دونوں خونی درندوں کو دیکھتے ہی میں اندر سے یخ سا ہونے لگا۔ ایک خوں ناک سی چادر میری آنکھوں کے آگے تنتی چلی گئی۔
ان دونوں خبیثوں کے چہروں پر بڑی مکروہ مسکراہٹ تھی جس میں ایک فتح کی چمک بھی گڈمڈ سی محسوس ہوئی۔
''باس! یہ ڈاکٹر سیف ہے......'' رمیش اگروال نے بدستور میری جانب گھورتے ہوئے امرناگ کو بتایا، انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی گزرے ہوئے واقعے کے حوالے سے اسے کچھ یاد دلانا چاہتا ہو۔
''اوہ......خوب......! تو یہ عادل کے بعد ہمارا اب دوسرا شکار بننے چلا ہے۔'' امرناگ نے جیسے بھویں اُچکاتے ہوئے مزہ لینے کے انداز میں کہا۔ میرے اندر کی یخ بستگی ایک کھولتے ہوئے اُبال میں بدلنے لگی۔ آج گویا میرے یقین کی حد تک شبے کی جیسے مکمل تصدیق ہو گئی تھی۔
''دیکھ لو باس! آج اس کی ویسی ہی بھیانک موت اسے یہاں کھینچ لائی، جو اس کے بھائی کا مقدر تھی۔'' رمیش مکروہ لہجے میں بولا۔ اس بغض اور سفاک انسان کا بار بار میرے بھائی کی اذیت ناک ہلاکت کا اس انداز میں تذکرہ کرنا ایک طرح سے میرے کرب کی اذیتوں پر نمک پاشی ہی تھا۔ یکایک میرے اندر کہیں ایک جنبش سی اُبھری تھی، یوں جیسے میں اسی وقت حرکت میں آؤں اور اس خنزیر رمیش پر جھپٹ پڑوں اور اسے اس وقت تک اپنے ہاتھوں پیروں کی ٹھوکریں برساتا رہوں جب تک اس کی تڑپ تڑپ کر جان نہ نکل جائے۔ یہ محض ایک جوشیلا خیال ایک خواہش

شکنجہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس لیے کہ اس وقت یہ دونوں تنہا نہیں تھے۔ ان کے ہمراہ ان کے زرخرید پانچ عدد مسلح کتے کھڑے تھے اور میری ایک ذرا سی جنبش مجھے ہی نہیں رومی کے لیے بھی فنا کا گھاٹ ثابت ہوسکتی تھی۔ لٰہذا میں ان دونوں شیطانوں کی حظ اُٹھاتی گفتگو صبر و برداشت اور خاموشی سے سنتا رہا۔

اس کے بعد رمیش نے اپنے ساتھ آنے والے دو آدمیوں میں سے ا کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ ہماری جانب بڑھا۔ اس نے جیب سے کوئی لمبی نوزل والی شے نکالی اور چند قدم ہمارے نزدیک آکر اس نے نوزل کا رخ ہماری جانب کرتے ہی کوئی بٹن پش کیا اور اس میں سے گاڑھا اسپرے ہمارے چہروں سے ٹکرایا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

جب ہوش آنے پر آنکھ کھلی تو میں نے خود کو قبر جیسی تاریکی میں پڑے پایا۔ اسپرے کا ذائقہ بڑا ہی بدبودار اور مچھاند کی طرح کا تھا جو ابھی تک مجھے اپنے حلق اور ناک کے اندر محسوس ہو رہا تھا اور میں نیم غنودگی کے عالم میں تھا۔

اس غنودگی کو جھٹکنے کے لیے میں نے اپنے سر کو دو تین بار زور زور سے دائیں بائیں ہلایا، مگر بے سود غنودگی ختم نہ ہوئی، اس کوشش میں چکر آنے لگے اور میں نے سر لٹکا دیا۔

میں شاید سخت زمین پر پڑا تھا۔ محسوس کرنے پر میں چونکے بنا نہ رہ سکا، کیونکہ اس میں تھرتھراہٹ تھی۔ سر ایک جانب ڈالنے کے بعد میری آنکھیں پھر بوجھل ہونے لگیں۔ شاید اس بدذائقہ اسپرے کا اثر ہنوز اعصاب اور دماغ پر طاری تھا۔ ہلکی سی گھرگھراتی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔

ناچار میں اسی طرح پڑے پڑے گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔ کچھ دیر مزید گزری تو ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کے لائق ہوا، غنودگی بھی چھٹنے لگی۔ عقدہ کھلا کہ میرے ہاتھ پاؤں رسن بستہ تھے۔ مجھے گزرے سارے واقعات مرحلہ وار یاد آتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ میں نے بے اختیار ہو کے رومی کو آواز بھی دے ڈالی۔

کوئی جواب نہ ملنے پر میں گرد و پیش کے نظر نہ آنے والے ماحول پر غور کرنے لگا اور پتا چلا کہ میں کسی بوٹ یا لانچ کے نچلے حصے کے کسی کیبن کے فرش پر اس طرح پڑا ہوا تھا۔

''آ آ...... آہ......'' معاً مجھے اپنے دائیں جانب ذرا فاصلے سے ایک کراہ سنائی دی۔

''رومی......!'' میں نے فوراً پکارا۔

''سس......سیف!'' یہ رومی ہی کی آواز تھی۔ اس کی آواز سنتے ہی مجھے حوصلہ اور تسلی ہوئی۔

''تت......تم ٹھیک ہونا؟''

''بس، اسی طرح ہوں جس حالت میں تم ہو۔'' اس نے کہا۔ ''ہم کہاں ہیں؟''

''شاید کسی لانچ میں......'' میں نے اپنے رسن بستہ وجود کو تھوڑی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ مستقل بندھے رہنے اور ایک جگہ لیٹے لیٹے اکڑن سی ہو رہی تھی۔

''ہاں! مجھے بھی یہی لگ رہا ہے۔'' وہ بولی۔

''کہاں لے جا رہے ہیں ہمیں یہ......؟''

''ان سے پوچھ کر ہی پتا چل سکتا ہے۔'' میں سرد لہجے میں بولا۔

''چنے کیوں چبا رہے ہو۔ میں سمجھی تھی کہ شاید تمہیں کوئی اندازہ ہوا ہو۔'' وہ چڑے ہوئے لہجے میں بولی۔

''تمہارا سوال ہی لدڑ قسم کا تھا۔'' میں بیزاری سے بولا۔

''توبہ ہے، یہ تم مجھ سے متروکہ زبان میں بات مت کیا کرو۔'' وہ بولی۔

میں خاموش رہا۔ میرا دماغ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ کئی لمحات اسی طرح طویل اور گمبھیر سی خاموشی میں گزر گئے۔

''کہیں خدانخواستہ فوت تو نہیں ہو گئے سیف؟'' رومی نے ہولے سے پکارا۔

''اس کے قریب قریب ہی سمجھو۔'' میں نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہوئے اور قریب آکر یہ جکڑبند کھولنے کی کوشش کرنی چاہیے۔''

''آواز کا اندازہ لگاتے ہوئے تم آجاؤ میرے قریب۔'' میں نے کہا۔

''کیوں، تمہارا آنا گناہ ہے؟ تم بھی یہی کوشش کرو۔'' وہ بولی۔

''کیا خبر تاریکی کی اس قربت میں کوئی گناہ ہو جائے۔'' میں نے اسے جلایا۔

''شٹ اپ! مت بھولو کہ ہم خطرناک اور درندہ صفت لوگوں کی قید میں ہیں۔''

''یاد دلانے کا شکریہ۔ میں تو واقعی بھول گیا تھا۔''

''نوٹنکیاں چھوڑ و اور بقا کی سوچو۔'' وہ بولی۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کی آوازوں سے سمتوں کا اندازہ لگایا اور ایک دوسرے کے قریب ہونے کے لیے گھسٹنے لگے۔

اس دوران کبھی پورے وجود کے ساتھ لڑھکنے کی بھی نوبت آئی مگر صرف ایک بار اور اسی میں ہی گویا قیامت آ گئی۔

میری لُڑھکنی پر رومی میرے نیچے تھی اور میں اس کے اُوپر...... میں کچھ بوکھلا گیا۔

''یہ تم آٹے کی بوری کی طرح کیا میرے اوپر لد گئے ہو۔ نیچے اُترو۔'' وہ جل کر بولی۔ میں نے لڑھکنی لگائی اور پھر بڑی مشکلوں سے ہم اپنے رسن بستہ جسموں کو ایک پوزیشن میں کرنے میں کامیاب ہوئے کہ تھوڑی سی کوشش سے ہم ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔

چونکہ ہمارے دونوں ہاتھ پشت کی سمت بندھے ہوئے تھے۔ اسی لیے ہم نے اپنی کمریں ایک دوسرے سے ملا دی تھیں۔ یوں ہمارے بندھے ہوئے ہاتھوں کی اُنگلیاں ایک دوسرے کی ڈوریوں کو چھونے لگیں اور یہی ہمارے لیے بہت تھا۔

ہم نے کوشش شروع کر دی۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی پہلے کسی کی ڈوری کھولنے میں کامیاب ہو جاتا، پھر بعد کا کام آسان تھا۔

ابھی یہ مہم جوئی جاری تھی کہ اچانک کچھ جھٹکے محسوس ہونے لگے۔ گھرگھر کرتی مخصوص آواز بھی جو پہلے ہموار تھی اب کم زیادہ ہونے لگی پھر اس کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ بھی بتدریج معدوم سی ہونے لگی۔ اس کے بعد ماحول کچھ ٹھہرا ٹھہرا سا محسوس ہونے لگا۔

''جلدی کرو، یہ لوگ کہیں لنگر انداز ہو چکے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''کر رہی ہوں، تم بھی جلدی کرو۔'' وہ بولی۔ میری اُنگلیوں نے تیزی سے حرکت شروع کر دی۔

کم بختوں نے بڑی مضبوطی سے ریشمی ڈوریوں سے ہمیں جکڑ رکھا تھا، ان کی گانٹھیں تو عام حالات میں بھی کھولنا محال تھا یہ تو پھر بھی ہم بندھے ہوئے تھے۔

سچی بات تھی کہ میں تو ناکام ہی رہا تھا۔ ایک گانٹھ تک نہیں کھول سکا تھا رومی کے ہاتھوں کی...... مگر رومی کی اُنگلیاں بڑی تیزی سے متحرک تھیں۔ جلد ہی اس نے میری کلائیوں کو ان منحوس ڈوریوں سے آزاد کر دیا۔

''او خدا......! تم ابھی تک ٹامک ٹوئیاں ہی مار رہے ہو اندھیرے میں......؟ جلدی سے میری رسیاں بھی کھولو۔'' رومی فکرمندی سے بولی۔

''یہ تمہاری تربیت کا حصہ ہے، میں کوئی تربیت یافتہ نہیں ہوں، اب کوشش کرتا ہوں، لیکن کیا خیال ہے میں پہلے اپنی ٹانگوں کی ڈوریاں نہ کھول لوں؟'' میں نے اپنی ''نااہلی'' کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا۔

''خدا کے لیے جو کرنا ہے جلدی کر لو، لانچ رک گئی ہے اور وہ یہاں پہنچنے والے ہوں گے۔'' رومی جھلا کے بولی۔

اسی وقت بھاری قدموں کی آوازیں اُبھرنے لگیں۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

''جلدی کرو۔'' رومی کے لہجے میں تشویش تھی اور آواز ہراساں۔

میں نے تاریکی میں ہی اپنی ٹانگوں کی ڈوریاں ٹٹولیں اور جلدی جلدی انہیں کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

میرے چونکہ اب دونوں ہاتھ آزاد تھے اسی لیے میں نے فوراً ہی یہ کام نمٹایا تھا۔ اس کے بعد میں نے رومی کے ہاتھوں کی ڈوریاں کھولیں اور جب اس کی ٹانگوں کی سمت جھکنے لگا تو اس نے مجھ سے کہا۔

''یہ کام میں نمٹا لوں گی، تم جلدی سے سوئچ بٹن تلاش کرو اور روشنی کرو۔''

میں نے ایسا ہی کیا اور نابیناؤں کی طرح اپنے دونوں بازوؤں کو پھیلا کر پہلے تو کسی دیوار کو چھونے کی کوشش کرنے لگا، مگر اسی وقت چٹ کی آواز اُبھری اور روشنی ہو گئی۔

وہ ایک چھوٹا کیبن ہی تھا جس کی مشرقی دیوار میں ایک گول پورٹ ہول نظر آ رہا تھا۔ سامنے دو مسٹنڈے ملاح نما آدمی کھڑے تھے۔ ایک تو میرے دونوں بازوؤں کے تقریباً نرغے ہی میں تھا اور اسے اتنا قریب دیکھتے ہی جانے کہاں سے میرے اندر پھرتی آ گئی اور میں نے ایک ہاتھ کا مکا بنا کر اس کے جبڑے پر رسید کر دیا۔ وہ کئی قدم پیچھے کو لڑکھڑا گیا، اور اپنے ساتھی سے جا ٹکرایا۔

سردست تو یہ دونوں ہی غیر مسلح نظر آ رہے تھے، وجہ یہی رہی ہوگی کہ ان کے گمان میں بھی نہ ہوگا کہ ہم خود کو رسیوں سے آزاد کرا چکے ہیں۔ اسی لیے دونوں مار کھا گئے تھے، خواہ عارضی طور پر سہی، لیکن اب میں مزید کیا کرتا اس کی مجھ میں ہمت ذرا کم ہی پڑ رہی تھی۔ ایک تو میں کوئی فائٹر نہیں تھا دوسرے وہ دونوں کسرتی جسم کے مالک تھے۔

جانے انجانے میں مجھ سے مار تو کھا لی مگر اب سنبھلنے

میں بھی انہوں نے دیر نہیں لگائی تھی اور نہ ہی مجھ میں اتنی ہمت تھی کہ میں انہیں سنبھلنے کا موقع دیے بغیر دوبارہ ان پر پل پڑتا۔

ادھر رومی، جس کے ہاتھوں کے جکڑ بند میں کھول چکا تھا، ہاتھ آزاد ہوتے ہی اس نے بھی اپنی ٹانگوں کو ڈوریوں سے آزاد کرانے میں دیر نہ لگائی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ جب ان دونوں مسٹنڈوں نے سنبھلتے ہی غرا کے میری طرف دوڑ لگائی تو میں کئی قدم پیچھے کو ہٹ کر جھکائی دے گیا، وہ اپنی جھونک میں آگے بڑھ گئے لیکن نہیں، راہ ان کی رومی نے اس طرح کھوٹی کی کہ اپنی ٹانگ چلا دی، جو ایک کے نازک حصے پر بڑے زور کی پڑی۔

اس کے حلق سے 'اوغ' کی ڈکراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی، اور وہ نیچے بیٹھ کر کراہنے لگا۔ اس موقع کو غنیمت جان کر میں نے اس کے دوسرے ساتھی کی خبر لینا چاہی جو کیبن کی پورٹ ہول والی دیوار سے ٹکرا کر فائر بال کی طرح واپس پلٹا اور میری جانب لپکا۔ مجھ میں بھی نجانے کہاں سے اتنی دلیری آگئی کہ میں اس کے آگے سینہ سپر ہو گیا۔

اس نے قریب آتے ہی مجھے ایک زوردار ٹھوکر رسید کی تو مجھے یوں لگا جیسے میں کششِ ثقل کھو بیٹھا ہوں اور اگلا لمحہ مجھے خلا میں بھٹکتا محسوس ہوا۔ ہوش تب آیا جب میں دروازے والی دیوار سے ٹکرا کر دھڑام سے فرش پر آرہا۔ ابھی میں سنبھل ہی رہا تھا کہ پہلے والا ملاح نما بدمعاش جو چوٹ کھانے کے بعد سنبھل چکا تھا، مجھ پر پلنے کے لیے پر تولنے لگا، لیکن ابھی شاید اس کے پَر پوری طرح نہیں کھلے تھے کہ رومی نے اس پر چھلانگ لگا دی۔

میرا خیال تھا کہ وہ اسے لیتے ہوئے فرش پر گرے گی تو میں بھی اس کی مدد میں جھپٹ پڑوں گا، مگر اگلا لمحہ میرے لیے حیران کن اور رومی کے لیے یقیناً کڑا ثابت ہوا۔

کیونکہ اس تنومند ملاح نے اپنی موٹے موٹے پایوں جیسی ٹانگوں کے ساتھ کھڑے کھڑے رومی کے نرم و نازک جسم کو اپنے دونوں ہاتھوں میں گویا 'کیچ' کر لیا اور باچھیں پھیلا دیں، جیسے کوئی پکا ہوا پھل اس کی گود میں آن گرا ہو۔

مجھے ڈر لگا کہیں یہ رومی کو فرش یا کسی دیوار پر نہ دے مارے...... اسی لیے میں اس کی اگلی حرکت کے انتظار میں ہی رہ گیا۔ عقدہ تو تب کھلا جب میں نے اس کی باچھوں کو غیر معمولی طور پر پھیلتے اور پھر بدستور رومی کو اپنے بازوؤں میں دبوچ کر خود سے لپٹاتے دیکھا۔

اب پتا نہیں وہ کم بخت رومی کو خود پر چھلانگ لگانے کی سزا دے رہا تھا یا پھر اپنی بوالہوسی کی تسکین چاہتا تھا کہ مجھے رومی کی مدد کے لیے اس مردود پر جھپٹنا ہی پڑا، مگر شاید اسے اس بات کی تسلی تھی کہ میں اس تک نہیں پہنچ پاؤں گا، کیونکہ اس نے کوئی حرکت نہ کی تھی حتیٰ کہ میری طرف دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی، کیونکہ اسی لمحے اس کا دوسرا ساتھی میرا راستہ روکے آن کھڑا ہوا اور میں اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تاہم اس کے مکے کے نشانے تک پہنچ ہی گیا۔

اس نتیجے میں اس نے بڑے سکون کے ساتھ اپنے ایک ہاتھ کا گھونسا میرے جبڑے پر رسید کر دیا۔ مجھے گرد و جوار کا ماحول جبڑے سمیت تڑختا محسوس ہوا اور کیبن کی دیواریں متحرک نظر آنے لگیں پھر ایک کے چار دکھائی دینے لگے۔

میں شاید مکا لگنے سے وہیں کھڑے کھڑے جھولنے لگا تھا۔ میرے مدِ مقابل نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے یوں ہولے سے دھکا دیا جیسے میں کوئی اسٹیچو ہوں۔ گرا بھی میں اسی انداز میں تھا فرش پر۔

ابھی میں اپنے اوسان بحال کرنے کی تگ و دو میں ہی تھا کہ مجھے اپنی ڈوبتی ڈوبتی ساعتوں میں چرچراہٹ کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی رومی کی کراہ سے مشابہ چیخ بھی...... میں نے فرش پر لیٹے لیٹے گردن گھما کر اس متوقع اور سنگین منظر کو ملاحظہ کرنے کی کوشش چاہی تھی کہ مجھے اسٹیچو کی طرح دھکا دینے والا بدمعاش ایک بار پھر غراتا ہوا میری جانب لپکا اور مجھے دبوچنے کے لیے مجھ پر آرہا کہ میں نے بھی بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ پہلو بدلا، بلکہ میں نے ایک پنتھ دو کاج کیے تھے۔ ایک جانب میں اس کے حملے سے بچا اور دوسرے میں نے اسی جانب ہی لڑھکنی لگائی تھی جہاں اس کا بوالہوس ساتھی رومی کو دبوچے اس کی شرٹ پھاڑ کر اسے برہنہ کرنے کی قبیح کوشش میں تھا کہ اس بدبخت کی ٹانگوں ....کے قریب پہنچتے ہی میں نے دو تو نہیں البتہ ایک ہی ٹانگ پر دونوں ہاتھ جما کر اسے زور سے جھٹکا دیا۔ اس کے لیے بلاشبہ میں نے لیٹے لیٹے جس طرح اپنے پورے بدن کی طاقت لگائی تھی وہ میں ہی جانتا تھا، نتیجتاً وہ رومی سمیت ہی نیچے آرہا۔ شکر تھا کہ میں بروقت پرے ہٹ گیا تھا، تاہم لگے ہاتھوں جیسے مجھے موقع ملا میں نے اس سے فائدہ اُٹھایا، چونکہ وہ میرے قریب ہی گرا تھا اسی لیے میں نے اپنے دائیں ہاتھ کا ایک مکا جما کے اس کی ناک پر جڑ دیا۔ اس کے حلق سے بیل جیسی ڈکراہٹ اُبھری تھی اور ناک سے.... ... بھل بھل خون جاری ہو گیا۔

میں نے اُٹھنے میں پھرتی سے کام لیا اور اُچھل کر زور

سے اس کے پیٹ پر لات رسید کی، غالباً یہ بھی زوردار ہی ثابت ہوئی، یوں اس کی دوسری ڈکراہٹ سننے کے بجائے میں نے اناڑی پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوبارہ اُچھل کر اس کے پیٹ پر طبع آزمائی کرنی چاہی تھی کہ وہ ایک طرف کو ہوگیا۔ میری وہ ٹانگ فرش پر لگی اور کمر کی ہڈی پر زور پڑا۔ میں نے اس کی پروانہ کی، ادھر مجھے پہلے والے بدمعاش کی کریہہ انگیز چیخ سنائی دی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو رومی نجانے کون سا اس پر داؤ آزمانے کے بعد اسے ڈھیر بلکہ اٹاغفیل کر چکی تھی۔

دوسرا بدمعاش غراتا ہوا اپنا خون آلود چہرہ لیے اُٹھا تو رومی نے ایک فلائنگ کک رسید کر کے اسے دیوار سے ٹکرا جانے پر مجبور کر دیا، یہی نہیں آگے بڑھ کر اس نے اس کی گردن کی کوئی رگِ حساس مسل ڈالی۔ وہ بھی وہیں بے حس و حرکت ہوگیا۔

''خس کم جہاں پاک......'' میں نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے ہولے سے کہا۔ رومی اپنی سانسیں درست کرنے لگی۔ پھر بولی۔

''نکل چلو، ابھی آگے امتحان اور بھی ہیں۔'' کہتے ہوئے اس نے دروازے کی جانب قدم بڑھائے تو میں نے آواز دے کر اسے روکا۔ وہ رک کر میری جانب پلٹی۔ میں اس کی نصف سے زیادہ پھٹی ہوئی شرٹ کو گھور رہا تھا۔

''بےشرم......'' اس نے سرخ چہرے کے ساتھ مجھے ڈپٹا۔

''اس کا خیال تمہیں کرنا چاہیے، توجہ دلانے کا مطلب یہ نہیں کہ میں بے شرم ہوگیا ہوں۔ تم تو ایسے ہی سر جھاڑ منہ پھاڑ نکلی جارہی ہو باہر......'' میں نے تلخی سے کہا۔

''اوہ سوری......!'' وہ ندامت سے بولی۔

''اب چلو اور ان لدڑوں میں سے کسی ایک کی شرٹ اُتار کر پہن لو۔ ورنہ...... باہر پھر کوئی ٹکرا گیا تو اسے مجھ سے زیادہ تمہاری فکر ہوجائے گی۔'' میں نے طنزیہ کہا۔

وہ ہونٹ بھینچ کر ان دونوں بے ہوش ملاحوں کو دیکھنے لگی اور پھر جس نے اس کی شرٹ کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا اسی کی شرٹ اُتار کر پہن لی۔

''اب ٹھیک ہے، چلو......'' میں نے سنجیدگی سے کہا، وہ اب میری جانب دلرُبا انداز میں دیکھ کر مسکرائی۔

ہم محتاط روی کے ساتھ دروازے کی جانب بڑھے اور باہر قدم رکھنے سے پہلے جھانک کر دیکھا، سامنے ڈیڑھ آدم گز راہداری تھی۔ کہیں سے سپیدی کی روشنی جھکتی نظر آرہی تھی۔ شاید صبح صادق کا ادھورا منظر تھا۔ ہم باہر آگئے اور دروازہ بند کر دیا۔ دائیں بائیں دو مزید کیبنوں کے دروازے نظر آئے جو بند تھے۔ یہ لانچ کا کوئی نچلا حصہ تھا، جس کے در و دیواروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ لانچ جدید اور لگژری قسم کی ہے۔ کچھ ٹائر بھی اس کی دیواروں سے ٹنگے نظر آرہے تھے۔

ہم دونوں آگے بڑھتے رہے اور چند قدموں کے بعد دائیں جانب مڑے تو ایک ریلنگ والا زینہ اُوپر غالباً عرشے پر جاتا دکھائی دیا۔

جب ہم زینے پر قدم رکھے اوپر چڑھنے لگے تو مقدور بھر آسمان نظر آنے لگا۔ سفید بادلوں کی ٹکڑیاں اور مرطوب سی ہوا سبک خرام تھی۔ سمندر کے پانیوں کا مخصوص ردھم ہماری سماعتوں سے ٹکراتا بھلا محسوس ہو رہا تھا۔

ہم ریلنگ کے سرے پر پہنچ کر جھک گئے اور اسی انداز میں سامنے دیکھنے کی کوشش چاہی تو سامنے کھلا عرشہ تھا اور شیشے کی چند ایک کھڑکیاں بھی نظر آئیں، جو لانچ کی فرنٹ اور سائڈ اسکرین کے ساتھ ساتھ بنی ہوئی تھیں۔ وہاں مجھے چند کرسیاں پڑی نظر آئیں۔

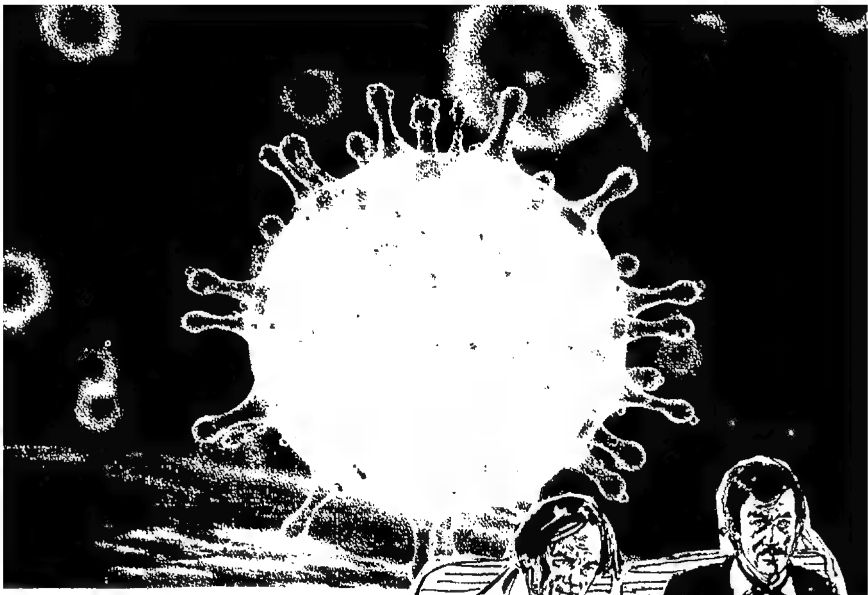
اب ہماری نظروں کے سامنے لانچ کا رقبہ کافی حد تک عیاں تھا۔ یہ ایک درمیانے درجے کی لانچ تھی۔ اوپر ایک ہی کیبن تھا جو بڑا تھا اور اسی میں ہی ''وہیل روم'' تھا۔

ہمیں ابھی تک کوئی ذی نفس نظر نہیں آیا۔ ممکن ہے کوئی اندر ہو۔ اس کے لیے ہم عرشے پر آگئے اور اسی طرح جھکے جھکے انداز میں رینگتے ہوئے کیبن کی دیوار کے ساتھ جا لگے۔

ہمیں ہر سو ایک عجیب سی خاموشی اور سناٹے کا احساس ہوا تھا۔ یہاں شیشے کی ایک کھڑکی تھی۔ میں نے سر اُبھار کر اندر جھانکا۔ شیشے پر دھندلاہٹ تھی اور اندر کا منظر واضح نہیں تھا۔ رومی اس پر اپنے منہ سے پھونکیں مارنے لگی اور پھر اپنی لمبی شرٹ کے ایک گوشے سے شیشہ صاف کیا۔ اگلے ہی لمحے منظر واضح ہوتے ہی ہم دونوں ہی بیک وقت دہشت زدہ ہو کے بلکہ چیخ مار کر پیچھے کو اُلٹ گئے۔

ایک عجیب سے گول سر والی شے اندر سے شیشے کے ساتھ آن چپکی تھی۔ یوں جیسے شیشہ توڑ کر ہمیں ہڑپ کر جائے گی۔

ان دیکھے دشمنی کے جال میں جکڑے نوجوان کی مزید مشکلات آئندہ ماہ پڑھیں



وائرس

شاکر لطیف

کامیابی کا نشہ... بڑا سُرور انگیز ہوتا ہے... ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی زندگی میں کامیابیاں ہاتھ باندھے کھڑی ہوں... اور لوگ مرنے کے بعد بھی اس کے کارنامے کی وجہ سے اسے جیتا جاگتا سمجھیں... طب کے شعبے سے جڑے دو دوست ڈاکٹر کی کتھا... ایک سائنسی تحقیق نے ان دونوں کی دوستی میں دراڑ ڈال دی تھی...

موجودہ حالات و واقعات کا احاطہ کرتی ایک پُراثر تحریر......

ڈاکٹر ایڈیسن اس وقت اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا کہ اس کا ذاتی ملازم ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔

''سر، ڈاکٹر مورس آئے ہیں۔'' ملازم نے مؤدبانہ لہجے میں بتایا۔

''ارے تمہیں کتنی بار کہا ہے اسے باہر مت روکا کرو جاؤ، اسے فوراً اندر بھیج دو۔'' ڈاکٹر ایڈیسن نے سخت لہجے میں کہا تو ملازم اثبات میں سر ہلاتے ہوئے واپس مڑ گیا۔

چند ثانیوں بعد ہی ڈاکٹر مورس اندر داخل ہوا۔ اس

کے ہاتھ میں ایک فائل بھی موجود تھی۔ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی بے تکلفی سے ڈاکٹر ایڈیسن کے سامنے موجود صوفے پر براجمان ہوگیا۔
''ارے تم آگئے، میرا تو خیال تھا کہ ہمیشہ کی طرح فون پر آنے کا کہہ کر پھر مکر جاؤ گے۔'' ڈاکٹر ایڈیسن نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''مکرنے والی بات درست نہیں ہے بس بسا اوقات کام کی زیادتی کی وجہ سے میں نہیں آپاتا ورنہ تم سے ملاقات کے بعد تو میرا ذہن بھی فریش ہو جاتا ہے۔'' ڈاکٹر موریس نے بے تکلفانہ لہجے میں کہا۔'' دراصل آج کل میں بہت مصروف ہوں ایک نئی ریسرچ پر کام رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں کامیابی کے بہت قریب پہنچ چکا ہوں' میری اس نئی اور انوکھی رسرچ کی بدولت جلد ہی طبّ کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہونے والا ہے۔''
''اچھا یہ کون سی انوکھی ریسرچ ہے ذرا مجھے بھی تو پتا چلے۔'' ڈاکٹر ایڈیسن نے استفسار کیا۔ ڈاکٹر موریس کی بات سن کر اس کے چہرے پر تجسس کے تاثرات ابھر آئے تھے کیونکہ وہ خود بھی ایک سائنس داں تھا اس لیے کسی بھی نئی ریسرچ میں دلچسپی لینا فطری بات تھی۔
''یہ واقعی ایک انوکھی ریسرچ ہے۔'' موریس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔''میں ایسی تھیوری پر کام کر رہا ہوں جس کے مکمل ہوتے ہی طبّ کی دنیا میں انقلاب آجائے گا۔''
''انقلاب بعد میں لے آنا میرے دوست' پہلے یہ تو بتاؤ کہ تمہاری نئی ریسرچ کس بارے میں ہے؟'' ایڈیسن نے پُر تجسس لہجے میں پوچھا۔
''تو پھر سنو' میں ایک ایسے وائرس پر ریسرچ کر رہا ہوں، جو بظاہر تو زکام کا عام سا وائرس ہے اگر اس میں کچھ جینیاتی تبدیلیاں کر دی جائیں تو وہ انسان کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوسکتا ہے مثلاً جینیاتی تبدیلی ہوتے ہی یہ وائرس پہلے سے بہت زیادہ طاقتور ہوجائے گا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوگی کہ انسان کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا مگر جسم اور خون میں موجود دیگر خطرناک جراثیموں کا خاتمہ کر دے گا یوں سمجھ لو کہ میں ایسی ریسرچ کر رہا ہوں جس میں زکام کے ایک عام وائرس کو کسی خطرناک مرض میں مبتلا جسم میں منتقل کیا جائے گا اور یہ زکام کا عام وائرس اس انسان کے جسم پر موجود کسی بھی خطرناک وائرس کے خلاف ایک اینٹی بائیوٹک کا کام کرے گا جس کی وجہ سے موت کے منہ میں جاتا ہوا انسان زندگی کی طرف لوٹ آئے گا تم خود سوچو کہ اگر میری یہ ریسرچ کامیاب رہی تو طبّ کی دنیا میں کتنا بڑا انقلاب آجائے گا اور میرا نام رہتی دنیا تک مثال بن جائے گا۔'' ڈاکٹر موریس نے جواب دیا تو ڈاکٹر ایڈیسن کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھر آئے جیسے اسے ڈاکٹر موریس کی ذہنی صحت پر شبہ ہو رہا ہو۔ اس کے چہرے پر موجود تجسس کے تاثرات بھی یکلخت غائب ہو گئے۔
''یہ کس قسم کی ریسرچ ہے، کیا کسی وائرس کو بھی کسی دوسرے وائرس کے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے؟ میرا نہیں خیال کہ تمہاری ریسرچ نتیجہ خیز ثابت ہوگی بلکہ میرا خیال ہے کہ تم ایک فضول قسم کی ریسرچ پر اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔ اس قسم کے آئیڈیاز پر پہلے کام ہو چکا ہے۔ بہت سے ریسرچرز اپنا وقت برباد کرتے رہے ہیں مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔'' ایڈیسن نے منہ بناتے ہوئے کہا حقیقت یہی تھی کہ اسے ڈاکٹر موریس کی یہ تھیوری ہی مضحکہ خیز لگی تھی کہ کسی وائرس کو ختم کرنے کے لیے کسی دوسرے وائرس کا سہارا لیا جائے۔ حالانکہ میڈیکل کی زبان میں وائرس کہا ہی اسے جاتا تھا جو انسانی جسم کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے جبکہ اس کا دوست ایک ایسے وائرس کی بات کر رہا تھا جو انسانی جسم کے لیے فائدہ مند ثابت ہوسکتا تھا، یہ بالکل.... عجیب و غریب تھیوری تھی جو ڈاکٹر ایڈیسن کو ہضم نہیں ہوسکی تھی تاہم وہ یہ بات بھی جانتا تھا کہ یہ بات ڈاکٹر موریس نے کی ہے جو کوئی عام سا ڈاکٹر نہیں بلکہ وہ جراثیموں پر ریسرچ کرنے والے سائنس دانوں میں ایک منفرد مقام رکھتا تھا اس کے نام پر کئی دوائیں بھی رجسٹرڈ تھیں۔
وہ شعبۂ طبّ میں ملک کے کئی اہم اداروں میں کام کر چکا تھا۔ اس نے ڈاکٹر ایڈیسن کے ساتھ بھی طویل عرصہ تک کام کیا تھا تاہم اب وہ دونوں سرکاری عہدوں سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ وہ دونوں بہت پرانے دوست تھے اور ان کی یہ دوستی آج تک برقرار تھی۔ ڈاکٹر ایڈیسن نے شادی نہیں کی تھی جبکہ موریس کے دونوں بیٹے دوسرے شہر میں مقیم تھے۔ موریس کی بیوی بھی پچھلے سال وفات پا چکی تھی جس کے بعد وہ تنہا زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے بیٹے شادی شدہ تھے۔ مہینے میں ایک بار اپنے بچوں کو لے کر اس سے ملنے کے لیے ضرور آتے تھے۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ موریس بھی ان کے ساتھ دوسرے شہر چلا جائے مگر موریس نے جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس نے اپنے گھر میں ایک چھوٹی سی لیبارٹری قائم کر رکھی تھی جہاں وہ اپنی ریسرچ وغیرہ

میں مصروف رہتا تھا اس لیے کسی دوسری جگہ منتقل ہونا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ ان دنوں وہ وائرس پر ریسرچ کر رہا تھا اور اب اپنی ریسرچ کے بارے اپنے پرانے دوست ڈاکٹر ایڈیسن کو آگاہ کرنے کے لیے آیا تھا تاہم ڈاکٹر ایڈیسن نے اس کی اس ریسرچ کو نا قابلِ عمل قرار دیا تھا۔

''میں جانتا تھا کہ تمہارا پہلا ردِعمل یہی ہوگا۔'' ڈاکٹر مورس مسکراتے ہوئے بولا۔ ''مگر تمہاری یہ بات بالکل غلط ہے کہ پہلے اس تھیوری پر کام نہیں ہوا اگر تم غور کرو تو کئی بیماریوں کے وائرس کے خلاف اسی بیماری کے وائرس کو استعمال کیا جاتا ہے۔ تم پولیو کی بیماری کی ویکسین کو ہی دیکھ لو، اس میں بچوں کو جو قطرے پلائے جاتے ہیں اس میں پولیو کا ہی کمزور وائرس ہوتا ہے جسے بچوں کا قوتِ مدافعت کا نظام آسانی سے شکست دے لیتا ہے اور جب پولیو کا طاقتور وائرس ان کے جسم پر حملہ کرتا ہے تو وہی مدافعتی نظام کمزور جراثیم کو شکست دیتا ہے کیونکہ وہ اس وائرس سے آگاہ ہو چکا ہوتا ہے اس لیے طاقتور وائرس کو بھی شکست دینے میں کامیاب رہتا ہے۔''

''وہ بالکل ایک الگ بات ہے۔'' ایڈیسن نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس میں ایک ہی قبیل یا ایک ہی نسل کے وائرس کی مدد سے قوتِ مدافعت کے نظام کو فعال کیا جاتا ہے مگر تمہاری تھیوری بالکل الگ نوعیت کی ہے۔ تم ایک عام وائرس میں ایسی جینیاتی تبدیلی کرنا چاہتے ہو جس سے وہ کسی خطرناک وائرس کو ہلاک کرنے کے قابل ہو سکے۔ میں اسے ناممکن تو نہیں کہوں گا کیونکہ سائنس کی دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے مگر یہ ضرور کہوں گا کہ فی الحال میرا ذہن اس آئیڈیے کو تسلیم نہیں کر پا رہا۔ بادی النظر میں دیکھا جائے تو مجھے یہ کسی صورت بھی ممکن نظر نہیں آ رہا۔''

''کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے یہ فائل پڑھ لو۔ اس میں وائرس میں ہونے والی جینیاتی تبدیلی کی تمام تفصیلات درج ہیں اور مجھے یقین ہے جیسے ہی تم اس تفصیل کو پڑھو گے، تم بھی میری ریسرچ کے قائل ہو جاؤ گے۔ میں نے اپنی اس ریسرچ کو ابھی تک صیغۂ راز میں رکھا ہے کسی سے ذکر تک نہیں کیا، صرف تمہیں بتایا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے مورس نے اپنے ہاتھوں میں موجود... فائل ڈاکٹر ایڈیسن کی جانب بڑھا دی جو وہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔

ایڈیسن نے اس بار مورس کو کوئی جواب دینے کے بجائے پہلے فائل پڑھ لینا مناسب سمجھا۔ اس نے فائل کھولی اور پھر اس کے مطالعے میں منہمک ہو گیا۔

ڈاکٹر مورس کی ریسرچ سائنس کی مخصوص کوڈنگ میں تھی، ایڈیسن کی جگہ کوئی عام آدمی ہوتا تو شاید وہ اسے پڑھ ہی نہ پاتا تاہم وہ خود بھی ایک سائنس داں تھا اس لیے اسے فائل کی سائنسی اصطلاحات پڑھنے میں کسی خاص دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

جیسے جیسے وہ فائل پڑھتا گیا، اُس کے چہرے پر سنجیدگی کی دبیز تہ چڑھتی چلی گئی۔ مورس نے بھی اس کے فائل پڑھنے کے دوران اس سے گفتگو کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک بار ایڈیسن اس کے فارمولے کو مکمل طور پر سمجھ لے، پھر اس سے زیادہ بہتر طریقے سے بات ہو سکے گی۔ اسے ایڈیسن کو کچھ سمجھانے کی بھی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ بہر حال اس سے بڑا سائنس داں مانا جاتا تھا۔

ڈاکٹر ایڈیسن کافی دیر تک سنجیدگی سے فائل کا مطالعہ کرتا رہا اور پھر اس نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے فائل ایک جانب رکھ دی۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اس قدر ذہین آدمی ہو۔'' ایڈیسن نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''تمہارا فارمولا اور تھیوری واقعی قابلِ عمل ہے۔ اس طرح کی جینیاتی تبدیلی سے واقعی ایک وائرس کو دوسرے وائرس کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے اگر یہ فارمولا کامیاب ہو گیا اور اس نے درست طریقے سے کام کیا تو طب کی دنیا میں واقعی ایک انقلاب آ جائے گا اور یقیناً تمہارا نام بھی ہمیشہ کے لیے امر ہو جائے گا۔ تم نے ایک ایسا فارمولا پیش کیا ہے جو آج سے پہلے کسی نے نہیں کیا اگر میں یہ فائل نہ پڑھتا تو شاید کبھی اس تھیوری پر یقین نہ کرتا کہ زکام کے ایک عام وائرس میں جینیاتی تبدیلی کر کے اسے کسی دوسرے اور خطرناک وائرس کے خلاف بھی استعمال جا سکتا ہے مگر اس فائل میں اتنے ٹھوس سائنسی نکات ہیں جنہیں میں تو کیا کوئی بھی سائنس داں رد نہیں کر سکے گا۔''

''ارے تم نے اتنی جلدی رائے بھی تبدیل کر لی۔'' مورس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اسی کو تو سائنس کہتے ہیں۔'' ایڈیسن نے جواب دیتے ہوئے کہا تو اس بار مورس کا قہقہہ پہلے سے بھی بلند تھا۔

''بہت خوب تمہاری حسِ مزاح آج بھی ویسی ہی ہے جیسی جوانی میں تھی۔'' مورس نے بدستور ہنستے ہوئے کہا۔

''میں مذاق نہیں کر رہا، میں واقعی تمہاری ریسرچ پڑھ کر چکرا کر رہ گیا ہوں۔ میرے خیال میں یہ اس صدی کی سب سے بڑی دریافت ثابت ہو سکتی ہے۔'' ایڈیسن نے جواب

دیا۔ ''بہرحال میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتاؤ۔''

''میں اسی سلسلے میں تو تمہارے پاس آیا ہوں۔'' مورس نے بھی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب، میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔'' ایڈیسن نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''بھئی اس فارمولے کو حکومتی سطح پر پذیرائی دلانے کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے سیدھی سی بات ہے۔'' ڈاکٹر مورس نے کہا۔

''مگر اس میں میری مدد کیا ضرورت تم خود بھی ایک سائنس داں ہو اور اعلیٰ عہدوں پر کام کر چکے ہو۔'' ایڈیسن نے حیرانی سے کہا۔

''تمہاری بات اس حد تک تو درست ہے کہ میرے حکومت کے اعلیٰ عہدے داروں سے تعلقات ہیں مگر اس فارمولے کی منظوری کی درخواست تمہارے ذریعے جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کیونکہ تم ہمارے ادارے کے سربراہ رہ چکے ہو، دوسرا یہ کہ اس وقت میڈیکل اتھارٹی ہی وہ واحد ادارہ ہے جس نے اس تجربے کو حکومتی سطح پر آگے بڑھانے کی باقاعدہ اجازت دینی ہے اور تم میڈیکل بورڈ کے سربراہ بوتھم سے تو واقف ہی ہو۔''

''اوہ تو اصل مسئلہ ڈاکٹر بوتھم ہے۔'' ایڈیسن نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ بوتھم بھی کسی دور میں ان کے ساتھ کام کرتا رہا تھا۔ اس کا شمار بھی ملک کے مانے ہوئے طبی ماہرین میں ہوتا تھا۔ ایڈیسن جانتا تھا کہ دورانِ ملازمت بوتھم اور مورس کے درمیان کبھی نہیں بنی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو سخت ناپسند کرتے تھے دونوں کی کئی بار تلخ کلامی بھی ہوئی تھی۔ بہرحال یہ پرانا قصہ تھا اور نیا قصہ یہ تھا کہ اب بوتھم اس حکومتی میڈیکل بورڈ کا سربراہ تھا جو کسی بھی دوا یا تھیوری کے عملی تجربے کی حکومتی سطح پر منظوری دیتا تھا، اس لحاظ سے دیکھا جاتا تو مورس واقعی اس کے پاس آنے پر مجبور تھا۔ کیونکہ بوتھم اس کی وائرس کی تحقیق کو رسکی اور خطرناک قرار دے کر اس پر پابندی عائد کروا سکتا تھا۔

ڈاکٹر ایڈیسن کو اب ڈاکٹر مورس کے اپنے پاس آنے اور اپنی ریسرچ سے آگاہ کرنے کی اصل وجہ بھی سمجھ آگئی تھی، ورنہ وہ مورس کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی کہ... وہ اپنی کسی بھی ریسرچ کو ہمیشہ خفیہ رکھنے کا عادی تھا، بوتھم کی وجہ سے اسے مجبوراً اس کے پاس آنا پڑا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ایڈیسن کے بوتھم سے بہت اچھے تعلقات ہیں، وہ اس کی بات کو رد نہیں کر سکے گا اور پھر مورس کا کام تو پوری انسانیت کی بھلائی اور فلاح کے لیے تھا، بوتھم اسے کیسے روک سکتا تھا۔

ایڈیسن اس کی ساری ریسرچ پڑھ چکا تھا اور اسے خود بھی یہ فارمولا قابلِ عمل لگ رہا تھا تاہم اس پر عمل درآمد کسی جدید لیبارٹری میں ہی ممکن تھا، کیونکہ یہ بہت حساس کام تھا، کسی غلطی کی وجہ سے اگر کوئی خطرناک وائرس باہر پھیل جاتا تو ہزاروں انسانوں کی زندگیوں کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔

''تم کھل کر بتاؤ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں، بوتھم کی تم فکر مت کرو اسے میں سنبھال لوں گا اور پھر تمہاری یہ ریسرچ ایسی ہے کہ ایک دفعہ حکومت کے طبی ماہرین کو اس کی پوری طرح سمجھ آگئی تو پھر بوتھم تو کیا ملک کا وزیراعظم بھی اس پر عملی تجربات کے لیے کسی جدید لیبارٹری کو تمہیں فراہم کرنے سے نہیں روک سکے گا، بوتھم کے علاوہ بھی میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں تو بتاؤ۔'' ایڈیسن تفہیمی لہجے میں بولا۔

''نہیں بس یہی ایک اہم معاملہ درپیش تھا۔''

''ٹھیک ہے تم مجھے کل تک کا وقت دو، میں اس سلسلے میں بوتھم سے بھی بات کرتا ہوں۔ میں اُسے قائل کرتا ہوں کہ وہ اس سلسلے میں اعلیٰ حکومتی عہدے داروں سے بات کرے۔ تم دونوں کی ذاتی پرخاش اپنی جگہ مگر یہ معاملہ انسانیت کی خدمت کا ہے۔''

کھانا کھانے کے بعد مورس گھر واپس چلا گیا۔ اس نے اپنی ریسرچ فائل ایڈیسن کے پاس ہی رہنے دی تھی۔ ایڈیسن نے بھی اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کل شام تک اسے کوئی نہ کوئی نتیجہ خیز بات بتا دے گا۔

مورس کے جانے کے بعد ایڈیسن دوبارہ ڈرائنگ روم میں آکر فائل کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے مزید دو بار اس فائل کو پڑھا اور پھر اطمینان کی ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے فائل بند کر کے ٹیبل پر رکھ دی۔ اب اسے یقین آگیا تھا کہ مورس کی تھیوری سو فیصد قابلِ عمل ہے اور اس کا یہ فارمولا طب کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دے گا۔ مورس کا نام پوری دنیا میں روشن ہونے والا تھا، اور یہی بات ایڈیسن کو بُری طرح ڈسٹرب کر رہی تھی۔ اسے مورس سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں تھی مگر اس کی ایجاد ایسی انقلابی تھی کہ ڈاکٹر ایڈیسن اسے اپنے نام سے منسوب کرنے کے بارے سوچ رہا تھا اسی لیے اس نے دانستہ ڈاکٹر مورس کو فائل اپنے پاس چھوڑنے کا کہا تھا مورس بھی اس پر بہت اعتبار کرتا تھا اس لیے فائل اس کے پاس چھوڑنے پر

رضامند ہو گیا تھا۔

ایڈیسن کی ہمیشہ سے خواہش تھی کی طب کی دنیا میں اس کا ایک الگ مقام ہو اگرچہ وہ اب بھی ملک کے چوٹی کے طبّی ماہرین میں شمار ہوتا تھا مگر مورس کا فارمولا دیکھنے کے بعد اسے اس حقیقت کا بخوبی ادراک ہو گیا تھا کہ اگر وہ اس فارمولے کو مورس کے بجائے اپنے نام سے رجسٹر کروانے میں کامیاب ہو جائے تو طب کی دنیا میں اس کا نام پوری دنیا میں مشہور ہو جائے گا۔ وہ خود مر جائے گا مگر اس کا نام امر ہو جائے گا۔ یہ اس کی برسوں پرانی خواہش تھی جو ڈاکٹر مورس کا فارمولا دیکھنے کے بعد یک بہ یک بیدار ہو گئی تھی۔ کسی کو پتا نہیں تھا کہ فارمولا اس کے پاس ہے ماسوائے ڈاکٹر مورس کے اور اسے اگلے دن آنا تھا مگر شاید کل تک اس کے پاس مہلت نہیں تھی۔ ایڈیسن فیصلہ کر چکا تھا کہ اب وائرس کی یہ ریسرچ اس کے اپنے نام سے رجسٹرڈ ہو گی۔

وہ بہت امیر کبیر آدمی تھا۔ اس کے دو ذاتی اسپتال بھی تھے۔ دنیا اسے ایک شریف آدمی کے طور پر جانتی تھی اور یہ حقیقت بھی تھی کہ وہ کبھی کسی ایسے کام میں ملوث نہیں تھا جس پر کوئی قانونی قدغن لگتی ہو تاہم اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ کسی جرائم پیشہ آدمی کو جانتا ہی نہیں تھا۔ اس کی دوستی بعض ایسے افراد سے بھی تھی جو ہر قسم کے جرائم میں ملوث رہتے تھے تاہم اپنی طاقت اور اثر رسوخ کی بنا پر معاشرے کے ایک شریف شہری کے طور پر جانے جاتے تھے۔ انہی ناموں میں ایک نام لارڈ کلب کے مالک، جونی، کا بھی تھا جو بظاہر ایک کلب چلاتا تھا مگر ایڈیسن اس کی اصلیت سے بخوبی آگاہ تھا ویسے وہ اس کے کلب کا باقاعدہ ممبر بھی تھا اور ہر ویک اینڈ پر لارڈ کلب میں جوئے میں کئی ہزار ڈالر کی رقم ہار جاتا تھا۔

ایڈیسن کلب میں جُوا بس اپنے شوق کی خاطر کھیلتا تھا اسے نہ جیتنے کا شوق تھا نہ چند ہزار ڈالر ہارنے سے کوئی فرق پڑتا تھا۔ اس کے پاس اتنی دولت تھی کہ اس کی زندگی کی ہر خواہش پوری ہوئی تھی سوائے ایک خواہش کے اور وہ یہ کہ اس کا نام ہمیشہ کے لیے امر ہو جائے۔ وہ ایک مسیحا کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے اب اس خواہش کو پورا کرنے کا وقت بھی آ گیا تھا۔ ڈاکٹر مورس کی تھیوری پر قبضہ جمانے کے بعد یہ کام بھی آسانی سے ہو سکتا تھا اور دولت کی طاقت کا استعمال کر کے مورس کو بھی راستے سے ہٹایا جا سکتا تھا۔

اس نے سیل فون اٹھایا اور لارڈ کلب کے مالک جونی کا نمبر ڈائل کر دیا۔

''ہیلو'' چند ثانیوں بعد ہی جونی کی بھاری اور کرخت آواز سنائی دی۔

''میں ڈاکٹر ایڈیسن بول رہا ہوں۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''جی ڈاکٹر ایڈیسن، آپ کا نمبر میرے پاس سیو ہے مگر آج تک آپ نے میرے سیل فون پر کال نہیں کی، آج یہ انہونی کیسے ہو گئی؟''

''جونی مجھے تم سے ایک کام کروانا ہے۔ کام غیر قانونی ہے معاوضہ تمہاری مرضی کا ملے گا۔ میں جانتا ہوں کہ تم ہر قسم کے غیر قانونی کاموں میں ملوث رہتے ہو۔'' ایڈیسن نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''صرف آپ ہی نہیں، ڈاکٹر صاحب یہ بات تو اس شہر کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ میں ہر قسم کے غیر قانونی دھندوں میں ملوث رہتا ہوں مگر میری طاقت اور اثر رسوخ کی وجہ سے پولیس نے کبھی مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کی۔ پولیس والے بھی جانتے ہیں کہ جس نے جونی پر ہاتھ ڈالا، جونی اس کو اس کے پورے خاندان سمیت جہنم میں پہنچا دے گا۔'' جونی نے فخریہ لہجے میں کہا۔

''اسی لیے تو میں نے تم سے رابطہ کیا ہے۔'' ایڈیسن نے مسکراتے ہوئے کہا مگر کام ذرا خطرناک اور بڑا ہے۔''

''کیا کسی کا مرڈر کروانا ہے ڈاکٹر صاحب۔'' جونی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''جونی کے لیے کوئی کام بڑا نہیں ہوتا بس معاوضہ بڑا ملنا چاہیے۔''

''معاوضے کی فکر مت کرو، تمہیں تمہارے مطلب کا معاوضہ مل جائے گا، رہ گئی کام کی بات تو ہاں مجھے واقعی کسی کا مرڈر کروانا ہے اور وہ بھی آج رات کے اندر اندر میں چاہتا ہوں کہ وہ شخص صبح کا سورج نہ دیکھ سکے۔'' ڈاکٹر ایڈیسن نے سفاک لہجے میں کہا۔

''حیرت ہے ڈاکٹر ایڈیسن! میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ آپ جیسا شریف النفس انسان بھی کبھی مجھے کسی کا مرڈر کرنے کا کہے گا بہر حال کام آج رات کے اندر ہی ہوگا معاوضہ پچاس ہزار ڈالر ہوگا۔ آپ اس شخص کا نام بتا دیں۔ آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید میں اس طرح کھل کر بات نہیں کرتا مگر آپ کے بارے میں مجھے پورا یقین اور اعتماد ہے کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، پوری سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں۔'' جونی نے اس بار سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''تم اُسے جانتے ہو؟'' ڈاکٹر ایڈیسن نے جواب دیا۔ ''اس کا نام ڈاکٹر مورس ہے۔''

”ارے ڈاکٹر مورس تو آپ کا بہت پرانا دوست ہے‘ آپ کے ساتھ کئی بار میرے کلب بھی آچکا ہے، آپ اسے کیوں مروانے کے خواہش مند ہیں؟“ جونی نے متحیر لہجے میں سوال کیا۔

”میں نے تو سنا تھا کہ جونی کو صرف معاوضے سے غرض ہوتی ہے۔“ ڈاکٹر ایڈیسن نے جواب دیا۔

”اوہ آئی ایم سوری، میں نے بس تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوکر پوچھ لیا تھا ورنہ آپ کی یہ بات درست ہے کہ مجھے صرف معاوضے سے ہی غرض ہوتی ہے بہرحال اس کی رہائش گاہ کا پتا بتادیں آج رات ہی کام ہوجائے گا۔“ جونی نے کہا تو ایڈیسن نے اسے مورس کی رہائش گاہ کا پتا بتانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتادیا کہ وہ اپنے گھر پر اکیلا رہتا ہے۔

پتا معلوم کرنے کے بعد جونی نے اوکے کہہ کر رابطہ منقطع کردیا، جبکہ ایڈیسن نے بھی سیل فون میز پر رکھ کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی اسے یقین تھا کہ جونی اس کا کام کر دے گا۔ ڈاکٹر مورس اس کا بہت پرانا دوست تھا مگر اس کی یہ تھیوری اتنی انقلابی تھی کہ ایڈیسن کے پاس اسے مروانے کے سوا کوئی چارہ نہیں بچا تھا۔ اس کے پاس اپنی ذاتی اور جدید لیبارٹری موجود تھی اور اسے یقین تھا کہ وہ اس وائرس سے متعلق باقی تمام عملی تجربات اپنی لیبارٹری میں ہی مکمل کر لے گا۔ اس کے بعد اس کے نام کا ڈنکا پوری دنیا میں بج جائے گا اگرچہ اپنی اس خواہش کی تکمیل کی خاطر اسے اپنے پرانے دوست کی قربانی دینی پڑی تھی، مگر وہ کیا کرتا یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش کا معاملہ تھا۔ اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے وہ ایک مورس تو کیا اس جیسے کئی دوست قربان کرسکتا تھا۔

آج رات اس کے دوست کی زندگی کی آخری رات تھی‘ ایڈیسن کو اس بات کا یقین تھا کہ مورس کے قتل کے سلسلے میں پولیس کو اس پر شک نہیں ہوگا اگر پولیس کے علم میں یہ بات آبھی جاتی کہ مورس مرنے سے ایک دن پہلے اس سے ملنے اس کے گھر آیا تھا تو بھی اسے کوئی غیر معمولی بات تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ڈاکٹر مورس اکثر اوقات اس سے ملنے کے لیے آتا رہتا تھا۔ رہ گئی اس کی سائنسی تحقیق کی بات تو وہ خود یہ بتاچکا تھا کہ اس نے اس بارے میں کسی اور سے بات نہیں کی تھی۔

اس رات وہ خاصی دیر تک جاگتا رہا۔ وہ رات اس کے لیے کوئی عام رات نہیں تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کسی انسان کی جان لینے کی پلاننگ کی تھی مگر وہ کرتا بھی کیا، اس کے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا آپشن ہوتا تو وہ ضرور مورس کی جان بچا لیتا‘ رات کے تقریباً دو بجے اس کو نیند آگئی تاہم صبح آٹھ بجے کے قریب ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ لاشعور سے شعور کی کیفیت میں آتے ہی وہ بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے رات جونی کو مورس کے قتل کا ٹاسک دیا تھا۔

اسے یقین تھا جونی نے اس کا کام کردیا ہوگا اور اب تک کسی سائیلنسر لگے ریوالور سے مورس کو انتہائی خاموشی سے ٹھکانے لگایا جاچکا ہوگا، تاہم اسے اس حقیقت کا بھی ادراک تھا کہ مورس اپنے گھر تنہا رہتا ہے جب تک کوئی اس کی لاش دریافت نہیں کرے گا کسی کو اس کے مرڈر کے بارے میں علم نہیں ہو سکے گا۔ مورس زیادہ افراد سے میل جول پسند نہیں کرتا تھا اس لیے یہ بھی ممکن تھا کہ تعفن پھیلنے تک اس کی لاش دریافت ہی نہ ہوتی بہرحال لاش دیر سے دریافت ہونے سے اسے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کا اصل مقصد اس کی ایجاد پر قبضہ جمانا تھا اور یہ مقصد اس کی موت سے ہی پورا ہو جاتا تھا بلکہ اب تو گویا پورا ہوچکا تھا۔

مورس نے اپنا موبائل آن کیا تو اس پر جونی کا میسج موجود تھا۔ میسج میں بس اتنا بتایا گیا تھا کہ کام ہوگیا ہے ساتھ ایک سوئس بینک کا اکاؤنٹ نمبر درج تھا۔ ایڈیسن اچھی طرح جانتا تھا کہ اس میسج کا کیا مطلب ہے۔ گویا ڈاکٹر مورس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ اب اس کا فارمولا ایڈیسن کی ملکیت تھا۔ اب وہ اپنے نام کو دنیا میں ہمیشہ کے لیے امر کرنے کی خواہش پوری کرسکتا تھا مگر ابھی کچھ عملی تجربات ضروری تھے۔ ویسے مورس کی فائل میں موجود نکات پڑھنے کے بعد اسے سو فیصد یقین تھا کہ اس کے تجربات ناکامی سے دوچار نہیں ہوں گے اور جلد ہی دنیا اسے ایک مسیحا کے طور پر پہچاننے لگے گی۔

اس نے اپنا لیپ ٹاپ اٹھالیا تاکہ جونی کے سوئس بینک اکاؤنٹ میں آن لائن رقم ٹرانسفر کرسکے۔ اس کا سوئس بینک میں ذاتی خفیہ اکاؤنٹ موجود تھا اس لیے وہ آسانی سے یہ رقم جونی کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرسکتا تھا ویسے وہ یہ بھی جانتا تھا کہ پولیس کو کبھی رقم کی اس منتقلی کا علم نہیں ہوسکے گا کیونکہ تمام سوئس بینک رازداری کی ضمانت دیتے تھے۔

اگلے چند دن ایڈیسن نے خاصی مصروفیت میں گزارے۔ اس دوران ڈاکٹر مورس کی لاش بھی دریافت ہو گئی تھی اور اس نے اس کی تدفین میں بھی شرکت کرلی تھی۔ پولیس مورس کے قتل کے سلسلے میں تفتیش کررہی تھی تاہم پولیس کو ابھی تک کوئی واضح کلیو نہیں مل سکا تھا۔ ایڈیسن جانتا

تھا کہ جونی پروفیشنل آدمی ہے اور بہت پکا کام کرتا ہے اس لیے پولیس کو قاتل کا سراغ نہیں مل سکے گا۔ بہرحال وہ ڈاکٹر مورس کی آخری رسومات میں شرکت کرنے اور اس کے بیٹوں کو تسلی وغیرہ دینے کے بعد اپنے گھر واپس آ گیا۔

اگلے دن اس نے اپنی ذاتی لیبارٹری میں ڈاکٹر مورس کی تھیوری پر کام کا آغاز کر دیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی ٹیوبس میں بند انتہائی خطرناک وائرس کا بندوبست کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے مردہ خانے سے ایک انسانی لاش کا بندوبست بھی کر لیا، یہ کسی لاوارث شخص کی لاش تھی اور مردہ خانے کے ریکارڈ کے مطابق اس لاش کو دفنا دیا گیا تھا۔ ایڈیسن کو بس لاش کے حصول اور کاغذی ریکارڈ میں اس کی تدفین کی انٹری کروانے کے لیے کچھ رقم خرچ کرنا پڑی تھی۔ وہ لاش اب اس کی لیبارٹری میں شیشے کے ایک بڑے باکس میں موجود تھی جبکہ خطرناک وائرس کو بھی اس نے اسی باکس میں منتقل کر دیا تھا۔

اب ایڈیسن کو ڈاکٹر مورس کے فارمولے کے مطابق زکام کے عام وائرس میں جینیاتی تبدیلیاں کر کے اسے اس خطرناک وائرس سے آلودہ ہونے والی لاش میں منتقل کرنا تھا اور پھر یہ دیکھنا تھا کہ یہ عام وائرس اس خطرناک وائرس کا خاتمہ کرتا ہے یا نہیں، یہی اس تجربے کی کامیابی کا سب سے کلیدی نکتہ تھا۔ کامیابی کے لیے ضروری تھا کہ زکام کا عام وائرس اس خطرناک وائرس کا خاتمہ کر دے۔ لاش والے باکس کے درجہ حرارت کو انتہائی سرد رکھا گیا تھا۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ تھا کہ انسانی لاش جلدی خراب نہیں ہوتی اور دوسرا وہ خطرناک وائرس اور جینیاتی تبدیلیوں سے تبدیل ہونے والا زکام کا وائرس بھی اس درجہ حرارت میں زیادہ فعال ہو جاتا۔

اگلے چند دنوں کا زیادہ تر وقت ایڈیسن نے اپنی لیبارٹری میں گزارا وہ صرف انتہائی ضرورت کے وقت ہی اپنی لیبارٹری سے باہر نکلتا تھا۔ جو کام وہ کر رہا تھا، اس میں بہت احتیاط کی ضرورت تھی کیونکہ ذرا سی بے احتیاطی کی وجہ سے وہ خطرناک وائرس اس کے جسم میں بھی منتقل ہو سکتا تھا۔

بالآخر چند دنوں کے تجربات کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ وہ زکام کے عام وائرس میں جینیاتی تبدیلی کرنے میں کامیاب ہو گیا گویا مورس کا فارمولا بالکل درست تھا۔

اب دیر کرنا مناسب نہیں تھا۔ ایڈیسن نے اس جینیاتی تبدیلی والے وائرس کو اس لاش میں منتقل کر دیا جہاں پہلے سے ایک خطرناک وائرس موجود تھا گویا ایک وائرس

فیس

''ڈاکٹر صاحب! میرے بہرے پن کے علاج کی آپ کتنی فیس لیں گے؟''

''دو ہزار خرچ آئے گا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''نو ہزار؟'' مریض نے تصدیق چاہی۔

ڈاکٹر نے مریض کے تیور بھانپتے ہوئے قلابازی کھائی اور رکھائی سے بولا۔ ''نو نہیں، پندرہ ہزار۔''

''ٹھیک ہے۔'' مریض نے سر جھکا کر کہا۔

کاشف عبید، لاہور سے

منطق

''سائیکل ہٹاؤ یہاں سے!'' سپاہی نے متکبرانہ لہجے میں لڑکے کو حکم دیا۔

''کیوں؟'' سوال قطعی فطری تھا۔

''یہاں سے وزیر، سفیر اور اسمبلی کے ممبر گزرتے ہیں...... ہٹاؤ یہاں سے اسے!''

''فکر نہ کرو...... ان میں سے کوئی بھی میری سائیکل نہیں چرا سکتا...... میں نے اسے تالا لگا دیا ہے!''

محمد یوسف کا اسلام آباد سے اطمینان

قیمت

مرزا جی نے امریکا کی سیر کے لیے ایک بہت پرانی اور خستہ حال گاڑی خرید لی، کئی ہفتوں تک وہ اس میں سیر سپاٹے کرتے رہے پھر گاڑی نے انہیں مسلسل تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اسے بیچنے کی بہتیری کوششیں کیں لیکن کوئی خریدنے پر تیار نہیں ہوا۔

ایک روز وہ اسی کار میں مضافات کی طرف نکل گئے۔ کچھ دیر میں ٹول پلازا آ گیا۔ انہوں نے بمشکل اپنی گاڑی کھڑکی کے پاس روکی۔

''دس ڈالر۔'' کھڑکی والا اونچی آواز میں بولا۔

''منظور!'' مرزا جی گاڑی سے کود گئے۔'' یہ تمہاری ہوئی، نکالو دس ڈالر۔''

گلزار فاطمہ، پشاور سے

سے دوسرے وائرس کو ہلاک کرنے کے عملی تجربے کا آغاز ہوگیا تھا۔ اب نتیجہ ظاہر ہونا تھا ساری محنت کا پھل ملنا تھا۔ اسی نتیجے کو حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنے پرانے اور قریبی دوست کو قتل تک کروانے سے گریز نہیں کیا تھا اگر وہ اس جگہ ناکام ہو جاتا تو یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی ناکامی ہوتی۔

مگر وہ ناکام نہیں ہوا۔ چند دن تک خوردبین کے ذریعے لاش کا جائزہ لینے کے بعد اس پر یہ خوش کن انکشاف ہوا کہ جینیاتی تبدیلی والے وائرس نے خطرناک وائرس کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا ہے اور وہ بھی انسانی جسم کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر...... ایڈیسن اپنے تجربے کا نتیجہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا۔ اس کے ہاتھوں طب کی دنیا میں انقلاب آنے والا تھا۔ وہ ہزاروں ان انسانوں کی جانوں کو بچا سکتا تھا جو اس خطرناک وائرس میں مبتلا تھے۔

مگر ابھی مزید کچھ تجربات بھی ضروری تھے۔ ایڈیسن کو اب یہ دیکھنا تھا کہ کیا اس کی جینیاتی تبدیلی والا وائرس ہر قسم کے خطرناک وائرس کے خلاف موثر ہے یا صرف چند جراثیموں کا ہی خاتمہ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

اگلے دو دنوں میں اس نے اس بارے میں بھی تسلی کر لی۔ اس نے کچھ خطرناک جراثیموں کو انسانی لاش میں منتقل کر کے دیکھا مگر نتیجہ وہی نکلا۔ جینیاتی تبدیلی والا وائرس کسی دوسرے وائرس کو انسانی جسم پر زندہ نہیں رہنے دیتا تھا۔ ایڈیسن اپنے مقصد میں سو فیصد کامیاب ہو چکا تھا، اس کا خواب حقیقت کا روپ دھار چکا تھا۔ بس اب حکومتی سطح پر اس کی اس تھیوری کو پذیرائی کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد دنیا اسے انسانیت کے مسیحا اور ایک فرشتے کے طور پر ہمیشہ یاد رکھتی مگر ڈاکٹر ایڈیسن یہ سب کچھ فوری چاہتا تھا تاہم اس کی اس خواہش میں چند رکاوٹیں حائل تھیں۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ کسی بھی طریقۂ علاج یا دوا کی منظوری یونہی نہیں مل جاتی، اس کے لیے حکومتی سطح پر طب کے ماہرین کی زیرِ نگرانی طویل عرصے تک تجربات کیے جاتے ہیں۔ اگر ماہرین کی ٹیم اس دوا یا تھیوری کی منظوری دے دے تو پھر اس تھیوری کو انٹرنیشنل منظوری بھی درکار ہوتی ہے۔ ان سارے مراحل سے گزرنے کے بعد ہی کسی ویکسین کو مارکیٹ میں آنے کی منظوری ملتی ہے اور اس سارے پروسیجر کو مکمل ہونے میں برسوں لگ سکتے تھے ایڈیسن اتنا طویل عرصے تک انتظار نہیں کر سکتا تھا، وہ جلد از جلد اس وائرس کو ایک انجکشن کی شکل دے کر مارکیٹ میں لانا چاہتا تھا تاکہ نام کے ساتھ ساتھ پیسہ بھی کما سکے مگر اس کے ذہن میں ایسی کوئی ترکیب نہیں آرہی تھی جس پر عمل پیرا ہو کر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا۔ وہ جانتا تھا کہ اپنے طور پر کسی ہربل فارمولے پر مبنی دوا کو مارکیٹ میں متعارف کروانے کے لیے بھی حکومتی میڈیکل بورڈ کی منظوری درکار تھی اور پھر یہ معاملہ تو ایک خطرناک وائرس کا تھا اس لیے اس کی جلدی منظوری ناممکن تھی' انتظار کا سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھوڑے کی طرح دکھنے لگا۔

انسانی دماغ بھی بڑی عجیب شے ہے جب کسی مسئلے کا حل نکالنے کا مصمم ارادہ کر لے تو پھر ایسی ایسی باتیں سوچنے لگتا ہے جو شاید عام حالات میں ذہن کے کسی گوشے میں موجود بھی نہیں ہوتیں۔ ایڈیسن نے بھی کئی دن کی مغزماری کے بعد ایک حل سوچ لیا اگرچہ اس کے سوچے گئے طریقے میں کچھ رسک تھا اور یہ غیر قانونی بھی تھا مگر ایڈیسن نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنی اس وائرس والی تھیوری کو عملی طور پر کسی زندہ انسان پر آزمانے کے لیے یہی بہتر طریقہ تھا۔

اس نے سوچا تھا کہ وہ اپنے ذاتی اسپتال کے کچھ ایسے مریضوں پر اس جینیاتی تبدیلی والے وائرس کا تجربہ کرے گا جو کسی دوسرے خطرناک وائرس کی وجہ سے موت کے منہ میں جانے والے ہیں۔ اگر اس کا تجربہ کامیاب ہوگیا اور جینیاتی تبدیلی والے وائرس نے بالکل اسی طرح کام کیا جس طرح اس نے مردہ جسم پر کیا تھا تو اس کا صاف اور سیدھا مطلب یہ تھا کہ موت کے منہ میں جاتا شخص زندگی کی طرف واپس لوٹ آئے گا۔

ایڈیسن اپنے اس منصوبے پر عمل کرنے کے بارے میں جتنی گہرائی سے سوچتا گیا، اسے یہ اتنا ہی قابلِ عمل لگنے لگا اور پھر اس میں کسی کی زندگی کا رسک بھی نہیں تھا جن مریضوں پر اس نے وائرس کو آزمانا تھا، وہ تو ویسے بھی مرنے والے تھے۔

ایڈیسن سوچنے لگا کہ جب زندگی سے مایوس مریضوں کو یہ معلوم ہوگا کہ وہ صحت یاب ہو گئے ہیں اور ان کو یہ نئی زندگی ایڈیسن کی بدولت ملی ہے تو یقیناً اُن کی نظر میں ایڈیسن کا رتبہ کسی فرشتے سے کم نہیں ہوگا۔ یہی تو اس کی خواہش تھی کہ وہ ایک فرشتے یا انسانیت کے مسیحا کے طور پر دنیا میں ہمیشہ کے لیے امر ہو جائے اور رہتی دنیا تک لوگ اسے یاد رکھیں۔

فیصلہ ہو چکا تھا۔ ایڈیسن نے .... اگلے چند دنوں میں اس جینیاتی تبدیلی والے وائرس کو ویکسین کی شکل دے کر

اس کے کافی انجکشن تیار کر لیے۔ وہ جانتا تھا کہ خون میں منتقلی کے بعد یہ وائرس پورے جسم پر از خود پھیل جاتا تھا۔ جسم اور اور خون میں موجود ہر قسم کے خطرناک وائرس کا خاتمہ کر کے انسانی باڈی پر مکمل اجارہ داری حاصل کر لیتا جس کے بعد یہ وائرس انسانی جسم کو اپنا مستقل ٹھکانا بنا لیتا تھا اور کسی بھی خطرناک وائرس کے حملے کی صورت میں ایک ڈھال کا کردار ادا کرتا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ جس جسم پر یہ وائرس موجود ہوتا، وہ بیماریوں سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتا۔ ایک صحت مند اور تندرست جسم جو مرتے دم تک بیماریوں سے دور رہتا گویا اس کے بعد انسان کی اوسط عمر میں اضافہ ہو جانا بھی یقینی تھا۔

مورس نے واقعی کمال کا دماغ پایا تھا بس طبیعت کا کچھ سادہ تھا جو ڈاکٹر ایڈیسن کو اپنی اس تھیوری کے بارے میں آگاہ کرنے کی غلطی کر بیٹھا اور ایڈیسن نے بھی اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

ایڈیسن کو اس فارمولے کو زندہ انسانوں پر آزمانا تھا۔ اس کے لیے اس نے اپنے خاص ماتحت ڈاکٹر مارٹی کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ اس کے بغیر یہ کام مشکل تھا۔ وہ ڈاکٹر مارٹی کی طبیعت سے بھی بخوبی واقف تھا۔ ڈاکٹر مارٹی انتہائی لالچی انسان تھا اور دولت کی خاطر کچھ بھی کر سکتا تھا۔ ایڈیسن نے فیصلہ کیا تھا کہ اپنے تیار کردہ انجکشن اسے دے گا اور حساس نوعیت کے مریضوں میں منتقل کرنے کا حکم دے گا ساتھ ڈاکٹر مارٹی کو کچھ رقم بھی دے گا تاکہ وہ اس بارے میں اپنا منہ بند رکھے۔

اسے یقین تھا کہ رقم ملنے کے بعد ڈاکٹر مارٹی اپنا منہ بند رکھے گا اور اس کے دیئے گئے انجکشن بھی مریضوں کو لگا دے گا کیونکہ یہ روٹین کا کام ہوگا اس لیے دوسرے ڈاکٹرز اور مریض وغیرہ کو شک بھی نہیں ہوگا۔

اگلے دن وہ اسپتال روانہ ہو گیا۔ اس کے بریف کیس میں تیار شدہ انجکشن خاصی تعداد میں موجود تھے۔

اسپتال میں اس نے اپنے لیے مختص پُرشکوہ آفس میں بیٹھتے ہی ڈاکٹر مارٹی کو طلب کر لیا اور اپنے پی اے کو بھی ہدایات جاری کر دیں کہ ڈاکٹر مارٹی کے آنے کے بعد کسی صورت بھی انہیں ڈسٹرب نہ کیا جائے، اسے ان کے ساتھ بہت ضروری معاملات ڈسکس کرنے ہیں۔

ڈاکٹر مارٹی کچھ ہی دیر میں راونڈ سے فارغ ہو کر اس کے آفس میں پہنچ گیا۔

وہ ساٹھ سال کے ایک بوڑھے شخص تھے۔ تاہم اپنے گنجے سر اور نظر کی عینک کے ساتھ اپنی عمر سے کہیں زیادہ کے لگتے تھے۔ ”ہیلو ڈاکٹر ایڈیسن آپ نے کافی دنوں بعد اسپتال کا راؤنڈ لگایا ہے۔ ڈاکٹر مورس کی تدفین کے بعد آپ اسپتال آئے ہی نہیں اور یہ آپ کے دوست مورس کو کس نے قتل کر دیا، وہ تو بہت شریف النفس انسان تھا۔ میری ڈاکٹر مورس سے دوستی تو نہیں تھی مگر آپ کے ساتھ اس سے بھی اکثر ملاقات ہو جاتی تھی، مجھے سمجھ نہیں آئی کہ اسے کس نے قتل کر ڈالا۔

ڈاکٹر ایڈیسن اس وقت مورس کے سلسلے میں بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”اس قصے کو چھوڑیں، ڈاکٹر مورس کو شاید کسی ڈاکو وغیرہ نے ہلاک کر دیا ہے۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے جلد ہی اصل صورتِ حال کا ادراک ہو جائے گا۔ اس وقت میں نے آپ کو بہت اہم موضوع پر بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔

اچھا تو کہیں میں ہمہ تن گوش ہوں۔“ ڈاکٹر مارٹی نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر ایڈیسن کی بات سن کر ان کے چہرے پر بھی سنجیدگی کی دبیز تہ چڑھ گئی تھی۔

”ڈاکٹر مارٹی جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ میں کافی دنوں سے اسپتال نہیں آسکا میں اسی بارے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں دراصل اِن دنوں میں ایک نئی ریسرچ میں مصروف رہا ہوں اور اب میں اس ریسرچ میں کامیاب بھی ہو چکا ہوں بس اب اس ریسرچ کو عملی شکل دینی ہے اور میں نے اسی سلسلے میں آپ کو بلایا ہے کیونکہ فی الحال میں کسی اور پر اعتماد نہیں کر سکتا۔“ ڈاکٹر ایڈیسن نے نپے تلے انداز میں گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟ میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔“ ڈاکٹر مارٹی نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

”مطلب سمجھنا اتنا آسان نہیں ہے ڈاکٹر مارٹی کیونکہ آپ صرف ایک ڈاکٹر ہیں جبکہ میں سائنس داں بھی ہوں تاہم میں آپ کو بس آسان لفظوں میں اتنا سمجھا سکتا ہوں کہ میں نے ایک وائرس میں کچھ ایسی جینیاتی تبدیلیاں کی ہیں جن کی وجہ سے وہ وائرس اب انسانی جسم اور خون میں موجود ہر قسم کے خطرناک جراثیموں کو ہلاک کرنے کے قابل ہو گیا ہے گویا ہم اس وائرس کی مدد سے موت کے منہ میں جاتے ہوئے انسانوں کو زندگی کی طرف واپس لا سکتے ہیں، ذرا سوچیں یہ کتنی بڑی اور انقلابی ایجاد ہے۔“ ڈاکٹر ایڈیسن نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”آپ جو کچھ بیان کر رہے ہیں اگر ایسا ہے تو پھر یہ

ایجاد واقعی انقلابی ہے تاہم میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ اس سلسلے میں، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ میں صرف ایک ڈاکٹر ہوں آپ کی طرح ریسرچر نہیں۔'' مارٹی نے بدستور حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

''آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔'' ڈاکٹر ایڈیسن نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ ''اگرچہ میں اس اسپتال کا مالک ہوں تاہم آپ جانتے ہیں کہ میں نے سب کچھ آپ کے سپرد کر رکھا ہے۔ اب میں اپنے ایجاد کردہ وائرس کو کچھ ایسے مریضوں پر آزمانا چاہتا ہوں جو موت کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں ایسے مریض ہمارے اسپتال میں بھی موجود ہیں۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر ایڈیسن۔'' ڈاکٹر مارٹی نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ جانتے ہیں کہ ایسا کرنا قانوناً جرم ہے۔ کسی بھی دوا کو منظوری کے بغیر کسی مریض پر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔'' ڈاکٹر مارٹی شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے تاہم ڈاکٹر ایڈیسن نے ہاتھ اٹھا کر انہیں مزید بولنے سے روک دیا۔

''ڈاکٹر مارٹی۔ جرم تو اس وقت تصور ہوگا جب کسی کو پتا چلے گا اسی لیے تو میں نے یہ کام آپ کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا ہے ویسے میں اس کام کا آپ کو انتہائی معقول معاوضہ بھی دوں گا۔ میری جیب میں اس وقت پچاس ہزار ڈالرز کا گارنٹڈ چیک موجود ہے جو آپ کے ہامی بھرتے ہی آپ کی جیب میں منتقل ہو جائے گا۔''

''مگر اس طرح کسی مریض کی موت واقع ہو گئی تو......؟'' اتنی بھاری رقم کا سنتے ہی ڈاکٹر مارٹی کے لہجے میں تذبذب عود آیا۔

''تو کیا ہوا سب یہی سمجھیں گے کہ وہ اسی بیماری یا وائرس سے ہلاک ہوا ہے جس میں وہ پہلے سے مبتلا تھا۔ میرے دریافت کردہ اس جینیاتی وائرس کے بارے تو کسی کو معلوم ہی نہیں ہے ماسوائے آپ کے۔'' ایڈیسن نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''مگر پھر بھی یہ کام غیر قانونی ہونے کے ساتھ ساتھ خطرناک بھی ہے۔'' ڈاکٹر مارٹی کا لہجہ بدستور تذبذب زدہ تھا۔

''خطرناک تو بالکل نہیں ہے۔'' ڈاکٹر ایڈیسن نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا، اب دیکھیں نا جن مریضوں پر یہ آزمایا جائے گا وہ موت کے منہ میں ویسے بھی جانے والے ہیں اگر ہمارے تجربے کے نتیجے میں مر جائیں تو کیا فرق پڑتا ہے لیکن اگر وہ اس وائرس کی بدولت صحت یاب ہو جاتے ہیں تو آپ سوچیں کہ یہ انسانیت کی کتنی بڑی خدمت ہوگی۔ میں نے اسی وجہ سے اپنے تیار کردہ اس وائرس کو مریضوں پر فوری آزمانے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ اس کے کامیاب ہوتے ہی اس کو ویکسین کی شکل میں جلد از جلد مارکیٹ میں لانچ کروا سکوں۔ تجربے کی کامیابی کے بعد حکومت بھی میرا ساتھ دینے پر مجبور ہو جائے گی ورنہ عام حالات میں اس تحقیق کو حکومتی منظوری ملنے میں برسوں لگ سکتے ہیں اور میں اتنا طویل انتظار نہیں کر سکتا ویسے یہ چیک ایڈوانس ہے کامیابی ملتے ہی میں آپ کو پچاس ہزار ڈالر کی رقم مزید دوں گا، فی الحال یہ چیک رکھ لیں۔'' ڈاکٹر ایڈیسن نے اپنی جیب سے چیک نکال کر ڈاکٹر مارٹی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''اوکے مجھے یہ ڈیل منظور ہے۔'' ڈاکٹر مارٹی نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے چیک اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لیا شاید وہ اپنی لالچی فطرت کی وجہ سے مجبور ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر مارٹی کے چیک قبول کرتے ہی ایڈیسن کے چہرے پر گہرے اطمینان کے تاثرات پھیل گئے کیونکہ اب اس کے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ڈاکٹر مارٹی آسانی سے انجکشن مریضوں کے جسم میں انجیکٹ کر لے گا۔ وہ تصور ہی تصور میں دیکھنے لگا کہ اس کے تجربے سے موت کے منہ میں جاتے ہوئے مریض زندگی کی طرف لوٹ آئے ہیں اور نیوز چینل سے لے کر اخبارات تک ہر طرف اس کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ ہر طرف اسی کی تعریفوں کے پُل باندھے جا رہے ہیں۔ صحت یاب ہونے والے افراد اسے ایک فرشتہ قرار دے رہے ہیں۔

''کیا ابھی انجکشن لگانے ہیں؟'' ڈاکٹر مارٹی نے سوال کیا تو وہ چونک کر اپنی تصوراتی دنیا سے باہر نکل آیا۔

''نہیں ابھی وارڈ میں دوسرے ڈاکٹر موجود ہیں بہتر ہے کہ آپ یہ کام اس وقت کریں جب وارڈ خالی ہو اور دوپہر کے کھانے کا وقفہ اس کام کے لیے مناسب رہے گا۔ اس وقت وارڈ میں ایک گھنٹے تک کوئی نہیں ہوتا۔'' ایڈیسن نے پُرخیال لہجے میں جواب دیا تو ڈاکٹر مارٹی نے یوں اثبات میں سر ہلایا جیسے وہ اس کی بات سے سو فیصد متفق ہو۔

دوپہر کے وقت ڈاکٹر مارٹی نے اس کے دیے گئے انجکشن مطلوبہ مریضوں کی ڈرپ میں خاموشی سے انجیکٹ کر دیے۔

سب کچھ ڈاکٹر ایڈیسن کے منصوبے کے مطابق ہوا

تھا۔ اس کا جنیاتی تبدیلی والا وائرس مریضوں کے خون میں شامل ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جلد ہی یہ وائرس ان مریضوں کی جلد پر بھی حفاظتی ڈھال بنا لے گا۔ اس کے بعد چند دن کے اندر اندر یہ ان مریضوں کے جسم میں موجود ان تمام خطرناک جراثیموں کا خاتمہ کر دے گا جن کی وجہ سے وہ مریض موت کے منہ میں جانے والے تھے۔ تاہم ان نتائج کے حصول کے لیے اسے کچھ دن انتظار کرنا تھا۔ اسے یقین تھا کہ دس سے بارہ دنوں کے اندر نتیجہ ظاہر ہو جائے گا اپنی لیبارٹری میں اس نے جس انسانی لاش پر تجربات کیے تھے وہاں بھی اتنے ہی دنوں میں نتیجہ ظاہر ہوا تھا تاہم یہ بھی ممکن تھا کہ وائرس کے کام کرنے کی رفتار میں اضافہ ہو جاتا اور مریض جلدی صحت یاب ہو جاتے ویسے بھی ایک زندہ جسم اور مردہ جسم میں بہت فرق ہوتا ہے اس لیے اب یہ دیکھنا تھا کہ اس کا تبدیل شدہ وائرس ان زندہ انسانوں کے جسم پر کیسی کارکردگی دکھاتا ہے۔

کام ہو چکا تھا نتیجے کے لیے کچھ دن کا انتظار کرنا تھا۔ اسپتال میں مزید رکنے کی ضرورت نہیں تھی اس لیے وہ واپس گھر آ گیا۔

پچھلے کئی دنوں سے مسلسل کام کرنے کی وجہ سے وہ خاصا تھک گیا تھا اس لیے اگلے چند دن اس نے آرام کرتے ہوئے گزارے تاہم اس دوران وہ ایک بار ڈاکٹر مورس کی قبر پر گیا اور کچھ دیر کے لیے اس کی قبر پر کھڑا رہا۔ اس حقیقت سے صرف وہی آگاہ تھا کہ جینیاتی تبدیلی والے وائرس کا اصل موجد ڈاکٹر مورس ہی تھا۔

تاہم منوں مٹی تلے مدفون ڈاکٹر مورس اب یہ راز کسی کو بتانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ مورس کے قتل کے سلسلے میں پولیس نے کیا تفتیش کی تھی، وہ نہیں جانتا تھا تاہم اسے یہ یقین تھا کہ وہ مشکوک افراد کی فہرست نہیں ہے ورنہ اب تک پولیس اسے شاملِ تفتیش کر چکی ہوتی۔ اگرچہ وہ اپنے ملک کا ایک نامور سائنس داں تھا تاہم اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ ڈاکٹر مورس کا شمار بھی اس ملک کے نامور طبی ماہرین میں ہوتا تھا اور پھر معاملہ بھی مرڈر کا تھا اگر پولیس کو اس پر کسی قسم کا شک ہوتا تو اس سے ضرور پوچھ گچھ کی جاتی۔

اگلے چند دن ڈاکٹر ایڈیسن نے بہت بے چینی میں گزارے۔ اس کے لیے ان چند دنوں کا انتظار بھی بہت طویل تھا اگرچہ وہ اس دوران اپنے کلینک میں جانے کے بجائے گھر پر ہی رہا تھا تاہم فون کے ذریعے ڈاکٹر مارٹی سے مسلسل رابطے میں رہا تھا۔ ڈاکٹر مارٹی کی جانب سے بھی اسے حوصلہ افزا رپورٹ مل رہی تھی۔ ڈاکٹر مارٹی کے مطابق ان تمام مریضوں کی حالت تیزی سے بہتر ہو رہی تھی جن میں جنیاتی تبدیلی والا وائرس منتقل کیا گیا تھا۔ ان کے پلیٹ سیلز بھی تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ اسپتال کے سبھی ڈاکٹرز حیران تھے کہ موت کے منہ میں جاتے مریض صحت یابی کی جانب کیسے گامزن ہو گئے تھے۔ انہوں نے اس کنڈیشن کے مریضوں کو آج سے پہلے اس طرح اور اتنی تیزی سے صحت یاب ہوتے کبھی نہیں دیکھا تھا، یہ ان سب ڈاکٹرز کے لیے انوکھا اور حیران کن تھا۔

ڈاکٹر مارٹی فون پر ایڈیسن کو اسپتال کے ڈاکٹرز کی حیرت کے بارے میں آگاہ کرتا تو ڈاکٹر ایڈیسن محظوظ ہوئے بغیر نہ رہتا۔

کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ مریض اتنی تیزی سے کیسے صحت یاب ہو رہے ہیں، ان کے گرتے ہوئے پلیٹ سیلز یک بہ یک ریورس گیئر میں کیسے آ گئے تھے۔ حقیقت کیا تھی، یہ صرف ڈاکٹر مارٹی اور ڈاکٹر ایڈیسن ہی جانتے تھے۔

مزید چند دن گزرتے ہی ایڈیسن کے تجربے کا مکمل نتیجہ ظاہر ہو گیا۔ موت کے منہ میں جاتے ہوئے مریض مکمل صحت یاب ہو گئے۔ ڈاکٹر مارٹی کے علاوہ دوسرے ڈاکٹرز نے بھی ان کے کافی ٹیسٹ کیے۔ وہ حیران تھے کہ ان کے جسموں پر اور خون میں موجود خطرناک وائرس ہلاک کیسے ہو گئے تھے۔

تاہم انہوں نے ان مریضوں کے جسم میں موجود ایک نیا وائرس دریافت کر لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ وائرس ہی دوسرے خطرناک جراثیموں کو ہلاک کر رہا ہے مگر کیسے اس کی کوئی وضاحت کرنے سے وہ قاصر تھے۔

چند دنوں کے اندر یہ خبر میڈیا کی زینت بھی بن گئی کہ ڈاکٹر ایڈیسن کے ذاتی اسپتال میں موجود ایسے مریض جو کسی خطرناک وائرس میں مبتلا ہو چکے تھے اور ڈاکٹر بھی ان کی زندگی سے ناامید ہو چکے تھے، حیرت انگیز طور پر ٹھیک ہو چکے ہیں اور ڈسچارج ہو کر اپنے گھروں کو بھی جا چکے ہیں جس کے بعد اسپتال میں مریضوں کا رش لگ گیا تھا۔ اس دوران ایڈیسن مزید انجکشن بھی ڈاکٹر مارٹی کو مہیا کرتا رہا جو ڈاکٹر مارٹی نئے آنے والے مریضوں کو لگاتا رہا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ چند دن کے اندر، اندر وہ سب مریض بھی صحت یاب ہونے لگے تھے اور مریضوں کی اس صحت یابی کا تناسب تقریباً سو فیصد تھا اور اب صحت یابی کے عمل میں بھی تیزی آ گئی تھی یعنی دو تین دن میں ہی نتیجہ ظاہر ہونے لگا تھا۔

ڈاکٹر ایڈیسن کا تجربہ کامیاب ہو چکا تھا اب اسے مزید تجربات کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ عنقریب دنیا میں اسے ایک انقلابی ایجاد کا موجد تسلیم کیا جانے والا تھا اس لیے اس نے اپنی ذاتی لیبارٹری میں موجود انسانی باڈی کو شیشے کے بند باکس سمیت برقی بھٹی کی نذر کر کے تلف کر دیا۔ اس باڈی پر اس نے بہت خطرناک قسم کے جراثیموں پر تجربات کیے تھے اس لیے اس نے ڈیڈ باڈی کو باکس سے باہر نکالنے کا رسک نہیں لیا تھا اور اسے باکس سمیت ہی نذرِ آتش کیا تھا۔

اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ ایک ماہ سے زیادہ کا وقت گزر چکا ہے اس لیے اسے میڈیا کے سامنے یہ اعلان کر دینا چاہیے کہ اس کے اسپتال میں صحت یاب ہونے والے تمام مریضوں کی صحت یابی کا راز اس کے اس جینیاتی تبدیلی والے وائرس میں چھپا ہے۔

اگرچہ اس دوران اس نے صرف ایک دو بار ہی اپنے کلینک کا چکر لگایا تھا تاہم ڈاکٹر مارٹی کی جانب سے فون پر اسے ایک ایک لمحے کی رپورٹ مل رہی تھی۔ ڈاکٹر مارٹی کے مطابق اب یہ بات حکومت کے علم میں بھی آ چکی تھی کہ اس کے کلینک میں داخل ہونے والے ایسے مریض بھی صحت یاب ہو رہے ہیں جن کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ محکمۂ صحت میں اس خبر کے حوالے سے کھلبلی مچ چکی تھی اور ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے ڈاکٹر ایڈیسن کے اسپتال سے فارغ ہونے والے تمام مریضوں کو چیک بھی کیا تھا۔ وہ ٹیم ان کے ٹھیک ہونے کے بارے میں کوئی واضح رائے تو قائم نہیں کر پائی تھی تاہم ٹیسٹ کے بعد انہوں نے ان صحت یاب ہونے والے افراد میں ایک خاص قسم کے اور انوکھے وائرس کی نشاندہی کی تھی حکومتی میڈیکل ٹیم کے مطابق اس وائرس کو پہلے کبھی دریافت نہیں کیا گیا تھا اور فی الحال اس کے انسانی جسم کو نقصان پہنچانے کے بارے میں بھی کوئی ثبوت نہیں ملا تھا تاہم میڈیکل ٹیم نے اپنی رپورٹ میں یہ بات لکھ دی تھی کہ ان افراد کے صحت یاب ہونے میں اس انوکھے وائرس کا کوئی نہ کوئی عمل دخل ضرور تھا اور تمام صحت یاب ہونے والے افراد کا تعلق بھی مشہور ریسرچر ڈاکٹر ایڈیسن کے اسپتال سے تھا۔

ایڈیسن تک یہ ساری خبریں پہنچ رہی تھیں۔ وہ میڈیا میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں اور تبصرے بھی دیکھ رہا تھا۔ ان خبروں کے بعد وہ دانستہ اپنے کلینک کا رخ نہیں کر رہا تھا کیونکہ وہاں میڈیا کے نمائندوں کا رش لگا رہتا تھا۔ ڈاکٹر مارٹی کے توسط سے اسے یہ خبر بھی ہو گئی تھی کہ اب اسپتال میں بھی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں کہ ڈاکٹر ایڈیسن نے اپنے مریضوں پر کوئی نئی دوا آزمائی ہے جس کی وجہ سے وہ تندرست ہوئے ہیں۔ ان افراد کے جسموں پر موجود کسی نووارد وائرس کی نشاندہی ہونے کے بعد اس طرح کی چہ میگوئیاں کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ ڈاکٹر ایڈیسن کو پہلے سے ہی اس صورتِ حال کا اندازہ تھا۔ کسی انوکھے وائرس کا علم ہونے کے بعد اسپتال کے ڈاکٹرز کے ذہن میں اسی کا نام آسکتا تھا کیونکہ اسپتال کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا شمار اس ملک کے چوٹی کے جراثیمی ماہرین میں ہوتا تھا اور کسی خطرناک وائرس کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے حکومت بھی اس سے تجاویز لیتی رہتی تھی۔

ابھی تک کسی حکومتی ارکان نے اس سے رابطہ نہیں کیا تھا مگر ایڈیسن جانتا تھا کہ جلد ہی اس بارے میں اس سے رابطہ کیا جائے گا۔ اس کے اسپتال سے صحت یاب ہونے والے افراد کے جسموں پر موجود عجیب غریب وائرس حکومت کے طبی ماہرین کو چین سے نہیں بیٹھنے دے گا اور اس وائرس کے بارے میں وضاحت ڈاکٹر ایڈیسن کے سوا کوئی نہیں دے سکتا تھا، اس کا خیال غلط نہیں تھا۔

اتوار کا دن تھا جب اسے بوتھم کی کال موصول ہوئی۔ بوتھم محکمۂ صحت میں ایک اہم عہدے پر فائز تھا اور ڈاکٹر مورس اسی کی وجہ سے ڈاکٹر ایڈیسن سے ملنے اور اس پر اعتماد کرنے کی غلطی کر بیٹھا تھا اور اس غلطی کا خمیازہ اسے موت کی صورت میں بھگتنا پڑا۔

ایڈیسن کے موبائل میں بوتھم کا نمبر محفوظ تھا اور اسے اس کی کال کی پہلے سے ہی توقع تھی اس لیے اس نے فون اٹھاتے ہی چہکتے ہوئے کہا۔

''ہیلو بوتھم کیسے ہو تم؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں ڈاکٹر ایڈیسن' آپ اپنی سنائیے آپ کیسے ہیں آج کل میڈیا پر آپ کے اسپتال کے بڑے چرچے ہیں۔ اب تو لوگوں یہ بات مشہور ہونے لگی ہے کہ ڈاکٹر ایڈیسن کے پرائیویٹ اسپتال میں موت کے فرشتے کا داخلہ ممنوع ہے۔'' بوتھم نے جواب دیا۔

''چلو تم ایسا ہی سمجھ لو اور اب اصل مدعے کی جانب آؤ' میں جانتا ہوں تم بنا مطلب کسی کو فون نہیں کرتے۔'' ایڈیسن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر ایڈیسن کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ حکومت میں کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ کے کلینک میں خطرناک وائرس کے شکار افراد تندرست ہو رہے ہے

ہیں مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ تمام تندرست ہونے والے افراد کے جسموں پر ایک بالکل نئی قسم کا وائرس بھی پایا گیا، ابھی تک ہم اس وائرس کے بارے میں اندھیرے میں ہیں مگر ہمیں یقین ہے کہ آپ اس بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ ہمیں شک ہے کہ آپ نے کسی نئی ویکسین کا ان مریضوں پر تجربہ کیا ہے جس کی وجہ سے وہ سب حیرت انگیز طور پر ٹھیک ہوگئے ہیں۔ بہتر ہے کہ آپ اس بارے اپنی خاموشی توڑ دیں آپ جانتے ہیں کہ بغیر حکومتی میڈیکل بورڈ اور انٹرنیشنل منظوری کے کسی ویکسین کو لوگوں پر آزمانا بہت سنگین جرم ہے اور ہماری رائے کے مطابق آپ اس جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ہم نے شہر کے تمام اسپتالوں کا ڈیٹا حاصل کیا، کسی خطرناک وائرس میں مبتلا کسی ایک مریض کے بھی صحت یاب ہونے کی رپورٹ نہیں مل سکی مگر آپ کے کلینک کے تمام مریض صحت یاب ہوئے ہیں اور وہ بھی اتنے مختصر عرصے میں کہ طب کی دنیا کا ہر ماہر حیران ہے۔ بہتر ہے کہ آپ اس بارے میں اپنی زبان خود سے کھول دیں ورنہ آپ کو حکومتی پرمشن کے بغیر مریضوں پر کسی نئی ویکسین کو آزمانے کے جرم میں گرفتار بھی کیا جاسکتا ہے۔'' بوتھم نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''مجھے گرفتاری کی دھمکی مت دو۔'' ایڈیسن نے سخت لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔''ہاں یہ سب کچھ میں نے ہی کیا ہے اور وہ انوکھا وائرس بھی میری ہی ایجاد ہے۔ تمہیں شاید یقین نہ آئے لیکن میں ایک ایسا وائرس ایجاد کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں جس کی بدولت انسان کو دوسرے تمام خطرناک جراثیموں سے نجات مل جائے گی۔ دیکھو میں نے موت کے منہ میں جاتے ہوئے لوگوں کو زندگی دی ہے، کیا میں نے کوئی غلط کام کیا؟ اگر میں اس تجربے کی منظوری کے لیے حکومتی اجازت کا انتظار کرتا تو شاید برسوں لگ جاتے اور اس دوران میرے علاج سے صحت یاب ہونے والے افراد قبروں میں جا چکے ہوتے۔ مگر میں نے انہیں مرنے سے بچایا ہے۔ میں ان کے لیے زندگی کی نوید ثابت ہوا ہوں۔''

''تو ہمارا شک درست تھا کہ ان سارے واقعات کے پیچھے آپ ہی ہیں۔'' بوتھم نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ ''مگر ڈاکٹر ایڈیسن آپ جانتے ہیں کہ آپ نے کس قدر غیر ذمّے داری کا مظاہرہ کیا ہے، کسی وائرس کی مدد سے بیماریوں کا خاتمہ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ اگر آپ کے اسپتال کے مریضوں کا ڈیٹا چیک کیا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ آپ واقعی کسی انقلابی وائرس کے موجد ہیں جو انسان کو نقصان کے بجائے فائدہ پہنچائے ورنہ تو وائرس تو کہتے ہی ان جرثیموں کو ہیں جو انسان کے دشمن ہوتے ہیں؟''

''ہاں بوتھم، میں واقعی ایک ایسا وائرس ایجاد کرنے میں کامیاب ہو چکا جس کی مدد سے انسانی جسم بیماریوں کے خلاف ناقابلِ تسخیر ہو جائے گا۔ تم میرے اسپتال کے مریضوں کے رزلٹ سے آگاہ ہو اور اب میں چاہتا ہوں کہ تم حکومت کے اعلیٰ عہدے داران کو قائل کرو کہ وہ میری اس ایجاد کے سلسلے میں مجھے گرفتار کرنے کے بجائے سپورٹ کریں۔ میری گرفتاری سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا چہ میگوئیاں پہلے سے جاری ہیں مگر جیسے ہی میڈیا کو یہ کنفرم ہوگا کہ موت کے منہ میں جاتے ہوئے افراد کو زندگی بخشنے والا میں ہوں، وہ سب میری حمایت میں کھڑے ہو جائیں گے اور لوگوں کی ہمدردیاں میرے ساتھ ہوں گی کیونکہ میری ایجاد کردہ ویکسین کے بارے میں جاننے کے بعد لوگ مجھے مسیحا سمجھیں گے۔ میری گرفتاری حکومت کے حق میں نہیں جائے گی۔'' ایڈیسن نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔

''یہ سارے نکات پہلے سے حکومت کے زیرِ غور ہیں ورنہ آپ کو کب کا گرفتار کر لیا جاتا مگر دیکھیں ابھی تک کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔''

''تو پھر ان سے بات کرو اور انہیں آمادہ کرو کہ میری حمایت کرنے سے ان کی شہرت میں اضافہ ہوگا۔ میرا تجربہ سو فیصد کامیاب ہو چکا ہے اب کسی شک و شبہے کی گنجائش ہی نہیں رہی، میرا ساتھ دو۔''

''میں آپ کا ساتھ دینا چاہوں بھی تو شاید نہیں دے سکوں گا۔'' بوتھم نے پُرسوچ لہجے جواب دیا۔''مجھے اپنے اوپر بھی جواب دینا ہے بہرحال اگر آپ کا یہ فارمولا واقعی کامیاب ہے تو پھر یہ بہت بڑی اور انقلابی ایجاد ہے تاہم اس کا فیصلہ وائرس کے بارے میں آپ کی تھیوری پر مشتمل نکات پڑھنے کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔ میں حکومت کے اعلیٰ عہدے داران سے بات کر کے ..... ایک حکومتی میڈیکل بورڈ تشکیل دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس بورڈ میں ملک کے چوٹی کے ماہرین کو شامل کیا جائے گا اگر انہوں نے آپ کی اس نئی اور انوکھی ویکسین کو قبول کر لیا تب ہی اس معاملے میں مزید پیش رفت ہوسکے گی۔''

''کوشش کر لو لیکن یاد رکھو میں زیادہ دیر انتظار نہیں کروں گا میں جلد ہی ایک پریس کانفرنس کرنے والا ہوں جس میں سارے حقائق کھول کر بیان کروں گا۔ میں نے انسانیت کی بھلائی کا کام کیا ہے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں

تمہارے اگلے فون کا منتظر رہوں گا اب تمہارا فون آتا ہے یا میری گرفتاری کے لیے پولیس، یہ تم پر منحصر ہے۔'' یہ کہتے ہی ڈاکٹر ایڈیسن نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اسی لمحے اس کے موبائل فون کی گھنٹی دوبارہ بج اٹھی تو وہ چونک کر سیدھا ہو گیا شاید بوتھم نے دوبارہ فون کیا تھا مگر نمبر دیکھتے ہی اس کا خیال غلط ثابت ہو گیا کیونکہ کال ڈاکٹر مارٹی کی تھی۔

''ہیلو ڈاکٹر کیسے ہیں آپ؟'' اس نے ڈاکٹر مارٹی کا حال پوچھا۔

''ڈاکٹر ایڈیسن میں پریشان ہوں۔ کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ آج میں نے اپنے جسم کا ٹیسٹ کیا ہے، مجھ پر یہ انکشاف ہوا ہے کہ آپ کا جینیاتی تبدیلی والا وائرس میرے جسم میں بھی موجود ہے۔ میں نے وارڈ میں داخل ہوتے وقت ہمیشہ تمام احتیاطی تدابیر اختیار کی ہیں پھر یہ وائرس مجھ سے کیسے چمٹ گیا۔ بہرحال شک ہونے پر میں نے اسپتال کے دیگر عملے کے ٹیسٹ بھی کروا لینا مناسب سمجھا اور رپورٹ دیکھنے کے بعد مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا ہے کہ وہ وائرس اسپتال کے تقریباً تمام عملے میں موجود ہے یعنی یہ وائرس صرف خون میں منتقلی سے ہی نہیں پھیلتا بلکہ یہ ایک جسم سے دوسرے جسم میں بھی منتقل ہو رہا ہے۔ تمام ڈاکٹرز کو اس صورتِ حال سے پریشانی لاحق ہو گئی ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں محکمہ صحت کو اطلاع کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' ڈاکٹر مارٹی نے پریشان سے لہجے میں جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ اب ویکسین کی بھی ضرورت نہیں رہے گی، یہ وائرس خود بہ خود ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہوتا رہے گا یعنی ایک وبائی ویکسین۔ آج تک میں نے وبائی امراض کا ہی سنا تھا مگر اب دنیا کو ایک وبائی ویکسین کے بارے میں پتا چلے گا جس کا موجد میں ہوں۔'' ڈاکٹر ایڈیسن نے فاخرانہ لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر ایڈیسن آپ صورتِ حال کو سمجھ نہیں رہے جب سے اسپتال کے عملے اور ڈاکٹرز کو پتا چلا ہے کہ ان کے جسم پر ایک انجان وائرس موجود ہے، وہ بے چینی کا شکار ہیں۔ ہر کوئی مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ ڈاکٹر ایڈیسن کب اسپتال آئیں گے اور میڈیا پر جو چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں، کیا وہ درست ہیں، کیا واقعی اسپتال کے مریضوں پر کسی ویکسین کا تجربہ کیا گیا ہے جس کے نتیجے میں یہ وائرس ان کے جسم میں پھیلا ہے، میں خود بھی اس صورتِ حال سے سخت پریشان ہوں۔ میں اسپتال سے کافی مرتبہ اپنے گھر گیا ہوں اور مجھے شک ہے کہ یہ وائرس میری بیوی، بیٹوں اور پوتوں۔۔۔۔ میں بھی منتقل ہو چکا ہوگا۔'' ڈاکٹر مارٹی نے متوحش لہجے میں کہا۔

''آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔'' ڈاکٹر ایڈیسن تفہیمی لہجے میں بولا۔ ''حالانکہ آپ اسپتال کے مریضوں پر اس وائرس کا نتیجہ دیکھ چکے ہیں۔ میری حکومتی میڈیکل بورڈ کے سربراہ بوتھم سے بات ہو چکی ہے جلد ہی میرے اس طریقۂ علاج کو حکومتی پذیرائی حاصل ہو جائے گی۔ آپ اسپتال کے تمام عملے کو تسلی دیں اور حقیقت بھی بتا دیں، انہیں بتائیں کہ یہ وائرس ان کو نقصان نہیں پہنچائے گا بلکہ ان کی حفاظت کرے گا اس لیے وہ گھبرائیں نہیں اور پھر اسپتال میں صحت یاب ہونے والے مریضوں کی مثال سب کے سامنے موجود ہے آپ کو انہیں قائل کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

''میں جلد ہی ایک پریس کانفرنس میں اس وائرس کے بارے میں اور اپنے تجربے کے بارے میں اعلان کرنے والا ہوں ویسے آپ خود بھی اس وائرس کا اسپتال کی لیبارٹری میں جائزہ لیتے رہیں۔''

''ٹھیک ہے ڈاکٹر ایڈیسن میں اسپتال کے عملے کو حقیقت بتا دیتا ہوں اور انہیں تسلی بھی دے دیتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ میری باتوں سے مطمئن ہو جائیں گے کیونکہ وہ اپنی آنکھوں سے مریضوں کو صحت یاب ہوتے دیکھ چکے ہیں۔'' ڈاکٹر مارٹی نے اس بار اطمینان بھرے لہجے میں کہا تو ایڈیسن نے او کے کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ اب اس کے چہرے پر گہرے اطمینان کے تاثرات تھے۔

تقریباً دو گھنٹے گزرنے کے بعد ہی اس کے سیل فون کی گھنٹی دوبارہ بج اٹھی نمبر بوتھم کا تھا۔

''ہیلو۔'' ایڈیسن نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''ڈاکٹر ایڈیسن آپ کے اسپتال کے کچھ ڈاکٹرز نے حکومت کے کچھ ذمے دار افراد سے رابطہ کیا ہے اور ان ذمے دار افراد میں آپ کا یہ ناچیز دوست بھی شامل ہے۔ ڈاکٹرز نے بتایا ہے کہ آپ کا دریافت کردہ وائرس ان کے جسم پر بھی پایا گیا ہے جس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ وائرس اب ایک جسم سے دوسرے جسم میں بھی پھیل رہا ہے، یہ اطلاع حکومتی عہدے داروں کے لیے چونکا دینے والی ہے لہٰذا فوری طور پر اس میڈیکل بورڈ کے ارکان کے ٹیسٹ کیے گئے ہیں جنہوں نے آپ کے اسپتال سے صحت یاب ہونے والے افراد کا معائنہ کیا تھا۔ جس پر یہ انکشاف ہوا ہے کہ یہ وائرس ان کے جسم پر بھی موجود ہے، ہمارے لیے یہ خبر

تشویش ناک ہے کہ آپ کا بنایا ہوا وائرس اب وبائی شکل اختیار کر گیا ہے نہ جانے یہ کس کس میں منتقل ہو چکا ہے اور پھر بہت سے لوگ تو فضائی سفر کے ذریعے دوسرے ممالک بھی چلے گئے ہیں۔ ہمیں خدشہ ہے کہ یہ وائرس ان کے ساتھ دوسرے ممالک بھی جا چکا ہے اور جلد ہی یہ دنیا بھر میں پھیل جائے گا۔ مجھے نہیں لگتا کہ اب میں آپ کی گرفتاری کو روک پاؤں گا۔'' بوتھم کی خوف زدہ کر دینے والی آواز سنائی دی۔

''تم کوشش کرو۔'' ڈاکٹر ایڈیسن نے پُرزور لہجے میں کہا۔ ''وائرس پھیلتا ہے تو یہ ہر شخص کے لیے بہتر ہے۔ یہ وائرس ہر اس شخص کی حفاظت کرے گا جس پر کوئی دوسرا وائرس حملہ کرے گا۔ تم بتاؤ کیا اس وائرس سے کوئی ایک شخص بھی ہلاک ہوا ہے الٹا موت کے منہ میں جاتے ہوئے افراد زندگی کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ حکومت کو تو چاہیے تھا کہ میری گرفتاری کے بجائے مجھے میڈل سے نوازتی۔''

''ابھی تک کوئی شخص ہلاک یا بیمار نہیں ہوا جن افراد میں بھی یہ وائرس پایا گیا ہے، وہ سب صحت مند ہیں اور یہی ایک پوائنٹ ہے جو آپ کے حق میں جاتا ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ فضائی مسافروں کے ساتھ یہ وائرس پوری دنیا میں پھیل سکتا ہے اور اگر دنیا کے علم میں یہ بات آگئی کہ ہمارے ملک سے کوئی پُراسرار وائرس دوسرے ممالک میں منتقل ہو رہا ہے تو وہ احتیاط کے طور پر ہمارے فضائی سفر اور تجارت پر پابندی عائد کر دیں گے۔ اس کی وجہ سے ہمیں کتنا نقصان ہوگا آپ اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔

''ڈاکٹر ایڈیسن آپ نے ذاتی حیثیت میں یہ تجربہ کر کے حکومت کو بہت بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ آج شام سات بجے اعلیٰ سطح کی میٹنگ میں آپ کے بارے فائنل فیصلہ کیا جائے گا۔ میں آپ کی کوئی مدد کرنے سے قاصر ہوں تاہم جو فیصلہ ہوا اس بارے میں آپ کو آگاہ کر دوں گا۔'' بوتھم نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

''کیا سارے حکومتی عہدے دار پاگل ہو گئے ہیں۔'' ڈاکٹر ایڈیسن.... سیل فون سامنے ٹیبل پر پٹختے ہوئے بڑبڑایا۔ ''انہیں ابھی اندازہ نہیں کہ طب کی دنیا میں کتنا بڑا انقلاب آچکا ہے، بہرحال جلد ہی سب کو میری صلاحیتوں کا معترف ہونا پڑے گا۔''

اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور پھر آنکھیں موند لیں۔ اسے اس بات کی زیادہ پروا نہیں تھی کہ حکومت اسے گرفتار کر لے گی۔ وہ جانتا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ حکومت بھی اسے رہا کرنے پر مجبور ہو جائے گی آخر انسانیت کے مسیحا کو کب تک قید میں رکھا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر ایڈیسن کافی دیر تک اسی طرح آنکھیں موند کر بیٹھا رہا تاہم سیل فون کی گھنٹی نے اس کی محویت ایک بار پھر توڑ دی۔ اس بار فون ڈاکٹر مارٹی کا تھا۔

''ہیلو۔'' ڈاکٹر ایڈیسن نے سیل فون کان سے لگاتے ہی کہا۔

''ڈاکٹر ایڈیسن معاملات کچھ عجیب اور قابو سے باہر ہو گئے ہیں۔ ہمارے اسپتال سے خطرناک وائرس میں مبتلا جو مریض صحت یاب ہو کر گئے تھے، اب سے کچھ دیر قبل ان میں سے زیادہ تر پھر سے ہمارے اسپتال آئے گئے ہیں۔ ان سب کو ایک مشترکہ پرابلم کا سامنا ہے اور وہ پرابلم یہ ہے کہ سب کو سانس لینے میں دشواری کا سامنا ہے۔ میں نے آکسیجن لگا دی ہے مگر مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی بڑا خطرہ ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔'' ڈاکٹر مارٹی کی آواز سنائی دی تو ایڈیسن چونک پڑا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''مطلب یہ کہ ڈاکٹر ایڈیسن مجھے لگتا ہے کہ آپ کے جینیاتی تبدیلی والے وائرس نے دوسرے جراثیموں کا تو خاتمہ کر دیا ہے مگر کچھ عرصہ انسانی جسم پر گزارنے کے بعد اب اس میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ میں لیب میں آپ کے کہنے پر مسلسل اس وائرس کو ٹیسٹ کر رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ درجہ حرارت تبدیل ہوتے ہی اس وائرس نے اپنے اندر مزید جینیاتی تبدیلیاں کر لی ہیں جس کے بعد وائرس نے انسانی جسم پر بھی حملہ شروع کر دیا ہے پچھلے دو دنوں میں درجۂ حرارت میں کافی تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔'' ڈاکٹر مارٹی نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، وہ وائرس کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔'' ڈاکٹر ایڈیسن نے تیز لہجے میں کہا۔ ''ممکن ہے یہ مریض دوبارہ کسی خطرناک وائرس کا شکار ہو گئے ہوں؟''

''میرا نہیں خیال کہ ایسا ہے۔'' ڈاکٹر مارٹی نے کہا۔ کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ تمام آنے والے مریضوں میں بیماری کی علامات مشترکہ ہیں۔ سب کو سانس لینے میں دشواری کا سامنا ہے دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے اسپتال کے عملے کو بھی سانس لینے میں دشواری ہو رہی ہے۔ میں خود بھی اپنے گلے میں تکلیف محسوس کر رہا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے میرا گلا پکڑ لیا ہے۔ یہ معاملہ اب طول پکڑتا جا رہا

ہے۔ مجھے شک ہے کہ وہ وائرس اب آہستہ آہستہ مہلک ہوتا جا رہا ہے۔ یہ خبر میڈیا تک بھی پہنچ چکی ہے کہ ہمارے اسپتال سے ڈسچارج ہونے والے مریض واپس آنے لگے ہیں اور ان سب کو ایک ہی قسم کی تکلیف کا سامنا ہے۔ شاید ان مریضوں کے اہلِ خانہ نے یہ خبر میڈیا کو دی ہے ورنہ اتنی جلدی مریضوں کی آمد کا انہیں علم نہیں ہو سکتا تھا اب سے کچھ دیر قبل تو ان مریضوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔''

''نہیں نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، میں نے پوری تسلی کرنے کے بعد ہی اس ویکسین کو مریضوں پر آزمایا تھا۔ آپ مجھے ایک گھنٹے بعد فون کریں میں چیک کرتا ہوں کہ اس وائرس پر درجۂ حرارت بدلنے سے کیا اثر ہوا ہے، میں کئی دنوں سے اپنی ذاتی لیبارٹی میں نہیں گیا۔'' یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر ایڈیسن نے رابطہ منقطع کر دیا اور تیزی سے اٹھ کر اپنی لیبارٹری کی جانب بڑھ گیا اگرچہ اس نے وہ ڈیڈ باڈی تلف کر دی تھی جس پر جینیاتی تبدیلی والے وائرس کے تجربات کیے تھے تاہم اس کے لیب میں چھوٹی چھوٹی ٹیوبز میں اس وائرس کے سیمپل موجود تھے۔

لیب میں وائرس کا خوردبینی جائزہ لیتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر مارٹی ٹھیک کہہ رہا تھا کہ درجۂ حرارت تبدیل ہوتے ہی اس وائرس نے اپنے اندر ایک اور جینیاتی تبدیلی کر لی تھی۔ وہ کچھ دیر تک لیب میں رہا اور پھر باہر نکل آیا۔ ڈرائنگ روم کی ٹیبل پر بیٹھتے ہی اس نے ڈاکٹر مارٹی کا سیل فون ملا دیا۔ وائرس میں ہونے والی اس خود ساختہ تبدیلی نے اسے ذہنی طور پر خاصا پریشان کر دیا تھا اور اب وہ جاننا چاہتا تھا کہ کلینک کے مریضوں کی حالت کیسی ہے۔

''ہیلو ڈاکٹر مارٹی اب کیا صورتِ حال ہے۔'' جیسے ہی ڈاکٹر مارٹی نے فون اٹینڈ کیا، اس نے تیز لہجے میں کہا۔

''ڈاکٹر ایڈیسن آپ کہاں تھے، میں کافی دیر سے آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر گھنٹی بجنے کے باوجود آپ فون نہیں اٹھا رہے تھے۔'' دوسری طرف سے ڈاکٹر مارٹی نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''معاف کیجیے گا ڈاکٹر مارٹی میں دراصل لیب میں تھا اور میرا سیل فون ڈرائنگ روم کی ٹیبل پر موجود تھا اس لیے آپ کا فون اٹینڈ نہیں کر سکا بہرحال بتائیے کیا پرابلم ہے اور یہ آپ کی آواز کو کیا ہو گیا ہے؟''

''مجھ سے ٹھیک طرح بولا نہیں جا رہا۔'' ڈاکٹر مارٹی نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''اور میں آپ کو اس لیے فون کر رہا تھا کہ صورتِ حال یک بہ یک..... انتہائی سنگین ہو گئی ہے۔ مریضوں میں سے دس مریض ہلاک ہو گئے ہیں اور دوسروں کی حالت بھی تشویش ناک ہے جب کہ ہمارے اسپتال کے دو ڈاکٹر بھی سانس کی تکلیف کی وجہ سے انتقال کر گئے ہیں۔ ہم نے اطلاع حکومت کے اعلیٰ حکام کو دے دی ہے اور انہوں نے ہمیں مزید کسی مریض کو داخل کرنے سے منع کر دیا ہے۔ کچھ ہی دیر میں حکومت کی ٹیم یہاں پہنچ کر ہمارے پورے اسپتال کو اپنے قبضے میں لے لے گی انہیں وائرس کے پھیلنے کا خدشہ ہے مگر مجھے لگتا ہے انہیں دیر ہو چکی ہے۔ وائرس تو پورے شہر میں ان مریضوں کے ذریعے ہی پھیل چکا ہو گا جو اب دوبارہ یہاں آئے ہیں اُف یہ میری سانس کو کیا ہو رہا ہے، میرا دم گھٹنے لگا ہے۔'' بات کرتے ہوئے یکلخت ڈاکٹر مارٹی کی گھٹی گھٹی سی آواز سنائی دی اور پھر رابطہ منقطع ہو گیا۔

ڈاکٹر ایڈیسن اپنی جگہ سے کھڑا ہو کر ہیلو ہیلو کرتا رہا مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔

صورتِ حال یکدم مخدوش ہو گئی تھی، اسے اب خطرے کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس کی ٹانگوں نے مزید اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور وہ بے اختیار صوفے پر گر پڑا، اسے اب اس حقیقت کا ادراک ہو گیا تھا کہ درجۂ حرارت کی تبدیلی نے اس وائرس پر کوئی ایسا منفی اثر کیا تھا جس کی وجہ سے وہ انسانی جسم کا بھی دشمن ہو گیا تھا گویا اس کا تجربہ ناکامی سے دوچار ہو چکا تھا جس کے انتہائی بھیانک نتائج ظاہر ہونا شروع ہو چکے تھے۔

مجھے حکومت کو بتانا چاہیے کہ یہ فارمولا میرا نہیں بلکہ ڈاکٹر مورس کا تھا، میرا بھلا اس میں کیا قصور، میں نے تو انسانیت کی بھلائی کی کوشش کی تھی۔ اس نے سوچا مگر پھر اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اب وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اس فارمولے پر قبضہ جمانے کے لیے خود ہی تو ڈاکٹر مورس کو قتل کروایا تھا اگر وہ مورس کا نام لیتا تو... پھر مورس کے مرڈر کے بارے میں پولیس کی تفتیش کا رخ بھی اس کی جانب مڑ جاتا۔ پولیس کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ مورس کا قتل اس کے فارمولے پر قبضہ جمانے کے لیے کیا گیا تھا۔

اور پھر اپنے اسپتال میں اس وائرس کو مریضوں پر آزمانے کا وہ بوتھم کے سامنے اعتراف بھی کر چکا تھا وہ دنیا کے سامنے ایک مسیحا بننے کا خواہش مند تھا مگر یہاں سب الٹا ہو گیا تھا۔ وہ کافی دیر تک اسی حالت میں بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر مارٹی نے کہا تھا کہ بات میڈیا تک بھی پہنچ چکی ہے۔ ذرا

دیکھا تو جائے میڈیا پر کیا خبریں ہیں؟ اس نے ٹیبل پر پڑا ٹی وی ریموٹ اٹھایا اور پھر ٹی وی آن کر دیا مگر ٹی وی آن کرتے ہی جو خبریں سننے کو ملیں، اس نے ڈاکٹر ایڈیسن کے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ میڈیا پر شہر میں کسی پُراسرار وائرس کے پھیلنے کی خبر گردش کر رہی تھی ساتھ ہی بتایا جا رہا تھا کہ شہر میں لوگوں کی اموات ہونا شروع ہوگئی ہیں۔ کسی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ یہ کیا ہو رہا ہے بس اتنا معلوم ہے کہ اس وائرس کو پھیلانے میں مشہور ماہر طبیعیات ڈاکٹر ایڈیسن کا کوئی نہ کوئی عمل دخل ضرور ہے اور اس کی تصدیق حکومت کے کچھ ذمے دار افراد کی جانب سے بھی کی گئی ہے۔

وہ ایک گھنٹے تک مسلسل خبریں دیکھتا رہا۔ ہر دو منٹ بعد بریکنگ نیوز جاری ہو رہی تھی اور بتایا جا رہا تھا کہ شہر کے عام بازاروں اور پبلک ایریاز میں بھی لوگ بے ہوش ہو کر گرنے لگے ہیں۔ کچھ کی موت موقع پر ہی واقع ہوگئی ہے۔ خوفناک وائرس بہت تیزی سے پھیل رہا ہے۔ حکومت کی جانب سے کچھ دیر میں اہم اعلانات متوقع ہیں۔

اسی لمحے اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ نمبر دیکھتے ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ بوتھم کا فون ہے۔

''ہیلو۔'' اس نے کہا تاہم اسے اپنی آواز.... بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''ڈاکٹر ایڈیسن تمہارے وائرس نے تباہی پھیلا دی ہے۔'' بوتھم کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی، شہر میں لوگ مرنے لگے ہیں۔ ہماری حکومتی میڈیکل ٹیم کے دس میں سے چھ افراد مر چکے ہیں اور ابھی مجھے اطلاع ملی ہے کہ تمہارے اسپتال کے انچارج ڈاکٹر مارٹی بھی تمہارے اس تجربے کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ تمہارے اسپتال کو حکومتی قبضے میں لیا جا چکا ہے مگر ہمیں لگتا ہے کہ بہت دیر ہو چکی ہے۔''

''میں نے کچھ نہیں کیا، میں تو بس انسانیت کی بھلائی کے لیے کام کرنا چاہتا تھا۔'' ڈاکٹر ایڈیسن نے کمزور سے لہجے میں کہا۔

''تمہاری بھلائی نے سب کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ شہر میں کتنے لوگ اس وائرس کا شکار ہو گئے ہیں، کتنے مر گئے اور کتنے موت کے دہانے پر کھڑے ہیں۔'' بوتھم نے چنگھارتے ہوئے کہا۔ ''اب تک کی اطلاعات اور تمہارے اسپتال کے ڈاکٹرز سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق یہ وائرس ایک جسم سے دوسرے جسم میں آسانی سے منتقل ہو رہا ہے۔ ہمارے ماہرین کے مطابق اگر ایسا ہوتا رہا تو یہ وائرس جلد ہی پورے ملک بلکہ دنیا بھر میں پھیل جائے گا۔ تم نے لاکھوں کروڑوں زندگیوں کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ کچھ ہی دیر میں تمہیں گرفتار بھی کر لیا جائے گا۔ پولیس تمہارے گھر تک پہنچنے ہی والی ہے۔''

''مگر میں.....'' ڈاکٹر ایڈیسن نے ڈاکٹر موریس کا نام لینا چاہا لیکن اس کی آواز اس کے حلق میں ہی اٹک گئی۔

''اب اگر مگر کا وقت گزر چکا ہے۔'' بوتھم نے کہا۔ ''تمہیں انجام بھگتنا ہوگا۔ ابھی کچھ ہی دیر میں حکومت کی جانب سے میڈیا پر اعلان کیا جائے گا کیونکہ یہ وائرس وبائی صورت اختیار کر گیا ہے اس لیے حکومت نے ملک بھر میں مکمل لاک ڈاؤن کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے تاکہ اس وائرس کو مزید پھیلنے سے روکا جاسکے۔ تمام تعلیمی ادارے ائرپورٹس ٹرانسپورٹس، مارکیٹیں آج سے غیر معینہ مدت کے لیے بند کی جا رہی ہیں سڑکوں پر فوج طلب کی جا رہی ہے۔ کسی .... کو بھی ماسک کے بغیر ڈیوٹی دینے کی اجازت نہیں ہوگی تم انسانیت کے مسیحا بننے کے خواہشمند تھے، تمہیں دنیا ایک مسیحا کے طور پر نہیں بلکہ ایک شیطان کے طور پر ہمیشہ یاد رکھے گی۔ گرفتاری کے بعد تمہیں عبرت کا نشان بنایا جائے گا۔'' بوتھم نے اپنے آخری الفاظ تقریباً دہاڑتے ہوئے کہے اور اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہوگیا۔

ڈاکٹر ایڈیسن ششدر نگاہوں سے کچھ دیر تک خالی خالی نگاہوں سے اپنے موبائل فون کو تکتا رہا اور پھر اس نے یکلخت موبائل فون کو سامنے دیوار پر دے مارا شاید اب اسے اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

اس کے ذہن میں بوتھم کے الفاظ اب بھی گردش کر رہے تھے کہ پولیس اسے گرفتار کرنے کچھ ہی دیر میں پہنچ جائے گی۔ دنیا اسے اب ایک مسیحا کے طور پر نہیں بلکہ ایک شیطان کے طور پر ہمیشہ یاد رکھے گی۔

ڈاکٹر ایڈیسن اٹھا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس نے اپنی الماری کھولی اور پھر اپنا پسٹل نکال لیا۔ پسٹل کا سیفٹی لاک ہٹا کر اس نے پسٹل اپنی کنپٹی سے لگالیا۔

''دنیا اب مجھے ایک ایسے شیطان کے طور پر یاد رکھے گی جس نے ہزاروں یا شاید لاکھوں زندگیوں کو خطرے میں ڈال دیا۔ میں نے اپنے دوست کو اس کی ایجاد کا کریڈٹ لینے کے لیے قتل کروایا تھا مگر اب اس کے حصے کی لعنت مجھے ملے گی مگر میں یہ نہیں دیکھ سکوں گا کبھی نہیں دیکھ سکوں گا۔'' ڈاکٹر ایڈیسن نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی ٹریگر دبا دیا۔



سرورق کی پہلی کہانی



مال مست

رو بینہ رشید

جنم لینے سے مرتے دم تک خواہشوں اور نا خواہشات کا ایک شور ہوتا ہے... والدین کے گھر سے آغاز ہونے والی زندگی میں بے فکری کے لمحات ساتھ ہوتے ہیں... ایسے ایسے گوشے میسر ہوتے ہیں... جہاں کسی بھی شخص کی نگاہیں سفر نہیں کر سکتی تھیں... آگے بڑھتے بڑھتے زندگی گویا ایک تماشا بن جاتی ہے... نازک... دلکش اور کومل سی لڑکی کی زندگی میں آنے والی تبدیلیاں... اس کی زندگی میں رشتے... محبتیں... رفاقتیں سب معنی رکھتی تھیں... مگر اس کی زندگی میں ایسا ہم سفر در آیا جس کی نگاہ میں محبتیں... چاہتیں... رفاقتیں... قربتیں سب بے معنی تھیں، کچھ اہم تھا تو وہ مال مفت... مال مست کی چاہ رکھنے والے بے رحم... عیّار... فریب کار کی جال سازیاں...

اس لڑکی کا فسانۂ حقیقت جو دھوکوں کے مایا جال میں پھنس گئی تھی......

موسم صبح سے بہت اچھا ہو رہا تھا۔ کومل کو ایک خاص رپورٹ کے انٹرویو کے لیے سائٹ ایریا جانا تھا۔ نیوز وین وہاں پہنچنے ہی والی تھی اور اسے گھر سے نکلنے میں معمول کے مطابق دیر ہو گئی تھی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ اس پر گھر کی ذمّے داریوں کا کچھ بوجھ تھا مگر دیر سے پہنچنا اس کا ٹریڈ مارک بن گیا تھا۔ پہلے اس کی وجہ اس کی نیند ہوا کرتی تھی۔ رات کتنی ہی جلد سو جاتی، کتنے ہی منصوبے بنا لیتی، کتنے ہی الارم بج بج کر گھر بھر کو جگا دیتے مگر وہ اپنے وقت پر ہی اٹھ کر دیتی مگر اب سب کچھ بدل گیا تھا۔ ننھے سمیر کی آمد کے بعد سے اس کا اپنا سارا وقت اسی کے لیے مخصوص تھا۔ سمیر کا خیال اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آیا۔ اس نے سامنے رکھے موبائل کو ٹچ کیا، اسکرین پر سمیر کی تصویر چمکنے لگی۔

''او...... ماما مِس یُو لٹل چیمپ......'' وہ اسے دیکھ کر بولی۔

اسی وقت اس کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے فون کان سے لگالیا۔
''میڈم ہم پہنچ گئے ہیں، آپ کتنی دور ہیں؟'' دوسری جانب ان کا کیمرا مین شاہنواز تھا۔
''بس دس منٹ میں...... شاہنواز رش بہت ہے یہاں۔''
''بہتر...... مگر مجھے ڈیڑھ گھنٹے بعد منسٹر کی میٹنگ کو بھی کور کرنا ہے۔'' وہ اسے یاد دلاتا ہوا بولا۔
''ارے فکر نہ کرو...... ہمارا پیکیج تو صرف پندرہ منٹ کا ہے پھر تم نکل جانا...... میں پہنچ رہی ہوں، تم اتنی دیر میں علاقے کے کچھ رینڈم شاٹس لے لو۔'' وہ بولی۔
رش تو واقعی کافی زیادہ تھا مگر گڑبڑ کی بڑی وجہ بدانتظامی اور اصولوں کا خیال نہ رکھنا تھا۔ ہر کسی کو بہت جلدی تھی یوں ذرا سی بھی جگہ نظر آتے ہی اپنی لائن چھوڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش سارے نظام کو بگاڑ دیتی تھی خصوصاً موٹر سائیکل سوار تو گویا ''اس ہاتھ پر سر اس پیر جگر'' کی تفسیر بنے گھوم رہے تھے۔ کومل خود فاسٹ لائن میں تھی اور اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ اس کا فون ایک بار پھر بج اٹھا۔ اس بار اسکرین پر چمکنے والا نمبر اس کے شوہر شاہ میر کا تھا۔ اس نے ٹریک کی وجہ سے ایک لمحے کو سوچا پھر کال ریسیو کرلی۔
''ہاں شاہ میر بولو......''
''کہاں ہو، معلوم کر رہا تھا کہ پہنچی کہ نہیں......'' وہ بولا۔
''ابھی کہاں؟ ابھی تو آدھا راستہ بھی نہیں ہوا، یار کافی لیٹ ہوگئی میں آج......'' اس نے تاسف سے کہا۔ ''اوہ...... ارے......'' وہ یکدم چونکی اور فون اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔
دورویہ سڑک پر سامنے سے آنے والا منی ٹرک اس کی گاڑی کو تقریباً چھوتا ہوا گزرا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس کی کار کو اڑا دینا چاہتا ہو، کومل نے بمشکل گاڑی کو دوسری جانب موڑا۔ اس کی اپنی رفتار خاصی تیز تھی پھر سڑک پر کافی گاڑیاں موجود تھیں۔ اس کے اس طرح مڑنے سے کئی گاڑیاں ڈسٹرب ہوئی تھیں۔ اس نے گاڑی کو روکنا چاہا مگر کچھ بھی نہ ہوا کار اسی تیز رفتاری سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے بریک پر پورا وزن ڈال دیا مگر بریک نیچے جا کر گویا غائب ہوگیا تھا۔ کومل کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، وہ تو اپنی گاڑی کی مکمل چیکنگ، آئل سروس وغیرہ سب پابندی سے کراتی تھی۔ اس کی گاڑی سڑک پر پھسلتی ہوئی پہلے ایک سرخ کار سے ٹکرائی پھر ایک رکشے کو ٹکر مارتی ہوئی فٹ پاتھ کی طرف بڑھی۔ چند قدم آگے فٹ پاتھ پر بس اسٹاپ تھا جس پر اس وقت خاصے لوگ موجود تھے۔ کومل کا دل اس کے کانوں میں دھڑک رہا تھا۔ اس نے اسٹیئرنگ کو گھمانے کی بھرپور کوشش کی مگر یکلخت اسٹیئرنگ بھی جام ہوگیا۔ وہ بے حد خوف زدہ تھی۔ چلا چلا کر لوگوں کو بتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس کی گاڑی کا بریک خراب ہو گیا ہے۔ اسٹیئرنگ کو موڑنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اس کے دونوں پیر بریک پر تھے مگر اس سب کے باوجود گاڑی تیزی سے بس اسٹاپ کی جانب بڑھ رہی تھی۔ کار کو اس طرح اپنی جانب آتا دیکھ کر اسٹاپ پر بھگدڑ مچ گئی۔ وہاں کالج کی کئی لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ سب تو اِدھر اُدھر ہو گئے تھے مگر ایک لڑکی اپنی جگہ جمی کھڑی رہ گئی تھی۔ اس کی خوف زدہ نظریں کار پر ٹکی ہوئی تھیں۔
''ہٹ جاؤ، ہٹ جاؤ بریک نہیں ہے۔'' کومل پاگلوں کی طرح چلا رہی تھی۔ ''پلیز ہٹ جاؤ......'' مگر وہ ساکت کھڑی خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ بالآخر کار کسی بدمست ہاتھی کی طرح اس لڑکی سے جا ٹکرائی۔ لڑکی کسی گڑیا کے مانند ہوا میں اچھلی اور کئی فٹ دور جا گری۔ کار اب بھی نہیں رکی تھی۔ وہ فٹ پاتھ پر بنی نشست سے ٹکراتی ہوئی سروس روڈ پر آئی اور پھر سامنے موجود عمارت کی دیوار سے ٹکرا گئی۔ کومل ان جھٹکوں سے اپنی جگہ سے اچھلی اور پھر سیٹ پر گری تھی۔ اس کا سر اسٹیئرنگ سے ٹکرایا۔ اس نے ایک لمحے کو سر اٹھایا اور پھر دوبارہ ڈھے گئی۔ اس کے سر سے نکلنے والے خون کی لکیر اس کے چہرے کو بھگو رہی تھی۔ نیم بے ہوشی سے مکمل بے ہوشی تک کے سفر کے دوران میں اس کے ذہن میں سوالیہ نشان ہی ناچ رہے تھے۔

☆☆☆

اس کے لیے آج کا دن بہت اہم تھا۔
اس دن کے لیے اس نے بہت لمبی پلاننگ کی تھی۔ اس کی تمام خوشیوں اور آنے والی زندگی کا انحصار آج کے دن پر ہی تھا۔ وہ بہت بے چینی سے اس خبر کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا فون سامنے میز پر سجا تھا، وہ ہر تھوڑی دیر بعد فون کی جانب دیکھ رہا تھا۔ کافی انتظار کے بعد وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا، اسے اپنا یہ پلان بھی پچھلی دو کوششوں کی طرح ...... خراب ہوتا نظر آرہا تھا۔ اس نے جھنجلا کر فون اٹھایا اور ایک نمبر ملایا۔
''سنو تم نے اپنا کام پورا کیا تھا؟'' اس نے سلسلہ

ملتے ہی سرد لہجے میں پوچھا۔

''بالکل، اپن اپنا کام ہمیشہ پورا کرتا ہے...... اسی بات کا تو پیسا ملتا ہے نا...... یہ سوال پوچھنے کی ضرورت کیوں ہوئی صاب......؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ ''اور ہاں میرا روکڑا مجھے کب تک مل جائے گا؟''

''پیسا دیا تو ہے تمہیں، پھر کیوں جان نکل رہی ہے؟''

''آدھا...... آدھا پیسا دیا ہے صاب، اپن کے پیسے کے معاملے میں گجنی نہیں بننے کا۔ وہ کیا ہے شارٹ ٹائم میموری لاسٹ ورنہ اپنے کو یادداشت واپس لانا آتا ہے۔'' وہ غرایا۔

''بکواس بند کر...... کام مکمل ہو جائے گا تو پیسا بھی مل جائے گا۔''

''اپن کام مکمل کر چکا، باقی تمہاری قسمت صاب...... اپن کو آج روکڑا مل جانا چاہیے۔ وہ کیا ہے کہ تاکہ اپن کا منہ بند ہو جائے۔''

''مل جائے گا۔'' اس نے اتنا کہہ کر فون رکھ دیا۔ اسے اس کا منہ تو بند کرنا ہی تھا مگر سب سے پہلے اسے ''خوش خبری'' کا انتظار تھا۔

☆☆☆

کومل کی آنکھ کھلی تو اسے چند لمحوں تک کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

''اوہ تم ہوش میں آگئیں۔'' پاس کھڑی نرس نے اسے دیکھ کر کہا۔

''مم میں بے ہوش تھی؟ کک کیا ہوا تھا مجھے؟ میں اسپتال میں ہوں۔'' وہ بمشکل بول پا رہی تھی۔ اس کے سارے جسم میں درد کی ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں۔

''ہاں اسپتال میں ہو، اکیلی نہیں ہو اپنے ساتھ چار چھ بندے بھی لے کر آئی ہو۔'' تیز طرار نرس نے تڑاخ سے جواب دیا۔ ''اور ہاں، چار گھنٹے ہو گئے تمہیں اسپتال لائے۔''

''کیا مطلب......'' اس نے ذہن پر زور ڈالا، لمحے بھر میں گزرے ہوئے حادثے کی فلم اس کی نظروں کے سامنے سے گزر سی گئی۔ اس نے ہڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کی مگر سر میں اٹھنے والی درد کی شدید لہر کی وجہ سے اٹھ نہیں پائی۔

''اٹھو مت...... تمہارے سر میں چوٹ ہے، چند گھنٹوں میں کچھ آرام آجائے گا فکر صرف یہ تھی کہ کوئی اندرونی چوٹ نہ ہو۔'' نرس نے ہمدردی سے کہا۔

''وہ لڑکی کیسی ہے؟'' کومل نے چند لمحوں بعد ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''وہ جسے تم نے ٹکر ماری تھی......؟''

''گاڑی کا بریک فیل ہو گیا تھا...... مم میں نے جان کر کچھ نہیں کیا......''

''مگر ہوا تو وہ ہی نا...... اس بے چاری کے پیروں کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ میں ہی تھی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ، اس لیے مجھے معلوم ہے، جانے اب بھی وہ چل بھی پائے گی یا نہیں...... اس کے علاوہ بھی کئی زخمی تھے، رکشے والا اور تین اور لوگ......''

''اوہ میرے خدا......'' کومل کا سر چکرا رہا تھا۔

''سسٹر...... تم نے اپنی لن ترانی شروع کر دی، تم سے کہا ہے نا کہ کم بولا کرو......'' ڈاکٹر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے نرس کو گھورا۔

''نہیں ڈاکٹر صاحب میں تو بس اسے بتا رہی تھی۔''

''بلڈ پریشر وغیرہ چیک کر لیا ہے؟'' ڈاکٹر نے اس کی فائل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''جی...... جی......''

''ڈاکٹر صاحب...... مجھے فون مل سکتا ہے؟'' کومل نے پوچھا۔

''آپ کا فون پولیس والوں کے پاس ہے۔'' ڈاکٹر بولا۔

''پولیس......'' کومل نے بے اختیار کہا۔

''ہاں ظاہر ہے کہ یہ پولیس کیس ہے، اب آپ بہتر ہیں، تھوڑی دیر بعد آپ کا بیان ہوگا۔''

''میں اپنے شوہر کو بلوانا چاہتی ہوں۔'' وہ بمشکل بولی۔

''انہیں اطلاع کر دی گئی ہے، اور وہ باہر موجود ہیں، اصل میں آخری نمبر انہی کا تھا پولیس نے ان کو کال کر دی تھی۔''

''شکریہ......'' کومل نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو گیا تھا۔ ''میں اپنے شوہر سے مل سکتی ہوں؟''

''بالکل...... پولیس والے بھی تمہارا بیان لینا چاہتے ہیں، تم خود کو ان سے بات کرنے کے لیے بہتر محسوس کر رہی ہو؟'' ڈاکٹر نے نرمی سے پوچھا۔

''جی...... بات تو کرنا ہی ہوگی۔'' کومل نے دھیرے

سے کہا۔

''اوکے...... میں بھیج رہا ہوں اُن کو۔''

''مگر اُن سے پہلے میں شاہ میر سے ملنا چاہتی ہوں۔'' اس نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

''بالکل، میں بھیجتا ہوں ان کو۔''

ڈاکٹر کے جانے کے چند لمحوں بعد ہی شاہ میر کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔

''کومل تم گھبراؤ مت......'' اس نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''یہ سب کیا ہو گیا شاہ میر...... ہم اس سے باہر کیسے نکلیں گے؟ مجھے اپنا فون دو، میں چینل پر بات کروں، کسی سے کچھ کہلوانا پڑے گا۔''

''نہیں اس طرح یہ معاملہ خراب ہو جائے گا۔'' وہ بولا۔ ''ویسے بھی یہ خبر تو اب تک تمام چینلز پر چل ہی چکی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''حادثے کی خبر...... اور تمہارے بارے میں بھی، تم بھی ایک اچھی رپورٹر ہو...... اس کی وجہ سے دوسرے چینلز زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

''مطلب...... کیا وہ مجھے الزام دے رہے ہیں؟'' کومل نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ہاں ایک طرح سے...... عینی شاہدوں کے مطابق تم موبائل استعمال کر رہی تھیں اور گاڑی بے قابو ہو گئی۔'' وہ جھجک کر بولا۔ ''کاش میں نے تمہیں فون نہ کیا ہوتا۔''

''مگر گاڑی اس وجہ سے بے قابو نہیں ہوئی تھی اس کا بریک اور اسٹیئرنگ دونوں جام ہو گئے تھے شاہ میر......''

''اوکے...... اوکے...... فی الحال تم انسپکٹر سے بحث مت کرنا، میری اس سے بات ہو گئی ہے، وہ سب ٹھیک کر لے گا۔ ہمیں اس کو کچھ روپے دینے ہوں گے، وہ تمہیں اس کیس سے باہر نکال لے گا۔''

''تمہیں یقین ہے؟''

''ہاں، تب ہی تو کہہ رہا ہوں جو وہ کہے مان لینا، میری اس سے بات ہو گئی ہے۔''

''میں تو کہتی ہوں ہمیں ابھی اوپر اپروچ کرنا چاہیے۔''

''نہیں، میں اس سے بات کر چکا ہوں اگر یہ لوگ بگڑ گئے تو بہت مشکل ہو جائے گی اور ضروری نہیں ہے کہ جس سے تم بات کرو، وہ بات سنبھال بھی لے باقی تمہاری مرضی ہے۔'' وہ نروٹھے پن سے بولا۔

''ٹھیک ہے پھر...... جیسے تم مناسب سمجھو۔'' کومل نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

''گڈ...... وہ آ رہے ہیں، تم گھبرانا نہیں۔'' شاہ میر اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے۔'' کومل بولی۔ وہ اپنے ذہن میں سارے واقعات کو ترتیب دے رہی تھی تاکہ اپنا بیان لکھوا سکے۔ اس کا دل اس لڑکی اور باقی زخمیوں کے لیے بھی افسردہ تھا مگر یہ حادثہ تھا اور یقیناً گاڑی کا معائنہ یہ ثابت کر سکتا تھا۔

'میں اس لڑکی کا علاج خود کرواؤں گی اور باقی افراد کا خرچ بھی برداشت کروں گی۔' اس نے سوچا۔ 'میری گاڑی کی خرابی کی سزا انہیں کیوں ملے۔'

تمام تر اعتماد کے باوجود جب درشت چہرے والا پولیس انسپکٹر اپنے ساتھیوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو وہ خود کو نروس محسوس کرنے لگی۔ وہ تیز نظروں سے اس کی جانب گھور رہا تھا۔

''مسز کومل شاہ میر...... میں آپ کو بدترین طریقے سے گاڑی چلانے، دورانِ ڈرائیونگ موبائل استعمال کرنے، کئی افراد کو زخمی اور ایک نوجوان لڑکی کو شدید زخمی کرنے کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں، آپ اسپتال میں ہماری نگرانی میں رہیں گی۔ یہاں سے ڈسچارج ہوتے ہی آپ کو کسٹڈی میں لے لیا جائے گا۔''

اس کے یہ الفاظ کومل کی سماعت پر بم کی طرح گرے تھے یہ تو اس نے سوچا تک نہیں تھا۔

''مگر میں نے کچھ نہیں کیا ہے انسپکٹر صاحب، میری گاڑی کا بریک جیم ہو گیا تھا۔'' وہ بمشکل بولی۔

''آپ کا بیان لیا جائے گا...... بہتر ہوگا کہ آپ اپنے لیے کسی وکیل کا بندوبست کر لیں کیونکہ زخمی ہونے والی لڑکی اب تک بے ہوش ہے اور اس کے ماں باپ نے آپ کے خلاف ایف آئی آر کٹوا دی ہے۔''

کومل پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی پھر اس نے پلٹ کر شاہ میر کی جانب دیکھا جس نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں مطمئن رہنے کا اشارہ کیا...... کومل کا سر چکرا رہا تھا، آنکھوں کے سامنے پتنگے سے ناچ رہے تھے۔ انسپکٹر کی آواز اسے لحہ بہ لحہ دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی پھر یکدم اس کے اردگرد بلیک آؤٹ ہو گیا۔

☆☆☆

رات گہری ہو چلی تھی۔

وہ اپنی کار سے نکلا، اس نے سیاہ پینٹ شرٹ پر ہوڈی پہن رکھی تھی۔ ہوڈی کی کیپ اس کے سر پر کچھ اس طرح موجود تھی کہ اس سے اس کا چہرہ تقریباً چھپ سا گیا تھا۔ اس کا رخ کچھ دور موجود پارک کی جانب تھا۔ اس پارک میں باہر کی جانب گاڑیوں کی پارکنگ کا انتظام تھا جہاں اس وقت بھی چند کاریں نظر آرہی تھیں مگر اس نے اپنی کار اس سے کچھ فاصلے پر کھڑی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ بڑے بڑے درختوں سے سجے اس خوب صورت پارک میں اندھیرا اور گہرا محسوس ہو رہا تھا۔ دور دور لگے گلوب میں چمکتے بلب ماحول کو مزید پُراسرار بنا رہے تھے۔ اس پارک کی خاص بات اس کا رات گئے تک کھلا ہونا تھا۔ اس وقت بھی وہاں کافی کافی فاصلے پر کچھ لوگ جوگنگ کرتے اور ٹہلتے نظر آرہے تھے۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا پارک کے آخری حصے میں پہنچ گیا جہاں وہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''صاب آپ نے بہت رات کردی اور بلایا بھی اس بکواس جگہ پر......'' وہ اسے دیکھتے ہی اس کے قریب آگیا۔

''ہاں، میں کچھ کاموں میں اُلجھ گیا تھا...... اور تمہیں اتنا خوب صورت پارک بکواس لگ رہا ہے۔'' وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

''اپن کو پسند نہیں یہ جگہ...... اتنی دور اور ایسی اُجاڑ...... بڑے لوگوں کے بڑے چوچلے۔'' وہ منہ بنا کر بولا۔ ''میرا روکڑا لائے ہو؟''

''ہاں، ہاں بالکل...... آؤ یہاں اس بینچ پر بیٹھتے ہیں۔'' وہ درختوں کی دوسری جانب موجود بینچ کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

''بیٹھنے کا کیا ہے...... بس کام کرتے ہیں اور نکلتے ہیں۔''

''یہاں بیچ بازار میں تو پیسے نہیں نکال سکتا نا...... کسی بھی وقت کوئی گارڈ آسکتا ہے۔'' اس نے اسے گھورا۔

''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' اس نے سر ہلایا اور وہ دونوں بینچ پر جا بیٹھے۔

''صاب کیا کوئی مہورت نکالو گے پیسا دینے کے لیے؟'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بالآخر بول اٹھا۔

''نہیں...... میں تو بس یہ سوچ رہا تھا کہ تم کام کے آدمی ہو مسئلہ صرف یہ ہے کہ بولتے بہت ہو...... خیر اب کام کر ہی لیتے ہیں۔'' اس نے یہ کہہ کر جیب میں ہاتھ ڈالا جب اس کا ہاتھ جیب سے باہر آیا تو اس میں ریوالور چمک رہا تھا۔ اس کی نال پر موجود سائلینسر نے اس کی لمبائی میں کچھ اضافہ کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ دوسرا شخص اپنی جگہ سے حرکت بھی کر پاتا، ہوڈی والے نے نال کو اس کے دل پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ گولی چلاتے ہی وہ تیزی سے کھڑا ہو گیا تھا تاکہ اس کے کپڑے خون کے دھبوں سے بچے رہیں۔ دوسری گولی اس نے اس کے سر پر ماری اور پھر ریوالور جیب میں رکھ کے گنگناتا ہوا باہر کی طرف چل دیا۔ پارک سے نکل کر کار تک پہنچنے میں اسے چند منٹ لگے تھے۔ سیٹ پر بیٹھ کر اس نے سر سے ہوڈی کی کیپ اتاری...... شیشے میں اپنے عکس کو دیکھ کر مسکرایا اور اگنیشن میں چابی گھمائی۔ اگلے لمحے اس کی سیاہ کار سڑک پر تیرتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

کوئی ایک واقعہ کسی کی زندگی کو یکدم اس طرح الٹ پلٹ سکتا ہے، یہ کومل نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ اسے ایک ہفتے میں ضمانت پر رہائی مل گئی تھی مگر مقدمہ شروع ہو گیا تھا۔ شاہ میر نے اس انسپکٹر کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی تھی جس نے اسے یقین دہانی کرائی تھی مگر وہ کہیں غائب ہو گیا تھا۔ زخمی ہونے والی لڑکی کا باپ سیشن جج تھا۔ اس نے اور اس کی بیوی نے کومل کی تمام باتوں، معافیوں، افسوس اور پیشکشوں کو ٹھکرا دیا تھا۔ ان کی بیٹی عمر بھر کے لیے معذور ہو گئی تھی۔ وہ اسے سزا دلوانے کے درپے تھے۔ ان کے میڈیا پر بیانات نے کومل کی ریپوٹیشن کو برباد کر دیا تھا۔ اس کی ملازمت ختم ہو چکی تھی۔ اس نے بھی سب سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنا سارا [illegible]ت اپنے نو ماہ کے بیٹے سمیر کے ساتھ گزار رہی تھی۔

آج کی رات اس کے لیے بہت مشکل تھی۔ کل اس کے مقدمے کی آخری شنوائی تھی۔ ایک رپورٹر کی نظر دیکھ رہی تھی کہ سب کچھ اس کے خلاف جا رہا تھا۔ کل کیا ہوگا؟ اس سوچ نے اس کی آنکھوں سے نیند اُڑا دی تھی۔

''کومل اب سو بھی جاؤ۔ دو بجنے والے ہیں صبح ہمیں جلدی کورٹ جانا ہے۔'' شاہ میر نے نیند سے بوجھل آواز میں اسے دوسری بار کہا۔

''تم سو جاؤ شاہ میر، مجھے جب نیند آئے گی میں بھی لیٹ جاؤں گی۔'' وہ بولی۔

''ٹھیک ہے، تمہاری مرضی۔'' اس نے یہ کہہ کر سر جھٹکا اور آنکھیں بند کر لیں۔

کومل کچھ دیر سمیر کے کاٹ کے پاس کھڑی اسے سوتا دیکھتی رہی پھر قریب رکھی آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ اپنی

زندگی کے اس مشکل پل اور سب سے مشکل رات میں سوچوں میں گھری ہوئی تھی اور اس کی زندگی کا ساتھی آرام سے نیند میں کھو چکا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر شاہ میر کی طرف دیکھا۔ کیا واقعی اس سے غلطی ہوگئی تھی؟

''میں تمہاری اس بات سے متفق نہیں ہوں۔'' اس کے کانوں میں بابا کی آواز گونجی۔

''یہ لڑکا تمہارے لیے مناسب نہیں ہے...... کسی بھی اعتبار سے مناسب نہیں ہے۔''

''بابا میں اس سے محبت کرتی ہوں۔'' وہ بابا سے ہر بات بہ آسانی کر لیتی تھی۔

''ہوسکتا ہے کہ یہ تمہیں اس وقت لگ رہا ہو، تم اس سے کتنے عرصے سے واقف ہو؟''

''ایک سال ہو گیا ہے بابا......'' وہ سال پر زور دیتے ہوئے بولی۔

''ایک سال کچھ بھی نہیں ہوتا، میں تمہیں اس شادی کا مشورہ نہیں دوں گا۔''

''مشورے کی کیا بات ہے، ہم اسے یہ شادی کرنے ہی نہیں دیں گے۔'' اماں نے سختی سے کہا۔ ''آپ نے اسے بہت سر چڑھا دیا ہے مگر میں اسے اس طرح کنوئیں میں گرنے نہیں دوں گی۔''

''تو آپ میرے ساتھ زبردستی کریں گی؟'' کومل نے گستاخی کی حد تک بگڑے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں کرنا پڑی تو وہ بھی کروں گی، تمہیں گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں ملے گی۔'' بابا جتنے نرم مزاج اور صلح جُو تھے، وہ غصے کی اتنی ہی تیز تھیں۔

''مجھے یہ قبول نہیں ہے۔'' اس نے پیر پٹختے ہوئے کہا تھا۔

''تو تم سے کوئی یہ پوچھ بھی نہیں رہا۔'' وہ بھی تڑخ کر بولیں۔

''بابا میں آپ کو بتا رہی ہوں، میں صرف اور صرف شاہ میر سے شادی کروں گی اور اگر کسی نے مجھے مجبور کیا تو میں زہر پی لوں گی۔''

اُس کے ان جملوں پر بابا ساکت رہ گئے تھے۔ ان کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔

''ایک بار سوچ لو بیٹا......'' انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''میں نے سوچ لیا ہے۔'' وہ بولی تھی۔

''ارے آپ کیا باتیں کر رہے ہیں......'' اماں شدید غصے میں تھیں۔

''خدیجہ بیگم آپ تھوڑی دیر چپ رہیے......کومل جو تم نے کہا ہے کیا تم اسے نبھا سکو گی؟ اگر تمہارا یہی فیصلہ ہے تو مجھے منظور ہے۔ میں تمہاری شادی اس لڑکے سے کرا دوں گا۔''

''ارے توقیر احمد یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' اماں سے رہا نہیں گیا۔

''آپ پلیز چپ رہیے بیگم......'' وہ بولے پھر انہوں نے گہری سانس لی۔ ''کومل یہ مت سمجھنا کہ ہم تمہیں تمہارے کسی حق سے محروم کریں گے...... تمہیں جائداد میں حصہ بھی مل جائے گا اور شادی بھی ہو جائے گی مگر اس کے بعد......'' وہ ٹھہر رکے۔

''تم کبھی ہم سے نہیں ملو گی...... بھول جانا کہ تمہارے کوئی ماں باپ بھی ہیں۔''

''کیا کہہ رہے ہیں آپ توقیر احمد، وہ نادان ہے مگر ہے تو ہمارے دل کا ٹکڑا۔'' اس بار اماں بھی لرز گئی تھیں۔ وہ بابا کے فیصلوں اور ان کی کومل سے چاہت دونوں کو جانتی تھیں۔

کومل چند لمحے ان کو دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''مجھے منظور ہے۔'' اسے یقین تھا کہ وہ ایسا نہیں کر پائیں گے۔ اس کے اس جملے نے بابا کو جیسے توڑ دیا تھا۔ ان کی وہ نظریں اسے اب تک یاد تھیں۔

آنسوؤں کی برسات اسے ماضی سے حال میں لے آئی تھی۔ شادی کے بعد بہت بار اس نے بابا سے ملنے کی کوشش کی مگر وہ اپنی بات پر قائم رہے تھے اور اس کی شادی کے چار ماہ بعد ایک رات وہ خاموشی سے خالقِ حقیقی سے جا ملے تھے۔ اماں جو اُن کی زندگی میں اس سے چھپ چھپا کر ملتی رہتی تھیں، یکدم سخت ہو گئی تھیں۔ شاید وہ اسے بابا کے جانے کی وجہ سمجھنے لگی تھیں۔ سجاد اس کا اکلوتا بھائی تو ویسے بھی اس سے خوش نہیں تھا۔

''کومل تمہیں جو چاہیے تھا، وہ تمہیں مل گیا جو تم کرنا چاہتی تھیں تم نے کر لیا...... بابا نے اپنی زندگی میں تمہارے لیے جو فیصلہ کیا تھا، میں اور اماں اس پر قائم ہیں۔ آج کے بعد تمہیں اس گھر میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' بابا کے چالیسویں کے بعد اس نے کھل کر اس سے بات کر لی تھی۔ وہ اس گھر میں اس کا آخری دن تھا۔

بابا کے بعد اماں بھی صرف چند ماہ ہی زندہ رہی تھیں۔ غیروں کی طرح ان کی موت پر گھر گئی تھی، ان کا

آخری دیدار کیا اور پھر لوٹ آئی۔

اس کے ایک فیصلے نے اس کے سب اپنوں کو اس سے چھین لیا تھا۔ ”آخر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہم جن کو سب سے بڑھ کر پیار کرتے ہیں، ان کی ہی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی اور پھر جو ہمارے دل کے سب سے قریب ہوتے ہیں وہی ہماری چھوٹی سی خطا پر ہمیں اس طرح دل سے نکال پھینکتے ہیں جیسے ہم وہاں کبھی تھے ہی نہیں۔“ وہ مسلسل سوچ رہی تھی۔ ”بابا، اماں مجھے معاف کر دیجیے شاید آپ ہی ٹھیک تھے۔“

بابا نے یہ بنگلا اور ایک دوسرا بنگلا جس کا کرایہ ان کے ماہانہ خرچ سے زیادہ تھا۔ اس کے نام کیا تھا مگر ان شرائط کے ساتھ ...کہ وہ خود بھی دونوں میں سے کسی کو پندرہ سال سے قبل فروخت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے نام پر بینک میں ایک خطیر رقم بھی موجود تھی اور اماں نے زیورات میں بھی اس کا حصہ اسے دے دیا تھا۔ اگر وہ ساری زندگی بھی کچھ خاص کام نہ کرتی تب بھی اسے کسی خاص دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑتا مگر اس نے صحافت پڑھی تھی اور وہ چار سال سے بہترین رپورٹر کا ایوارڈ بھی حاصل کرتی آئی تھی یوں شادی کے بعد بھی اس کی ملازمت جاری رہی تھی۔ شاہ میر ایک ادارے میں ملازم تھا مگر شادی کے چند ماہ بعد اس کی ملازمت ختم ہو گئی تھی اور تب سے اب تک وہ ایک ورکشاپ کھولنے کی پلاننگ کر رہا تھا۔ سمیر کے پیدا ہونے کے بعد وہ اس کے گھر پر ہونے سے اطمینان بھی محسوس کرتی تھی۔

یوں تو وہ روز ہی اماں اور بابا کو یاد کرتی تھی مگر آج اس لمحے اسے ان کی شدید یاد آ رہی تھی۔ کاش وہ ہوتے اور وہ ان کے دامن میں جا کر چھپ جاتی۔ اس نے گہری سانس لی اور بستر کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

”مسمی کومل شاہ میر عدالت میں یہ ثابت کرنے میں ناکام رہی ہیں کہ وقوعے کے وقت ان کی گاڑی کے بریکس اور اسٹیئرنگ جام ہو گئے تھے۔ ان کے مکینک اور سروس سینٹر کے عملے کے بیان اور گاڑی کے معائنے کی تحریری رپورٹس کے مطابق گاڑی کے بریک حادثے کے بعد بھی کام کر رہے ہیں۔ سی سی ٹی وی کیمروں کی تصاویر یہ بتاتی ہیں کہ وہ پُر ہجوم سڑک پر موبائل کا مسلسل استعمال کر رہی تھیں جس کی وجہ سے گاڑی بے قابو ہوئی۔ جس کے نتیجے میں ایک بچی زندگی بھر کے لیے اپاہج اور تین دوسرے افراد زخمی ہوئے۔ عدالت اس مجرمانہ غفلت، لوگوں کو زخمی کرنے اور قانون شکنی کی سزا کے طور پر مسز کومل شاہ میر کو پانچ سال قید کی سزا سناتی ہے۔“

جج کے ان جملوں کے ساتھ کومل نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کا بدترین خدشہ حقیقت کا روپ دھار کر اس کے سامنے آ موجود ہوا تھا۔

”میڈم آپ پریشان نہ ہوں، ہم ہائی کورٹ میں اس فیصلے کے خلاف اپیل کریں گے۔“ اس کے وکیل کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو اس نے آنکھیں کھول لیں۔

”کس لیے......؟ کن شواہد...... کی بنیاد پر وکیل...... جب آپ یہاں کچھ ثابت نہ کر سکے تو وہاں کیا ہوگا؟ میں بے گناہ ہوں، گاڑی کے بریکس بالکل کام نہیں کر رہے تھے مگر رپورٹس کے مطابق تو وہ حادثے کے بعد بھی کام کر رہے ہیں۔“ وہ آنسو پیتے ہوئے بولی۔ ”مجھے یہ سزا کسی اور جرم کی ملی ہے۔“

”کومل پلیز خود کو سنبھالو......“ شاہ میر اُس کے قریب آ کر بولا۔ ”پریشان مت کرو اپنے آپ کو۔“

”کیوں......کیا اب بھی تمہاری کسی سے بات ہو گئی ہے اور وہ مجھے جیل کے بجائے میرے بچّے کے پاس گھر پہنچانے والا ہے؟“ اس نے سادگی سے پوچھا۔

”تم مجھے غلط مت سمجھو کومل، میں نے پوری کوشش کی مگر اس لڑکی کے باپ نے ہر جگہ اپنا اثر رسوخ استعمال کیا ہے۔“

”وہ تو ہم بھی کر سکتے تھے مگر ہم دوسروں پر بھروسا کر کے مارے گئے۔“ وہ بولی۔

”چلیں بی بی......“ دو خواتین کانسٹیبل کومل کے اردگرد آ گئی تھیں۔

”شاہ میر تم سمیر کا بہت خیال رکھنا......اُسے مجھ سے ملوانے کے لیے لاتے رہنا، جلد......“

”بالکل میں کل ہی اسے تم سے ملوانے لے کر آؤں گا۔“ وہ فوراً بولا۔

کومل چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ جیل کی گاڑی اس کے بیٹھتے ہی روانہ ہو گئی تھی۔ اس کے اندر جوار بھاٹا سا اٹھ رہا تھا مگر وہ بالکل خاموش تھی حتیٰ کہ اس کی آنکھ میں ایک آنسو بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

جیل پہنچ کر معمول کی کارروائی سے گزر کر اسے اندر پہنچنے میں دو گھنٹے لگ گئے تھے۔ اس دوران وہ، اس کی

شناخت سب تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کے جسم پر جیل کا لباس تھا۔ اس کی شناختی تصاویر کھنچ چکی تھیں، تلاشی لی جا چکی تھی۔ سب سے آخر میں اسے لیڈی اسسٹنٹ جیل سپرنٹنڈنٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ ایک موٹی سی ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ اس کے چہرے سے درشتی عیاں تھی۔

''بھئی تم تو میڈیا والی ہو..... ہمیشہ پولیس اور جیل انتظامیہ پر تنقید کرتے ہو تم لوگ..... اب کیسا لگ رہا ہے یہاں آنا.....؟'' وہ اسے دیکھ کر طنزیہ انداز میں بولی۔ کومل جواب میں خاموش رہی تھی۔

''سنا ہے بہت پیسا ہے تمہارے پاس..... مگر یہاں تمہاری میڈیا گردی نہیں چلے گی۔ سمجھ گئی نا..... جیسا کہا جائے گا وہی کرنا ہوگا، کام تو خیر تمہارے پاس نہیں ہے کیونکہ تمہاری قید بامشقت نہیں ہے مگر آرام دہ جگہ کے لیے خود کو اس کے قابل ثابت کرنا پڑتا ہے یہاں..... یوں سمجھ لو کہ یہ بڑی دنیا سے الگ ایک چھوٹی دنیا ہے جہاں تمہیں ہمارے احکامات پر چلنا ہوگا۔'' وہ رعونت سے بولی۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے سر ہلایا۔

''اسے شاہدہ والی کوٹھری میں جگہ دو..... اس میں موجود قیدی ویسے بھی اسپتال میں ہے جب وہ واپس آئے گی تو اسے کہیں اور فٹ کر دیں گے۔'' وہ کانسٹیبل کی طرف دیکھ کر آنکھ دباتے ہوئے بولی۔

''شاہدہ والے سیل میں؟'' کانسٹیبل نے دوبارہ پوچھا۔

''ہاں، ہاں وہیں..... بھئی پڑھی لکھی ہے، سنبھال لے گی اسے، اور اس کا انٹرویو بھی کر سکتی ہے۔'' وہ ہنسی۔

''ٹھیک ہے۔'' لیڈی کانسٹیبل نے سر ہلایا۔ ''چل بھئی.....'' اس نے کومل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سپرنٹنڈنٹ کے دفتر سے نکل کر کچھ آگے جا کر دفتری علاقہ ختم ہو گیا تھا وہاں سے ایک پتلی سی کوریڈور نما جگہ تھی جس سے گزر کر وہ کھلے میدان میں پہنچ گئے۔ تقریباً ہزار گز کے فاصلے پر بنی عمارت اصل جیل تھی۔ اس کا بایاں حصہ عورتوں کے لیے مخصوص تھا۔ وہ پہلے بھی یہاں آ چکی تھی مگر تب اس کا مقصد رپورٹنگ تھا۔ آج وہ یہاں جس طرح آئی تھی، اسے ہر جگہ سے وحشت ہو رہی تھی۔

''تم یوں تو سمجھ دار لگ رہی ہو مگر میرا فرض ہے کہ تمہاری مدد کروں۔'' لیڈی کانسٹیبل نے چلتے چلتے کہا۔

''کیسی مدد.....؟'' کومل نے پوچھا۔

''دیکھو یہ جیل ہے، اس کے اپنے قاعدے ہیں، کچھ تو لکھے ہوئے ہیں اور کچھ لکھے ہوئے نہیں مگر زیادہ عمل انہی پر ہوتا ہے۔ تم نے سنا تھا سپرنٹنڈنٹ میڈم نے کیا کہا، تمہیں آرام دہ جگہ کے لیے خود کو اس کے قابل ثابت کرنا ہوگا۔''

''اور وہ کیسے؟''

''یہ تو تمہیں خود پتا ہونا چاہیے۔'' اس نے سر ہلایا پھر انگشت شہادت اور انگوٹھے کو آپس میں رگڑتے ہوئے بولی۔ ''پیسے۔''

''کتنے؟''

''ہاں یہ کام کی بات پوچھی تم نے..... دیکھو اگر تم یہاں سکون سے رہنا چاہتی ہو تو تمہیں ہر ہفتے ادائیگی کرنا ہو گی تم مہینے کے مہینے بھی کر سکتی ہو..... بس ادائیگی زیادہ ہوتی ہے پھر جو طے ہو وہ دیتی رہنا۔''

''پھر بھی.....؟'' کومل نے پوچھا۔

''اگر تم شروع میں اسّی ہزار کا بندوبست کر لو اور پھر مہینے کے مہینے چالیس ہزار دیتی رہو تو سکون سے رہو گی، گھر کا کھانا یا باہر کا کھانا بھی کھا سکو گی، اپنے خرچ پر..... اور ہر ہفتے گھر فون کر سکو گی موبائل پر..... کتابیں منگوا کر پڑھ سکتی ہو، زیادہ دیے تو موبائل بھی رکھ سکتی ہو۔'' وہ رازداری سے بولی۔ ''یعنی جتنا گڑ ڈالو گی اتنا ہی میٹھا ہوگا۔''

''اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو.....؟'' کومل نے پوچھا۔

''تو بہت مشکلات ہوں گی، کوئی سہولت نہیں ملے گی۔ زندگی جہنم ہو جائے گی تمہاری..... چاہو تو یہ بھی کر کے دیکھ لو۔'' وہ دھمکانے والے انداز میں بولی۔

''نہیں، میں یہ پیسے دے دوں گی کل میرے شوہر آئیں گے..... اگر ان سے رابطہ ہو جائے تو میں ان سے پیسے منگوا سکتی ہوں۔'' کومل بولی۔ جو کچھ لیڈی کانسٹیبل کہہ رہی تھی، کومل کو اس سب کا پہلے سے اندازہ تھا۔

''تو پھر ادھر آؤ.....'' وہ اسے تقریباً گھسیٹتی ہوئی ایک کمرے میں لے گئی۔ یہ شاید ان لوگوں کے لیے ریسٹ روم طرز کا بنایا گیا تھا جہاں ایک ٹوٹا پھوٹا سا صوفہ اور چند کرسیاں موجود تھیں۔ ''یہ لو میرا موبائل..... تمہیں اپنے شوہر کا نمبر یاد ہو تو اسے کال کر لو۔''

شاہ میر نے چند گھنٹیوں بعد کال ریسیو کر لی تھی۔

''ٹھیک میں کل پیسے لے آؤں گا..... ویسے مہینہ ختم بھی ہو رہا ہے تمہاری چیک بک بھی لے آؤں گا..... یہاں بھی گھر میں پیسوں کی ضرورت ہے، تم چیک کاٹ دینا تاکہ اخراجات چلتے رہیں۔'' وہ اس کی بات سن کر بولا۔

''ٹھیک ہے۔'' کومل بولی۔ ''سمیر کیسا ہے میری اُس

سے بات کرواؤ۔''

''وہ مشکل سے سویا ہے کومل، تمہیں بہت مس کررہا تھا اگر اب اسے جگایا تو بہت پریشان ہوگا وہ۔''

''نہیں، نہیں مت جگاؤ...... اسے میری طرف سے بہت پیار کرنا اور کل لے کر ضرور آنا۔''

''اوکے۔'' اس کا جواب سن کر اس نے کال کاٹ دی اور فون کانسٹیبل کی طرف بڑھا دیا۔

''شاباش...... چلو اب تمہیں تمہارا سیل دکھا دوں۔'' وہ خوش ہوگئی تھی۔ ظاہر ہے ان سب کو حصہ جو ملتا تھا۔ ''یہ سیل چند بہترین کوٹھڑیوں میں سے ایک ہے مگر شاہدہ ہوتی ہے یہاں......''

''یہ شاہدہ کون ہے؟''

''بہت غصہ ور اور خطرناک ہے، ڈرگ کا بڑا دھندا چلاتی رہی ہے اپنی سیل میٹ کو اس نے خراٹے لینے پر مار مار کر اسپتال پہنچا دیا ہے۔''

''کیا مجھے اور کوئی جگہ نہیں مل سکتی؟'' کومل نے پوچھا۔

''نہیں، یہ کوئی ہوٹل نہیں ہے یہاں جو کہہ دیا جائے وہی کرنا ہوتا ہے، دوسری جگہ آٹھ آٹھ عورتوں کے ساتھ رہنا پڑے گا۔ یہاں صرف یہ ہی ہے۔'' کانسٹیبل نے ایک چھوٹے سیل کا تالا کھولتے ہوئے کہا۔

سیل ایک درمیانے کمرے جتنا تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ لوہے کا بنکر بیڈ لگا ہوا تھا جس کے نچلے بیڈ پر ایک صحت مند عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی عمر چالیس پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ گوری رنگت، سرخی مائل بھورے بالوں کے ساتھ وہ ایک عام سی خاتون نظر آرہی تھی مگر جب اس نے کومل کی طرف دیکھا تو وہ اندر ہی اندر لرز کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں سفاکی اور درشتگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سگریٹ تھا۔ اس نے بے نیازی سے کانسٹیبل اور کومل کی طرف دیکھا اور پھر کش لگانے میں مصروف ہوگئی۔

''شاہدہ، یہ کومل ہے، نئی پنچھی ہے۔ میڈم نے کہا ہے کہ یہ یہاں رہے گی۔'' لیڈی کانسٹیبل نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ہوں، تو رہے مجھے کیا ہے...... میں نے کونسا دو بستروں پر ایک ساتھ سونا ہے۔'' وہ کومل کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

کانسٹیبل کومل کو وہاں چھوڑ کر باہر نکل گئی۔ کمرے میں ایک طرف پانی کا مٹکا رکھا تھا اس کے ساتھ ایک پلاسٹک کا گلاس موجود تھا۔ کومل نے اس کی طرف دیکھا پھر زمین پر بچھی چھوٹی سی چٹائی پر سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔

''کیا کر کے آئی ہے؟'' شاہدہ کی کرخت آواز سیل میں گونجی۔

''کچھ بھی نہیں۔'' کومل نے بمشکل کہا۔

''تو پھر یہاں کیا تیر تھ یاترا پر آئی ہے؟'' وہ زور سے ہنسی۔ ''سزا تو تجھے ہوگئی ہے تو پھر چھپانے کا فائدہ؟ ویسے تو ہماری دنیا کی لگتی نہیں ہے۔''

''ٹریفک کا حادثہ...... میں کار چلا رہی تھی...... کچھ لوگ زیادہ زخمی ہوئے تھے۔''

''کتنے سال کی ہوئی ہے؟''

''پانچ سال......'' وہ دھیرے سے بولی۔

''چل ٹھیک ہے۔'' وہ بولی۔ ''دیکھ بھائی تو گاڑی تیز چلا...... بندے مار...... کچھ بھی کر مگر یہ یاد رکھ کہ میرے کو شور شرابا پسند نہیں ہے تو خراٹے تو نہیں لیتی؟''

''نن، نہیں۔'' کومل بولی۔

''بس پھر ٹھیک ہے، سگریٹ پیے گی؟'' اس نے ہاتھ میں پکڑی سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں میں نہیں پیتی۔'' کومل کے جواب پر وہ ہنسی۔

''تو کیا کرتی تھی اسے بھول جا...... یہ جو جیل ہوتی ہے نا یہ بندے کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ ابھی پیتی ہے تو پی ورنہ تیری مرضی......'' وہ بستر پر دراز ہوتے ہوئے بولی۔

کومل پھٹی پھٹی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

اس کا موڈ بہت خراب تھا۔

اس کا کھیل خراب ہوگیا تھا، جو وہ چاہتا تھا وہ نہیں ہو پایا تھا۔ اسے اب بھی پیسے کے لیے اسی کی طرف دیکھنا تھا۔ دولت اور بہت زیادہ دولت ہمیشہ سے اس کا خواب، محبت اور تمنا رہی تھی۔ اسی لیے اس نے اسے محبت کے جال میں پھنسایا تھا مگر کامیابی کے باوجود ہار ہی اس کا مقدر بنی تھی۔ توقیر احمد نے بیٹی سے ناراض ہو کر قطع تعلق ضرور کرلیا تھا اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کے پیسے اور جائداد کو اس کے لیے محفوظ بھی کر دیا تھا۔ اس نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے۔

''اس کے ہاتھ کیا آیا، ماہانہ ملنے والی لگی بندھی رقم

اور بیوی کی چاکری...... بہر حال اسے اپنا حق لینا آتا ہے۔'' اس نے سوچا۔ وہ اب تک کومل کے کافی زیورات پر ہاتھ صاف کر چکا تھا اسے علم تک نہیں ہو پایا تھا کہ اس کے سونے یا پلاٹینم کے کتنے زیور اب سونے چڑھے چاندی میں ڈھل چکے تھے مگر اس کی اصل نظر اس کی کروڑوں کی جائداد پر تھی۔

'اگر وہ اس حادثے میں مر جاتی تو یہ سب کچھ اس کے اور اس کے بیٹے سمیر کے نام ہو جاتا مگر......' اس نے تاسف سے سر ہلایا۔

بہر حال وہ ہار ماننے والا نہیں تھا۔ ''وہ اب یہاں نہیں ہے اور میں ہی تمام چیزوں کا مالک ہوں پھر یہ تو پرانی بات ہے کہ دعویٰ جھوٹا اور قبضہ سچا، وہ جب تک باہر آئے گی وہ یہ سب صاف کر چکا ہوگا۔'' اس سوچ نے اسے تسلی دی۔

ویسے قسمت کی دھنی ہے، وہ دو بار پہلے بھی اس کی موت کی کوششیں کر چکا تھا مگر ہر بار وہ مکھن سے بال کی طرح صاف نکل جاتی۔ اس بار اس کا پتا صاف کرنے کی کوشش میں اسے بالو استاد کو موت کے گھاٹ اتارنا پڑا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اگر وہ اس کا منہ بند نہ کرتا تو وہ اس کا جینا حرام کر دیتا۔ اس جیسے لوگ اور یہ سب کچھ اس کے لیے نیا نہیں تھا۔ ماں باپ کی موت کے بعد کافی چھوٹی عمر میں بڑے بھائی اور بھاوج نے اسے چوری کے الزام میں گھر سے باہر نکال دیا تھا تب سے وہ اس جیسے لوگوں سے مقابلہ کرتا آیا تھا۔ کومل سے ملاقات سے قبل وہ ایک چھوٹے شہر میں ایک اور شادی کر چکا تھا۔ اس شادی سے اسے بہت کچھ ملا تھا مگر پیسے کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ خرچ ہو جاتا ہے۔ جب وہ ان لوگوں کا ایک ایک پیسا خرچ کر چکا تو اس نے کراچی کا رخ کیا تھا اور پھر کومل سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ اس کے خاندان، دولت کے قصوں نے اسے کومل کے ساتھ باندھ دیا۔ اگر یہ سارا پیسا اسے مل جاتا تو یہ اس کے لیے برسوں تک کے لیے کافی تھا پھر اب تو سمیر بھی اس کے ساتھ تھا۔ یہ اس کا واحد رشتہ تھا جسے وہ دل سے پیار کرتا تھا۔ اس نے بستر پر کھلونوں سے کھیلتے سمیر کی جانب دیکھا پھر وہ ہی تو اس خزانے کی چابی تھا۔ کومل اس کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی۔ شاہ میر مسکرایا اور ڈیڑھ سالہ سمیر کو بانہوں میں بھر لیا۔

☆☆☆

وقت آسان ہو یا مشکل، اس کا کام گزرنا ہوتا ہے۔ کومل کو جیل میں رہتے سال بھر سے زیادہ ہو گیا تھا جہاں ایک لمحہ، ایک دن اور ایک رات گزارنا دشوار اور ناممکن نظر آتا تھا وہاں اس نے اتنا عرصہ گزار لیا تھا۔ شاہدہ کا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک تھا۔ کومل اسے ناراض ہونے کا موقع نہیں دیتی تھی اور نہ ہی اس کے معاملات میں دخل اندازی کرتی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ یہاں بھی اپنا چکر چلا رہی تھی۔ اس کے کافی ملاقاتی آتے تھے۔ اس کے تکیے کے نیچے ایک تھیلا تھا جس کی وہ مخصوص تاریخوں میں خاص حفاظت کرتی تھی اور اسے اپنے صندوق میں مقفل رکھتی تھی۔ کومل کا خیال تھا کہ وہ یہاں زنانہ اور مردانہ جیل میں ڈرگز کا دھندا کر رہی تھی۔ اس کے گاہکوں میں بعض اہلکار بھی شامل تھے جو اس سے حاصل شدہ ڈرگز کو آگے فروخت کرتے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ اس معاملے میں ہلکا سا دخل بھی اس کے لیے جانی خطرے کا سبب بن سکتا تھا اس لیے وہ خود بھی بہت محتاط رہتی تھی۔

شاہ میر شروع کے چند ماہ تو ہر ہفتے اس سے ملنے آتا رہا تھا، سمیر کو بھی ساتھ لایا کرتا پھر اس کی آمد مہینے میں ایک بار ہونے لگی۔ وہ ہمیشہ چیک بک ساتھ لاتا تھا۔ آٹھ ماہ بعد اس کے اصرار پر کومل نے اسے بینک سے پیسے نکلوانے اور چیک پر دستخط کا اختیار دے دیا تھا جس سے اس کا آنا اور کم ہوتا چلا گیا تھا۔

''کومل مجھے تمہیں اس طرح دیکھنا اچھا نہیں لگتا، ہزاروں کام ہوتے ہیں تم تو یہاں ہو، مجھے ہی سب کچھ دیکھنا ہوتا ہے، سمیر کو یہاں لانا اچھا نہیں لگتا...... تمہیں خود سمجھنا چاہیے۔'' ہر بار وہ اس کے سوالوں پر الگ الگ وجوہات بیان کرتا۔

اس کے جیل کے پیسے البتہ وقت پر موصول ہو جاتے تھے اور وہ ہفتے میں ایک بار اس سے فون پر بات کر لیتی تھی۔ فون ہی اس کا سمیر سے رابطے کا ذریعہ تھا۔

اسے جیل میں رہتے ہوئے اٹھارہ ماہ اور نو دن ہو گئے تھے۔ وہ ہر صبح اپنی ڈائری پر دنوں کا حساب کرتی تھی۔ وہ لکھ رہی تھی تب سیل کا دروازہ کھلا۔

''چلو کومل تمہاری ملاقات آئی ہے۔'' ایک اہلکار اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔

''میری ملاقات......؟'' وہ خوشی سے کھڑی ہو گئی۔ یقیناً شاہ میر ہی آیا ہوگا اس کے علاوہ کومل سے ملنے آج تک کوئی جیل نہیں آیا تھا نہ اس کے دوست احباب اور نہ ہی اس کا سگا بھائی۔ ملاقات کے کمرے میں پہنچ کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ وہاں شاہ میر نہیں تھا میز پر ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص اس کا منتظر تھا۔

''جی......'' وہ میز کے قریب پہنچ کر بولی۔ جیل کی زندگی نے اسے یہ سکھا دیا تھا کہ اجازت کے بغیر خالی کرسی پر بھی بیٹھنا بہت مشکلات اور بے عزتی کی وجہ بن سکتا ہے۔
''مسز کومل...... پلیز آپ بیٹھیے۔'' وہ اسے دیکھ کر شائستگی سے بولا۔
''شکریہ...... میں آپ سے واقف تو نہیں ہوں۔''
''بالکل آپ مجھ سے واقف نہیں ہیں مگر واقف ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے میرا نام دلشاد شاہ ہے۔'' وہ اپنا وزیٹنگ کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔
''میں سینیٹر فریدہ شمس الدین کا پی اے ہوں۔''
''جی مگر میں آپ کے لیے کیا کرسکتی ہوں؟'' کومل نے وزیٹنگ کارڈ پڑھنے کے بعد حیرت سے پوچھا۔
''میں لمبی بات نہیں کروں گا کومل صاحبہ، ہمارے پاس آپ کا پروفائل ہے۔ آپ ایک بہترین صحافی رہی ہیں آپ کے ساتھ جو حادثہ ہوا ہے، اس پر مجھے افسوس ہے مگر کیا آپ جلد رہا ہونے میں دلچسپی رکھتی ہیں؟''
''یقیناً مگر یہ کیسے ممکن ہے؟'' کومل نے پوچھا۔
''دنیا میں کچھ ناممکن نہیں ہے۔ سینیٹر صاحبہ ڈرگز کے خلاف ایکشن کمیٹی چلا رہی ہیں، ہمارے علم میں ہے کہ یہاں جیل میں یہ کاروبار ہو رہا ہے، اس حوالے سے کافی معلومات بھی موجود ہیں۔ آپ کی سیل میٹ شاہدہ اس گینگ کی کرتا دھرتا ہے، اگر آپ اس کے خلاف گواہی دیں تو سینیٹر صاحبہ آپ کی پانچ سال کی سزا کو دو سال میں ختم کروادیں گی۔''
''گواہی......؟ مگر وہ تو مجھے مار ڈالیں گے؟''
''انہیں اس کا علم نہیں ہوگا کہ آپ نے ان کے خلاف ہمارا ساتھ دیا ہے۔ آپ ایک رپورٹر رہی ہیں اور اچھی طرح جانتی ہیں کہ آپ کو اس کے متعلق معلومات کس طرح حاصل کرنی ہیں آپ کو صرف یہ نظر رکھنی ہے کہ یہاں اس سے کون کون ڈرگز لیتا ہے اور کس وقت ڈرگز اس کے پاس ہوتی ہیں۔ ہمیں جلدی نہیں ہے ہمیں مضبوط شواہد درکار ہیں اور آپ کے پاس اس کے لیے چھ ماہ کا وقت ہے۔ آپ مجھے اس نمبر پر فون کرسکتی ہیں جو کارڈ پر موجود ہے۔''
''کیا آپ کے پاس پین ہے؟'' کومل نے چند لمحے سوچنے کے بعد پوچھا۔
''پین؟ وہ کیوں؟'' اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
''میں آپ کا نمبر اپنے ہاتھ پر لکھ لوں گی اور اندر جا کر ڈائری میں اپنے شوہر کے نام سے محفوظ کردوں گی۔''

وہ بولی۔ ''اس کارڈ کا میرے پاس رہنا خطرناک ہے۔''
''گریٹ، ہمیں اندازہ تھا کہ آپ بہترین چوائس ثابت ہوں گی اور آپ نے ثابت بھی کرنا شروع کردیا۔'' وہ مسکرادیا۔
''کیا مجھے واقعی چھ ماہ بعد رہائی مل جائے گی؟''
''بالکل یہ حکومت کا آپ سے وعدہ ہے۔'' اس نے اسے یقین دلایا۔ ''لیکن آپ کو ابھی اس بارے میں کسی سے بات نہیں کرنی چاہیے خود اپنے گھر والوں سے بھی نہیں، کیونکہ دیواروں کے کان ہوتے ہیں اور جیل کی دیواریں تو سب دیکھتی بھی ہیں۔ بعد میں انہیں سرپرائز دے سکتی ہیں۔''
''بالکل درست، میں کسی سے بات نہیں کروں گی۔''
''ٹھیک ہے، جیسے ہی آپ مناسب سمجھیں گی، اور کام مکمل ہو جائے گا تو آپ کو اپنا بیان ریکارڈ کرانا ہوگا اس کے بعد آپ آزاد ہوں گی......'' وہ کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔
''بہت شکریہ...... میری سمجھ نہیں آرہا کہ میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں۔'' وہ بہت خوش تھی۔
''محتاط رہ کر...... آپ اپنا کام احتیاط سے کیجیے گا۔'' وہ بھی مسکرایا۔
اس کے جانے کے بعد وہ چند لمحے ہاتھ پر لکھے نمبر کو یاد کرتی رہی اور پھر کانسٹیبل کے آنے پر اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔
امید نے اس کی دنیا روشن کردی تھی۔ یہ نمبر اندھیری سرنگ کے اس پار نظر آتے سورج کے مانند تھا۔ وہ پرمٹ جو اسے اس قید خانے سے نکال سکتا تھا۔ اسے اس کے سمیر کے پاس لے جا سکتا تھا۔ اسے یہ سب کرنا تھا ہر قیمت پر...... اس نے مٹھیاں بھینچیں اور کمرے سے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

اسے شاہدہ کی مصروفیات کا اندازہ تو تھا ہی اب اس نے اس پر باقاعدہ نظر رکھنا شروع کردی تھی۔ جیل کے کون کون سے اہلکار اس کے پاس آتے تھے؟ کس کس کے ساتھ اس کے مراسم تھے؟ یہ سب کس طرح کیا جارہا تھا؟ کچھ ہی عرصے میں اسے علم ہوگیا تھا کہ سب کچھ نہایت منظم طریقے سے ہورہا تھا۔ عملی طور پر جیل کا یہ چھوٹا سا کمرا ڈرگز سپلائی کی ہول سیل مارکیٹ بنا ہوا تھا۔ پانچ ماہ میں اس کے ذہن میں تمام ملوث افراد کے ناموں کی لسٹ تیار ہوچکی تھی۔ ہر ماہ چار پانچ مرتبہ شاہدہ کے گھر سے کھانا آتا تھا جو کہ مقدار میں کافی زیادہ ہوتا تھا۔ اس کھانے کے ہمراہ ہی غالباً ڈرگز اندر لائی جاتی تھیں۔ بڑی مقدار میں دینے کے بعد جیل کے

''کلائنٹس'' کے لیے وہ ڈرگز اپنے تھیلے میں رکھتی تھی۔ یہ کھانا ہر مرتبہ الگ الگ تاریخوں اور دنوں میں لایا جاتا تھا۔

اس صبح وہ معمول کے مطابق اپنے بستر پر بیٹھی میڈیٹیشن کر رہی تھی۔ ''یہ کیا ہر وقت یوگا شوگا کرتی رہتی ہے۔'' شاہدہ کا موڈ اچھا لگ رہا تھا۔ ''مجھے سکھا یہ سب...... تھوڑا اسمارٹ شارٹ کر مجھے۔''

''جب آپ کہیں، ویسے یہ... یوگا نہیں ہے یہ تو یوں سمجھیں کہ مراقبہ ہے ذہنی سکون کے لیے، آپ یہ بھی کیا کریں۔ ٹینشن کم ہوتی ہے۔'' کومل نے جواب دیا۔

''چل سیکھیں گے پر آج تو بڑی مصروف ہوں، ابھی ملاقات آرہی ہے اور آج دوپہر بعد گھر سے بڑا کھانا بھی آئے گا، جگہ رکھنا پیٹ میں۔''

''ٹھیک ہے۔'' کومل کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

اس نے دو دن پہلے دلشاد شاہ سے بات کی تھی۔ اس کے مطابق کومل کی رہائی کے لیے تمام کاغذی کارروائی مکمل ہو چکی تھی جس دن وہ بیان دیتی اور ثبوت پکڑا جاتا، وہ رہا ہو سکتی تھی۔

شاہدہ کے ملاقات پر جاتے ہی اس نے سیل کا دروازہ بجانا شروع کر دیا۔

''کیا مصیبت پڑ گئی ہے۔'' کانسٹیبل اسے دیکھ کر چیخی۔ کومل جانتی تھی کہ اگر اس کی جگہ شاہدہ ہوتی تو اس کے منہ سے جی کے علاوہ کچھ نکلنے والا نہیں تھا۔

''مجھے فون کرنا ہے آج...... میرے بیٹے کی سالگرہ ہے۔'' وہ بولی۔

''پر آج تو تمہارے فون کا دن نہیں ہے دو دن پہلے ہی تو کیا تھا۔''

''ہاں مگر میرے بیٹے کی سالگرہ ہے، اس لیے کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''پھر تو ہمارا بھی منہ میٹھا ہونا چاہیے نا۔'' وہ بولی اور مسکرائی۔

''بالکل کیوں نہیں۔'' کومل بھی مسکرائی۔ ''بات کر لوں پھر کرتے ہیں کچھ......''

''چلو آؤ پھر...... فون کر لو مگر بہت لمبی نہیں کرنا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ وہ اسے فون کے قریب چھوڑ کر تھوڑی دور کھڑی ہوگئی۔

''میں آج تیار ہوں۔'' اس نے دلشاد شاہ کی آواز سنتے ہی کہا۔

''زبردست...... کوئی اور خبر یا ثبوت ہے؟''

''فون پر نہیں بتا سکتی مگر جلد کام کرنا ہوگا۔'' کومل بولی۔

''ٹھیک ہے میں دس منٹ میں خود پہنچ رہا ہوں، آپ تیاری کر لیں۔''

''سالگرہ بہت مبارک میری جان......'' وہ سلسلہ کٹنے کے بعد زور سے بولی۔

''بالکل یاد تھا میں کیسے بھول سکتی تھی...... دیکھو میں نے پاپا سے کہہ دیا ہے کہ آج تمہاری ساری باتیں مانیں اور تمہیں بہت اچھی ٹریٹ دیں...... ٹھیک ہے نا......'' اس نے چند باتیں کر کے فون بند کر دیا۔ سیل واپس پہنچ کر وہ چپ چاپ بیٹھ گئی تھی۔ اس کا ذہن بیان کی تفصیلات نوٹ کرتا جا رہا تھا تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک دوسری کانسٹیبل نے آکر دروازہ کھولا۔

''چلو تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔''

کومل یہ سنتے ہی تیزی سے آگے بڑھی اور اندر آتی شاہدہ سے ٹکرا گئی۔

''اندھی ہوگئی ہو کیا؟'' وہ غرائی۔ ''نظر نہیں آتا تجھے کہ میں اندر آرہی ہوں۔''

''م...... سوری...... غلطی ہوگئی ہے۔'' وہ ہکلائی۔

''ٹھیک ہے۔ دفع ہو اب۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی اپنے بستر کی طرف بڑھی۔ کانسٹیبل اسے سیدھا جیل سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں لے آئی تھی۔ دلشاد شاہ وہیں موجود تھا۔ اسے دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرایا اور اس کے سلام کے جواب میں سر ہلایا۔

''آپ کو مبارک ہو، آپ آج رہا ہو رہی ہیں۔'' سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔

''واقعی......'' کومل کو سب کچھ جانتے بوجھتے بھی اس خبر پر یقین نہیں آرہا تھا۔

''جی ہاں واقعی، البتہ آپ کو اس سے قبل دلشاد صاحب اور دیگر افراد کے سامنے اپنا بیان ریکارڈ کرانا ہو گا...... اور یہ بھی کہ یہ سلسلہ یہاں ختم نہیں ہوگا، رہائی کے ایک دو دن کے بعد آپ کو سینیٹر صاحبہ کے دفتر رپورٹ کرنا ہو گا اور ان کی کمپین کے سلسلے میں عدالت میں بھی بیان دینا ہو گا یہ نہایت ضروری ہے۔'' دلشاد نے کہا۔

''میں تیار ہوں۔'' وہ خوشی سے بولی۔

بیان ریکارڈ کرانے میں اسے تقریباً دو ڈھائی گھنٹے لگ گئے تھے۔ اس دوران اس نے ان کے سوالات کے جوابات بھی دیے تھے اور ان سارے افراد کے نام بھی

ریکارڈ کرائے تھے جو اس کی تحقیق کے مطابق اس ریکٹ کا حصہ تھے۔ وہاں سے فراغت کے بعد دلشاد شاہ واپس چلا گیا تھا۔ کومل کی رہائی کا پروسیس تیار تھا۔ اسے اس کا اپنا لباس فراہم کردیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا سیل، پرس اور دیگر اشیا بھی واپس مل گئی تھیں۔ اس کا فون تو بند تھا اس نے وہاں سے ہی شاہ میر کو کال کی۔ گزشتہ ایک ہفتے سے وہ اسے فون نہیں کر پائی تھی اور نہ ہی سمیر سے بات ہوئی تھی۔

''ہیلو کومل کیسی ہو تم......؟ یار میں باہر ہوں ذرا...... تھوڑی دیر بعد کال کر سکتی ہو...... سمیر بھی گھر پر ہے۔'' وہ بڑے رسمی سے انداز میں بولا۔ جیسے وہ جیل سے نہیں اپنے ڈرائنگ روم سے بات کر رہی ہو۔ مگر کومل اس قدر خوش تھی کہ وہ اس کے لہجے کی خشکی کو محسوس نہیں کر سکی۔

''شاہ میر اب مجھے کال کرنے کی ضرورت نہیں ہے...... میں آج رہا ہو گئی ہوں۔''

''کیا...... تم نے کیا کہا؟''

''میں رہا ہو گئی ہوں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''تم مجھے لینے آ سکتے ہو؟'' دوسری طرف مکمل سناٹا چھا گیا تھا۔ ''شاہ میر...... تم سن رہے ہو نا؟''

''ہاں مگر تمہیں تو پانچ سال بعد رہا ہونا تھا یہ سب کیسے ہوا؟''

''یہ سب میں گھر آ کر بتاؤں گی، تم مجھے لینے آ جاؤ...... یہاں مجھے ایک گھنٹا اور لگے گا تم چار بجے تک پہنچ جانا۔'' وہ بولی۔

''ٹھیک ہے، میں آرہا ہوں۔'' اس کے انداز میں گرم جوشی بالکل نہیں تھی۔

''سمیر کو لے آؤ گے؟''

''لے آؤں گا۔'' وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

''ٹھیک ہے۔'' کومل نے فون بند کر دیا۔ اسے اس کا رویہ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا مگر اس وقت وہ یہ سب سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

معمول کی کارروائی سے نمٹ کر وہ گیٹ پر پہنچ گئی تھی۔ شاہ میر کو دیے ہوئے وقت میں ابھی پندرہ بیس منٹ باقی تھے۔ وہ گیٹ پر موجود چوکی میں رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''کیا تھا اگر آج وہ سب کچھ چھوڑ کر وقت سے پہلے اس کے آنے کا انتظار کر رہا ہوتا۔'' اس خیال نے اسے کچھ افسردہ سا کر دیا تھا۔ یوں بھی اسے کوئی کام تو تھا نہیں مگر وہ ہمیشہ ''لک بزی ڈو نتھنگ'' کی تفسیر بننے میں ماہر تھا۔

''آپ کے شوہر آرہے ہیں آپ کو لینے؟'' گارڈ نے تقریباً سوا چار بجے اس سے پوچھا۔

''ہاں، لگتا ہے کہ کہیں ٹریفک میں پھنس گئے ہیں پہنچنے والے ہی ہوں گے۔'' وہ بولی۔

انتظار کرنا یوں بھی بہت مشکل کام ہوتا ہے مگر ایسے وقت میں انتظار کرنا تقریباً ناقابل برداشت تھا۔ پانچ بجے اس نے گارڈ کے فون سے اس کا نمبر ملایا۔ اس کا فون بند آرہا تھا۔ کومل کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے، گارڈ روم میں موجود لوگ بھی اسے افسوس اور ہمدردی بھری نگاہوں سے گھور رہے تھے کچھ آنکھوں میں شکوک بھی جھانک رہے تھے۔

''کیا میں آپ کو ٹیکسی لا کر دوں؟'' ساڑھے پانچ بجے گارڈ نے اس سے پوچھا۔ چھ بجے ان کی ڈیوٹی تبدیل ہوتی تھی۔ اس نے اس دوران دوبار پھر شاہ میر کا نمبر ملایا مگر اس کا نمبر مسلسل بند آرہا تھا۔ کومل کے ذہن میں عجیب عجیب سے خیالات آرہے تھے۔ 'خدا جانے کیا ہوا تھا آخر شاہ میر کہاں ہے؟ اس کا فون بند کیوں آرہا ہے؟' یہ سوال اس کے ذہن کو دھندلا رہے تھے۔

''میرا خیال ہے کہ مجھے ٹیکسی ہی لے لینی چاہیے۔'' چھ بجے وہ شرمندہ سے انداز میں کھڑی ہو گئی۔

''ٹھیک ہے سسٹر میں آپ کی مدد کروں؟'' گارڈ نے پوچھا۔

''نہیں، میں باہر سے لے لیتی ہوں۔'' وہ بولی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ ٹیکسی میں بھی اس کی آنکھیں بار، بار دھندلا رہی تھیں۔ فکر اور ٹینشن اس کے اعصاب پر سوار ہوتے جارہے تھے۔

جب وہ اپنے گھر پر پہنچی تب تک رات کا اندھیرا روشنی پر غالب آ گیا تھا۔ اس کے پرس میں ہزار کا ایک نوٹ موجود تھا اس نے اس سے ٹیکسی والے کا کرایہ ادا کیا بقیہ پیسے پرس میں رکھے اور اپنے گیٹ کی جانب بڑھی، گیٹ پر کوئی نہیں تھا اور گیٹ بند تھا۔

''اشرف بابا کہاں گئے؟'' وہ بڑبڑائی اور اس نے بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔

بیل کافی دیر بجتی رہی تھی مگر کوئی باہر نہیں نکلا۔ ''آخر سب کہاں چلے گئے؟'' اس نے گیٹ کو دھکا دیا، وہ اندر سے بند تھا مگر وہ اس کا گھر تھا وہ جانتی تھی کہ چھوٹے گیٹ کا تالا درمیان میں پین گھمانے سے کھولا جا سکتا ہے۔ اس نے اپنی اسی ٹرک کا استعمال کیا اور گیٹ کھل گیا۔ اندر داخل ہو کر

اس نے دروازہ بند کیا اور داخلی دروازے کی جانب بڑھی۔ پورچ میں شاہ میر کی گاڑی نہیں تھی یعنی وہ نکلا ہوا ہی تھا۔ اس نے داخلی دروازے کا ناب گھمایا۔ وہ بھی اندر سے لاک تھا۔ کافی کوشش کے باوجود وہ اسے کھول نہیں پائی پھر اس نے پیچھے کچن کے دروازے کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ کچن کا دروازہ بھی لاک تھا مگر اس نے کھڑکی سے ہاتھ ڈال کر اسے کھول لیا تھا۔ ہر گزرتا لمحہ اس کے اندر پریشانی اور غصے کو ہوا دے رہا تھا۔

کچن میں داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔ کچن تو یہ اس کا تھا مگر وہاں موجود چار کرسیوں والا ٹیبل غائب تھا۔ سامان میں بھی کافی تبدیلی تھی۔ وہ کچن سے گزر کر لاؤنج میں داخل ہوئی۔ لاؤنج میں سب کچھ بدلا جا چکا تھا۔ اس کے برانڈڈ ڈیزائنر فرنیچر کی جگہ عام سا فرنیچر رکھا ہوا تھا۔ یقیناً وہ قیمتی تھا مگر اس میں ذوق نہیں تھا۔

''شاہ میر نے یہ کیا کیا ہے گھر کا حال؟'' وہ جھنجلاتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھی، ان کے بیڈرومز اوپر تھے۔ وہ لپک کر سمیر کے لیے مخصوص بیڈروم میں داخل ہوئی۔ وہ کسی بچے کا بیڈروم نہیں تھا۔ کمرے میں ڈبل بیڈ، ڈریسنگ، الماریاں، ٹی وی اسکرین سب کچھ موجود تھا مگر وہاں نہ سمیر تھا اور نہ اس کا کاٹ...... وہ تیزی سے مڑی اور اپنے بیڈروم میں داخل ہوئی۔ یہاں بھی پورے گھر کے مانند اس کا سامان موجود نہیں تھا۔ اچانک اسے گیٹ کھلنے اور کار کے اندر آنے کی آواز آئی۔ وہ تیزی سے سیڑھی کی جانب لپکی۔ وہ شاہ میر سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی اور سمیر کو سینے سے لگانا چاہتی تھی۔

وہ آخری سیڑھی پر تھی جب داخلی دروازہ کھلا۔ اندر آنے والا اسے دیکھ کر ساکت سا کھڑا رہ گیا تھا۔ خود اس کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ اندر آنے والا درمیانی قد اور قدرے فربہی مائل جسم کا مالک تھا۔ اس کے سر پر بال نہ ہونے کے برابر تھے۔ چہرے سے وہ قدرے بدمعاش ٹائپ نظر آ رہا تھا۔

''کون ہو تم؟'' وہ دونوں ایک ساتھ بولے تھے۔

''یہ میرا گھر ہے......'' کومل بولی۔ ''آپ کون ہیں اور اس طرح اندر کیسے داخل ہو رہے ہیں؟''

''آپ کو کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے محترمہ یہ میرا گھر ہے اور آپ غیر قانونی طور پر اندر گھسی ہیں کہیں آپ چور تو نہیں ہیں؟'' وہ اب نارمل ہو چکا تھا۔

''کیا فضول بات کر رہے ہیں آپ......؟'' کومل نے کہا۔

''کتنے عرصے بعد آپ یہاں آئی ہیں؟ میں تو یہاں رہتا ہوں اور اگر آپ مجھے مطمئن نہ کر پائیں تو میں پولیس کو فون کر رہا ہوں۔''

''یہ میرا گھر ہے۔ میں دو سال کے لیے یہاں سے باہر تھی۔'' وہ ہچکچا کر بولی۔ ''مگر میرے شوہر اور بیٹا اسی گھر میں تھے۔'' اس نے کہا۔ ''میری آج دوپہر کو بات ہوئی تھی مگر انہوں نے تو مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

''شاید آپ شاہ میر صاحب کی بات کر رہی ہیں۔'' وہ بولا۔

''جی، جی...... وہ ہی میرے شوہر ہیں۔'' وہ پزل سے انداز میں بولی۔

''اب جب یہ واضح ہو گیا ہے کہ ہم میں سے کوئی کرمنل نہیں ہے تو پھر آپ نیچے آ جائیں، ہم یہاں سکون سے بیٹھ کر بھی بات کر سکتے ہیں۔'' وہ بولا۔

''شکریہ......'' کومل لاؤنج میں رکھے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھیں سوالیہ انداز میں اس کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

''شاید آپ کو علم نہیں ہے یا انہوں نے بتایا نہیں ہے کہ وہ آٹھ ماہ قبل ہی یہ گھر مجھے بیچ چکے ہیں، اس میں موجود سامان ہم نے نہیں خریدا تھا، وہ انہوں نے کسی اور کو بیچا ہے۔''

''اور وہ خود کہاں ہیں؟'' کومل نے بے اختیار پوچھا۔

''یہ تو آپ کو معلوم ہوگا، آپ کے شوہر ہیں...... میں یہ کیسے بتا سکتا ہوں۔'' وہ کندھے اچکا کر بولا۔

کومل کا دماغ گویا اڑ سا گیا تھا۔ یہ سب کیسے ہو سکتا تھا۔ شاہ میر سے اس کی ملاقات نہیں ہو رہی تھی مگر وہ فون پر اس سے بات کرتی آئی تھی۔ اس نے اس حوالے سے اسے کچھ نہیں بتایا تھا پھر یہ مکان تو اس کے نام تھا آخر وہ اسے کیسے بیچ سکتا تھا۔

''کیا میں آپ کا فون استعمال کر سکتی ہوں، میرا فون بند ہے۔'' وہ بمشکل بولی۔

''جی...... جی یہ لیجیے۔'' اس نے اپنا موبائل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

کومل نے اس کے موبائل پر شاہ میر کا نمبر لگایا۔ فون اب بھی بند تھا۔ اس نے دو اور کوششیں کیں اور پھر فون میز پر رکھ دیا۔

''ٹھیک ہے، میں چلتی ہوں۔'' وہ مایوسی سے کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔

''ارے آپ اس وقت کہاں جائیں گی۔ میرے اندازے کے مطابق آپ سفر سے آئی ہیں بلکہ مجھے یاد آیا شاہ میر صاحب کی بیوی پر تو ٹریفک حادثے کا مقدمہ تھا۔ آپ جیل سے آئی ہیں...... ہیں نا...... محلے والوں سے ایک آدھ گیٹ ٹوگیدر میں ذکر ہوا تھا۔ میری فیملی ناردرن ایریاز کے ٹرپ پر گئی ہے آپ یہاں آرام سے رہ سکتی ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں خباثت کا رنگ گہرا ہوتا جارہا تھا۔

''آپ کا شکریہ...... میں یہاں نہیں رہ سکتی۔'' وہ داخلی دروازے کی جانب بڑھی۔

''آپ خواہ مخواہ ضد کررہی ہیں۔'' وہ اس کا راستہ روکتے ہوئے بولا۔ ''آج تم میرے گھر میں جس طرح داخل ہوئی ہو میں تمہیں پولیس کے حوالے بھی کرسکتا ہوں، تم یوں بھی ابھی جیل سے نکلی ہو۔'' وہ قدرے سختی سے بولا۔

''کیا آپ کا دماغ خراب ہوگیا ہے، یہ درست ہے کہ میں گھر میں داخل ہوئی مگر میں تو اپنا گھر سمجھ کر آئی تھی۔''

''جب آہی گئی ہو تو جانے کی ضد نہ کرو۔'' وہ داخلی دروازے کو لاک کرتا ہوا بولا۔

''میرے قریب آنے کی کوشش مت کرنا۔'' کومل پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں اگر پولیس کو بلوانا ہے تو بلوا لو...... میں تیار ہوں۔''

''ارے پولیس کو چھوڑو...... بیٹھ کر کوئی حل نکال لیتے ہیں۔'' وہ اسے بازو سے پکڑتے ہوئے بولا۔

''مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔'' کومل نے اس کے ہاتھ کو جھٹکنے کی کوشش کی۔

''زیادہ نیک پروین بننے کی کوشش مت کرو۔'' وہ غرایا اور اسے اپنی جانب گھسیٹنا چاہا۔

کومل نے اپنے ہاتھ کو اس کی گرفت سے نکالنے کی کوشش کی، ناکام رہنے کے بعد وہ جھکی اور اس نے اس کے بازو پر اپنے دانت گاڑ دیے۔

''ہائے...... کمینی عورت......'' وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر چلّایا۔ کومل نے اس دوران دروازے کی جانب دوڑ لگا دی تھی۔ وہ صرف ایک لمحے کو رکا تھا پھر اس نے لپک کر اسے دھکا دیا۔ وہ پھسل کر گری اور سائڈ بورڈ سے ٹکرا گئی۔ اس کے گرتے ہی اس نے اس کا گلا پکڑ لیا۔ اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ کومل کو اپنی سانس رکتی محسوس ہورہی تھی۔

''چھوڑو مجھے......'' وہ بھنچی بھنچی آواز میں بول رہی تھی اور دونوں ہاتھوں سے خود کو اس سے چھڑانے کی کوشش بھی کررہی تھی۔

''اب تمہیں کوئی نہیں چھڑا سکتا۔ تم مجھ سے مقابلہ کرو گی، تمہاری اتنی ہمت۔'' اس نے اس کی گردن چھوڑ کر بالوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ ''بہت اچھی طرح جانتا ہوں تم جیسی عورتوں کو......'' وہ اسے گھسیٹتا ہوا صوفے کی جانب لے جانا چاہ رہا تھا۔ کومل نے سائڈ بورڈ کو پکڑنا چاہا مگر ممکن نہ ہوسکا البتہ جھٹکے کی وجہ سے اس پر رکھا بھاری میٹل کا گلدان اس کے ہاتھ پر گرا، اس کے منہ سے زوردار کراہ نکل گئی تھی مگر پھر اس نے اس گلدان کو اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا۔ وہ یکلخت پلٹی اور اس نے اپنے پیچھے موجود موٹے کے سر پر وہ گلدان اپنی پوری طاقت سے رسید کیا تھا۔

وہ زور سے ڈکرایا اور سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑتا زمین پر ڈھے گیا۔ اس کے سر سے خون کی موٹی سی لکیر بہہ نکلی تھی۔ کومل چند لمحے وہیں کھڑی ہانپتی رہی پھر گلدان کو زمین پر پھینک کر اپنا دوپٹا سنبھالا اور دوڑتی ہوئی گھر سے باہر نکل گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ دوڑتی ہوئی پورچ میں اور پھر گیٹ سے باہر نکل گئی۔ سڑک پر نکل کر بھی وہ کچھ دور تک ایسے ہی بھاگتی رہی تھی پھر کونے میں موجود چھوٹے سے پارک کے باہر کی جانب بنی بینچ پر گر سی پڑی۔ اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ یہ سب کیا ہوگیا تھا، کیا ہورہا تھا؟ اور کیوں ہورہا تھا؟ سوال اسے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھے اور اس کے پاس ان میں سے کسی کا کوئی جواب نہیں تھا۔

☆☆☆

رات گہری ہوتی جارہی تھی۔

موسم کی خنکی بھی قدرے بڑھ رہی تھی۔ کومل نے دوپٹے سے چہرہ پونچھا۔ وہ اپنے آپ کو قدرے سنبھال چکی تھی اور اب خاصا عجیب محسوس کررہی تھی۔ آتے جاتے لوگ اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر سڑک کی جانب چل دی۔ اسے ٹیکسی بہ آسانی مل گئی تھی۔

''کہاں جائیں گی میڈم؟'' ٹیکسی والے نے چند لمحے انتظار کے بعد پوچھا۔

''فیز سکس...... فیز سکس کی طرف چلو۔'' بالآخر وہ بولی۔

اس کا اکلوتا بھائی سجاد فیز سکس میں قیام پذیر تھا۔ اس کے گھر کے سامنے پہنچ کر اس نے ٹیکسی والے کو رخصت کیا۔ چند لمحے دروازے پر کھڑے رہنے کے بعد دستک کے لیے

ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ گیٹ کھل گیا۔
"آیئے میڈم......" سامنے کھڑے ملازم نے اس کے چرمر کپڑوں کو عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "پارٹی کا انتظام اس طرف ہے۔"
"مجھے اس طرف نہیں جانا مجھے بھائی جان سے ملنا ہے۔" وہ لفظ اس کے گلے میں پھنس رہے تھے۔ یہ اس کے بابا اور اماں کا گھر تھا۔ وہ یہاں ان کی خوشبو محسوس کررہی تھی۔
"کس سے؟" ملازم نے دوبارہ پوچھا۔
"سجاد احمد صاحب سے۔" وہ بولی۔
"ٹھیک ہے میں ان کو بتاتا ہوں۔" وہ بولا اور تیر کی طرح گھر میں داخل ہوگیا۔ چند لمحوں میں سجاد اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ اسے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے منجمد سا ہوگیا، پھر بولا۔ "تم......تم یہاں کیوں آئی ہو؟ تم تو جیل میں تھیں نا؟"
"تو آپ کو یہ معلوم تھا؟" اس نے دکھ سے پوچھا۔
سجاد کو شاید ملازم اور آتے جاتے مہمانوں کا خیال آگیا۔ "قدیر تم ان بی بی کو میری اسٹڈی میں لے جاؤ۔ داخلی دروازے سے نہیں پاگل...... اسٹڈی کے باہر والے دروازے سے...... اور تم۔" وہ اس کی طرف مڑا۔ "تم وہاں رکو...... میں آرہا ہوں، باہر مت نکلنا۔"
اسے اسٹڈی میں پہنچا کر ملازم غائب ہوگیا تھا۔ کومل کی آنکھیں دوبارہ آنسوؤں سے بھر گئیں۔ بھائی کے رویے نے اسے مزید دکھی کردیا تھا۔
"خیر یہ تو متوقع تھا۔" اس کے دماغ نے اسے تسلی دی۔
"اب بتاؤ کیسے آئی ہو؟" سجاد چند لمحوں میں وہاں آگیا تھا اندر آکر اس نے کمرے کو اندر سے بند کرلیا تھا۔
"بھائی اگر آپ کو سب معلوم ہے تو شاید یہ بھی پتا ہو کہ میں بے قصور تھی۔ وہ صرف ایک حادثہ تھا۔ مجھے دو سال میں رہائی مل گئی مگر میں گھر پہنچی تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔"
"کیا مطلب......؟" سجاد نے اسے گھورا۔
"شاہ میر...... شاہ میر نے وہ گھر بیچ دیا ہے اور سمیر کو لے کر پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے۔" وہ رو پڑی۔
"شاباش......" سجاد نے بلند آواز میں کہا اور گردن جھٹکی۔ "وہ گھر تمہارے نام تھا مگر اس دو نمبر آدمی نے اسے بھی بیچ ڈالا۔ یہی تو سمجھایا تھا تمہیں کہ وہ اس قابل نہیں ہے مگر تمہاری آنکھوں پر تو پٹی بندھ گئی تھی...... خیر اب...... اب کیا ارادہ ہے...... اُسے ڈھونڈو گی؟"
"میرا بیٹا ہے اس کے پاس...... اور وہ ایسا کیسے کر سکتا ہے میرے ساتھ؟"
"ایسے ہی جیسے اس نے کیا۔ مجھے تو اب اس کا ملنا مشکل لگتا ہے دوسرے گھر کے بارے میں معلوم کیا تم نے؟"
"نہیں صبح معلوم کروں گی؟" وہ بولی۔
"مجھے ڈر ہے وہ بھی بیچ دیا ہوگا اس نے۔" اس نے پھر گردن جھٹکی، ٹینشن سے دروازے کی طرف دیکھا۔ "خیر اب تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"
"میں ابھی کہاں جاؤں بھائی...... دن میں یہ دیکھوں گی کہ کیا کرسکتی ہوں اس وقت میں کہاں جاتی؟ اس لیے یہاں آئی ہوں۔"
"دیکھو کومل، برسوں پہلے یہ فیصلہ ہوگیا تھا کہ اس گھر سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ دوسری بات ہے کہ جب تم خوش تھیں تب تو تم نے پلٹ کر ہماری طرف نہیں دیکھا تو اب کیوں آئی ہو اور آخری بات یہ کہ میں تمہیں یہاں نہیں رکھ سکتا۔ میری بیوی یہ پسند نہیں کرے گی اور نہ ہی میرے بچوں کو تمہارے بارے میں کچھ معلوم ہے۔" وہ قطعیت سے بولا۔
"مگر بھائی میں اس وقت کہاں جاؤں؟"
"یہ میرا مسئلہ نہیں ہے...... اور تمہیں میرے لیے مسائل کھڑے کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"
"بھائی کیا میں صرف آج کی رات رک سکتی ہوں؟ کل صبح یہاں سے چلی جاؤں گی۔" کومل نے بمشکل کہا۔ گھر پر ہونے والے ہولناک تجربے نے اسے خوف زدہ کردیا تھا۔
"نہیں کومل یہ ممکن نہیں ہے...... ہاں میں تمہیں کچھ پیسے دے دیتا ہوں، تم کسی ہوٹل میں ٹھہر جاؤ...... تمہارے پاس پیسے بھی نہیں ہوں گے...... ہے نا؟" اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔
"ہاں، نہیں ہیں۔" وہ بولی۔
"ٹھیک ہے یہ لو دس ہزار روپے...... کسی عام سے ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس میں چلی جاؤ۔ کل ساری چیزیں دیکھ لینا...... تمہارے بینک اکاؤنٹ میں تو رقم ہوگی نا، وہ تو وہ نہیں نکال سکتا......" وہ نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔
"مجھے نہیں لگتا کیونکہ سات آٹھ ماہ پہلے میں نے

اُسے سائننگ اتھارٹی دی تھی۔‘‘
’’بہت خوب۔‘‘ سجاد نے سر پر ہاتھ مارا۔ ’’تم نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑے مار رکھے ہیں تو کوئی اور کیا کرسکتا ہے بہرحال ہم نے تو تمہیں تمہارے حصے سے بہت زیادہ دیا تھا تاکہ تم خوش رہ سکو، اب ہم پر کوئی ذمے داری عائد نہیں ہوتی۔‘‘ وہ سرد مہری سے بولا۔
’’ٹھیک ہے بھائی — اس مدد کا بہت شکریہ۔‘‘ وہ آنسو پیتے ہوئے بولی۔ ’’آپ اپنی پارٹی انجوائے کریں، مجھے ایک گلاس پانی مل سکتا ہے۔‘‘
’’ہاں میں خود لے آتا ہوں، سارے ملازمین کو تمہاری یہاں موجودگی کی خبر نہیں ہونی چاہیے۔‘‘ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ کومل کے اس طرح سے آجانے نے اس کے حواس اُڑا دیے تھے۔ ’وہ جتنی جلد یہاں سے چلی جائے بہتر ہے۔‘ اس نے فریج سے پانی نکالتے ہوئے سوچا۔ فریج مختلف نعمتوں سے بھرا ہوا تھا۔ ’شاید وہ بھوکی بھی ہوگی کیونکہ آج کے دن میں اسے کچھ کھانے کا موقع نہیں ملا ہوگا۔‘ اس کے ذہن میں خیال ابھرا۔ ’وہ گیسٹ ہاؤس میں کھالے گی، اگر سوسن یا بچوں میں سے کوئی یہاں نکل آیا تو بہت مسئلہ ہو جائے گا۔‘ دوسرے خیال نے پہلی سوچ کو رد کردیا۔
وہ گلاس میں پانی لے کر اسٹڈی میں داخل ہوا تو کمرا خالی تھا۔ وہ بیرونی دروازے سے جا چکی تھی۔ میز پر پیپر ویٹ کے نیچے پانچ، پانچ ہزار کے دو نوٹ پھڑ پھڑا رہے تھے۔
☆☆☆
کومل اس خوب صورت بنگلوں سے سجی سڑک پر پیدل چلی جارہی تھی۔ اس علاقے میں سواری ملنا قدرے مشکل کام تھا۔ یوں بھی وہ اس وقت کچھ زیادہ سوچ بھی نہیں پارہی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے دوسب سے اہم سب سے پیارے رشتوں کو ایک جھوٹی محبت کے لیے ٹھکرایا تھا اور جواب میں زندگی میں بقایا رشتوں نے اسے اپنی اپنی زندگیوں سے بے دخل کردیا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ شاہ میر کا دھوکا اس سے جینے کی تمنا تک چھین سکتا تھا مگر سمیر کا خیال سانس بن کر اس کے دل میں دھڑک رہا تھا۔ اسے آگے بڑھنے اور سارے پردے چاک کرنے کا حوصلہ دے رہا تھا۔ اسے اس کو ڈھونڈنا تھا مگر ابھی.....’اس وقت اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس نے سوچا۔ ’اس کے پاس صرف ایک سو نوے روپے بچے تھے، وہ صبح سے بھوکی اور پیاسی تھی اور اس کے پاس رات گزارنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس سے تو وہ جیل میں ہی بہتر تھی۔‘ اس نے سوچا اور گہری سانس لی۔
’’زارا.....‘‘ اچانک اس کے تصور میں گویا ایک بلب سا جل اٹھا۔ زارا اس کے اچھے دوستوں میں شامل نہیں تھی مگر وہ اس کی دفتری ساتھی تھی۔ عام دوستوں سے بالکل الگ، کھری بات کرنے والی، اسے یقین تھا کہ وہ اس مشکل وقت میں اس کی مدد کرسکتی تھی۔ یوں بھی وہ اس کی احسان مند تھی۔ کومل نے اسے اپارٹمنٹ خریدتے وقت دو لاکھ روپے کا قرض دیا تھا جسے اس نے حسب وعدہ چھ ماہ میں اتار دیا تھا۔ اسے آگے مارکیٹ سے رکشا، ٹیکسی مل سکتی تھی مگر اس کے پاس پورا کرایہ نہیں تھا۔ اس کے پرس میں سونے کی ایک چین اور انگوٹھی موجود تھی مگر وہ انہیں بیچنا نہیں چاہتی تھی۔ اب اس کے پاس بابا اور اماں کی یہی نشانی بچی تھی۔
وہ زارا کے اپارٹمنٹ کی عمارت میں پہنچی تو رات کے بارہ بجنے والے تھے۔
’’اوہ تم......کومل...... آؤ اندر آؤ...... کیا حال بنا رکھا ہے اپنا۔‘‘ وہ اسے دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔
’’زارا میں تمہیں اس وقت زحمت دینے پر معافی چاہتی ہوں۔‘‘
’’ارے یہ کیا اجنبیوں جیسی باتیں کررہی ہو، بیٹھو یہاں پانی لاتی ہوں میں۔‘‘
’’وہ......‘‘ وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ ’’نیچے رکشے والا کھڑا ہے اس کے چار سو روپے اور دینے ہیں میرے پاس کھلے نہیں ہیں۔‘‘
’’اوکے نو بگ ڈیل...... میں دے کر آتی ہوں، تم یہاں آرام سے بیٹھ کر پانی پیو، اگر امی جاگ جائیں تو ان کے چیخنے چلّانے اور پولیس کو کال ملا دینے سے پہلے ان کو بتا دینا کہ تم میری دوست ہو۔‘‘ وہ ہنسی۔ وہ پانچ منٹ میں واپس آئی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی۔
کومل تھری سیٹر صوفے پر نیم دراز سی تھی‘ اس کا سر پھسل کر صوفے کی سیٹر پر آگیا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی۔
☆☆☆
’’یار یہ تو حد ہی ہوگئی ہے‘ یہ کوئی بہت فراڈ آدمی نکلا......شاید اس نے اسی لیے تم سے شادی کی ہوگی۔ ایسے آدمی سے تو پیچھا چھوٹ جانا ہی بہتر ہے، تم کیا اُسے تلاش کرنا چاہتی ہو؟‘‘ دوسری صبح ناشتے کے بعد کومل نے اسے

اپنی ساری بپتا سنائی تھی۔

''ہاں، ڈھونڈنا چاہتی ہوں' مجھے اس سے اپنے سوالوں کے جواب درکار ہیں زارا اور اپنا بیٹا بھی...... میں اپنے سمیر کو اس کے پاس نہیں چھوڑ سکتی۔''

''اچھا تو اب تمہارے ذہن میں کیا ہے؟'' زارا نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

''تم ہو زارا......'' وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

''خیر وہ تو میں ہوں ہی اتنی اچھی اور وہ بھی کہ من آنم کہ من جانم...... ایسے ہی ہے نا کچھ...... ویسے میں تمہارے ذہن میں کیا کر رہی ہوں؟''

''تمہیں یاد ہے کہ جب تم رپورٹنگ کر رہی تھی اور ہمیں کسی بندے کا سراغ لگانا ہوتا تو تم نے میری مدد کی تھی کئی بار...... یاد ہے؟''

''ہاں، ہاں مگر وہ تو ای میل کے تھرو نا...... کیا یہ مسٹر فراڈیا ای میل استعمال کرتا ہے؟''

''بہت زیادہ، ہر روز چیک کرتا ہے، کیا تم یہ کام کر سکتی ہو؟''

''کر تو سکتی ہوں کومل مگر ایک مسئلہ ہے وہ سب ایک ایپ کے تھرو کرتی ہوں نا میں...... اور وہ ایپ میرے لیپ ٹاپ پر ڈاؤن لوڈ نہیں ہے، پہلے اسے ڈاؤن لوڈ کرتی ہوں اب تو اس سے ہم اس کے سوشل میڈیا سے بھی پہنچ سکتے ہیں مگر ای میل والا یہ ایپ بہت آزمودہ ہے۔''

''پھر ڈاؤن لوڈ کر لو۔'' کومل بولی۔

''کرتی ہوں میڈم مگر اس میں مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں اس کا آئی پی ایڈریس اور وہ خود کس جگہ ہے یہ اسی وقت معلوم ہو سکتا ہے جب وہ ہماری بھیجی ہوئی میل میں موجود اٹیچمنٹ کو کھولے۔''

''میرے پاس ایک آئیڈیا ہے، میں تمہیں میل کا کانٹینٹ (مواد) بنا کر دیتی ہوں' مجھے یقین ہے وہ یہ ای میل ضرور کھولے گا۔'' کومل کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے پھر...... تم بم بناؤ، میں توپ تیار کرتی ہوں ویسے کومل بم کیا توپ سے پھینکتے ہیں؟ نہیں نا...... کیسے کیسے اسٹوپڈ خیال آتے ہیں مجھے میری امی کہتی ہیں کہ بھولی بہت ہوں میں...... شاید اسی لیے۔'' اس کی بات پر کومل ہنس پڑی۔ ''چلو شکر ہے تم نے ہنس کر تو دکھایا ورنہ مسلسل منہ لٹکا رکھا تھا' یار ہنسنے سے جھریاں نہیں پڑتیں اور انسان کو سب سے پہلے اپنا خیال رکھنا چاہیے' وہ جو کہا ہے علامہ اقبال نے کہ اپنی ذات سے عشق ہے سچا باقی سب افسانے ہیں۔''

''بس بس...... باتوں کی ریل گاڑی' یہ علامہ اقبال نے کبھی نہیں کہا۔''

''اچھا چلو پھر کسی اور نے کہا ہوگا۔ اپنے کو کیا اپن کو تو اپنا کام کرنا ہے، چھٹی تم نے میری ویسے ہی کرا دی ہے تو کم از کم یہ کام تو کر لیں۔''

''بالکل مگر تم چپ رہو گی تو میں لکھ پاؤں گی نا۔''

''افسوس، امید نہیں تھی تم سے...... یہ میری آواز تو تمہاری انسپائریشن ہونی چاہیے تھی مگر چلو...... لکھو اب...... میں چپ ہو رہی ہوں۔''

کومل نے دس منٹ میں ای میل کا مضمون تیار کر لیا تھا جس کے مطابق ایک خاص لاٹری کو حاصل کرنے کے لیے نیچے دیا گیا اٹیچمنٹ کھولنا ضروری تھا۔ اس اٹیچمنٹ میں ایک فارم تھا جس میں لاٹری میں حصہ لینے والے شخص کو اپنا نام اور پتا درج کرنا لازمی تھا۔ اس کے بعد ہی وہ لاٹری میں شامل ہو پاتا اور اگر اس کا انعام نہ بھی کھلتا تب بھی وہ کچھ نہ کچھ ضرور حاصل کر سکتا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ اس قسم کی لاٹری اور قرعہ اندازی وغیرہ شاہ میر کی کمزوری تھی۔ اگر یہ ای میل اس تک پہنچتی تو وہ اسے ضرور کھول کر دیکھے گا۔''

''واؤ...... زبردست...... اب اس کا ای میل ایڈریس دو۔'' زارا نے کہا۔ ای میل ایڈریس لے کر اس نے اسے ٹائپ کیا اور ایک پھڑکتا ہوا سبجیکٹ ڈالا اور سینڈ کا بٹن دبا دیا۔ ''لو ہو گیا تمہارا کام، اب ہمیں انتظار کرنا ہوگا' وہ جیسے ہی اٹیچمنٹ کھولے گا ہمیں اس کی لوکیشن معلوم ہو جائے گی۔'' زارا بولی۔ ''اور یہ لو تمہارا موبائل بھی فل چارج ہو گیا ہے، اب اسے کھولو۔''

''بہت شکریہ زارا...... تم نہ ہوتیں تو شاید میں بچ نہ پاتی۔'' کومل نے دل کی گہرائی سے کہا۔

''تھوڑا اور شکریہ ادا کرو...... ایک تو اس سے میرا دماغ اچھی طرح خراب ہوگا دوسرا مجھے اندازہ ہو جائے گا کہ تم مجھے اپنی دوست سمجھتی ہی نہیں۔''

''ارے نہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو میں سیدھی تمہارے پاس کیسے آتی؟ مجھے ایک فکر ستا رہی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''میں اپنے گھر پر گئی تھی' وہاں جو کچھ ہوا وہ تو میں تمہیں بتا چکی ہوں وہ شخص سخت زخمی ہوا تھا' پتا نہیں اس کا کیا ہوا ہوگا؟'' کومل نے فکرمندی سے کہا۔

''میں معلوم کرواتی ہوں، کرائم رپورٹرز سے پتا چل

جائے گا۔'' زارا بولی۔ ''پر تمہیں اس کی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے، غلطی تو اسی کی تھی نا۔''

''پہلے میں بھی اسی طرح سوچتی تھی مگر دیکھو نا میری کار کے بریکس نے مجھے دھوکا دیا، میں اس حادثے میں مر بھی سکتی تھی مگر اس کے باوجود سزا بھی مجھے ہی ملی۔'' کومل نے تاسف سے کہا۔

''کبھی کبھی ہماری زندگی میں جو بُرا ہورہا ہوتا ہے نا وہ بھی ہمارے فائدے میں ہی ہوتا ہے۔'' زارا نے چند لمحوں کے بعد کہا۔

''وہ کیسے؟''

''دیکھو نا اگر یہ سب نہ ہوتا تو تمہیں شاہ میر کی حقیقت کیسے معلوم ہوتی۔'' وہ بولی۔

''شاید ٹھیک کہہ رہی ہو۔''

''نہ جانے کیوں میری چھٹی حس یہ کہہ رہی ہے کہ یا یوں کہو کہ رپورٹرانہ جبلّت کہ تمہارے اس حادثے میں بھی کہیں نہ کہیں اسی شخص کا ہاتھ ہے۔'' زارا چند لمحے کی خاموشی کے بعد بولی۔ ''خیر دیکھتے ہیں۔'' الفاظ اس کے منہ میں تھے کہ اس کے موبائل کی بیل بج اٹھی۔

''جی...... ہاں بولو فرحان کیا معلوم ہوا...... کیا؟ اچھا...... اچھا۔'' وہ کچھ دیر خاموشی سے سنتی رہی پھر شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا۔

''کیا ہوا......؟'' کومل نے پوچھا۔

''اس شخص نے تمہارے خلاف گھر میں گھسنے، چوری کرنے اور پکڑے جانے پر اسے شدید زخمی کرنے کا الزام لگایا ہے، ابھی ایف آئی آر نہیں کاٹی گئی مگر پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔'' زارا نے سنجیدگی سے کہا۔

''بس اسی کی کسر تھی۔'' کومل نے آنکھیں بند کر لیں۔

''میرے امتحان ختم کیوں نہیں ہورہے زارا۔''

''تم پریشان مت ہو، ہمیں کوئی وکیل ہائر کرنا پڑے گا۔ مسائل بھاگنے یا منہ چھپا لینے سے حل نہیں ہوتے دوست، ان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مجھے ذرا سوچنے دو۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔ ان کی گفتگو کے دوران اس کے لیپ ٹاپ سے بیپ کی مخصوص آواز سنائی دی۔

''واؤ......'' زارا زور سے بولی اور اس نے اپنا ای میل ایپ آن کیا۔ ''وہ مارا۔'' وہ چلائی۔ ''تمہارا یہ کام تو ہو گیا۔''

''کیا ہوا، کیا اُس کا پتا مل گیا ہے؟''

''ہاں، بالکل...... وہ کراچی میں نہیں ہے اسلام آباد کے قریب ہے، یہ تو اس ایپ کی رپورٹ ہے مگر اس مسٹر فراڈیے نے لاٹری کے لالچ میں اپنا ایڈریس خود ہمیں ارسال کر دیا ہے۔''

''شکر ہے اب میں اپنے بیٹے تک پہنچ سکتی ہوں۔'' کومل قدرے اطمینان سے بولی۔

''ہاں، یہ اچھی خبر ہے مگر تمہیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ اسے معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہمیں اس کا پتا مل گیا ہے ورنہ وہ اسے لے کر دوبارہ بھی غائب ہوسکتا ہے اور تمہیں اس پولیس رپورٹ کا مسئلہ بھی نمٹانا ہے ورنہ یہ ایشو بڑھتا چلا جائے گا۔''

''زارا میں سب سے پہلے سمیر کو دیکھنا چاہتی ہوں اور دوسری بات یہ ہے کہ میں تمہیں اپنے ساتھ اس مشکل میں نہیں پھنسانا چاہتی، تم نے میرے ساتھ نیکی کی ہے، مجھے یہ پتا دلوایا یہی بہت ہے۔'' کومل بولی۔

''تم پاگل ہو گیا؟ کیا ہم دوست نہیں ہیں؟'' زارا نے خفگی سے پوچھا۔

''ہیں بالکل اور تم نے اس کا ثبوت دے دیا ہے اب میری باری ہے، یہ میری جنگ ہے یار اور اسے مجھے خود لڑنا ہوگا۔ میں سمیر کو حاصل کر لوں اس کے بعد میں کچھ بھی برداشت کر سکتی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''تم پر اپنی والدہ کی اور خود اپنی ذمے داری بھی ہے۔''

''مگر تم اکیلی کیسے یہ سب کرو گی؟''

''اگر مجھے ضرورت ہوئی تو میں سب سے پہلے تمہیں آواز دوں گی۔'' کومل بولی۔ ''اب تو میرا موبائل بھی آن ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''تو پھر پلان کیا ہے؟''

''مجھے بس یا ٹرین کے ذریعے اسلام آباد جانا ہے، ائرپورٹ پر چیکنگ اور شناختی کارڈ کے مسائل رہیں گے اس لیے میں جہاز سے سفر کرنا نہیں چاہتی۔'' وہ بولی۔

''ٹرین میں تو اتنی جلدی بکنگ نہیں ملے گی۔ تم کار رینٹ پر لے سکتی ہو اور اسی میں واپس بھی آسکتی ہو، میرے ایک بہت اچھے دوست کی کار رینٹ کمپنی ہے اور وہ لمبے سفر کے لیے کاریں دیتا ہے۔ میں اُس سے بات کرتی ہوں۔''

''مگر وہ مہنگا ہوگا میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔'' کومل نے دھیرے سے کہا۔

''مجھے معلوم ہے میں نے کہا نا کہ وہ میرے دوست کی کمپنی ہے، ہم اسے پے منٹ بعد میں بھی دے سکتے ہیں۔''

کچھ دیر میں کومل کی روانگی کا انتظام ہو گیا تھا۔ اسے شام میں روانہ ہونا تھا اور گاڑی والے کے مطابق وہ اگلے روز دوپہر تک اسلام آباد پہنچ جاتی۔

''کومل کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ اتنی آسانی سے بچہ تمہارے حوالے کر دے گا؟'' زارا نے سب کاموں سے فارغ ہو کر پوچھا۔

''زارا وہ حقیقی معنوں میں ایک بزدل انسان ہے، اس نے دھوکے سے میرا گھر بیچا ہے۔ میرے زیور اور میرے بینک اکاؤنٹ سے پیسا چرایا ہے۔ اگر وہ سمیر کو میرے حوالے نہیں کرے گا تو میں اس کے خلاف ایف آئی آر کٹوا سکتی ہوں۔ خود کو بچانے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے مگر اس کے لیے پہلے اس کو پکڑنا ضروری ہے۔ اس سے قبل اگر اسے علم ہو گیا تو وہ کہیں غائب ہو جائے گا۔''

''جیسے تم مناسب سمجھو مگر اپنا خیال رکھنا اور یہ لو......'' اس نے بیگ سے ایک کارڈ نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔ وہ اس کا اے ٹی ایم کارڈ تھا۔

''یہ کیا ہے؟''

''اے ٹی ایم کارڈ......'' وہ مسکرائی۔ ''میرے پاس دو اے ٹی ایم کارڈز ہیں ایک جو میں استعمال کرتی ہوں اور ایک یہ جسے میں نے کسی کام یا بُرے وقت کے لیے اپنے بچت اکاؤنٹ کے طور پر رکھا ہے۔ یہ تمہارے کام آئے گا۔''

کومل ششدر سی اسے دیکھ رہی تھی۔ ''نہیں زارا تم پہلے ہی میرے لیے بہت کر چکی ہو، میں یہ نہیں لے سکتی۔''

''جب تمہارا مسئلہ حل ہو جائے تو تم مجھے پیسے واپس کر دینا، میں کون سا تمہیں گفٹ دے رہی ہوں، قرض ہے اور اس کا ایک مطلب اور بھی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''یہ ذمے داری ہے کہ تمہیں پیسے لوٹانے کے لیے ٹھیک ٹھاک واپس آنا ہے۔''

''زارا......'' کومل چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتی رہی پھر اسے گلے سے لگا لیا۔ ''میری کوئی بہن نہیں تھی مگر تم نے مجھے یہ رشتہ دے دیا ہے۔''

''بس بس نو جذباتی سین......'' وہ مسکرائی۔ ''تیاری کر لو......گاڑی آتی ہو گی۔''

''ٹھیک ہے، میں آنٹی سے مل لیتی ہوں۔'' کومل بولی۔

''ایک گھنٹے بعد وہ اسلام آباد کے لیے روانہ ہو گئی تھی۔ کار کا ڈرائیور ایک پینتیس چالیس سالہ پٹھان شخص تھا جو بقول خود اس کے ہفتے میں ایک یا دو لمبے ٹرپس آسانی سے لگا لیتا تھا۔ ٹول سے گزرتے ہوئے کومل کا ذہن متضاد سوچوں میں گھرا ہوا تھا۔ شہر سے نکلتے وقت وہ کارڈ سے پانچ ہزار روپے نکالنا نہیں بھولی تھی۔

☆☆☆

''وہ آخر کہاں غائب ہو گئی ہے دلشاد؟ اسے جیل سے نکلے کئی دن ہو چکے ہیں۔ ہماری مہم کے لیے اس کا عدالتی اور کمیٹی میں بیان ضروری ہے، تم نے اسے یہ بتا دیا تھا کہ اس کی رہائی ان سب چیزوں سے مشروط ہے......؟'' سینیٹر صائمہ کے لہجے میں الجھن اور غصہ نمایاں تھا۔ وہ ایک پرانی اور گھاگ سیاست داں تھی۔ پچھلے دو ٹینیور سے وہ مسلسل سینیٹ میں منتخب ہوتی چلی آئی تھی۔ قدرے پستہ قامت اور صحت مند جسم کی مالک صائمہ شاہ ریسٹورنٹس کی معروف چین کی مالکہ بھی تھی۔ اس کے ساتھ کام کرنے والے لوگ اس کے غصے سے واقف تھے۔

''جی میڈم......ہم اسے تلاش کر رہے ہیں، ہمارے پاس اس کے گھر کا پتا تھا مگر وہ وہاں نہیں ہے اور اس کا گھر بھی بک چکا ہے۔ مگر میرے آدمی اس کو جلد ٹریس کر لیں گے۔ ہمارے پاس اس کا نمبر ہے مگر فون بند جا رہا ہے۔''

''الیکشن میں صرف بیس دن باقی ہیں، ہمیں اس دوران اس کیس کو سلجھانا ہے اگر یہ گروہ ہماری وجہ سے پکڑا گیا تو سینیٹ کی سیٹ سے مجھے کوئی ہلا نہیں سکے گا۔ مجھے ہر قیمت پر سینیٹ میں رہنا ہے اور ڈرگ کنٹرول کمیٹی کی سربراہی بھی درکار ہے۔'' وہ میز پر ہاتھ مار کر بولی۔

''میں جانتا ہوں میڈم۔'' وہ مؤدبانہ انداز میں بولا۔

''تو کچھ کرو، کسی بھی طرح اس کا پتا چلاؤ اور اسے کمیٹی کے سامنے پیش کرو۔ یہ انتہائی ضروری ہے اور میں اس حوالے سے بااثر اتھارٹیز سے بات بھی کر چکی ہوں۔ ہمارا کام صرف شاہدہ، اس کے بھائی اور ان کے گینگ کا خاتمہ نہیں ہے بلکہ ان کی پشت پناہی کرنے والے سینیٹر کا چہرہ سامنے لانا بھی ہے۔ ایک بار وہ گندہ ہو گیا تو پھر اس کا نامزد ہونا ہی ناممکن ہو جائے گا اور یہی میں چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے میڈم...... میں بندے بھی بڑھا دیتا ہوں ان شاء اللہ کل تک رپورٹ آپ کے پاس ہو گی۔'' دلشاد شاہ نے کہا۔

''ایسا ہی ہونا چاہیے ورنہ......'' اس نے سرد لہجے میں

جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
”ایسا ہی ہوگا میڈم۔“ وہ خوف زدہ انداز میں بولا۔
وہ اسے جانتا تھا اور یہ بھی کہ وہ کیا کیا کرسکتی تھی۔ اب کومل کی پیشی خود اس کی بقا کے لیے لازمی ہوگئی تھی۔

☆☆☆

اس ہال نما کمرے میں گہری خاموشی طاری تھی۔
وہاں اس وقت تین افراد موجود تھے۔ ان میں سے ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ نظر آرہی تھی۔ وہ ورزشی جسم اور طویل القامت تھا۔ اس کے گہرے سانولے چہرے پر بے رحمی و درشتی نمایاں تھی۔ ہونٹوں کی بناوٹ مزاج کی سختی کا پتا دے رہی تھی۔ اس کے سامنے دو افراد کھڑے تھے۔ وہ دونوں شکل سے ہی بدمعاش نظر آرہے تھے۔ ان میں سے ایک کے چہرے پر زخم کا لمبا نشان تھا جبکہ دوسرا قدرے چھوٹی قد وقامت کا بھاری جسامت والا شخص تھا۔
”کہاں، کہاں لے کر گئے ہیں وہ آپا کو — ؟ جیل سے باہر تو نہیں لے جاسکتے۔“ بیٹھا ہوا شخص بولا۔
”جی بھائی...... باہر تو ہم نے نظر رکھی ہوئی ہے مگر اندر سے معلوم ہوا ہے کہ آپا کو دو دن پہلے سیل سے لے گئے تھے...... اور ہمارا اکنسائنمنٹ اسی دن پکڑا گیا تھا۔“
”مگر کیسے؟ ہم تو اندر سب کو اتنا پیسا دے رہے ہیں؟ آپا خود سب سے مطمئن تھی اور سب کچھ بالکل ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا پھر اچانک یہ ریڈ کیسے پڑگئی؟ ہمیں اس پر سوچنا ہوگا؟ اور وہاں موجود ہمارے بندوں کو الرٹ کرو، کیا کررہے ہیں وہ؟ مجھے مکمل تفصیلات اور اندر کی ساری خبریں درکار ہیں۔“ وہ دہاڑا۔
”ایسا ہی ہوگا بھائی۔“ پستہ قد سر ہلا کر بولا، ان کے چہرے پر خوف طاری تھا۔
”ایسا ہی ہونا چاہیے۔“ وہ غرایا۔ ”ہم نے یہ فوج اس لیے نہیں پالی کہ وقتِ ضرورت ہمیں کچھ معلوم ہی نہ ہو سکے......“ ابھی یہ الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ ایک لمبا اور کچھ دبلا پتلا شخص کمرے میں داخل ہوا۔
”بھائی مختار آیا ہے، کہہ رہا ہے کہ اس کے پاس آپا کے حوالے سے اہم خبر ہے۔“
”تو اسے باہر کیوں چھوڑ آئے ہو...... عقل چرنے گئی ہے کیا...... بھیجو اس کو اندر فوراً۔“ وہ غرایا۔
اس کے باہر جاتے ہی ایک ادھیڑ عمر شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے سر پر بال نام کی کوئی شے نہیں تھی۔
چہرے سے وہ سخت بدمزاج اور خطرناک لگ رہا تھا۔
”بول مختار...... جلدی بول......“ وہ اس کے اندر داخل ہوتے ہی بول پڑا۔
”بھائی خبر ملی ہے کہ آپا کی مخبری ہوئی ہے۔“ وہ بولا تو اس کی آواز اس کے جثے اور شخصیت کے برخلاف نہایت مہین سی تھی۔
”کس نے کی ہے؟ کون ہے وہ؟ نام بتا اس کا؟“ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔
”مجھے وہاں دفتر میں اپنے سورس سے پتا چلا ہے بھائی کہ وہ کوئی عورت ہے۔ آپا کے ساتھ اس کی کوٹھری میں رہ رہی تھی۔ اسی نے یہ گل کھلایا ہے۔“
”وہ اب تک زندہ ہے جیل میں؟“ اس نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔
”بھائی وہ اب جیل میں نہیں ہے، اسے رہا کردیا گیا ہے۔“
”یعنی جاسوس بن کر آئی تھی۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”کون ہے وہ؟ کہاں رہتی ہے؟ خاندان میں کون کون ہے؟ مجھے ساری معلومات چاہئیں آج شام تک — میں اسے عبرت کا نشان بنادوں گا۔“
”جی بھائی، میں اس پر کام کررہا ہوں۔ شام تک آپ کو ساری معلومات مل جائیں گی۔“ وہ سعادت مندی سے بولا۔
”اب تم سب بھی کٹو......“ وہ ہاتھ سے ان سب کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ سب کے جانے کے بعد بھی وہ اسی پوزیشن میں بیٹھا رہا تھا۔ سلطان چھ برس کا تھا جب اس کی ماں کا انتقال ہوا تھا۔ باپ اس سے قبل ایک پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا۔ آپا اس کے لیے ماں کی طرح تھی۔ اس نے ہی اسے پالا تھا۔ وہ بہت جی دار تھی۔ یہ کاروبار اس کا ہی پھیلایا ہوا تھا جسے اس کے جیل جانے کے بعد سے وہ چلا رہا تھا۔ آپا کے جیل جانے کے بعد تو ان کا کام اور پھیل گیا تھا۔ اس نے وہیں سے بے شمار نئے گاہک بنا لیے تھے۔ شروع میں انہیں تھوڑا بہت خوف اگر تھا بھی تو اندر کے بندوں کو خریدنے کے بعد اب وہ بھی دور ہوگیا تھا اور جب سب بالکل انڈر کنٹرول چل رہا تھا تو یہ لوچا ہوگیا۔
”وہ اسے چھوڑے گا نہیں...... وہ جہاں ہوگی وہیں اس کا خاتمہ کرنا ہوگا تاکہ آئندہ کسی کو ان کی مخبری کی ہمت نہ ہو۔ ہر کاروبار کی کامیابی کی ایک کنجی ہوتی ہے، ان کے کاروبار کی کامیابی خوف تھا اور اسے اس خوف کو بڑھانا تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر خرم لودھی چند لمحوں پہلے ہی دفتر آیا تھا۔ اس کے آتے ہی اس کے اسسٹنٹ نے اسے طلبی کا پیغام سنایا تھا۔

''اچھا......'' وہ یہ کہہ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''میں دس منٹ میں آرہا ہوں۔'' وہ میز پر رکھی فائلوں پر کام ختم کر کے ایس پی کے سامنے حاضر ہونا چاہتا تھا۔ اسے اپنے کام سے محبت تھی۔ اسے اس کی ایمان داری، مستقبل مزاجی اور محنت کی وجہ سے ڈپارٹمنٹ کا بہترین آفیسر قرار دیا جاتا تھا۔ وہ جس کیس کو ہاتھ میں لیتا، اسے حل کر کے ہی چھوڑتا۔ اس کی یہ شہرت جہاں اس کے لیے اچھا نام، تعریفیں، شاباشیں اور اطمینان لاتی تھیں وہیں کام کا رش روز بروز بڑھتا ہی جارہا تھا۔ یہاں لوگ یوں بھی من حیث القوم ''اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا'' کی مثال ہیں یوں ہر مشکل کیس کا رخ اس کی جانب موڑ دیا جاتا۔

وہ تھوڑی دیر بعد ایس پی صاحب کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔

''خرم...... آپ جانتے ہیں کہ ہم اور خصوصی طور پر میں آپ پر بہت فخر محسوس کرتا ہوں، آپ جیسے آفیسر ہمارا اثاثہ ہیں۔ میں نے ہیڈ آفس کو لکھا تھا کہ آپ کو پولیس اکیڈمی میں نئے ریکروٹمنٹ کو لیکچر اور ٹریننگ دینے کے لیے مدعو کیا جائے، ان کی جانب سے جواب آیا ہے جو میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔ آپ اسے دیکھ کر اپنی سہولت کے حساب سے کوئی تاریخ دے دیں۔''

''بہت شکریہ سر...... مگر اس میں کچھ وقت لگے گا۔ ہمارے پاس آج کل کافی کام ہے۔ شہر میں ڈرگز کی خرید وفروخت میں اضافہ نظر آرہا ہے اور نوجوان ان کا خاص ٹارگٹ ہیں۔'' وہ بولا۔

''ہمیں اس پر بھی بات کرنا ہے۔'' ایس پی نے کہا۔

''جی فرمائیے۔'' سینئر انسپکٹر خرم بولا۔ اس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ سانولی رنگت، درمیانی قدوقامت اور متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔

''ہمارے پاس ایک کیس آیا ہے جسے میں خاص تفتیش کے لیے تمہارے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ اس عورت کا نام کومل شاہ میر ہے۔'' وہ ایک فائل آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ ٹی وی چینلز کی رپورٹر رہی ہے۔ ٹریفک کے ایک حادثے کی وجہ سے اسے جیل کی سزا ہوئی تھی جہاں یہ مشہورِ زمانہ ڈرگ ڈیلر شاہدہ کی سیل میٹ تھی۔ تعلیم یافتہ اور مہذب عورت ہے، اس کا رویہ بھی بہترین رہا ہے۔ شاہدہ اور اس کے بھائی سلطان کے خلاف مضبوط کیس میں اس نے جیل انتظامیہ اور ڈرگ کمیٹی کی سربراہ سینیٹر صائمہ شاہ کی مدد کی تھی جس کی وجہ سے اس کو دو سال میں رہائی مل گئی، ہمیں اس عورت کو ڈھونڈنا ہے۔''

''مگر کیوں سر......؟''

''رہائی کے بعد اس نے حسبِ وعدہ کمیٹی سے رابطہ نہیں کیا اور نہ ہی کمیٹی اور عدالت میں بیان ریکارڈ کرایا، جیل میں البتہ وہ ابتدائی بیان ریکارڈ کرا چکی ہے مگر سینیٹر صائمہ کو اس کی اجلاس میں موجودگی درکار ہے۔''

''ٹھیک ہے مگر یہ اتنا بڑا جرم تو نہیں جس کے لیے اسے اُس تندہی سے ڈھونڈا جارہا ہے۔''

''اور بھی کچھ مسائل ہیں۔ رہائی والے دن ہی اس کے خلاف ایک اور شکایت فائل ہوئی ہے جس کے مطابق اس نے ایک گھر میں زبردستی گھس کر چوری کی کوشش کی اور مداخلت پر گھر میں موجود شخص کو شدید تشدد کا نشانہ بنایا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا جس پر بارہ ٹانکے آئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے مگر ایسے تو بہت جرائم ہوتے ہیں، ہمیں اس پر کیا خاص کام کرنا ہے؟''

''ہمیں اس عورت کو تلاش کرنا ہے کیونکہ سینیٹر صائمہ شاہ کو سینیٹ کے الیکشن سے قبل اسے کمیٹی میں پیش کرنا ہے یوں سمجھو کہ اس کی کامیابی کا انحصار اس کے بیان پر ہے اور اس وجہ سے ہم پر اس کی تلاش کا شدید دباؤ ہے، ایک بات جو میں سوچ رہا ہوں اور جس وجہ سے میں نے تمہیں اس کام کے لیے منتخب کیا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ عورت ڈرگ مافیا کے خلاف مددگار ثابت ہوسکتی ہے، اگر اس کی وجہ سے شاہدہ پھنسی ہے تو سلطان اور اس کا گینگ بھی اس کے پیچھے ہوگا اگر ہم اس تک پہنچ پائے تو یقیناً ان کو پکڑنے میں آسانی ہو گی، تمہیں بیٹھے بٹھائے ایک چارہ مل گیا ہے۔''

''ہوں...... آپ درست کہہ رہے ہیں، میں اس فائل کو دیکھتا ہوں اور اس پر کام شروع کرتا ہوں۔'' وہ بولا۔

''گڈ، تم جانتے ہو کہ ہمیں تیز رفتاری سے آگے بڑھنا ہوگا ورنہ ہوسکتا ہے کہ شہر کے کسی کونے سے اس کی لاش برآمد ہو۔''

''جی، میں سمجھتا ہوں۔'' وہ بولا اور اجازت لے کر کمرے سے باہر آگیا۔ اسے فائل کا بغور معائنہ کرنے میں بیس منٹ لگے تھے۔ اس کے حساب سے یہ عورت خطرناک

ملزمہ ہوسکتی تھی جبکہ اس کی تصویر کچھ اور ثابت کر رہی تھی۔ بہرحال یہ اس کے کام کا کیس تھا۔ اس نے فون اٹھایا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔

☆☆☆

''ہاں بھئی وکیل، تو بتا کہ اس معاملے سے کیسے نمٹا جائے، تجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ آپا ہے کدھر؟ کیا وہ اسے جیل سے باہر لے جاسکتے ہیں؟'' سلطان نے پوچھا۔

''معاملہ گمبھیر ہے، میں نے معلومات کی تھیں۔ انہیں آپا جی کے کھانے کے ساتھ اور ان کے کمرے میں بھی ڈرگز ملی ہیں، ان کو تفتیش کے لیے لے جایا گیا ہے مگر وہ انہیں جیل سے باہر نہیں لے جاسکتے۔ وہ جیل میں ہی ہیں مگر وہ کہاں ہیں اس معاملے میں نہایت رازداری برتی جارہی ہے، آپ جیل میں موجود اپنے بندوں کو اس کام پر لگائیں شاید وہ معلوم کرسکیں۔'' وکیل احمد علی بولا۔ وہ ان کا پرانا وکیل تھا۔

''تو کیا تیرے خیال میں، میں یہ نہیں کر رہا ہوں گا؟'' سلطان غرایا۔ ''مگر وہاں ہمارے بندوں کو بھی اس معاملے سے بالکل الگ رکھا جارہا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہاں کون کون آپ کا سہولت کار رہا ہے۔'' وکیل نے کہا۔

''ہاں مخبری پکی ہے اور مخبر کو بہت ہی پکی قبر میں دفنانے والا ہوں میں......'' سلطان سرد لہجے میں بولا۔ ''تو آپا کا وکیل ہے کچھ کرتا کہ معلوم ہوسکے کہ وہ لوگ اب کیا کرنے والے ہیں؟''

''آپ لوگ بھی کچھ دنوں کے لیے محتاط ہوجائیں خصوصاً آپ۔'' وکیل سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔'' وہ کچھ سوچ رہا تھا اتنے میں مختار دو تین بندوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ ''کچھ معلوم ہوا؟'' اس نے اسے آتا دیکھ کر پوچھا۔

''بھائی یہ اپنا اورنگزیب پولیس انسپکٹر بن کے اس کے بھائی کے گھر پر گیا تھا۔ پیسے والا آدمی ہے، یہ بڑا تو بنگلا ہے۔ پہلے تو وہ مکر ہی گیا کہ وہ اس کی بہن ہے۔ تھوڑی سختی کی تو کہنے لگا کہ ہم نے اسے عاق کر رکھا ہے اور اس سے کوئی تعلق نہیں ہے پھر ایک دو دھمکیوں کے بعد مان گیا کہ وہ جس روز رہا ہوئی تھی رات گئے اس کے پاس آئی تھی مگر اس نے اسے نہیں رکھا اور اسی وقت گھر سے نکال دیا۔''

''کوئی بڑا ہی بے غیرت بھائی ہے۔'' سلطان بڑبڑایا۔

''جی بھائی، ہم سے بھی منتیں کر رہا تھا کہ آہستہ بولیں ورنہ میری بیوی بچے پریشان ہوجائیں گے۔'' وہ اس کی نقل اتارتے ہوئے بولا۔

''یعنی کام نہیں بنا، اس کا کوئی کھرا نہیں ملا اب تک۔'' سلطان نے پوچھا۔

''مل گیا ہے بھائی۔'' وہ بولا۔

''تو پہلے وہ بک نا کیا ڈرامے بازی کر رہا ہے۔'' سلطان غرایا۔

''بھائی ہم وہاں سے نکلے تو ٹیپو مل گیا، وہ اپنا پرانا یار ہے اسی علاقے میں ٹیکسی چلاتا ہے، یہ اورنگزیب کی کھوپڑی میں آئیڈیا آیا کہ اگر اس نے اسے دیکھا ہو تو مدد ہوسکتی ہے۔''

''پھر......؟''

''پھر کمال ہوگیا بھائی......اس رات کو وہاں سے اس نے ہی ایک لڑکی کو بٹھایا تھا۔ وہ راستے میں رو بھی رہی تھی۔ اس کی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے اسے وہ یاد رہ گئی۔ اس نے اسے امپریل بلڈنگ پر چھوڑا تھا، اس کے پاس کرائے کے پیسے بھی نہیں تھے اس لیے وہ اسے بتا کر گئی تھی کہ وہ فلیٹ نمبر 22 میں جارہی ہے اور ابھی پیسے بھیج رہی ہے۔ نمبر اس نے اس لیے پوچھ لیا تھا کہ کہیں بھاگ نہ جائے......اس نے بتایا کہ پیسے دینے کے لیے دوسری لڑکی آئی تھی۔''

''زبردست......تم لوگ وہاں گئے؟''

''نہیں بھائی، اب آپ کی اجازت سے جائیں گے۔''

''الو کے پٹھو فوراً جانا چاہیے تھا۔'' وہ چیخا۔ ''چلو میں بھی تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔''

''نہیں بھائی آپ کا جانا خطرے سے خالی نہیں ہو گا۔'' مختار جھجکتے ہوئے بولا۔

''ہاں، وہ وکیل بھی یہی کہہ رہا تھا۔'' وہ بولا۔ ''جاؤ تم لوگ، مجھے وہ چاہیے۔''

''ٹھیک ہے بھائی ہم نکل رہے ہیں۔''

ان لوگوں کے نکلنے کے بعد وہ بھی بستر پر دراز ہوگیا۔ اس سارے چکر کے فوراً بعد اس نے اپنی قیام گاہ تبدیل کر لی تھی۔ اس وقت وہ ڈیفنس میں موجود ایک بنگلے میں رہ رہا تھا۔ اس نے یہ بھی انتظام کر لیا تھا کہ اگر پولیس اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانے والی ہو تو وہاں موجود کالی بھیڑیں اسے اس سے فوری طور پر مطلع کرسکیں۔ ویسے بھی یہ سب ان کے دھندے میں معمول کی باتیں تھیں مگر اس بار ایک

عجیب سی بے چینی اور بے سکونی نے اسے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

☆☆☆

شاہدہ کئی دنوں سے ڈرگز کنٹرول اتھارٹی کے خفیہ افسران کی زیرِ نگرانی تھی۔ جواد احمد اس مشن کا سربراہ تھا۔ ڈرگز اور اس کا کام کرنے والے افراد سے اسے شدید نفرت تھی۔ اس کا اپنا چھوٹا بھائی منشیات کا عادی ہو کر موت کے گھاٹ اتر چکا تھا۔ انسانیت کے ان دشمنوں کے لیے اس کے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں تھا۔ انھوں نے شاہدہ سے ہر ممکن معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اس وقت اسی حوالے سے ایک خفیہ میٹنگ جاری تھی۔

''ان معلومات کی مدد سے شہر میں کام کرنے والے اس سب سے بڑے گینگ کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے مگر ایک خوف ہے۔'' جواد احمد بولا۔

''کیسا خوف......؟'' ایک سینئر افسر نے پوچھا۔

''ان کے زرخرید لوگ ہر ڈپارٹمنٹ میں موجود ہیں یقیناً انہیں کافی خبریں مل چکی ہوں گی، اس لیے ہمیں نہایت تیزی سے کام کرنا چاہیے۔'' اس نے کہا۔

''شاہدہ کا کیا کرنا ہوگا؟'' ایک اور افسر نے پوچھا۔

''شاہدہ کو واپس اس کے سیل منتقل کر دیا جائے۔ نئے مقدمے کے بعد اس کے مستقبل کا فیصلہ عدالت کرے گی۔'' ڈپارٹمنٹ کے سربراہ عطاالرحمن نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے سر...... ہم اسے واپس بھیج دیتے ہیں۔'' جواد نے کہا۔

''تمھیں ڈپارٹمنٹ کے اس فیصلے پر اعتراض کرنا چاہیے تھا۔ وہ واپس جا کر مسائل میں اضافہ کرے گی اور ایک ایسے وقت میں جبکہ ہم اتنی رازداری برت رہے ہیں ساری بات باہر نکل جائے گی۔'' اس کے ساتھی شفقت نے میٹنگ ختم ہونے کے بعد کہا۔

''وہ ایسا کچھ نہیں کر سکے گی۔'' جواد احمد مسکرایا۔

''وہ کیسے؟ کیا تم اسے سمجھا بجھا کر بھیجو گے کہ برائے مہربانی اپنا منہ بند رکھنا۔''

''نہیں، وہ ایسے کہ وہ کچھ بتانے کی پوزیشن میں ہی نہیں ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''شفقت ان لوگوں نے لاتعداد گھر اجاڑے ہیں، کتنے ہی نوجوانوں کو تباہ کیا ہے اور انہیں موقع ملا تو یہی کرتے رہیں گے۔ یہ سدھرنے والے لوگ نہیں ہیں۔ ایک ہوتے ہیں حادثاتی مجرم انہیں سدھارا جا سکتا ہے اور دوسرے شاہدہ اور سلطان قسم کے لوگ جن کی رگوں میں جرم تمنا اور لطف بن کر گزرتا ہے یہ سُدھرنا نہیں چاہتے...... اس لیے ان سے معاشرے کو بچانا ہمارا کام اور ذمّے داری ہونا چاہیے۔''

''وہ تو ہے ہی، دیکھا نہیں تھا کہ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے باوجود کس طرح دھمکیاں دے رہی تھی وہ......'' وہ بولا۔ ''مگر تمہاری بات کا مطلب کیا ہے؟''

''وہ اسی تیر کا شکار ہوگئی ہے جس سے وہ لوگوں کی جان لینے کی ماہر تھی۔''

''یعنی۔''

''یعنی نہ جانے کیسے اس نے خود ڈرگز لینا شروع کر دی ہے اور ان چند دنوں میں ہی اس کی شدید عادی ہوگئی ہے۔ اب تو وہ ایک لمحے نشے کے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' جواد احمد نے بے نیازی سے کہا۔ شفقت اس کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

زارا، کومل کے جانے کے بعد سے قدرے اُداسی محسوس کر رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے گھر خالی ہوگیا ہو۔

''اچھی لڑکی ہے، کتنی خوب صورت اور نفیس مگر قسمت دیکھو اس کی، اسی لیے تو بچیوں کے اچھے نصیب کی دعا مانگتے ہیں۔'' اس کی امی نے کہا۔ ''کس قدر تکلیفیں اور غم اٹھانا پڑ رہے ہیں بے چاری کو...... اللہ کرے کہ اس کے لیے آسانیاں پیدا ہوں اور بدمعاش شوہر اس کے بیٹے کو اس کے حوالے کر دے۔''

''بس امی آپ دعا کریں۔ میں اپنے لیے چائے بنا رہی ہوں آپ کے لیے بناؤں؟'' زارا نے پوچھا۔

''نہیں بیٹا، میرا دل نہیں ہے۔'' ان کے جواب پر زارا کچن کی طرف چلی مگر لاؤنج تک ہی پہنچی تھی کہ دروازے پر بمباری سی ہونے لگی۔

''کون ہے بھئی اڑتے جھاڑو پر سوار...... بندے کو دو تین منٹ تو لگتے ہیں دروازے تک آتے آتے......'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے دروازہ کھولا اور اپنے چہرے کے سامنے لہراتے ریوالور کو دیکھ کر ساکت سی ہوگئی۔

''چلو اندر......'' ریوالور والے نے اسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

''کک...... کون ہو تم لوگ......؟ کیا چاہتے ہو؟ ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' دھکے کی وجہ سے وہ

لاؤنج کے درمیان ... آ گری تھی۔
اندر گھسنے والوں کی تعداد چار تھی۔ وہ شکل سے غنڈے لگ رہے تھے، انہوں نے اندر گھس کر دروازہ بند کرلیا۔
"تم سے جو پوچھا جائے تم نے اس کا سچ سچ جواب دینا ہے، کوئی چالاکی نہیں، سمجھی نا...... ورنہ گولی چلنے میں صرف ایک لمحہ لگتا ہے۔" ان میں سے ایک غرایا۔
"کیا...... کیا بتانا ہے؟" خوف کے مارے اس کی آواز بھی پوری طرح نہیں نکل رہی تھی۔
"کون ہے بیٹا ..... اس وقت کون آیا ہے؟" امی کمرے سے نکلیں اور ٹھٹک کر کھڑی رہ گئیں۔
"امی، زارا، ارے میرے خدا...... گھر میں ڈاکو گھس آئے ...... میں کہتی تھی نا کہ سیکیورٹی سسٹم لگوا لے...... کون ہو تم لوگ؟ میری بچی کو کچھ مت کرنا میرے پاس جو ہے وہ لے لو......" وہ ہاتھوں میں پڑی سونے کی چوڑیاں اتارتے ہوئے بولیں۔ ان کی آواز کانپ رہی تھی اور سارا جسم لرز رہا تھا۔
"آواز بند کر بڑھیا......" ان میں سے ایک بولا۔
"گھر میں اور کون کون ہے؟"
"کوئی نہیں، ہم ماں بیٹی رہتے ہیں یہاں۔" وہ بمشکل بولیں۔
"نن...... نہیں بھائی جان بھی آجائیں گے ابھی۔" زارا نے کہا۔
"تم دونوں میں سے جھوٹ کون بول رہا ہے۔" لمبی قامت اور ورزشی جسامت والے غنڈے نے زارا کی امی کے سر پر پستول رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے سچ اور فوراً جواب چاہیے ورنہ یہ آنٹی اوپر جارہی ہیں۔" اس کے لہجے میں اتنی بے رحمی تھی کہ زارا لرز کر رہ گئی۔
"مم...... میں......" وہ بولی، اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کے بائیں جانب کھڑے موٹے شخص نے اس کے چہرے پر طمانچہ جڑ دیا۔
"جھوٹ نہیں چاہیے، ایک لفظ بھی نہیں۔" وہ غرایا۔
"نہیں بولے گی، نہیں بولے گی...... معاف کر دو اسے......" امی تڑپ کر بولیں۔
"وہ عورت کومل کہاں ہے؟" لمبی قامت والے نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔
"کک...... کون......؟" زارا بولی۔
"لگتا ہے کہ تمہاری یادداشت کھو گئی ہے۔ یار بھائی لوگ یہ باجی پرانے فیشن والی ہیں۔ ریوالور تو آخری فیصلہ ہوتا ہے نا، اب اگر کچھ جاننا ہے تو اپنا چاقو نکالو...... کچھ خون کی لکیریں بنانا پڑیں گی ماں بیٹی کے جسم پر...... شاید تب سب یاد آجائے۔" وہ سفاکی سے بولا اور جیب سے چاقو نکال کر اسے کھول لیا۔
"نہیں...... نہیں...... اسے کچھ مت کرو...... میں بتاتی ہوں۔" امی نے کہا۔
"ہاں بولو، شاباش......" وہ ان کی جانب مڑا۔
"وہ زارا کی دوست ہے، مشکل میں تھی اس لیے یہاں آئی تھی۔"
"اب کہاں ہے وہ......؟" اس نے تحمل سے پوچھا۔
"تم اسے جان سے تو نہیں مار دو گے؟" انہوں نے پوچھا۔
"لگتا ہے کہ تمہیں اپنی بیٹی کی جان کی فکر نہیں ہے۔" وہ غرایا۔ "ہمارے پاس تمہاری رام کہانی سننے کا وقت نہیں ہے، وہ کہاں ہے؟" وہ چاقو لے کر زارا کی جانب بڑھا۔
"نہیں، نہیں، اسے کچھ مت کہنا، میں تمہیں بتاتی ہوں۔" وہ رو رہی تھیں۔
"امی۔" زارا نے کچھ کہنا چاہا۔
"زارا مجبوری ہے بیٹا، وہ اسلام آباد گئی ہے۔" وہ بولیں۔
"کیسے؟"
"کار سے...... کار سے گئی ہے کرائے کی۔"
"کار کا نمبر؟"
"وہ تو مجھے معلوم نہیں ہے۔" وہ بے چارگی سے بولیں۔
"وہ ہمیں چاہیے کیوں بھی حسینہ......" وہ زارا کی گردن پر چاقو کی نوک رکھتے ہوئے بولا۔ "نہیں بتاؤ گی یا اندر کمرے میں لے چلوں؟"
"وہ مجھے یاد نہیں مگر اس کا نمبر ہے میرے پاس......" وہ بالآخر بولی۔
"وہ کاغذ لے کر آ فوراً، کوئی چالاکی نہیں ورنہ کل ماں کا جنازہ پڑھانا پڑے گا۔"
زارا نے لرزتے کانپتے ہاتھوں سے سلپ نکالی اور اس کی طرف بڑھا دی۔ اس پر کلائنٹ .... کے کالم کے سامنے ڈرائیور کا نام، گاڑی کا میک اور نمبر سب کچھ تحریر تھا۔
"یہ ہوئی نا کام کی بات...... چلو باندھ دو ان دونوں

کو۔''

''مگر ہم نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔'' زارا نے کہا۔''پھر کیوں؟ میری امی مریض ہیں وہ ٹینشن برداشت نہیں کر سکتیں۔''

''ہاتھ پیر بندھونے ہیں یا سر میں سوراخ کروانا ہے؟'' اس نے سفاکی سے پوچھا۔

''گھر میں جتنے فون ہیں وہ اٹھالو، انہیں باندھنے کے بعد وہ بولا۔ چند لمحوں میں وہ جس تیزی سے آئے تھے اسی طوفانی انداز میں غائب ہو گئے۔ زارا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ یہ یقیناً کوئی معمولی چور اچکے نہیں تھے نہ جانے ان کومل سے کیا دشمنی تھی۔ پتا نہیں یہ اس کے ساتھ کیا کرنا چاہتے تھے؟ سوالیہ نشان اس کے اردگرد ناچ رہے تھے اور وہ بے بسی سے دروازے کو دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

سفید ٹویوٹا ہائی وے پر تیزی سے جارہی تھی۔

کومل، پچھلی نشست پر بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پانی کی بوتل تھی۔ برابر میں سیل فون کھلا ہوا تھا۔ اس کے ذہن میں خیالات کا مجمع تھا جس میں درد، تکلیف، دکھ، دھوکوں کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ انسان جن کو اپنا خیال کرتا ہے اور ان کی خاطر سب کچھ کر گزرتا ہے وہ ہی یکلخت اس کے دشمن ثابت ہوتے ہیں۔ یہ کیا عجب کہانی تھی۔ اس نے گہری سانس لی، وہ وہاں پہنچ کر کیا کرے گی؟ شاہ میر کو کیسے ڈھونڈے گی؟ اور جب وہ مل جائے گا تو اس سے کیا کہے گی؟ کیا پوچھے گی؟ سمیر اسے پہچانے گا بھی کہ نہیں؟ اب تو وہ ساڑھے تین سال اور اٹھارہ دنوں کا تھا۔ فون پر وہ اس سے بات کرتا رہا تھا۔ اسے وہ یاد تو بہرحال تھی۔ وہ سوچوں میں مگن تھی کہ اس کا فون بج اٹھا۔

''کہاں پہنچیں کومل؟'' یہ زارا کا میسج تھا۔

''ہائی وے پر ہوں حیدرآباد کراس کرنے والے ہیں۔'' اس نے جواباً تحریر کیا۔

''اچھا سنو جب تم ٹیاری کے قریب سے گزرنے والی ہو تب مجھے دس منٹ پہلے بتا دینا۔'' زارا کا اگلا پیغام آیا۔

''کیوں زارا؟''

''اصل میں مجھے کچھ چھوٹا سا کام ہے، تمہیں مسئلہ تو نہیں ہوگا؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں تو، ڈرائیور صاحب کو اگر اعتراض نہ ہو تو......''

''اسے کیا اعتراض ہوگا پلیز بتا دینا۔''

''ٹھیک ہے زارا، میں بتاتی ہوں کال کر دوں گی۔'' کومل نے لکھا۔

''نہیں میسج کرنا، امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، ڈسٹرب ہو جائیں گی، ان ہی سے متعلق کام ہے، وہاں ایک مزار ہے وہاں دو لمحے کے لیے دعا کرنا ہے۔''

''ضرور بتاؤں گی، آنٹی کا خیال رکھنا۔''

''سنو کومل ڈرائیور سے پوچھنا کہ وہ کتنے بجے تک وہاں پہنچ پائے گا؟''

ڈرائیور نے اس کے سوال کے جواب میں ایک گھنٹا بتایا تھا۔''تقریباً تیس میل کا سفر ہے۔'' اس نے بتایا۔

''ٹھیک ہے پہنچ کر میسج کر دینا اللہ حافظ۔'' زارا کا پیغام آیا۔

کومل کو تھوڑا عجیب تو لگا تھا مگر زارا ایسی ہی تھی۔ کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتی تھی مگر وہ کتنی اچھی ہے، اس نے سوچا اللہ اسے کبھی کوئی غم نہ دے، وہ چند لمحے فون کو دیکھتی رہی پھر اس نے ایک بار شاہ میر کا نمبر ملایا۔ توقع کے مطابق بیل مسلسل بج رہی تھی۔

''کتنا بھاگو گے شاہ میر، تم سے ملاقات ہونے ہی والی ہے۔'' وہ طنزیہ انداز میں مسکرائی اور کال کاٹ دی۔

☆☆☆

''اعلیٰ، یہ کیا ہے تو نے کام۔'' سلطان پیغامات دیکھ کر مسکرایا۔''شکل سے تو کتنی سیدھی سادی لگ رہی ہے۔'' زارا کے فون میں کومل کا نمبر تصویر کے ساتھ فیڈ تھا جس کی وجہ سے اس کے پاس اس کی تصویر بھی پہنچ گئی تھی۔''اب تو فوراً خان محمد کا نمبر ملا شاباش۔'' اس کی نظریں اب بھی کومل کی تصویر پر جمی ہوئی تھیں۔

سعید نے فون ملا کر اس کی طرف بڑھایا۔''خان تمہاری ضرورت ہے سلطان کو۔'' اس نے کال اٹھاتے ہی کہا۔

''سلطان کے لیے جان بھی حاضر ہے، کام بتاؤ سائیں۔'' وہ بولا۔

''ہمارا ایک دشمن ایک گھنٹے میں تمہارے علاقے کے قریب سے گزرنے والا ہے، وہ ایک عورت ہے اور اس نے ہماری آپا کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔'' وہ نفرت سے بولا۔''مجھے وہ زندہ یا مردہ چاہیے زندہ ہوتا تو بہتر ورنہ اس کی لاش۔''

''حاضر سائیں، آپ کے احسان ہیں ہم پر...... ہم

سڑک پر ہوں گے پر کوئی نشانی...... کوئی کُھرا۔''
''ہاں میں تمہیں ابھی گاڑی کا نمبر، رنگ وغیرہ بھیج رہا ہوں اور اس عورت کی تصویر بھی۔ اس کی گاڑی جہاں رکوائی جائے گی وہیں تمہیں اس کو پکڑنا ہوگا۔''
''یہ تو پھر ٹکھن کام ہوگیا سائیں، صبح سے پہلے چھوری آپ کے قدموں میں ہوگی۔'' وہ بولا۔
''ٹھیک ہے میرے فون کا انتظار کرو...... مگر وہاں پہنچ کر سڑک پر......''
''حاضر سائیں۔'' اس نے جواب دیا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

سینئر انسپکٹر خرم، کومل شاہ کے کیس کے بارے میں جتنی گہری تفتیش کرتا جارہا تھا، نت نئی چیزیں اس کے سامنے آرہی تھیں۔ یہ بظاہر دو اور دو چار جیسا کیس اس قدر سیدھا ہرگز نہیں تھا۔ وہ اپنے کمرے میں اس وقت تنہا تھا اور اس کا ذہن کومل شاہ میر کے کیس اور سزا میں الجھا ہوا تھا۔ آج ملنے والی اطلاعات نے اس کے ذہن میں موجود اس کیس کے خاکے اور اس عورت کومل کے امیج کو خاصا متاثر کیا تھا۔
وہ ایک صحافی تھی اور اپنے شعبے میں خاصی نامور...... اس کو دو بار بہترین رپورٹنگ ایوارڈ بھی مل چکا تھا۔ وہ برسوں سے گاڑی چلا رہی تھی پھر اس سے یہ حادثہ ہو جاتا ہے جس میں ایک لڑکی شدید زخمی ہوتی ہے اور کومل کو پانچ سال قید کی سزا ہو جاتی ہے۔ وہ پہلے دن سے ایک ہی بات کہہ رہی تھی کہ اس کی گاڑی کے بریکس فیل ہو گئے تھے مگر اس کے مکینک کی رپورٹ جو اس کے شوہر نے خود عدالت میں جمع کرائی تھی کے مطابق بریکس بالکل ٹھیک تھے پھر اس نے جیل میں ایک مجرمہ کے خلاف شواہد جمع کرنے میں مدد دی جو کہ اس کے لیے بالکل مشکل نہیں تھا، وہ تحقیقی رپورٹنگ میں مہارت رکھتی تھی اور پھر رہائی کے بعد سے وہ غائب تھی۔ اس کا گھر بک چکا تھا جس کا شاید اسے علم نہیں تھا لہٰذا سیدھی وہاں پہنچی تھی وہاں حقیقت میں کیا ہوا تھا، یہ فی الحال اس کے علم میں نہیں تھا لیکن اس نے وہاں موجود شخص کو زخمی کیا تھا اور اس پر چوری کی رپورٹ بھی کی گئی تھی۔
وہ سب سے پہلے گاڑی کی رپورٹ اور کومل کے بیان پر اٹکا تھا۔ اس نے سب سے پہلے اس ورکشاپ پر جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ آگے اسی وقت بڑھ سکتا تھا جب اس کے ذہن میں یہ کیس مکمل طور پر واضح ہو جاتا۔
ورکشاپ کا مالک شاہجہاں ایک سمجھ دار شخص نظر آرہا تھا۔ خرم کے تعارف کے بعد وہ تھوڑا بہت الجھا ہوا نظر آرہا تھا۔
''سر کیا ہمارے بارے میں کسی نے آپ کو رپورٹ کیا ہے؟'' وہ بالآخر پوچھ بیٹھا۔
''نہیں، آپ مطمئن رہیں ایسی کوئی بات نہیں، میں آپ سے چند سال پرانے ایک کیس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''
''جی سر...... پوچھیے۔''
''مسز کومل شاہ میر ایک جانی پہچانی خاتون تھیں، شاید آپ کے ذہن میں ہوں، وہ اپنی گاڑی کا کام یہیں سے کراتی ہیں۔ ان سے ایک حادثہ ہوگیا تھا جس کے بعد انہیں سزا بھی ہوگئی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ حادثے کے وقت ان کے گاڑی کے بریکس اور اسٹیئرنگ جام ہو گئے تھے جبکہ آپ کے ادارے نے رپورٹ کی تھی کہ وہ بریک بالکل ٹھیک تھے۔'' انسپکٹر خرم نے تفصیل سے پوچھا۔
''ہاں وہ کیس مجھے یاد ہے، وہ اچھی خاتون ہیں، میری ایک دو ملاقاتیں ہوئی تھیں ان سے۔ ان دنوں میری بیوی کا آپریشن تھا اس لیے میں ورکشاپ بہت کم آرہا تھا۔ ان کا کام جاوید دیکھتا تھا وہ ہمارا سینئر مکینک تھا۔''
''تھا سے کیا مراد ہے؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔
''ان دنوں کئی افسوسناک واقعات ایک ساتھ ہوئے تھے، ایک تو یہی مسز کومل والا واقعہ اور دوسرا جاوید کا قتل......''
''جاوید کا قتل؟'' خرم چونک اٹھا۔
''ہاں اس کی باقاعدہ رپورٹ ہوئی تھی مگر کچھ ہوا نہیں...... نہ ہی قاتل کا پتا چلا۔ اس کی لاش ڈیفنس کے مشہور پارک سے ملی تھی کسی نے اس کے دل پر اور سر پر گولی ماری تھی۔ وہ ہوتا تو آپ کو پوری معلومات دے سکتا تھا۔''
''آپ کا بہت شکریہ۔'' خرم نے کہا۔ ''کیا یہاں موجود آپ کے دیگر ملازمین میں سے کوئی جاوید کے قریب تھا؟ مجھے اس کے گھر کا پتا بھی درکار ہے۔ امید ہے کہ آپ تعاون کریں گے؟''
''بالکل، ویسے کیا جاوید کے قتل کا کوئی تعلق مسز کومل والے واقعے سے ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''ابھی کچھ کہہ نہیں سکتے۔'' خرم نے سچائی سے کہا۔
''آصف اس کا اچھا دوست تھا اس سے آپ کو اس کے گھر کا پتا بھی مل سکتا ہے، میں اسے بلاؤں؟''
''نہیں آپ مجھے اس کے پاس بھجوا دیجیے۔'' انسپکٹر

نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔
آصف درمیانی قدوقامت اور ادھیڑ عمر کا شخص تھا۔ شاید وہ کام سے فارغ ہوا ہی تھا۔ وہ خرم سے ہاتھ منہ دھو کر آنے کی اجازت لے کر گیا اور تھوڑی دیر میں واپس آ گیا۔
''جی صاب۔'' وہ دونوں ورکشاپ کی ایک جانب رکھی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ''میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟''
''سنا ہے کہ تم جاوید کے اچھے دوست تھے، اس کے قتل کے بارے میں تمہارا کیا کہنا ہے؟ کس نے مارا ہوگا اسے اور کیوں؟''
''اللہ اس پر رحم فرمائے، ہم اچھے دوست تھے، اسے کس نے مارا یہ تو صاب میں بالکل نہیں جانتا نہ ہی کسی پر شک کر سکتا ہوں مگر ان دنوں وہ بہت اونچا اڑنے [illegible] تھا۔ اس کے پاس نوٹ بھی کافی آ رہے تھے۔ کہتا تھا کہ جلد ہی اس نوکری پر لات مار کر اپنا ورکشاپ کھولوں گا.....'' وہ بولا۔
''نوٹ کہاں سے آ رہے تھے؟''
''پتا نہیں، ہاں ایک بات یاد آئی۔ جس دن سے وہ شاہ میر صاحب ملنے آئے تھے بس اس دن سے ہی اس کا دماغ ہوا میں اڑنے لگا تھا۔''
''شاہ میر؟''
''وہ کومل صاحبہ کے شوہر ہیں، ان کے مقدمے کے دوران وہ کئی بار یہاں آئے تھے۔''
''کومل صاحبہ کی گاڑی کی رپورٹ کس نے بنائی تھی؟''
''جاوید نے، وہ ہی ان کا کام کرتا تھا، عدالت میں گواہی بھی اسی نے دی تھی۔''
''مجھے اس کے گھر کا ایڈریس مل سکتا ہے؟''
''جی..... جی میں آپ کو سمجھا دیتا ہوں۔'' وہ ایڈریس کی تفصیل بتاتے ہوئے بولا۔
''ٹھیک ہے ضرورت پڑنے پر میں آپ سے دوبارہ رابطہ کروں گا۔ انسپکٹر خرم نے کہا اور باہر کی جانب چل دیا۔

☆☆☆

''میڈم ہمیں یہاں کتنی دیر رکنا ہوگا؟'' ڈرائیور نے کومل سے پوچھا۔ وہ لوگ زارا کے میسیج کے مطابق مٹیاری کے قریب ہائی وے سے اتر کر سیدھے ہاتھ پر مڑ گئے تھے۔ یہاں سڑک بنی ہوئی تھی اور دونوں اطراف میں جھاڑی نما درخت موجود تھے۔
''شاید پانچ منٹ اور.....'' کومل بولی۔ اسے خود اس جگہ سے ڈر سا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ علاقہ قدرے سنسان تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اکا دکا گاڑیاں البتہ گزر رہی تھیں۔
''میری معلومات میں تو اس طرف اس طرح کا کوئی مزار نہیں ہے۔ پتا نہیں زارا صاحبہ نے ہمیں یہاں کیوں رکوایا ہے۔'' وہ ایک منٹ بعد بولا۔
''میں اسے کال کر لیتی ہوں۔'' کومل نے انتظار سے تنگ آ کر موبائل اٹھایا۔ وہ زارا کا نمبر ملا ہی رہی تھی کہ ایک بڑی جیپ ان کے آگے آ کر رک گئی۔ جیپ کے رکتے ہی اس میں سے چار لمبے چوڑے افراد اترے، ان کا رخ ان کی کار کی طرف تھا۔
''یہ..... یہ کون ہیں؟ یہ سب ٹھیک نہیں لگ رہا مجھے.....'' ڈرائیور بڑبڑایا اور اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی۔ انجن نے ہلکی سی آواز کی۔ ان میں سے آگے آنے والا اس آواز کو سن کر تیزی سے کار کی جانب لپکا اور کار کی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر ڈرائیور کو باہر گھسیٹ لیا۔ باقی تین ابھی قدرے پیچھے تھے۔
کومل کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے فوری فیصلہ کیا اور ان کی کشمکش کے دوران اپنی جانب کا دروازہ کھولا اور کھسکتی ہوئی بے آواز انداز میں گاڑی سے نیچے پھسل گئی۔ رات کا گہرا اندھیرا اس وقت اس کا مددگار ثابت ہوا تھا۔ وہ زمین پر تقریباً لیٹ کر کھسک رہی تھی۔ سڑک پر پڑے پتھر وغیرہ اس کی جلد کو چھیل رہے تھے۔ وہ جلد از جلد جھاڑیوں کی طرف پہنچنا چاہ رہی تھی کیونکہ اگر وہ کوئی ڈاکو نہیں تھے تو یقیناً وہ روشنی کے ذریعے اسے تلاش کرنا شروع کر سکتے تھے۔ اس کا پرس کار میں رہ گیا تھا۔ موبائل البتہ اب بھی اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے، زارا اس کے ساتھ بھی ایسا نہیں کر سکتی تھی پھر یہ سب کیا تھا۔ وہ خراشوں اور چوٹوں کی پروا کیے بغیر تیزی سے کھسکتی ہوئی جھاڑیوں کے پیچھے پہنچ گئی۔ اسے ڈرائیور کی بھی فکر ہو رہی تھی۔
''او اوہ تو یہاں کہیں نظر نہیں آ رہی۔'' ان میں سے ایک نے گاڑی میں روشنی ڈالتے ہوئے چیخ کر کہا۔
''وہ وہیں کہیں ہوگی، بہت مکار ہے، اسے ہر قیمت پر پکڑنا ہے۔'' قدرے بھاری آواز بلند ہوئی۔
''تو بتا کہاں ہے وہ؟'' ان میں سے ایک نے ڈرائیور کے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے پوچھا۔
''مجھے کیا معلوم بھائی، میں تو صرف ڈرائیور ہوں، یہ رینٹ اے کار کی گاڑی ہے۔ مجھے تو ان کے بارے میں

بھی کچھ معلوم نہیں ہے، پلیز مجھے چھوڑ دو۔'' وہ گھگیایا۔

''آپ لوگ جانیں اور وہ میڈم مجھے آپ جانے دیں میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔''

''وہ ہاتھ لگ جائے تو چھوڑ دیں گے تجھے......'' وہی بھاری آواز پھر سنائی دی۔

''تم لوگ اسے ڈھونڈو یہیں کہیں ہوگی اور تو سیدھا کھڑا رہ، ذرا بھی حرکت کی تو اوپر پہنچ جائے گا سمجھا نا۔''

''جی جی صاحب سمجھ گیا، میرا اس جھگڑے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

اس دوران میں کسی کا موبائل بجا تھا۔ اس نے شاید ایک یا دو منٹ بات کی تھی اور پھر فون بند ہوگیا۔ اس کے فوراً بعد کومل کے ہاتھ میں دبا موبائل بج اٹھا۔ موبائل کی گھنٹی سناٹے میں گونج اٹھی تھی اور ساتھ ہی اسکرین بھی روشن ہوگئی تھی جس پر زارا کی تصویر چمک رہی تھی۔

''وہ...... وہ رہی...... پکڑو اسے۔'' ان میں سے ایک چلایا اور وہ سب جھاڑیوں کی جانب لپکے۔ کومل نے فون کاٹ دیا اور تیزی سے سڑک کی جانب دوڑی، بھاگنے سے پہلے اس نے زمین سے ایک پتھر اٹھا لیا تھا جسے اس نے اپنے قریب آ جانے والے آدمی کے چہرے پر دے مارا۔

''ہائے...... مر گیا۔'' وہ چیخ کر جھکا۔ باقی دو اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کومل کی حالت خراب تھی مگر عجیب بات یہ تھی کہ وہ اب بالکل خوف زدہ نہیں تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ جو بھی تھے وہ ان کا مقابلہ کرے گی چاہے وہ ان سے جیت نہ سکے مگر ہار ہرگز نہیں مانے گی، وہ سب چونکہ جھاڑیوں کی جانب لپکے تھے اس لیے وہ گاڑی کی دوسری جانب کھلی سڑک پر آگئی۔ گاڑی میں چابی لگی ہوئی تھی۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا اور تیزی سے بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی۔

''وہ بھاگ رہی ہے۔'' کوئی چیخا اور اس کے ساتھ ہی کار پر فائر ہوا تھا۔ فائر کی آواز نے اسے لمحہ بھر کے لیے دہلا دیا مگر پھر اس نے ایکسلریٹر پر پیر رکھا۔ کار جھٹکا کھا کر آگے بڑھی تھی اسی وقت ان میں سے ایک نے پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول لیا اس سے پہلے کہ وہ اندر داخل ہو پاتا کومل نے گاڑی کو جھٹکا دیا، وہ اچھل کر سڑک پر گرا تھا۔ آگے کھڑی جیپ کی وجہ سے وہ آگے نہیں جا سکتی تھی۔ اس نے ریورس گیئر لگایا اور ایکسلریٹر کو پورا دبا دیا۔ کار تیزی سے پیچھے ہٹی اور پیچھے سے آنے والے شخص سے ٹکرائی۔ زوردار ٹکر نے اسے اڑا دیا تھا مگر اسی وقت کئی فائر ایک ساتھ ہوئے تھے۔

ان میں سے کوئی فائر گاڑی کے پہیوں میں لگ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ ایک جگہ جم سی گئی تھی۔ ان میں سے دو تو زخمی ہو چکے تھے مگر اب بھی دو باقی تھے۔ کومل نے گاڑی کا دروازہ کھولا تب ہی دو باتیں ایک ساتھ ہوئیں۔ ایک کھردرے سے ہاتھ نے اسے گلے سے پکڑ کر گاڑی سے کھینچ لیا تھا اور اس اندھیرے کو چاک کرتی روشنی کے دیے لیے ایک اور بڑی جیپ ان کے بالکل قریب آ کر رکی تھی۔

''بہت گرمی ہے تجھ میں...... بہت زور ہے ہاں۔'' یہ کہہ کر اسے اتارنے والے نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کیا۔ کومل اچھل کر سڑک پر جا گری۔ اس ایک تھپڑ نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ بچپن سے وہ شہزادیوں کی طرح پلی تھی۔ بابا اور اماں نے اسے کبھی پھول کی چھڑی بھی نہیں چھوائی تھی۔ شادی کے بعد بھی شاہ میر اس سے کبھی بدتہذیبی سے پیش نہیں آیا تھا۔ اگلا لمحہ اس کے لیے حیرت کا طوفان لایا تھا۔ کسی اور کے زوردار تھپڑ نے اسے تھپڑ مارنے والے شخص کو اسی طرح اچھال کر اس سے کچھ دور لا پھینکا تھا۔

''کس قدر شرم کی بات ہے، دو تین مرد ایک اکیلی عورت پر حملہ کر رہے ہو اور عورت پر ہاتھ بھی اٹھایا، یار تم لوگوں نے تو مرد ذات کو بدنام ہی کر دیا۔'' وہ سادگی سے بولا۔

''تو نے کیا سمجھ رکھا ہے خود کو...... پکڑو اسے، یہ ہاتھ اٹھائے گا مجھ پر...... خان محمد پر...... تو نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال دیا ہے بچے گا نہیں تو۔''

''ابے پہلے خود اٹھ کر تو کھڑا ہو پھر مجھے بھی مار لیجیو اگر مار سکے تو۔'' وہ کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔

''ان کے پاس پستول ہیں، یہ آپ کو مار دیں گے۔'' کومل جو اتنی دیر میں کھڑی ہو چکی تھی، بولی۔

''آپ فکر نہ کریں، ان جیسوں کی پستولوں سے مرنے والا نہیں ہوں میں، آپ میری گاڑی میں بیٹھیں اور تو طرم خان تو بھی کھڑا ہو جا۔'' وہ اس کے قریب پہنچ کر بولا۔

اس کا ہاتھ کوٹ کی جیب سے باہر آیا تو اس میں ریوالور دبا ہوا تھا۔ اس نے گھسیٹ کر خان محمد کو کھڑا کیا اور اس کے سر پر پستول رکھ دیا۔ اس کی پشت پر خود اس کی گاڑی تھی۔ ''اب کس کو گولی چلانے کا شوق ہے وہ ابتدا کرے۔ دوسری گولی اس موٹے کے سر میں لگے گی، بلا اپنے ساتھیوں کو بلوں سے باہر آ جائیں۔'' اس نے خان محمد کے سر پر ٹہوکا مارتے ہوئے کہا۔ وہ چپ رہا تو اس نے ٹریگر پر انگلی رکھ دی اور اسے ہلکی

سی حرکت دی۔

''رک جاؤ...... رک جاؤ۔ آجاؤ تم دونوں باہر۔''
خان محمد چیخ پڑا۔

چند لمحوں بعد اس کے دونوں ساتھی باہر آگئے۔ ''شرم کرو یار۔'' وہ پھر بولا۔ ''اپنے ہتھیار زمین پر ڈال دو۔'' اس نے کہا۔

ان دونوں نے ریوالور خود سے دور زمین پر اڑا دیے۔ اس نے گردن ہلائی اور مسکرایا۔ ایک لمحے کے لیے وہ خان محمد سے غافل ہوا تھا۔ اس نے اسی لمحے کا فائدہ اٹھایا اور اس کے ریوالور والے ہاتھ کو زوردار جھٹکا دیا، وہ اسے گرانے میں تو کامیاب نہیں ہوا البتہ اس کا ریوالور نیچے گر گیا تھا۔ کومل نے پھرتی سے ریوالور اٹھالیا تھا مگر اس دوران ان دونوں نے بھی اپنے پسٹل اٹھا لیے اور ان میں سے ایک نے ایک ساتھ دو فائر بھی کر دیے تھے۔ اجنبی نے خود کو بچانے کے لیے خان محمد کو ڈھال بنایا جسے وہ دونوں فائر لگے تھے، اس کے جسم سے خون بہنے لگا تھا۔ اس کے دونوں ساتھی ایک لمحے کو جیسے ساکت رہ گئے۔ پھر وہ اس کی جانب لپکے، ان کے ہاتھوں میں پسٹلز تھے اور آنکھوں میں دیوانگی تھی۔

''یہ لیجیے......'' کومل پکاری۔ اجنبی نے اس کی طرف دیکھا کومل نے اس کا ریوالور اس کی جانب اچھالا جسے اس نے کمال پھرتی سے کیچ کر کے ان دونوں کے پیروں کو نشانہ بنایا، دونوں ایک ساتھ گرے تھے۔ کومل پھٹی پھٹی آنکھوں سے سڑک پر پڑے زخمیوں کو دیکھ رہی تھی۔

''گاڑی میں بیٹھو۔'' وہ زور سے بولا پھر اس نے لپک کر خان محمد کا فون اٹھایا اور پولیس ایمرجنسی نمبر ملا کر وقوعے کی اطلاع دی۔

''آپ کون بول رہے ہیں؟'' دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

''ایک ذمّے دار شہری۔'' اس نے یہ کہہ کر کال کاٹ دی۔ پسٹل زمین پر ڈال دیا اور تیزی سے گاڑی میں آبیٹھا۔

''یہاں کار کا ڈرائیور بھی تھا۔'' کومل بولی۔

''کہاں، یہاں تو کوئی نظر نہیں آرہا۔'' وہ بولا۔ ''ہمیں اب یہاں سے نکلنا چاہیے۔ اتنی فائرنگ ہوئی ہے، ان کے مزید لوگ کسی بھی وقت آسکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ بولی۔

اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی اور گاڑی ریورس ہو کر ہائی وے کی طرف مڑ گئی۔

☆☆☆

''میں جان سکتا ہوں کہ یہ سب کیا تھا؟ آپ کہاں جارہی ہیں؟ اور یہ سب آپ کو کیوں مارنا چاہتے تھے...... میرا مطلب ہے کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو شیئر کریں شاید میں آپ کی کوئی مدد کرسکوں۔'' دس منٹ کی خاموش ڈرائیو کے بعد وہ بالآخر بولا۔

''میں اسلام آباد جارہی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''آپ نے میری پہلے ہی بہت مدد کی ہے، آپ کی وجہ سے ہی میں اس وقت زندہ ہوں اگر آپ نہ ہوتے تو وہ مجھے ختم کر چکے ہوتے۔''

''اگر مجھے آپ کا نام معلوم ہوتا تو میں آپ کا نام لے کر کہتا کہ یہ میرا فرض تھا مگر ویسے میں بغیر نام کے بھی کہہ سکتا ہوں۔''

''میرا نام کومل ہے۔'' وہ بولی۔

''یعنی اسم بامسمیٰ ...... مجھے حسن کہتے ہیں حسن احمد خان اور مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' وہ بولا۔ ''تو کومل صاحبہ یہ جو ایکشن فلم تھی، یہ سب کیا تھا؟''

''سچ پوچھیے تو مجھے بھی معلوم نہیں۔'' وہ بے بسی سے بولی۔ ''میں جانتی ہوں کہ آپ کو اس بات پر یقین نہیں آئے گا مگر سچ یہی ہے۔''

''پھر تو یہ کافی کمال کی بات ہے، آپ اسلام آباد جاتے جاتے ہائی وے چھوڑ کر اس طرف کیوں چلی گئیں؟''

''میری دوست کا میسیج آیا تھا کہ وہاں اسے کچھ کام ہے اس لیے ہم وہاں گئے تھے۔''

''اور آپ کی کار اور ڈرائیور وہیں رہ گئے۔''

''وہ میری کار نہیں تھی، میں کرائے کی گاڑی سے جارہی تھی مگر میرا پرس اس کار میں رہ گیا ہے۔'' اسے جیسے یاد آگیا اور موبائل بھی وہیں کہیں گر گیا ہے۔''

''یعنی پولیس کے لیے اب آپ کو پہچاننا بالکل مشکل نہیں ہوگا۔'' وہ سادگی سے بولا۔ اس کی اس بات پر کومل چونک اٹھی۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت اڑ سی گئی۔

''آپ پریشان مت ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں آج کی رات سفر نہیں کرنا چاہیے۔''

''کیا مطلب؟ کیوں؟''

''اس کیوں کے دو جواب ہیں۔ پہلا یہ کہ اب تک پولیس پارٹی آپ کی چیزیں حاصل کر چکی ہوگی۔ دوسرے یہ کہ تھوڑا آگے سخت چیکنگ ہو رہی ہے جو اس روٹ پر اس

طرح نہیں کی جاتی۔" وہ اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ان سے قدرے دور پولیس والے گاڑیوں کو باقاعدہ روک کر چیکنگ کررہے تھے۔

"ہم کدھر جائیں گے؟" کومل نے جیسے خواب کی سی حالت میں پوچھا۔

"کہیں نہ کہیں بلکہ یہیں......" وہ مسکرایا اور اس نے ایک روڈ سائڈ بنے ہوٹل کی جانب گاڑی کو روک لیا۔ گاڑی کو وہ خاصا اندر لے گیا تھا اور درختوں کے نیچے کھڑا کردیا۔

"آیئے۔"

کومل بہت نروس ہورہی تھی۔ اس طرح اجنبی مقام پر اجنبی شخص کے ساتھ کیا اسے یہ کرنا چاہیے دوسری صورت میں وہ دوبارہ گرفتار ہوسکتی تھی اور وہ شمیر سے ملے بغیر یہ نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ بالآخر اس نے دل کڑا کیا اور گاڑی سے اُتر آئی۔

"ہمیں یہاں تھوڑی سی اداکاری کرنا پڑے گی مگر وہ مجبوری ہے، آپ مجھے غلط مت سمجھیے گا اور پلیز اعتماد کیجیے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔ اس کی آنکھوں میں سچائی نظر آرہی تھی۔ کومل مسکرائی اور سر ہلایا۔

اس نے کاؤنٹر پر جاکر مسٹر اینڈ مسز حسن کے لیے ایک کمرا بک کرایا۔ "ہم اسلام آباد جارہے ہیں لیکن میری مسز تھکن محسوس کررہی تھیں اور پھر آپ کا بورڈ نظر آگیا۔ ہم اسے قدرت کا اشارہ سمجھ کر یہاں آگئے۔" وہ مسکرایا۔

پانچ منٹ بعد وہ پہلی منزل پر واقع صاف ستھرے کمرے میں تھے۔ حسن نے کافی اور سینڈوچز کا آرڈر دیا تو کومل کو بھی بھوک کا احساس ستانے لگا تھا۔ وہ غور سے اسے فون پر آرڈر دیتے ہوئے دیکھتے رہی۔ وہ لمبے قد اور ورزشی جسم کا مالک تھا۔ اس کے بال گہرے بھورے رنگت کے تھے۔ اس کی شخصیت میں سب سے زیادہ متاثر کن اس کی آنکھیں تھیں۔

"یقین کریں کومل میں کوئی غنڈا موالی نہیں ہوں۔" وہ اس کی محویت کو دیکھ کر بولا۔

"مجھے یقین ہے۔" وہ چونک کر بولی۔

"آرام سے بیٹھیں اور مطمئن رہیں، میری موجودگی میں کوئی آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"اب بتائیں یہ کیا مسئلہ ہے؟ اور آپ کی اصل پریشانی کیا ہے؟" سینڈوچز سے نمٹ لینے کے بعد وہ کافی کے سپ لیتے ہوئے بولا۔

کومل جواب میں اسے چند لمحوں تک دیکھتی رہی۔ وہ دل ہی دل میں فیصلہ کررہی تھی کہ اسے اپنے ہمدرد کو سب کچھ بتانا چاہیے یا نہیں پھر اس نے اس پر اعتماد کرنے کا فیصلہ کیا اور جس قدر مختصر ہوسکتا تھا، اسے سب کچھ بتاڈالا۔

"اوہ......" وہ سب سن کر دو لمحوں کے لیے خاموش رہ گیا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میرے چکر میں آپ پریشان ہوگئے ہیں۔" وہ اسے خاموش دیکھ کر بولی۔ "مگر آپ چاہیں تو میں یہاں سے بس وغیرہ بھی لے سکتی ہوں۔"

"بغیر پیسوں کے۔" وہ مسکرایا۔

"پیسے تو پرس میں رہ گئے مگر یہ چین اور انگوٹھی ہے میرے پاس۔"

"پلیز کومل۔" وہ بھاری آواز میں بولا۔ "مجھے یہ سب سن کر بہت افسوس ہوا ہے۔ آپ کا وہ شوہر تو شوٹ کردینے کے قابل ہے...... خیر اللہ بہترین کرے گا۔ میرا ذہن کہتا ہے کہ آپ کی کہانی میں یہ دوسرا ٹریک شاہدہ والے مسئلے سے متعلق ہے۔"

"یعنی آپ کا مطلب ہے انہیں پتا چل گیا ہے؟" کومل نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔ "آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں ورنہ کون مجھ پر اس طرح حملہ کرے گا، شاہ میر کو تو معلوم بھی نہیں ہے کہ میں راستے میں ہوں۔"

"بالکل اور مجھے لگتا ہے کہ وہ میسیجز بھی ان میں سے کسی نے ہی کیے ہوں گے۔ آپ کی دوست کو آپ کو اس طرح کے میسیجز کرنے کی کوئی تک نہیں بنتی۔"

"مگر وہ زارا کے نمبر سے آئے تھے۔" کومل بولی پھر اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ زارا تک پہنچ گئے تھے نہ جانے انہوں نے ان دونوں کے ساتھ کیا کیا ہوگا؟" آنسو اس کی آنکھوں سے چھلک پڑے۔ "میں کتنی منحوس ہوں، جو میری مدد کرتا ہے، وہ ہی مصیبت میں پڑ جاتا ہے۔"

"کیسی باتیں کررہی ہیں آپ کومل، خود کو سنبھالیے یہ وقت اس طرح سوچنے کا نہیں ہے، ہم صبح آپ کی دوست کے معاملے کو دیکھیں گے اس وقت تو رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اس وقت یہ سوچنا ضروری ہے کہ کیا کیا جانا چاہیے۔ ابھی جو کچھ ہوا ہے وہ ان حالات میں آپ کے کھاتے میں جانے والا ہے۔"

"کیا کرنا چاہیے؟"

"سب سے پہلے ذہن کو پُرسکون کیجیے اور اس کے بعد کل آپ کے لیے ایک بہترین اور قابل وکیل کرنا ہوگا



کھانا ٹھنڈا کرنے کا دیسی طریقہ

تاکہ وہ آپ کے مسائل کو کم کر سکے۔"

"اور سمیر؟"

"آپ اپنے شوہر کو نوٹس بھیجیں، اس کے خلاف رپورٹ کرائیں۔ بچے کو اس طرح لے جانے کے علاوہ وہ چوری اور چار سو بیسی میں بھی ملوث ہے۔"

"نہیں حسن، وہ سمیر کو لے کر بھاگ جائے گا۔" وہ بے اختیار بولی۔

"او کے، پھر اس کا کوئی حل نکالا جائے گا فی الحال آپ آرام کر لیں تھوڑی دیر...... کیا کہتی ہیں؟"

"مجھے تو نیند نہیں آرہی۔"

"یعنی اونچا سننے کا مسئلہ ہے۔" وہ متانت سے بولا۔ "میں نے سونے کو کب کہا ہے، آرام کر لیں تاکہ صبح تازہ دم ہوں۔"

وہ مسکرائی پھر سنجیدہ ہو کر بولی۔ "میں آپ کو اس مشکل میں الجھانا نہیں چاہتی، آپ مجھے اسلام آباد چھوڑ دیجیے گا باقی معاملات میں دیکھ لوں گی۔"

"یہ تو مشکل ہے۔" وہ جواباً مسکرایا۔ "مانا کہ ہم کچھ دیر پہلے ملے ہیں مگر کیا آپ کو لگتا ہے کہ میں کسی سے مدد کا وعدہ کر کے اسے راستے میں چھوڑ جانے والا شخص ہوں؟ اور وہ بھی خصوصاً ایک ایسے انسان کو جو مجھے پہلی نظر میں ہی اتنا اچھا لگا ہو۔"

"کک کیا مطلب......؟" کومل نے اسے گھورا۔

"جملے میں تصحیح کر لیں اچھا کا مطلب ہے...... بے گناہ......سچا...... اچھا......"

کومل کو اس کی وضاحت پر ہنسی آ گئی۔

"ٹھیک ہے۔"

"آپ کی مسکراہٹ اچھی ہے پھر مسکرانے میں اتنا بخل کیوں؟"

''مسکرانے والے حالات نہیں ہیں میرے حسن صاحب۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''حالات بنانے پڑتے ہیں کومل صاحبہ اور اب مجھے یہ صاحب مت کہیے گا، مجھے بڑھاپا سا محسوس ہونے لگتا ہے۔''

''تو پھر آپ بھی مجھے صاحبہ نہ کہیں۔'' وہ بولی اور ہنس پڑی۔ اپنی ہنسی کی آواز سن کر اسے خود بھی عجیب سا لگا تھا۔ کئی برسوں کے بعد وہ اس طرح ہنسی تھی۔

''بالکل نہیں کہیں گے اور اگر آپ اس طرح ہنستی رہیں تو شاید حسن احمد خان کچھ کہنے کے بھی قابل نہیں رہیں گے۔'' وہ مسخرے پن سے بولا۔

''میرا خیال ہے کہ آپ تھوڑی دیر سو لیں کل آپ کو ڈرائیو کرنا ہے۔'' وہ کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے بولی۔

''آپ کا مجھے یہاں سوتے ہوئے چھوڑ کر بھاگنے کا ارادہ تو نہیں ہے نا؟'' وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

''نہیں۔'' وہ مسکرائی۔ ''کم از کم اسلام آباد پہنچنے تک تو نہیں۔''

''گڈ پھر ٹھیک ہے۔'' وہ مسکرایا اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

کومل کی بھی رات میں نہ جانے کس وقت نیند لگ گئی تھی۔ صبح اس کی آنکھ ٹی وی کی آواز سے کھلی تھی۔ حسن نے اس کے جاگتے ہی چینل بدل دیا تھا مگر کومل کو لگ رہا تھا جیسے اس نے خبر میں اپنا نام سنا تھا۔

''کیا ہوا ہے؟'' وہ حسن کو دیکھ کر بے اختیار بولی۔

''کچھ خاص نہیں۔'' وہ بولا۔

''نیوز چینل دوبارہ لگا دیجیے پلیز۔'' وہ ٹھیک سے بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''یا پھر آپ خود بتا دیجیے اب تک تو خبر چلی گئی ہوگی۔''

''کل والا معاملہ رپورٹ ہو گیا ہے کار سے آپ کا پرس ملا ہے جس سے آپ کی شناخت ہو گئی ہے ساتھ ہی کسی ماہر صحافی نے جیل میں موجود اس لیڈی ڈان کے حوالے سے آپ کی خدمات کا بھی ذکر کر دیا ہے۔'' وہ بالآخر بولا۔

''خیر انہیں تو پتا تھا ہی تب ہی وہ تمہارے پیچھے تھے، معاف کیجیے آپ جناب کہہ کر منہ دکھ گیا تھا۔''

''آپ مجھے تم کہہ سکتے ہیں۔'' وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔ ''مگر میں جانتی ہوں کہ آپ نے موضوع بدلنے اور ماحول کو اچھا بنانے کے لیے یہ کہا ہے۔''

''اب ایسا بھی نہیں ہے اور میں برابری کے حقوق پر یقین رکھتا ہوں۔''

''کیا مطلب......''

''مطلب یہ کہ اگر میں تمہیں، تم کہوں گا تو مجھے بھی تم سے مخاطب کرنا ہوگا۔'' وہ متانت سے بولا۔

''او کے...... مجھے یہ لگ رہا ہے حسن کہ اب آپ کو اپنا راستہ الگ کر لینا چاہیے۔ میرے ساتھ رہنا آپ کے لیے بہت مسائل کھڑے کر سکتا ہے اور میں آپ کے خلوص کی سزا نہیں دینا چاہتی۔'' وہ سنجیدگی سے بولی اور کھڑی ہو گئی۔

''یار یہ او کے کے بعد پھر آپ......؟ کیا یہ کھلا تضاد نہیں ہے؟''

''حسن میں سنجیدہ ہوں۔''

''یہ تو اچھی خبر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔''

''کیا مطلب......'' اس نے اسے گھورا۔

''اس قدر مطلبی خاتون میں نے آج تک نہیں دیکھی، ہر بات پر کیا مطلب...... مطلب یہ ہے کومل بی بی کہ اول تو میں کمٹمنٹ کرتا نہیں اور اگر کر لیتا ہوں تو پھر سلمان خان کی طرح اپنی بھی نہیں سنتا...... یہاں تو معاملہ اب میری اپنی زندگی کا ہے۔''

''آپ کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔'' وہ بولی۔

''خیر فی الحال تو تم ناشتا کرو، مجھ غریب کو بھی کافی کا کپ بنا دیں۔ میں نے اپنے ایک وکیل دوست سے وقت لیا ہے، ہم اسلام آباد پہنچ کر ان سے مل لیں گے......''

''اور میرا بیٹا......'' وہ بے اختیار بولی۔ ''میں شاہ میر سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ کیا میں تمہارا فون استعمال کر سکتی ہوں، شاید وہ یہ نمبر اٹھا لے۔''

''او کے ضرور......'' اس نے اپنے فون پر کچھ ڈھونڈا، پھر فون اس کی جانب بڑھا دیا۔ ''تم بات کر لو...... میں اتنے میں کاؤنٹر پر حساب کر کے آتا ہوں۔''

کومل مشکور نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے بعد اس نے شاہ میر کا نمبر ملایا۔ خلافِ توقع تیسری بیل پر اس نے فون ریسیو کر لیا۔

''شاہ میر...... میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔'' وہ اس کی آواز سن کر بولی۔ ''تم نے جو کچھ میرے ساتھ کیا وہ کیا ...... میں تمہیں وہ پیسے معاف کر دوں گی مگر مجھے میرا بیٹا چاہیے۔''

''تم ہو کہاں؟'' اس نے پوچھا۔
''میں جہاں بھی ہوں، اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' وہ بولی۔
''اگر میں کہوں کہ میں یہ نہیں کروں گا تو......؟''
''تو میں آخری سانس تک تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گی چاہے تم پاتال میں بھی جا کر کیوں نہ چھپ جاؤ...... مجھے سمیر چاہیے۔''
''اور اگر میں کہوں کہ میں راضی ہوں...... مگر میری ایک شرط ہے۔''
''وہ کیا......؟'' کومل نے پوچھا۔
''تم دوسرا بنگلا میرے نام کر دو گی......''
''منظور ہے......'' وہ اس کی پوری بات سنے بغیر بولی۔ ''مگر اس کے کاغذات بینک میں ہیں۔''
''اس کے کاغذات میرے پاس ہیں اور مجھے تم سے اٹارنی چاہیے۔ وہ میں تیار کر کے رکھوں گا، تم اس پر دستخط کر دینا اور سمیر کو لے جانا۔''
''ٹھیک ہے، میں کل شام کو تمہارے گھر آؤں گی، تم مجھے اپنا پتا بھیج دو۔'' اس کے پاس پتا موجود تھا مگر وہ موبائل میں رہ گیا تھا اور یہ اس پر ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔
''ٹھیک ہے لکھو......'' کومل نے بیڈ سائڈ سے پیڈ اور پین اٹھایا اور پتا لکھ کر اپنی آستین کے فولڈ میں محفوظ کر لیا۔
''کل شام ساڑھے سات بجے میں تمہارا انتظار کروں گا۔ اکیلے آنا ورنہ سمیر تمہیں نہیں ملے گا۔'' اس نے یہ کہہ کر لائن کاٹ دی تھی۔

☆☆☆

''بھائی غضب ہو گیا ہے......'' سعید ایک دھماکے سے دروازہ کھول کر سلطان کے کمرے میں داخل ہوا۔
''کیا قیامت آ گئی ہے جو تو سارے طور طریقے بھول گیا ہے۔'' وہ بستر سے اٹھ کر غرایا۔ وہ صبح کے قریب ہی سویا تھا۔ خان محمد کی ناکامی اور موت اس کے اعصاب پر ویسے بھی بہت اثر انداز ہوئی تھی۔
''بھائی آپا جی......''
''کیا ہوا آپا جی کو...... کل تو انہیں واپس سیل میں لے آیا گیا تھا نا...... کیا وہ پھر وہاں نہیں ہیں؟''
''بھائی......''
''بول بھی اب...... کیوں سسپنس پھیلا رہا ہے۔''
''بھائی ہماری آپا جی دنیا میں نہیں رہیں......''
''کیا......؟'' وہ حلق کے بل دھاڑا۔ ''کیا بکواس کر رہا ہے تو......'' اس نے پلٹ کر سعید کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔
''میں...... میں سچ کہہ رہا ہوں بھائی، یہ دیکھیے یہ اخبار میں خبر چھپی ہے۔'' وہ اخبار اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔
سلطان نے اخبار اس سے جھپٹ کر سیدھا کیا۔ صفحے کے درمیان ایک سنگل کالم خبر پر اس کی نظریں جم کر رہ گئی تھیں۔
ڈرگ ڈان شاہدہ جیل میں انتقال کر گئیں۔
تفصیلات کے مطابق شاہدہ کا انتقال بھاری مقدار میں ڈرگ کے استعمال کی وجہ سے ہوا۔ گزشتہ دنوں...... وہ اپنے خلاف نئے مقدمے کی وجہ سے بہت زیادہ پریشان تھیں۔ جیل انتظامیہ اس معاملے میں تحقیقات کر رہی ہے کہ سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود وہ کہاں سے منشیات حاصل کر رہی تھیں۔ یاد رہے کہ گزشتہ دنوں ایک اور قیدی اور سابق صحافی کومل شاہ میر نے ان کے حوالے سے جیل حکام کی مدد کی تھی اور ان کی جیل میں ڈرگ کے کاروبار کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔
''بکواس کرتے ہیں سالے...... آپا نے کبھی کوئی نشہ استعمال نہیں کیا۔ وہ صرف سگریٹ پیتی تھی......'' وہ چیخا۔ ''میری بہن کو قتل کیا گیا ہے۔ مار دیا ہے اسے۔'' وہ آنسوؤں سے رو رہا تھا۔ ''میں اس کے قاتلوں کو معاف نہیں کروں گا...... میں خود ان کا حساب بے باق کروں گا اور سب سے پہلے میرا شکار بنے گی یہ...... کومل شاہ میر......'' اس کی آنکھیں خون کے مانند سرخ ہو رہی تھیں اور اس کا چہرہ نفرت سے سیاہ ہو رہا تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر خرم صبح سے بہت مصروف تھا۔
گزشتہ شام جاوید کے گھر والوں سے ملاقات، اسے ملنے والی بڑی رقم کی تاریخ اور پھر مزید پیسوں کے انتظار کی تفصیلات کے بارے میں جاننے کے بعد اسے اپنے شکوک سچ ثابت ہوتے نظر آ رہے تھے۔ اس کے بندوں کی رپورٹس کے مطابق شاہ میر نے اپنی بیوی کی جائداد جعلی اٹارنی کے بل پر بیچ دی تھی۔ اس کا بینک اکاؤنٹ خالی کر دیا تھا...... اسے اب اس عورت سے ہمدردی ہوتی جا رہی تھی۔ کومل کو یقیناً گھر کی فروخت کا علم نہیں تھا اسی لیے وہ وہاں پہنچی تھی۔ وہ صبح ہی اس کے نئے مالک سے ملنے گیا تھا۔

اسے وہ شخص ذرا بھی پسند نہیں آیا تھا۔ پہلے تو وہ اپنی کہانی سے ہٹنے کے لیے ذرا بھی تیار نہیں تھا مگر جب انسپکٹر خرم نے اسے بتایا کہ حادثاتی طور پر اس روز ہونے والا تمام واقعہ کومل کے فون میں ریکارڈ ہوگیا تھا اور وہ اس کے پاس موجود ہے تو وہ گھبرا گیا۔

''مجھے لگتا ہے کہ کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے۔'' وہ ہکلایا۔

''آپ کو میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔ آپ کسی عورت سے بدتہذیبی کیسے کرسکتے ہیں...... اُمید ہے کہ آپ جانتے ہوں گے کہ یہ ایک جرم ہے۔'' انسپکٹر نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

''مم مجھے معاف کردیں...... مجھے شیطان نے بہکا دیا تھا۔'' تیر نشانے پر لگا تھا۔ ''میں اپنی رپورٹ واپس لے لوں گا، میں جرمانہ دینے کے لیے بھی تیار ہوں۔'' وہ اس کے قدموں میں گر پڑا۔ ''میرے بیوی بچوں کو اگر یہ بات معلوم ہوگئی تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔''

''ویسے تو یہ جرم ہے مگر اس کا صرف ایک حل ہے، تم اپنی رپورٹ واپس لو اور ایک کاغذ پر معافی نامہ لکھو......''

وہ وہاں سے نکلا تو وہ معافی نامہ اس کے پاس تھا۔ دفتر پہنچتے ہی اسے ایس پی کا پیغام ملا تو وہ ان کے کمرے کی طرف چل دیا۔

''خرم معاملہ کچھ آگے بڑھا ہے'' وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

''جی سر! میں اسی پر کام کر رہا ہوں۔''

''میں نے اسی حوالے سے تمہیں کچھ بتانے کے لیے بلایا ہے۔ رات ہائی وے کے قریب ہونے والی فائرنگ میں دو افراد ہلاک ہوئے اور دو زخمی ہیں۔ وہاں موجود گاڑیوں میں سے ایک لیڈیز پرس ملا ہے جس میں موجود کاغذات کے مطابق وہ کومل شاہ میر کا پرس تھا۔ پولیس کو وہاں سے کئی موبائل ملے ہیں مگر وہ ٹوٹ گئے ہیں، ان کا ریکارڈ بھی جس قدر ممکن ہوگا چیک کیا جائے گا۔ یعنی اب کومل کا نام قتل کی واردات سے جڑ گیا ہے اور رپورٹرز بھی اس خبر کو لے اڑے ہیں۔''

''ہوں......'' وہ مختصر جواب دے کر خاموش ہوگیا، پھر بولا۔ ''سر اس میں وہی ڈرگز مافیا ملوث ہوگا۔ مجھے یقین ہے میں اس کی رپورٹس اور سارے افراد کی شناخت منگواتا ہوں۔''

''اوکے، اندازہ یہ ہے کہ وہ اسلام آباد گئی ہے۔ تم چاہو تو وہاں ڈپارٹمنٹ سے مدد لے سکتے ہو...... ہمیں اس کیس کا جلد ڈراپ سین چاہیے۔''

''جی سر......'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''انشاء اللہ سب جلد واضح ہوجائے گا۔''

اسے ڈراپ سین کے جلد ہونے سے زیادہ دلچسپی، حقائق کی تلاش میں تھی۔

☆☆☆

سلطان اس وقت اپنے ذاتی جم میں کھڑا ہوا تھا جو اس کے بنگلے کے بیسمنٹ میں بنایا گیا تھا۔ مسلسل ورزش سے اس کا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ اس کا شوق اور غم و ٹینشن یا ذہنی دباؤ سے لڑنے کا واحد طریقہ تھا۔ اس وقت اسے اس کے سوا اور کچھ نہیں سوجھا تھا۔ دوپہر میں وہ ایک این جی او کے حوالے سے اپنی آپا کی تدفین کرچکا تھا۔ وہ ان کے دھندے کی روح اور چہرہ تھیں۔ سلطان ان کا داہنا بازو تھا مگر اب تک اس کے سر پر براہِ راست کوئی کیس یا الزام نہیں تھا اور یہ آپا جی کی کوششوں سے ہی ممکن ہوا تھا۔ بحیثیت بھائی ان کی لاش وصول کرنا اس کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا اور آپا جی ایسا کبھی پسند نہیں کرتیں اور یہ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

وہ ویٹ لفٹنگ سے فارغ ہوکر پانی کی بوتل کی جانب بڑھا ہی تھا کہ اس کا فون بج اٹھا۔

''آپ سلطان صاحب بول رہے ہیں؟'' دوسری جانب سے ہیلو کے جواب میں سوال کیا گیا۔

''آپ کو سلطان صاحب سے کیا کام ہے؟'' اس نے محتاط انداز میں پوچھا۔

''میں نے آپ کا نمبر اپنے دوستوں کے حوالے سے آپ کے ایک دوست مجید شہزاد سے حاصل کیا ہے۔ میں شاہ میر بول رہا ہوں۔ کومل کا سابق شوہر......''

''کومل کا شوہر!'' سلطان غرایا۔ ''تم نے مجھے فون کیوں کیا ہے؟ کیا تم بھی مرنا چاہتے ہو؟''

''نہیں میں مدد کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے اور اب تو سب جان گئے ہیں کہ کومل نے آپ کا بہت بڑا نقصان کیا ہے اور آپ اسے تلاش کر رہے ہیں۔''

''ہاں اور وہ میرے ہاتھ سے بچے گی نہیں......''

''اگر میں اس معاملے میں مدد کروں تو مجھے کیا فائدہ ہوگا؟'' اس نے کمینگی سے پوچھا۔

''کیسی مدد؟''

''میں اسے آپ کے حوالے کرسکتا ہوں۔''

''اور تجھے کیا چاہیے؟''
''پیسا—'' وہ بولا۔
''مل جائے گا۔ تو اس کو میرے حوالے کر، تجھے منہ مانگا معاوضہ مل جائے گا۔'' سلطان جوش سے بولا۔
''کل رات وہ اسلام آباد میں میرے گھر پر ہوگی...... میں پتا آپ کو صبح بھیج دوں گا اگر آپ اپنا انتقام لینا چاہتے ہیں تو اسلام آباد آجائیے۔''
''ٹھیک ہے، تو اپنا پتا بھیج...... ہم کل وہاں ہوں گے......''
''مگر زیادہ رش نہ ہو اور زیادہ ہنگامہ بھی نہیں ورنہ اس کو شک ہو جائے گا......''
''ٹھیک ہے، تو رقم بھی بتا دے۔ وہ تجھے اسلام آباد میں کل مل جائے گی۔''
''دس کروڑ......'' وہ گھگھیایا۔
''ڈن......'' سلطان غرایا اور فون بند کر دیا۔ اسے اسلام آباد پہنچنے کے انتظامات کرنے تھے۔

☆☆☆

شاہ میر بہت زیادہ خوش تھا۔ یہ معاملہ تو اس کے لیے چپڑی اور دو دو کے مصداق ثابت ہوا تھا۔ کومل اس کے اٹارنی کے پیپرز پر دستخط کے لیے تیار تھی۔ اس کے بعد وہ اسے سلطان کے حوالے کر کے مفت کے دس کروڑ کما سکتا تھا۔ پھر وہ اپنے بیٹے کو لے کر اس ملک کو چھوڑ جائے گا۔ اس نے سوچا۔
کومل کے بارے میں خبر سُن کر ہی اس نے یہ پلان بنایا تھا اور اپنا فون کھلا چھوڑا تھا۔ اس طرح اس کا اس سے ہمیشہ کے لیے پیچھا چھوٹ سکتا تھا اور اس پر کوئی الزام بھی نہیں آتا۔
''بھئی واہ شاہ میر، تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو۔'' اس نے خود کو داد دی اور سمیر کے بیڈروم کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

کومل اور حسن بھی بالآخر اسلام آباد پہنچ گئے تھے۔ وہ اس کے منع کرنے کے باوجود اسے اپنے اپارٹمنٹ میں لے گیا تھا۔
''میں تمہیں اس معاملے میں انوالو نہیں کرنا چاہتی حسن......''
''یار اب اس تسبیح کو بند کر دو۔'' وہ بولا۔ ''اس وقت تمہارا کہیں اور رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے اور خطرہ بھی دگنا یعنی ڈبل۔ اگر ڈرگ مافیا تمہارے پیچھے ہے تو دوسری طرف پولیس کو بھی تمہاری تلاش ہے۔ ہمیں جلد از جلد وکیل سے ساری بات کر کے کوئی صحیح فیصلہ لینا پڑے گا۔''
''اچھا مگر ہم یہ ملاقات کل کے بعد کریں گے۔'' کومل بولی۔
''وہ کیوں......؟'' اس نے ایک ابرو اٹھا کر اسے دیکھا۔
''میں ایک دن اپنے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔'' وہ بولی۔
''ٹھیک ہے، میں سب چیزیں لائن اَپ تو کر سکتا ہوں نا؟''
''ہاں—'' وہ مسکرائی۔ کوئی شخص صرف ایک دو دن میں کسی کے لیے اتنا اہم ہو سکتا ہے، یہ اس کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔
اسے کل شام شاہ میر کے گھر جانا ہی تھا مگر وہ اس کا تذکرہ حسن سے نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اسے اکیلا ہرگز نہیں جانے دے گا۔ وہ اسے کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ اگر وہاں سب معاملات ٹھیک رہتے تو وہ اگلے روز وکیل سے ملنے اور پولیس کے پاس جانے کے لیے بھی تیار تھی مگر اس کے لیے سب سے پہلے سمیر تھا۔ وہ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی۔

☆☆☆

انسپکٹر خرم آج صبح ہی اسلام آباد پہنچا تھا۔ اس وقت وہ اسلام آباد کے پولیس ہیڈ کوارٹر میں موجود تھا۔ یہاں پر موجود انسپکٹر شہریار اس کا ذاتی دوست بھی تھا اور وہ ہی اس کیس میں اس کی مدد بھی کر رہا تھا۔
''تو تمہارے خیال میں وہ مطلوبہ خاتون اسلام آباد میں ہے؟'' شہریار نے ساری تفصیلات سننے کے بعد پوچھا۔
''ہاں، وہ اپنے بیٹے کے لیے آئی ہے۔ اس کا شوہر شاہ میر اسلام آباد میں ہے۔ ہمیں یہ ساری تفصیل اس کی دوست زارا سے معلوم ہوئی ہے۔ ڈرگ مافیا کے بندوں نے اسی سے کومل کا پتا لگایا تھا۔ خبر چلتے ہی اس نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ اسی سے مجھے کومل کی بقیہ کہانی معلوم ہوئی...... حقیقت فسانے سے زیادہ رنگین و سنگین ہوتی ہے۔ یہ جس نے بھی کہا ہے سچ ہی کہا ہے۔'' وہ پاؤں پسارتا ہوا بولا۔ ''تم ایک اچھی کافی کا انتظام کر سکتے ہو......؟''
''بالکل کر سکتا ہوں...... تمہارا پلان کیا ہے......؟'' اس نے کافی کا آرڈر دے کر پوچھا۔
''میں اس نامراد شوہر سے ملنا چاہتا ہوں مگر آج

نہیں...... آج مجھے کومل کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہیں۔ اگر وہ اس شہر میں ہے تو کہاں ہے...... اور اس کا پتا لگانے کا ہمارے پاس کل ملا کر ایک ہی طریقہ ہے......''

''اور وہ کیا ہے؟''

''ہمیں اس شاہ میر کے مکان کی نگرانی کرنی ہے۔ اسے بتائے بغیر وہ اس کے گھر پر ضرور جائے گی...... لہٰذا ہمیں ان دونوں میں سے کسی کو بھی محتاط کیے بغیر اس گھر کی نگرانی کرنی ہے۔''

''ٹھیک ہے...... میں اس کا بندوبست کرتا ہوں۔'' شہریار بولا۔

''شاید ہمیں پورا دن یا رات بھی انتظار کرنا پڑے۔ اس حساب سے بندوبست کرنا۔'' وہ بولا اور پھر کافی پینے میں مصروف ہوگیا۔ اس کی چھٹی حس کیس مکمل ہونے کے اشارے دے رہی تھی اور اسے اپنی اس حس پر پورا اعتماد تھا۔

☆☆☆

حسن صبح سے ہی کہیں مصروف تھا۔ کومل یہی چاہ رہی تھی کہ وہ جلد واپس نہ آئے تا کہ وہ گھر سے نکل پائے۔ اس نے گوگل میپ کے ذریعے یہ معلوم کرلیا تھا کہ شاہ میر کا گھر اس اپارٹمنٹ سے گیارہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور وہ کار کے ذریعے زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ سکتی تھی۔ وہ ساڑھے چھ بجے اوبر کار منگوا کر گھر سے نکلی۔ ڈرائیور وہاں کے راستوں سے بخوبی واقف تھا۔ رش البتہ اسے امید سے زیادہ ملا تھا۔ یوں وہ سوا سات تک وہاں پہنچ گئی تھی۔ شاہ میر کا گھر ایک خوبصورت کالونی کا حصہ تھا جہاں تمام ہی مکانات ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔

''اس نے میرے پیسے کا صحیح استعمال کیا ہے۔'' وہ بڑبڑائی۔ اس کا گھر ایک ون یونٹ بنگلا تھا جس میں خوب ہریالی اور درخت موجود تھے۔ اس نے کال بیل پر انگلی رکھی۔ اس گھر کے اندر اس کی زندگی موجود تھی۔ سمیر سے ملنے اور اسے.... پالینے کی خواہش یکدم اس پر چھا گئی تھی۔ دوسری بار بیل بجنے کے بعد دروازہ کھل گیا تھا۔ شاہ میر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ اسمارٹ اور صحت مند لگ رہا تھا۔

''آگئیں تم...... وقت سے بھی پہلے...... لگتا ہے کہ پرانی عادتیں چھوڑ دی ہیں۔'' وہ ایسے باتیں کر رہا تھا جیسے ان کے درمیان کچھ غلط نہ ہوا ہو۔

''سمیر کہاں ہے......؟'' اس نے ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی سوال کیا۔

''وہ اس وقت سو رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں اٹھ جائے گا۔ ہم اس دوران اپنا کام نمٹا لیتے ہیں۔''

''ضرور...... ویسے تو اب میں سب سمجھ گئی ہوں مگر پھر بھی دل چاہ رہا ہے کہ تم سے پوچھوں کہ تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟''

''جو گزر گیا اس پر رونا بے سود ہوتا ہے......'' وہ بولا۔ ''اور مجھے اس قسم کے ڈراموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ دنیا ہے اور انسان اپنے فائدے کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہے جو تمہیں غلط لگتا ہے۔ وہ میرے لیے بہترین ہے، کہیں کا ہیرو کسی کا ولن ہوتا ہے، یہ چلتا رہتا ہے......''

کومل اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر مارے مگر وہ ضبط کیے کھڑی رہی۔

''شاید تم درست کہہ رہے ہو مگر شاہ میر چور تو سب کے لیے چور ہوتا ہے نا......'' وہ بالآخر بولی۔

''اگر تم یہ سب کرنے آئی ہو تو ہم اپنی ڈیل منسوخ کرسکتے ہیں۔'' وہ ناراضگی سے بولا۔

''تم تو رشتے تک منسوخ کردیتے ہو، بہرحال لاؤ میں تمہاری اٹارنی پر دستخط کرنے کے لیے تیار ہوں، تم سمیر کو بلاؤ۔''

''پہلے دستخط...... ڈرتی کیوں ہو، میں اس چکر سے نکلنا چاہتا ہوں۔ آج یہ مسئلہ ختم کرکے یہ ملک چھوڑ دوں گا۔'' وہ بولا اور ایک فائل نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ کومل نے فائل کھول کر کاغذات کی جانب دیکھا۔ یہ اس کی جائداد کے کاغذات تھے جو بینک کے لاکر میں محفوظ تھے۔

''ان کے ساتھ میری امی کے زیورات بھی تھے...... تم نے انہیں بیچ دیا؟'' کومل نے سادگی سے پوچھا۔

''ہاں......'' شاہ میر نے کہا۔ ''ویسے تمہیں مجھے بینک اکاؤنٹ کی پاور نہیں دینی چاہیے تھی۔ آئندہ محتاط رہنا۔'' اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''اب کیا پوری فائل پڑھو گی؟''

''نہیں...... دیکھ لیا ہے میں نے......'' وہ بولی۔ ''یہ چیک کر رہی تھی کہ تم کوئی اور کاغذ بھی اس دھوکے میں سائن نہ کرالو۔'' اس نے بالآخر فائل پر دستخط کردیے۔ ''یہ لو تمہارا کام ہوگیا...... میرا بیٹا کہاں ہے؟'' اس نے فائل اس کی جانب بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''برابر والے کمرے میں......'' شاہ میر نے کہا۔

''کیا میں وہاں چلی جاؤں......؟ کومل کچھ ہچکچائی۔

''ہاں ہاں، میں نے بتادیا ہے اسے تمہارے بارے میں......'' وہ بولا۔

کومل تیزی سے کمرے سے نکلی۔ ڈرائنگ روم کے سامنے دوسرا کمرا موجود تھا۔ خوشی سے اس کا دل ڈرم بن کر بج رہا تھا۔ وہ اپنے بچے کو بالآخر گود میں لینے والی تھی۔

اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگئی۔ کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔ اچانک ''چٹ'' کی آواز کے ساتھ بلب روشن ہوگئے۔ اس کے چہرے کے سامنے ایک سیاہ نال تھی۔ اس نے سر اٹھایا، ایک لمبا چوڑا شخص اس کے سامنے تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ چہرے پر سفاک مسکراہٹ تیر رہی تھی۔

''ک...ک......کون ہوتم......؟'' اس نے کانپتے ہوئے پوچھا۔

''سلطان......عرف تیری موت عرف آپا شاہدہ کا بھائی سلطان......'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ کومل کا سر چکرا رہا تھا، دل بیٹھ رہا تھا۔ موت اس کی آنکھوں کے سامنے تھی اور بچنے کے تمام راستے بند ہوچکے تھے۔

☆☆☆

حسن کومل کے نکلتے ہی گھر پہنچا تھا۔ کومل کو نہ پا کر وہ سر پکڑ کر رہ گیا تھا۔ وہ یقیناً شاہ میر کے گھر گئی ہوگی۔ اس سوچ نے اچانک اسے کچھ یاد دلایا۔ اس نے اپنا فون نکالا۔ دو دن پہلے کی فون کالز چیک کیں بالآخر اسے نمبر سے کی گئی وہ کال مل گئی۔ اس کے فون میں کالز ریکارڈ کرنے کا سسٹم موجود تھا۔ اس طرح وہ کسی بھی چیز کو کنفرم کرسکتا تھا اور ہفتے کے ہفتے غیر ضروری ریکارڈ کو ڈیلیٹ کردیتا تھا۔ کومل کی اس کال کا ریکارڈ موجود تھا۔ اس نے ٹیپ آن کیا اور ہینڈ فری کو کان میں لگایا۔ کومل کا پورا پروگرام اس کے سامنے آگیا تھا۔ شاہ میر کے ایڈریس تک پہنچتے ہی وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ اس نے الماری سے اپنا ریوالور نکال کر جیب میں رکھا اور دوڑتا ہوا اپارٹمنٹ سے باہر نکل گیا۔ اسے جلد سے جلد وہاں پہنچنا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کے ذہن کی سلیٹ پر بار بار ایک لفظ ابھر رہا تھا اور وہ ''دھوکا'' تھا۔

☆☆☆

''تو یہ ہے کومل......'' انسپکٹر خرم نے اسے بیل بجاتے دیکھا اور بڑبڑایا۔

''یار یہ عورتیں اولاد کے معاملے میں کس حد تک پاگل ہوتی ہیں۔ یہ اکیلی اس چالاک اور خطرناک شخص کے گھر آ پہنچی ہے۔''

''تب ہی تو ماں کے پیروں کے نیچے جنت رکھی گئی ہے۔'' شہریار نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''اب کیا پلان ہے، کیا میں مدد منگوالوں، تمہارا ٹارگٹ تمہارے سامنے ہے۔''

''اس سے پہلے جو تین افراد اندر گئے ہیں، وہ کون ہوسکتے ہیں؟'' خرم نے باآواز بلند سوچا۔

''یہ تو میں بھی سوچ رہا ہوں لیکن خیر ہوں گے کوئی......اب ہمیں کیا کرنا ہے......؟''

''ہمیں اندر داخل ہونا ہے۔'' خرم کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

''بغیر سرچ وارنٹ......؟''

''ہاں ہاں میرا ٹارگٹ سامنے ہے، میں یہ کرسکتا ہوں۔ شہریار مجھے صرف اسے گرفتار نہیں کرنا ہے۔ میں اس معاملے کی تہ تک جانا چاہتا ہوں، اس کے لیے اندر داخل ہونا ضروری ہے۔''

''پچھلے حصے کو آزمانا پڑے گا......''

''جو بھی ہو۔'' وہ بے نیازی سے بولا۔

شہریار نے تھانے کال کی اور پھر وہ دونوں مکان کے عقبی حصے کی جانب بڑھے۔ پچھلی سمت میں دیوار کافی چھوٹی تھی۔ کوئی بچہ بھی اس پر چڑھ کر اندر کود سکتا تھا۔

''مجھے یہ لگ رہا ہے کہ اس دیوار کو ہم سے پہلے کوئی استعمال کرچکا ہے۔'' خرم نے شہریار کے کان کے قریب سرگوشی کی۔

''وہ کیسے......؟''

''یہ دیکھو اس پر جوتوں کے بالکل تازہ نشان موجود ہیں۔'' وہ موبائل کی روشنی دیوار پر ڈالتے ہوئے بولا۔

''ہاں یہ لگ تو ایسے ہی رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں فورس کے آنے کا انتظار کرنا چاہیے۔'' شہریار نے کہا۔

''ہمیں اندر جانا چاہیے...... وہ بھی آتے ہی ہوں گے۔'' خرم نے کہا اور دیوار پار کرگیا۔ شہریار اس کے پیچھے تھا۔

☆☆☆

حسن کے ذہن میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔

وہ نہایت تیزی رفتاری سے ڈرائیو کررہا تھا۔ کومل ان تین چار دنوں میں اس کے لیے بہت اہم ہوگئی تھی۔ وہ خطرے میں تھی۔ یہ خیال ہی اسے پینک Panic میں لانے کے لیے کافی تھا۔ وہ والدہ کی وفات کے بعد سے تنہا رہ رہا تھا۔ وہ ایک کامیاب آرکیٹیکٹ تھا اور اس کی کمپنی پاکستان میں کام کررہی تھی۔ اس کا ہیڈ آفس کراچی میں تھا۔

وہ بہت سے لوگوں سے ملتا تھا مگر حسین سے حسین لڑکیاں بھی اسے متاثر کرنے میں ناکام رہی تھیں۔ اسے مصنوعیت اور دکھاوے سے نفرت تھی۔ کومل کی سادگی، سچائی اور رشتوں سے محبت اس کے دل میں اُتر گئی تھی۔

''وہ مجھے بتا بھی تو سکتی تھی۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''خود ہی سُپرمین بننے نکل کھڑی ہوئی۔'' وہ اب شاہ میر کے مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے گاڑی گھمائی اور مکان کے عقبی حصے سے کچھ فاصلے پر پارک کر کے مکان کے قریب آ گیا۔ اس کالونی کے مکانات کی دیواریں یوں بھی قدرے چھوٹی تھیں جیسے علاقے کے محفوظ ہونے کا تاثر دیا جاتا تھا۔ حسن نے دیوار پر ہاتھ رکھا اور بندروں کی طرح اچھل کر دوسری جانب اُتر گیا۔ پچھلا دروازہ لاک نہیں تھا۔ وہ اسی سے عمارت میں داخل ہوا...... یہ راستہ کچن اور پھر ایک لمبی کوریڈور سے گزرتا تھا۔ اس کے دونوں جانب کمرے بنے ہوئے تھے۔ ایک کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

☆☆☆

''تمہاری وجہ سے میری آپا آج اس دنیا میں نہیں ہے۔'' سلطان غرایا۔ اس کی آنکھوں سے شرارے سے نکل رہے تھے۔

''شاہدہ کا انتقال ہو گیا؟'' کومل کو واقعی حیرت ہوئی تھی۔

''ہاں اور اب تمہارا ہونے والا ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''مجھے میرے بیٹے سے ملنے کا ایک موقع دے دو......'' وہ گڑگڑائی۔

''پھر اسے بھی تمہارے ساتھ جانا پڑے گا......''

''نہیں نہیں، تم ایسا کچھ نہیں کرو گے......'' وہ لرز سی گئی۔

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' سلطان بولا۔ ''پھر سوچتا ہوں کہ کچھ وقت دے ہی دیتا ہوں تمہیں۔'' وہ اس کے قریب آتا ہوا بولا۔

''شاہ میر......'' کومل چلائی۔

''وہ نہیں آئے گا۔ اس نے تمہارا سودا کیا ہے مجھ سے۔ ہم اسے منہ مانگی رقم دے چکے ہیں۔''

اس انکشاف نے کومل کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ شاہ میر اتنا گر سکتا ہے، اس نے اس سب کے ہو جانے کے باوجود نہیں سوچا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ اچھا آئیڈیا ہے یہ......'' وہ کمینگی سے مسکرایا۔ ''تم تڑپ تڑپ کر مرو گی تو آپا بھی خوش ہو گی۔''

''میرے قریب مت آنا......'' وہ سخت لہجے میں بولی۔

''اور اگر آؤں تو کون روکے گا مجھے......؟'' وہ غرایا اور اس نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ کومل نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ بالآخر اس نے اس کے بازو پر اپنے دانت جما دیے۔ اس کی یہ ترکیب کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ سلطان تڑپ کر پیچھے ہٹا تھا۔ کومل اس کے ہٹتے ہی دروازے کی جانب دوڑی۔ سلطان نے جھنجلا کر گولی چلا دی تھی۔

کومل کو یوں لگا جیسے جلتا ہوا شعلہ اس کے کندھے میں اُتر گیا ہو۔ خون کسی فوارے کے مانند نکلنا شروع ہوا تھا۔ وہ لہرائی، پھر مڑی۔ سلطان نے دوسرا فائر کیا۔ اس بار یہ گولی اس کے جسم کو چھوتی ہوئی نکلی تھی۔ دوسری گولی کے بعد وہ ڈگمگائی اور زمین پر ڈھیر ہو گئی...... اس کے جسم سے بہتا خون اس کے اردگرد پھیلنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں کی بینائی مدھم ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اس کے ہونٹ دھیرے دھیرے حرکت کر رہے تھے۔ وہ سمیر کو آواز دے رہی تھی۔

☆☆☆

فائر کی آواز پر وہ اچھل سا پڑا تھا۔ آواز اسی کمرے سے آئی تھی۔ اس کا دل گویا حلق میں دھڑک رہا تھا۔ اس نے جیب سے ریوالور نکال کر ان لاک کیا اور اسے ہاتھ میں دبا کر دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازہ کھلتے ہی نظر آنے والے منظر نے اس کا دل تقریباً بند کر دیا تھا۔

سامنے زمین پر کومل گری ہوئی تھی۔ اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا اور کچھ فاصلے پر ایک شخص کھڑا تھا جس کے ہاتھوں میں پسٹل تھا۔ حسن نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر فائر کیا۔ گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔ اس نے بے یقینی سے حسن کی طرف دیکھا، پھر اپنے سینے سے بہتے ہوئے لہو کو دیکھا...... پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر زمین پر جا گرا۔ وہ چند لمحے سینے کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ڈولتا رہا اور پھر کسی کٹے ہوئے درخت کے مانند زمین بوس ہو گیا۔

''کومل...... کومل، آنکھیں کھولو...... یار تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ تم میرے ساتھ اس طرح بے ایمانی نہیں کر سکتیں......'' اس نے جیب سے فون نکالا۔ ایمبولینس اور پولیس کو کال کرنے کے بعد وہ پھر کومل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کی نبض چل رہی تھی مگر خون کافی بہہ گیا تھا۔ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ حسن اس کا سر گود میں لیے اس

سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کے سامنے اس کی زندگی ختم ہو رہی تھی اور وہ اسے آوازیں دینے کے سوا کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔ بے بسی کے معنی اسے زندگی میں پہلی بار پورے سیاق و سباق کے ساتھ سمجھ میں آئے تھے۔

☆☆☆

فائرنگ کی آواز پر خرم اور شہزاد ایک لمحے کو ساکت ہو گئے پھر تیزی سے گھر میں داخل ہو گئے۔ لاؤنج میں انہیں شاہ میر سیڑھیوں سے اترتا نظر آیا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا اور وہ تیزی سے نیچے آ رہا تھا۔

''اے رک جاؤ.....'' خرم نے اس کی جانب پسٹل کر کے اسے آواز دی۔ وہ یونیفارم میں نہیں تھے۔ شاہ میر غالباً انہیں سلطان کے آدمی سمجھا تھا جنہیں وہ گاڑی میں چھوڑ کر آیا تھا۔

''وہ سلطان اندر کمرے میں ہے..... میں نے کومل کو بھی وہیں بھیج دیا ہے۔ تم مجھے کیوں روک رہے ہو..... فائر بھی وہیں ہوا ہے، اس کمرے میں.....'' وہ بولا۔

''تمہارے بغیر ہم کہیں نہیں جائیں گے۔'' خرم نے سرد آواز میں کہا۔ سلطان کا نام سن کر یوں بھی اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ شاہ میر اس کی بات کا نہ جانے کیا مطلب سمجھا۔ اس نے سوٹ کیس کو ایک ہاتھ میں لیا اور جیب سے ریوالور نکالتے ہوئے بولا۔ ''تم ڈیل خراب نہیں کر سکتے۔ یہ میرا ہے، تم اسے مجھ سے نہیں چھین سکتے۔ سلطان کو کومل درکار تھی، وہ میں نے اس کے سپرد کر دی۔ اب یہ میرا ہے.....''

''ریوالور نیچے پھینک دو۔'' خرم کا لہجہ درشت تھا۔

''اچھا، مجھے لگتا ہے کہ تم ایسے نہیں مانو گے.....'' اس نے اچانک فائر کر دیا تھا۔ خرم عین موقع پر چھلانگ لگانے کی وجہ سے بچ گیا تھا۔ شہریار نے اس کے فائر کے جواب میں فائر کر دیا تھا۔ گولی اس کے سر پر لگی تھی..... وہ الٹا ہوا زمین پر آ گیا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کا سوٹ کیس بھی پھسلتا ہوا نیچے آ کر بکھر گیا۔ اس میں نوٹ ہی نوٹ بھرے ہوئے تھے جو اب اس کی لاش کے اردگرد اڑ رہے تھے۔

خرم اور شہزاد لپک کر کمرے میں داخل ہوئے جہاں حسن اور کومل موجود تھے۔ اسی وقت فضا سائرن کی آوازوں سے گونج اٹھی۔

☆☆☆

کومل کی آنکھ کھلی تو وہ اسپتال میں تھی۔ اس کے سامنے زارا کھڑی تھی۔ بیڈ کے برابر میں کرسی پر حسن بیٹھا ہوا تھا جس کی گود میں ساڑھے تین سالہ سمیر بیٹھا کومل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کومل کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی..... اس نے سمیر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''مجھے بلا رہی ہو.....؟'' حسن نے لپک کر پوچھا۔

''نہیں مجھے.....'' سمیر نے کہا اور ماں کی طرف بڑھ گیا۔

کومل کو اسپتال سے دو ہفتے بعد چھٹی مل گئی تھی مگر مقدمے کی وجہ سے اسے ایک بار پھر کسٹڈی میں جانا پڑا تھا۔ اس پر سنگین الزامات تھے مگر انسپکٹر خرم کی محنت اور پھر ڈرگ ایکٹ کے خاتمے میں اہم کردار ادا کرنے کی وجہ سے عدالت نے اسے صرف ایک سال قید کی سزا دی تھی۔ عدالت نے خود اس کی درخواست پر اس کے بیٹے سمیر کی کسٹڈی حسن کو دی تھی۔

''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کومل! یہ ایک سال چٹکی بجاتے گزر جائے گا۔'' حسن کی آواز پر اس نے اس کی جانب دیکھا اور سر ہلایا..... اسے خواتین کانسٹیبلوں کا انتظار تھا مگر کورٹ سے رش ختم ہوتے ہی کچھ اور لوگ اندر داخل ہوئے تھے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے حسن سے پوچھا۔

''کورٹ اور محترم جج صاحب نے ہماری درخواست پر تمہیں ایک گھنٹے کا وقت دیا ہے اور یہ سب ہمارے نکاح کی تیاری ہے۔'' حسن نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اس پورے سال میں یہ یاد رہے کہ باہر ہم دونوں تمہارے منتظر ہیں۔''

''مگر تم نے مجھے پرپوز تو کیا نہیں نہ میں نے ہاں کہا اور تم قاضی لے کر آ گئے.....'' کومل نے اسے گھورا۔

''اچھا! لو یہ تو میں بھول ہی گیا۔ تو چلو ابھی کر دیتا ہوں.....'' وہ مسکرایا۔

کومل جب جیل جانے کے لیے روانہ ہوئی تو وہ شاید پہلی قیدی تھی جو مسکرا رہی تھی۔ سمیر اور حسن اس سے ہر ہفتے ملنے آتے رہے۔ وقت واقعی انتہائی تیزی سے گزرتا ہے۔ ایک سال بعد رہائی کے وقت اسے اپنی پہلی رہائی یاد آ رہی تھی۔ پرانے واقعات کسی ہارر فلم کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔

گارڈ روم میں گھنٹوں انتظار کی کیفیت کی تکلیف دل میں تازہ ہو رہی تھی مگر جب وہ جیل سے باہر آئی تو اس بار منظر مختلف تھا۔ حسن اور سمیر اس کے منتظر تھے ان کے چہروں پر ہمیشہ کے لیے پا لینے والی خوشی بکھری ہوئی تھی۔

❖❖❖

شکارگاہ

محمد فاروق انجم

کچھ جگہیں یا علاقے بالکل شکارگاہوں کے مانند ہوتی ہیں... راستوں کے دونوں جانب کھائیوں کا خوف... روشنی کی راہ میں پرچھائیوں کا خوف... گھر کے باہر منتظر خنجر بکف لوگوں کا خوف... ایسے حبس زدہ ماحول میں سانس لینا بھی دشوار ہوتا چلا جاتا ہے... بے بصیرت لوگوں کی بھیڑ میں وہ مہذب تھا... اس کی چاہ تھی... مگر خائف تھا کہ ہر پل اس کی ذات میں اندھیرے اترتے جارہے ہیں... آئینے کے روبرو گویا سہما ہوا تھا... کیونکہ پس آئینہ جھوٹ... فریب اور خاموش سچائیوں کا ایک پہاڑ تھا...

ایک ہستی کو مختلف سمتوں سے شکار کرنے والے شکاریوں کا کھیل......

بندوق سے گولی نکلی اور سیدھی شاخ پر بیٹھے طوطے کے سینے میں لگی اور وہ خون میں لت پت ہوکر زمین پر جا گرا۔ اپنے نشانے پر مغرور سے ملک حیات نے قریب کھڑے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا۔

''نشانہ ایسا ہونا چاہیے جو خطا نہ جائے، اور نظر ایسی کہ ایک بار دیکھ لیا تو شکار ہاتھ سے نکلنے نہ پائے۔''

''بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے چوہدری صاحب۔''

ملک حیات کے دائیں جانب کھڑے پچاس سالہ شخص نے خوشامدانہ لہجے میں اس کی بات کی تائید کی۔ اس کے ساتھ ملک حیات کے دو باڈی گارڈ اور پرانا ڈرائیور فرزند کھڑا تھا۔ فرزند کی جوانی ملک حیات کی گاڑی کی ڈرائیوری کرتے ہوئے گزر گئی تھی۔ وہ ملک حیات کا رازدار تھا اس لیے ملک حیات اس کے بغیر کہیں آتا جاتا نہیں تھا۔ فرزند جو کچھ دیکھتا اور سنتا تھا، وہ اس کے سینے میں دفن ہوجاتا تھا۔ وہ مجبور تھا کہ اس کی نوکری چھوڑ نہیں سکتا تھا، فرزند اپنے سینے میں ان رازوں کو چھپائے خاموشی سے اپنے فرائض ادا کررہا تھا۔ ملک حیات کو اس پر اتنا اعتبار تھا کہ وہ کسی اور کو ڈرائیور رکھنے کا کبھی سوچتا بھی نہیں تھا۔ اس لیے فرزند کا نوکری چھوڑنا ناممکن تھا اگر وہ نوکری چھوڑنا بھی چاہتا تو ملک حیات اسے نوکری چھوڑنے نہ دیتا۔

ملک حیات ایک ظالم شخص تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ ملک حیات کے سینے میں دل نہیں پتھر دھڑکتا ہے۔ وہ حریص نظر کا مالک تھا اور وہ ہر ایک کو اپنے سے کمتر سمجھتا تھا۔ اس کا لب ولہجہ ایسا متکبرانہ ہوتا تھا کہ سامنے والے کو اپنے الفاظ کی تپش سے جھلسا دیتا تھا لیکن کوئی بھی اس کے آگے ایک لفظ نہیں کہتا تھا۔ ایسی ہی عادت اس کے بڑے بیٹے ملک شہباز کی بھی تھی۔

فرزند نے کئی بار سوچا تھا کہ وہ اس آدمی کی نوکری چھوڑ دے۔ یہ خیال اسے ایسا کرنے سے روک دیتا تھا کہ ملک حیات نے ایک بار باتوں باتوں میں اسے کہا تھا۔

''فرزند تو جانتا ہے کہ میرے معاملات کیا ہیں، اور میں یہ جانتا ہوں کہ تیرا سینہ وہ قبر ہے جس سے کبھی میری کوئی بات باہر نہیں نکل سکتی۔ روز روز ڈرائیور بدلے نہیں

جاتے اور تو بھی میری نوکری کو نوکری نہیں اپنی قبر ہی سمجھا کر۔''

جب بھی فرزند کو ملک حیات کے وہ الفاظ یاد آتے تھے وہ پھر چپ ہو جاتا تھا۔

ملک حیات کا رویہ کبھی کبھی بدل جاتا تھا۔ کبھی وہ نرم ہوتا تو کبھی وہ سخت ہو جاتا تھا، نرم وہ اسی وقت ہوتا تھا جب اسے کوئی اپنا مطلب . بر مفاد ہوتا تھا۔

ملک حیات نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دے کر بندوق اپنے آدمی کی طرف بڑھائی اور کہا۔ ''جب سے دشمن داری بڑھی ہے اب شکار میں مزہ نہیں رہا۔ پہلے تو دور تک نکل جایا کرتا تھا اور اب گاؤں کے اندر ہی رہنا پڑتا ہے۔''

''چوہدری صاحب آپ کو کس چیز کی پروا ہے، ہماری جان آپ پر قربان۔'' اس آدمی کا نام عنایت تھا اور وہ ملک حیات کی چاپلوسی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ وہ ملک حیات کی تعریف اور حقہ گرم کرنے کے علاوہ اس کے اور بھی کام کرتا تھا۔ جو رات کے اندھیرے میں انجام دیے جاتے تھے۔ ملک حیات اسے محض حکم دیتا تھا۔

''مجھے تم لوگوں پر فخر ہے لیکن شہباز کہتا ہے کہ اباجی آپ احتیاط کیا کریں۔ دشمن ہماری تاک میں ہے۔'' ملک حیات ہنسا۔

''کہتے تو وہ بھی ٹھیک ہیں۔'' عنایت نے سر ہلایا۔ ''جب سے ہم نے ان کے آدمیوں کو زخمی کیا ہے، وہ



ہماری تاک میں رہتے ہیں۔''
''دو مہینے پہلے جو..... سبق شہباز نے انہیں دیا ہے، اس سے وہ آس پاس نظر آنے کی جرأت نہیں کر سکتے لیکن دشمن سے بے خبر رہنا بھی نادانی ہوتی ہے۔'' ملک حیات ایک طرف چل پڑا۔ وہ اپنے گاؤں کے اندر ہی جہاں درختوں اور جھاڑیوں کے سوا کچھ نہیں تھا، وہاں ایسے ہی بندوق اور اپنے آدمی لے کر آ گیا تھا۔
''ملک شہباز بھی شیر ہیں۔'' عنایت نے گردن کھڑی کر کے کہا۔
چلتے ہوئے ملک حیات نے فرزند کی طرف دیکھا جس کا چہرہ لٹکا ہوا تھا اور وہ دھیمے دھیمے چل رہا تھا۔
''او..... فرزند.....'' ملک حیات نے اس کی طرف دیکھ کر اسے مخاطب کیا۔ فرزند فوراً چونکا۔
''جی چوہدری صاحب.....''
''کیا بات ہے، بڑا ڈھیلا چل رہا ہے۔ پیروں میں جان نہیں رہی کہ بوڑھا ہو گیا ہے۔'' ملک حیات کہہ کر ہنسا تو اس کا ساتھ عنایت نے بھی دیا۔
''چوہدری صاحب دو دن سے طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' فرزند نے جواب دیا۔ ''آج سوچا تھا کہ چھٹی کر لوں۔''
''چھٹی کا نہ سوچا کر۔ تیرے بغیر میں کہیں آتا جاتا نہیں ہوں۔ حکیم سے دوائی شوائی لے۔'' ملک حیات نے کہا۔
''دوائی لی ہے لیکن فرق نہیں پڑا۔'' فرزند کا دل چاہا کہ وہ کہہ دے کہ وہ ابھی چھٹی کرنا چاہتا ہے۔
''دوائی کھا..... بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔'' ملک حیات کہہ کر اپنی کار کی طرف بڑھا۔ فرزند چپ ہو کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف چلا گیا۔
ملک حیات نے کار کا دروازہ کھولنے سے قبل دائیں بائیں دیکھا اور کچھ سننے کی کوشش کی پھر اس نے اپنے آدمیوں سے پوچھا۔
''میرا وہم ہے یا کوئی ہلچل تم لوگوں کو بھی محسوس ہوئی ہے۔''
اس کے آدمیوں نے دیکھا اور پھر عنایت نے جواب دیا۔ ''سب خیر ہے چوہدری صاحب..... کچھ نہیں ہے.....''
ملک حیات اپنی کار میں بیٹھنے لگا تو اسے کچھ فاصلے پر کچھ ہلچل پھر محسوس ہوئی اور اس نے ایک بار پھر اس طرف دیکھا۔ اسی وقت ایک پتلا سا آدمی جھاڑیوں کے پیچھے سے نکل کر ایک طرف چل پڑا تو ملک حیات نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔
''پکڑو اسے.....''
ملک حیات کا اتنا کہنا تھا کہ وہ آدمی ڈر کر بھاگنے لگا لیکن ملک حیات کے آدمی بھی تیز بھاگے تھے۔ انہوں نے اس آدمی کو دبوچ لیا۔ جونہی وہ ان کی گرفت میں آیا، وہ ایسے چلّانے لگا جیسے بکری کا بچہ بھیڑیے کے منہ میں آ گیا ہو۔ وہ اسے ملک حیات کے سامنے لے آئے۔ وہ آدمی سہما ہوا ہاتھ باندھے ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔
''کون ہو تم.....؟'' ملک حیات نے آنکھیں نکال کر اس کی طرف دیکھا۔
وہ اور بھی گھبرا کر بولا۔ ''مم..... میں اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔''
''کونسے گاؤں جا رہے ہو؟'' ملک حیات نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔
''میں اُدھر سے آ رہا تھا۔'' اس سے کوئی جواب نہیں بن پا رہا تھا، وہ بہت ڈر گیا تھا۔ جس جھاڑی کے پیچھے سے وہ نکلا تھا، عنایت نے وہاں سے ایک بکری کا بچہ اُٹھا لیا تھا۔
''چوہدری صاحب یہ دیکھیں..... بکری کا بچہ وہاں اینٹ کے ساتھ باندھا ہوا تھا۔''
عنایت کی گود میں بکری کے بچے کو دیکھ کر وہ شخص اور بھی ڈر گیا۔ ملک حیات نے کہا۔ ''چوری کر کے لایا ہے.....؟''
اس آدمی کے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکل رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی اور وہ متوحش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔
''بولتا کیوں نہیں ہے..... چوری کر کے لایا ہے؟''
ملک حیات نے زور سے کہا تو اس کا سارا جسم ہل گیا۔
''جی.....'' اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔
ملک حیات پہلے تو اسے گھورتا رہا اور پھر مسکرایا اور عنایت کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''بکری کا بچہ تو پیارا ہے..... رکھ لو اسے گاڑی میں اور اسے اس درخت کے ساتھ الٹا لٹکا کے باندھ دو۔ چور کو سزا بھی تو ملنی چاہیے۔''
''میں آئندہ نہیں کروں گا..... مجھے معاف کر دیں..... میں آپ کی منت کرتا ہوں۔'' وہ آدمی جلدی سے ملک حیات کے پیروں میں گر گیا اور گڑگڑانے لگا۔

ملک حیات کو کوئی پروا نہیں تھی۔ اس نے پیر کی ٹھوکر سے اسے پرے کیا اور اپنی کار میں جا کر بیٹھ گیا۔ اس کے آدمیوں نے چیختے چلّاتے آدمی کو گاڑی سے رسی نکال کر درخت سے الٹا لٹکا کر باندھ دیا۔ وہ چلّاتا رہا اور وہ سب گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ بکری کا بچہ عنایت کی گود میں ہی تھا۔

ملک حیات بے پروائی سے ہنستا رہا۔ اس نے گردن گھما کر بکری کے بچے کی طرف دیکھا اسے اپنے ہاتھ سے پیار کیا اور بولا۔ ''پیارا ہے...... اسے چھوڑ دینا اپنے ریوڑ میں...... کھائے پیے گا اور بڑا ہو جائے گا...... چلو فرزند......''

فرزند کے لیے یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ وہ اس سے بھی زیادہ بہت کچھ دیکھ چکا تھا۔ وہ گاڑی چلاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس بکری چور اور ملک حیات میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ایک چھوٹے سے چور سے ایک بہت بڑے چور نے بکری کا بچہ چھین کر اسے سزا دے دی تھی اور وہ خود شاید اس خیال میں مدہوش تھا کہ اسے کوئی سزا دینے والا نہیں ہے۔

جب ان کی کار بہت آگے نکل گئی تو اس لٹکے ہوئے آدمی کی چیخیں بھی بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ اچانک اس طرف ایک نوجوان آنکلا۔ اس نے اس آدمی کو دیکھ کر درخت سے نیچے اتار لیا تھا۔

☆☆☆

فرزند نے چارپائی پر اپنی کمر لگائی تو اسے ایسا لگا جیسے سارا سکون اس بستر میں چھپا ہوا تھا۔ اس کا پورا جسم جیسے اپنی .... جگہ پر آ گیا ہو۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اس سکون کا لطف لینے لگا۔

اچانک اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اسے مخاطب کر رہا ہو۔ اس کے کانوں میں آواز پڑ رہی تھی۔

''ابا جی...... ابا جی آپ سو گئے ہیں......؟''

فرزند نے اپنی آنکھیں کھول کر دیکھا، اس کا اکلوتا بیٹا صفدر ہاتھ میں دودھ کا گلاس لیے اس پر جھکا ہوا تھا۔

''میں جاگ رہا ہوں۔'' فرزند نے کہا۔

''اماں نے دودھ دیا ہے آپ کے لیے۔'' صفدر بولا۔

''ایک طرف رکھ دو تھوڑی دیر کے بعد پیتا ہوں۔'' فرزند نے کہا اور صفدر نے دودھ کا گلاس چارپائی کے پاس پڑی ایک پرانی سے تپائی پر رکھ دیا۔ صفدر باپ کی ٹانگوں کے پاس بیٹھ گیا اور ہولے ہولے ٹانگیں دبانے لگا۔

صفدر خوبصورت اور مضبوط جسم کا نوجوان تھا۔ اس نے چودہ جماعتیں پڑھی تھیں لیکن کہیں نوکری نہیں ملی تھی۔ گاؤں کے بچوں کو گھر میں ٹیوشن پڑھا کر وہ باپ کی کمائی میں کچھ حصہ ڈال رہا تھا۔ فرزند کو اپنے بیٹے کی فکر تھی کہ اسے کہیں اچھی نوکری مل جائے۔ اس کی نوکری کے لیے فرزند نے ملک حیات سے بھی بات کی تھی اور اس نے بھرپور تسلی دی تھی لیکن اس کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے غلام کے بیٹے کو بھی اپنا غلام ہی بنانا چاہتا تھا۔ وہ اسے نوکری دلا کر یہ ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ پڑھا لکھا اس نوکری کے لیے اہل تھا۔

''جب کوئی پڑھائی نہیں کرتا تو سب کہتے ہیں پڑھو تمہاری زندگی سنور جائے گی اور جب کوئی پڑھ لکھ جاتا ہے تو نوکری کو وہ بھیک کی طرح تلاش کرنا شروع کر دیتا ہے۔'' فرزند کے لہجے میں تلخی آ گئی تھی۔

''ابا جی آپ پریشان نہ ہوا کریں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' صفدر نے مسکرا کر تسلی دی۔

''سب ٹھیک ہونے کے یقین پر ہی تو اپنے خدا سے مانگتا ہوں۔'' فرزند نے کہا۔

''بس آپ دعا کیا کریں۔''

''میری بھی اب طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ ملک حیات کی نوکری چھوڑنا چاہتا ہوں مگر وہ مجھے چھوڑنے نہیں دے گا۔''

''اب آپ کی صحت مزید کام کی اجازت نہیں دیتی۔ آپ وہ نوکری چھوڑ دیں۔'' صفدر نے کہا۔

''تجھے نوکری مل جاتی تو میں بے فکر ہو جاتا۔'' فرزند کے لہجے میں افسردگی تھی۔

''ابا جی ہم نے اپنی جو تھوڑی سی زمین ٹھیکے پر دی ہے، اس پر خود کام شروع کر دیتے ہیں۔'' صفدر نے کہا۔

''ایک دن میں نے بھی اس بارے میں سوچا تھا۔ اب تم نے بات کی ہے تو اور بھی سوچ لیتے ہیں۔ لیکن پڑھ لکھ کر تم زمین پر کام کرو گے۔'' فرزند اداس ہو گیا۔

''ابا جی تعلیم انسان کو شعور دیتی ہے۔ میں اس زمین پر بہتر طریقے سے کام کر سکوں گا۔'' صفدر بولا۔

میں تو خود کہتی ہوں .... کہ صفدر کو جلدی سے کوئی نوکری مل جائے پھر ہم اس کی شادی کر دیں۔'' اس اثنا میں صفدر کی ماں بھی آ گئیں اور وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

''اماں شادی بھی ہو جائے گی۔'' صفدر بھی مسکرایا۔

''میں تیری شادی پر اپنے سارے ارمان پورے کروں گی۔'' اس کی ماں پاس ہی بیٹھ گئیں۔

''اماں تم سارے ارمان پورے کر لینا۔ تمہیں کوئی منع کرے گا۔'' صفدر کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

شادی کے نام پر ہی اسے سیما یاد آ گئی تھی۔ سیما نے بھی چودہ جماعتیں پڑھی تھیں اور وہ لڑکیوں کے اسکول میں پڑھاتی تھی۔ اسے نوکری اس لیے جلدی مل گئی کیونکہ اس کا باپ اسکول ٹیچر تھا۔

سیما بہت خوبصورت تھی بالکل ایسی جیسی سنگ مرمر کی مورتی ہو اور یا آسمان سے اتری ہوئی حور...... وہ گھر سے باہر برقع میں آتی جاتی تھی اس لیے اس کے چاند سے چہرے کو کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ صرف اس کی گلی کے لوگ جانتے تھے کہ سیما اس گاؤں کی سب سے خوبصورت لڑکی ہے۔

صفدر اور سیما کیونکہ ایک ساتھ بی اے کر رہے تھے اس لیے پہلی بار اپنے باپ ماسٹر کرم دین کے کہنے پر سیما اس کے گھر نوٹس لینے آئی تھی۔ اس پہلی ملاقات نے صفدر کو ہی نہیں سیما کو بھی مضطرب کر دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔ خیالوں میں ایک دوسرے سے باتیں ہونے لگی تھیں اور تصور .... میں وہ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر دور تک چلنے لگے تھے۔

ایک دن جب سیما اس کے گھر میں موجود تھی اور آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے تو صفدر کے دل میں بار بار یہ بات آ رہی تھی کہ ابھی اتنی بارش ہو کہ سیما یہیں بیٹھی رہے اور سیما بھی ایسا ہی سوچ رہی تھی کہ کاش بارش شروع ہو جائے اور اسے صفدر کے سامنے کچھ دیر اور بیٹھنے کا موقع مل جائے۔

پھر ایسا ہوا کہ آسمان نے بارش برسانی شروع کر دی۔ بارش بھی ایسی کہ اب رکے گی ہی نہیں...... ایسی موسلا دھار بارش شروع ہوئی کہ دونوں کمرے میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے رہے۔ سامنے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور دونوں کی نگاہیں کھڑکی سے باہر برستی ہوئی بارش پر مرکوز تھیں۔

اچانک صفدر نے کہا۔ ''مجھے بارش بہت اچھی لگتی ہے۔''

''مجھے بھی بہت اچھی لگتی ہے۔'' ایک دم سے سیما نے جواب دیا۔

''بارش میں مجھے چائے بھی اچھی لگتی ہے۔'' صفدر نے ایسے ہی کہہ دیا۔ اس نے یہ بات ایک ناول میں پڑھی تھی کہ بارش کے دوران ناول کا ہیرو فوراً چائے بناتا ہے اور بارش کا نظارہ کرتے ہوئے چائے کی چسکیاں لینے لگتا ہے۔

سیما نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر بولی۔ ''میں خود چائے بنانے چلی جاتی ہوں۔'' سیما نے کہہ تو دیا لیکن اس نے سوچا کہ وہ تو چائے بہت کم پیتی ہے۔

''میں امی سے کہوں کہ ہمیں چائے بنا دیں؟'' صفدر نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

سیما نے جھجکتے ہوئے صفدر کی طرف دیکھا اور پھر بولی۔ ''ایسے ہی خالہ کو تکلیف ہو گی۔''

''اس میں تکلیف کی کونسی بات ہے۔ پتا ہے اس گھر میں اماں چائے لسی کی طرح پیتی ہیں۔''

''غٹا غٹ......؟'' مبہوت ہوتی سیما نے سوال کیا تو اس کی معصومیت پر صفدر کو ہنسی آ گئی۔ سیما اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ ''آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟''

''میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ چائے لسی کی طرح غٹا غٹ پی جاتی ہیں بلکہ جب اماں کا دل چاہتا ہے وہ چائے بنا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ ابھی جب میں اماں سے کہوں گا تو وہ ہماری پیالیوں کے ساتھ اپنی پیالی بھی بنا لیں گی۔ میں ابھی امی کو چائے کا کہہ کے آتا ہوں۔'' صفدر نے جا کر جب اپنی ماں سے چائے بنانے کے لیے کہا تو اماں نے پہلے اس کی طرف متحیر نگاہوں سے دیکھا۔

''آج چائے کا شوق کدھر سے چڑھ گیا ہے۔''

''بارش ہو رہی ہے۔ میں نے ایسے ہی سیما سے پوچھا تو اس نے کہہ دیا کہ چلیں پی لیتی ہوں تو میں نے سوچا اب وہ اکیلی پیتی ہوئی اچھی نہیں لگے گی میں بھی ساتھ پی لیتا ہوں۔''

''کوئی بات نہیں اگر تم چائے نہیں پینا چاہتے تو میں اس کے ساتھ بیٹھ کے پی لیتی ہوں۔'' اماں نے پیشکش کی۔

''موسم اچھا ہے آپ میرے لیے بھی چائے بنا لیں۔'' صفدر نے جلدی سے کہا۔

صفدر واپس سیما کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اب صفدر سوچ رہا تھا کہ وہ کیا بات شروع کرے پھر اس نے پوچھ

ہی لیا۔

''آپ کو بارش کیوں اچھی لگتی ہے؟''

''جو چیز کسی کو اچھی لگتی ہے، اس کے اچھا لگنے کی کوئی وجہ تلاش کرنا ممکن نہیں ہوتا، یہ دل کی باتیں ہوتی ہیں اور کہتے ہیں دل سمندر سے بھی گہرا ہوتا ہے......'' سیما نے بلا تامل جواب دیا۔

''جیسے اچانک مجھے......'' صفدر کہتے کہتے رک گیا۔ اس کا دل زور سے دھڑکا تھا اور وہ اس خوف سے ہی چپ ہو گیا کہ اس کے منہ سے یہ بات نکلنے کیسے لگی تھی۔

''جیسے کہ......؟'' سیما نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

صفدر چپ ہو کر سوچنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ بات کو اب کیسے گھمائے۔ صفدر کو چپ دیکھ کر اس نے پھر استفسار کیا۔ صفدر کو لگا جیسے سیما بھی سننا چاہتی ہے جیسے وہ سن کر خود بھی کچھ کہنا چاہتی ہے۔

''جیسے کہ میں نے آپ کو دیکھا اور پسند کرنے لگا ہوں'' صفدر نے بغیر اٹکے اور رکے اپنا جملہ مکمل کر دیا۔ ایک لمحے کے لیے سیما کے چہرے پر متانت آئی اور پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کرنے لگی اور اسی اثنا میں اماں چائے کی تین پیالیاں ٹرے میں رکھے اندر آ گئیں۔ دونوں کی طرف ایک ایک پیالی بڑھا کر وہ اپنی چائے کی پیالی لے کر ان کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

سیما اور صفدر نے بھری ہوئی چائے کی پیالیوں کی طرف دیکھ کر سوچا کہ اب وہ انہیں ختم کیسے کریں گے؟

بارش ختم ہو گئی...... اماں نے اطمینان سے چائے پی لی تھی لیکن ان دونوں کی پیالیوں کی چائے ختم نہ ہوئی۔ اماں اُٹھ کر چلی گئیں تو صفدر نے بتایا۔

''دراصل میں نے ایسے ہی کہہ دیا تھا کہ بارش میں مجھے چائے بہت پسند ہے۔''

''اور میں نے آپ کی بات سن کر کہہ دیا تھا'' سیما نے سچ بتا دیا اور دونوں کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

اس کے بعد ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے دلوں میں محبت کی جڑیں مضبوط ہوتی جا رہی تھیں۔ اب تو وہ مستقبل کے خوابوں میں بھی ایک دوسرے کو ہم سفر دیکھنے لگے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں چھپاتے تھے۔

پورے گاؤں میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ صفدر اور سیما کے بیچ کیا چل رہا ہے..... منور ایسا نوجوان تھا جس نے دونوں کو باتیں کرتے، مسکراتے اور ہنستے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

منور اسی گلی میں رہتا تھا جس گلی میں سیما کا گھر تھا۔ منور کا باپ عنایت تھا جو ملک حیات کا سب سے بڑا خوشامدی تھا۔ منور نے پہلے بھی کئی بار سیما کو دیکھا تھا اور سیما کو وہ پسند کرنے لگا تھا۔ وہ اکثر اپنے ہاتھ میں پکڑے موبائل فون سے اس تاک میں رہتا تھا کہ کسی طرح سے وہ سیما کی ایک تصویر کھینچ کر محفوظ کر لے، یا اس کی چلتی ہوئی ویڈیو بنا لے لیکن فی الحال اسے ایسا موقع میسر نہیں آیا تھا۔

منور اس گاؤں کا سب سے زیادہ آوارہ لڑکا تھا۔ وہ کوئی کام کاج نہیں کرتا تھا۔ اس کے دوست بھی اس جیسے ہی تھے، وہ صبح نکلتا تھا اور رات کو جانے کب اپنی آوارہ گردی اور دوستیوں سے فارغ ہو کر واپس گھر آتا تھا۔ اس کے باپ نے کیونکہ حرام زیادہ کمایا تھا اور حرام کھلایا تھا اس لیے اس کی اولاد بھی ایسی ہی تھی اور اسے خود بھی اپنی اولاد کی کوئی خاص پروا نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنے حال میں مست تھا۔ منور کیونکہ گھر میں کم اور آوارہ گردی میں زیادہ مشغول رہتا تھا اس لیے وہ بہت سی باتیں جان جاتا تھا کہ کہاں کیا ہو رہا ہے۔ اسی لیے اس نے صفدر اور سیما کو ملاقات کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

منور کو جب سے..... ان دونوں کے بارے میں پتا چلا تھا اس کے دل میں کانٹے اُگنے لگے تھے۔ وہ سوچتا رہتا تھا کہ ان کا راز کیسے وہ اُگلے کہ ان کی راہیں جدا ہو جائیں اور سیما کے لیے اس کا راستہ صاف ہو جائے۔ پھر جب وہ یہ سوچتا کہ ماسٹر کرم دین پڑھا لکھا ہے اور سیما نے بھی چودہ جماعتیں پڑھی ہیں، وہ کیسے اسے قبول کریں گے جبکہ وہ پورے گاؤں میں آوارہ مشہور ہے۔ ایسی باتیں سوچ کر وہ بھی چپ ہو جاتا تھا۔ لیکن اس نے راستہ نکالنے کا طریقہ سوچنا بند نہیں کیا تھا۔ وہ اس تاک میں تھا کہ صفدر اس سے دور ہو جائے اور سیما کو وہ اپنی بیوی بنا کر کہیں دور لے جائے۔

☆☆☆

فرزند کو شدید بخار تھا۔ جسم آگ کی طرح جل رہا تھا اور اس سے اُٹھنا بھی محال تھا۔ گاؤں میں جو ڈاکٹر تھا، وہ صبح آ کر فرزند کو دیکھ کر گیا تھا۔ فرزند ہلکا ناشتا کر کے اور دوا کھا کے لیٹ گیا تھا کہ اچانک دروازہ بجنے لگا۔

صفدر کی اماں دروازے تک گئیں تو باہر عنایت کھڑا تھا۔ ''بہن جی فرزند کو بھیجیں چوہدری صاحب کو شہر جانا

ہے۔ وہ اس کا انتظار کررہے ہیں۔''

''انہیں بہت بخار ہے، اُٹھ نہیں سکتے...... اس لیے آج نہیں آئیں گے۔'' صفدر کی ماں نے جواب دیا۔

''چوہدری صاحب نے کل تاکید کی تھی کہ شہر جانا ہے۔ انہیں بھیجیں۔'' عنایت نے نمک حلالی کرنے کی کوشش کی۔

''انہیں بہت بخار ہے، وہ نہیں آسکتے۔'' ایک بار پھر صفدر کی ماں نے کہا۔

''میں چوہدری صاحب سے کہہ دیتا ہوں کہ فرزند آنے سے انکاری ہے۔'' عنایت چلا گیا۔

''انہوں نے انکار نہیں کیا، وہ بیمار ہیں۔'' صفدر کی ماں نے جلدی سے کہا۔

''ایک ہی بات ہے۔'' عنایت بڑبڑایا اور چلا گیا۔

عنایت نے ملک حیات کے پاس جاکر کہا۔ ''اس کی بیوی کہتی ہے کہ اسے بہت بخار ہے، جبکہ میں نے اسے خود اندر جاتے ہوئے دیکھا ہے۔''

''فرزند کے بغیر تو ہم کہیں جاتے ہی نہیں ہیں۔ اُسے لے کر آؤ۔ بخار ہوا تو اس کی چارپائی اُٹھالانا۔ اب کمی کمین مجھے انکار کریں گے۔ مجھے بتائیں گے کہ بخار ہے اس لیے نہیں آسکتا۔ میرے حکم کے آگے اپنی مجبوریوں کو بیان کریں گے۔'' ملک حیات کو غصہ آگیا تھا۔

عنایت اسی وقت فرزند کے گھر کی طرف دوڑا اور جو کچھ ملک حیات نے کہا تھا، اس سے بھی بڑھا کر اس نے کہہ دیا۔ اس وقت صفدر باہر نکلا تھا۔ صفدر کو اس کی بات سن کر غصہ آگیا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ ہم کمزور لوگ ہیں۔ ان کا مقابلہ کرنا تو دور کی بات ان کو پلٹ کر جواب دینے کی بھی ہمت نہیں رکھتے۔ اس لیے اس نے تحمل سے بات کی۔

''ابا جی کے لیے جانا مشکل ہے۔''

''ہم ان کے غلام ہیں۔ ہمارے لیے یہ لفظ ہی نہیں بنا کہ یہ کام مشکل ہے اور وہ آسان ہے۔'' عنایت نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''آپ دیکھ لیں کہ وہ کس قدر بخار میں ہیں۔ ان کا جانا مشکل ہے۔'' صفدر کی کوشش تھی کہ اس کے لہجے سے اس کے اندر کا غصہ عیاں نہ ہو۔

''چوہدری صاحب ان کے بغیر کہیں نہیں جاتے۔ انہیں شہر جانا ہے اور وہ بھی بہت ضروری، اب کیا کریں وہ۔'' عنایت بولا۔

''مجبوری ہے، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' صفدر کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ عنایت کو اُٹھا کر دور پھینک دے لیکن وہ ایسا کر نہیں سکتا تھا۔

اسی وقت فرزند گرم کھیس لیے دروازے تک آگیا۔ اسے کپکپی ہورہی تھی۔ صفدر نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

''ابا جی آپ کیوں آگئے......؟''

''چلو میں چلتا ہوں چوہدری صاحب کے پاس۔'' فرزند نے اپنی کانپتی آواز میں کہا۔

''ابا جی آپ کہاں جائیں گے؟'' صفدر بولا۔

''جب وہ چلنے کو تیار ہیں تو تم کیوں روک رہے ہو، انہیں جانے دو۔'' عنایت نے جلدی سے کہا تو صفدر نے اسے گھور کر دیکھا۔

''میں چلتا ہوں اور خود بات کرتا ہوں۔'' فرزند نے کہا۔ یہ بات فرزند ہی جانتا تھا کہ اس دن ملک حیات شہر میں اس عورت سے لازمی ملنے جاتا ہے جس کے عشق میں گرفتار وہ اپنی جیبیں خالی کررہا تھا۔ فرزند کو ایک بار وہ عورت دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا وہ بہت خوبصورت تھی، اس لیے فرزند دروازے تک آگیا تھا تاکہ وہ خود جاکر ملک حیات کو بتاسکے کہ وہ مجبور ہے۔

صفدر نے اسے سہارا دیا اور ملک حیات کی حویلی کی طرف چل پڑے۔ فرزند سے چلنا دوبھر ہورہا تھا۔ اس لیے صفدر نے قریب سے جاتے ہوئے تانگے والے کو روکا اور اس میں بیٹھ کر وہ حویلی میں جا پہنچے۔

جب وہ سب حویلی میں داخل ہوئے تو ملک حیات اپنے بیٹے ملک شہباز کے ساتھ برآمدے میں ہی چارپائی پر ایک ٹانگ کے اوپر دوسری ٹانگ جما کر بیٹھا اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔

ملک حیات نے فرزند کو دیکھتے ہی تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ ''آگیا فرزند...... تجھے یاد نہیں تھا کہ میں اس روز شہر جاتا ہوں۔ آڑھت کے سوحساب کتاب کرنے ہوتے ہیں۔''

''چوہدری صاحب ابا جی کو بہت تیز بخار ہے۔'' صفدر بول پڑا۔

''میں نے تجھ سے بات نہیں کی...... تیرے باپ سے بات کررہا ہوں۔'' ملک حیات نے اطمینان سے صفدر کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر اسے کچھ دیر کے لیے گھورتا بھی رہا۔ صفدر نے خود ہی نگاہیں پھیر لیں ورنہ اس کے جسم میں بھی گرم خون دوڑ رہا تھا۔

''چوہدری صاحب بیمار ہوں آج نہیں جا سکتا۔'' اس بار فرزند نے کپکپاہٹ بھری آواز میں جواب دیا۔

ملک حیات نے زعم سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''فرزند تم جانتے ہو کہ تیرا باپ میرے باپ کا غلام تھا، تیرے آنے سے پہلے تیرا باپ بھی میرا غلام رہا، پھر تو آ گیا اور تیری جوانی اس حویلی کی دہلیز پر گزر گئی، تو میرا اور میرے بچوں کا غلام ہے اور یہ تیرا پُتر صفدر بھی ہمارا غلام ہے، اب اگر تو بیمار ہے، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ چل میرے ساتھ ابھی شہر چلنا ہے، بہت دیر ہوگئی ہے۔''

ملک حیات کا لب ولہجہ اور صفدر کے باپ کو رعب سے حکم دینا صفدر کے لیے برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا لیکن وہ جبر کیے کھڑا تھا۔ اس پر یہ بات پہلی بار منکشف ہوئی تھی کہ ملک حیات اس کے باپ دادا اور خود اسے اپنے اور اپنے بچوں کا غلام سمجھتا تھا۔ جبکہ انہیں اس نے خریدا نہیں تھا۔ وہ کام کرتے تھے اور مزدوری لیتے تھے۔

''چوہدری صاحب ہم آپ کے غلام نہیں ہیں۔ آپ کے پاس محنت مزدوری کرتے ہیں۔'' صفدر نے نرم لہجے میں کہا تو ملک حیات کے ساتھ ساتھ ملک شہباز کی نگاہیں بھی اس کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔

''تم چپ رہو...... تم گھر چلو...... چوہدری صاحب اس نے گستاخی کی ہے تو میں معافی مانگتا ہوں۔'' فرزند نے صفدر کو کہنے کے بعد اپنے ہاتھ ملک حیات کے سامنے جوڑ دیے۔ صفدر کے لیے یہ حیران کن بات تھی۔

''فرزند تو نے اپنے پُتر کو بتایا نہیں ہے کہ ہم نے تجھ سے ستر ہزار روپے لینے ہیں جو تجھ پر قرض ہیں۔'' ملک شہباز نے پہلی بار زبان کھولی تو صفدر مبہوت رہ گیا کیونکہ فرزند نے ایک بار بتایا تھا کہ اس نے ملک حیات کا بیس ہزار روپے قرض دینا ہے۔ بیس ہزار روپے، ستر ہزار کیسے ہو گئے اس بات نے تو فرزند کو بھی حیران کر دیا تھا۔

''قرض تو بیس ہزار روپے تھا۔'' صفدر بولا۔

ملک حیات نے پاس کھڑے منشی کو آواز دی اور اسے رجسٹر لانے کو کہا۔ منشی بھاگتا ہوا گیا اور رجسٹر اُٹھا لایا۔ اس نے صفدر کو وہ کھاتا دکھایا جو فرزند کے نام پر تھا۔ اس پر ستر ہزار لکھے ہوئے تھے اور ساتھ فرزند کے انگوٹھے کا نشان بھی تھا۔

''ابا جی یہ تو ستر ہزار روپے ہیں؟'' صفدر نے متحیر لہجے میں کہا۔

''دیکھ کر بھی یقین نہیں آ رہا ہے۔ ایک ایک پیسے کا حساب ہوتا ہے۔ چھوڑ وان باتوں کو، شہر جا کر واپس بھی آنا ہے۔ چلو......'' ملک حیات نے کہا۔

''جو آپ کا حکم چوہدری صاحب۔'' فرزند نے سر جھکائے کہا۔ وہ خود پریشان ہو گیا تھا کہ بیس ہزار کا ستر ہزار روپے کیسے بن گیا۔ شاید اس کی وجہ اس کا اَن پڑھ ہونا تھا کہ اس نے جب اپنا انگوٹھا لگایا تھا تو اس نے اس طرف غور ہی نہیں کیا تھا کہ وہاں قرض کتنا لکھا ہے۔ اور اگر غور کر بھی لیتا تو اسے کیا پتا چلتا۔

''ابا جی آپ اس حالت میں ڈرائیونگ کیسے کریں گے؟'' صفدر نے جلدی سے اپنے ابا کی طرف دیکھ کر تشویش سے پوچھا۔

''تم گھر چلو......'' فرزند کہہ کر گاڑی کی طرف بڑھا۔ اس سے چلنا دوبھر تھا۔ اس کا سارا جسم سردی سے کانپ رہا تھا۔ ملک شہباز اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ فرزند کی حالت ٹھیک نہیں ہے تو اس نے ملک حیات سے کہا۔

''اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے ابا جی...... اس حالت میں گاڑی کہیں مار دے گا...... اسے لے کر نہ جائیں......کل چلے جائیں۔''

ملک حیات شہر اس لیے تو نہیں جا رہا تھا کہ اسے آڑھت کا حساب کتاب کرنا تھا بلکہ وہ تو اپنی محبوبہ کے پاس جا رہا تھا۔ ان کا یہ دن مخصوص ہوتا تھا۔ غلہ منڈی تو اس کا منشی جاتا تھا۔

''نہیں' جانا ضروری ہے، آج کے دن حساب کتاب کرنا ہوتا ہے۔'' ملک حیات نے کہا۔

''پھر میرا ڈرائیور لے جائیں۔'' ملک شہباز بولا۔

ملک حیات بیٹے کا ڈرائیور کیسے لے جاتا اس لیے وہ سوچنے لگا۔ اچانک اس کی نگاہ صفدر پر پڑی اور اس نے صفدر سے کہا۔

''تم بھی تو گاڑی چلا لیتے ہو؟''

''جی ہاں چلا لیتا ہوں۔'' صفدر نے جواب دیا۔

''آج تم میرے ساتھ چلو۔'' ملک حیات نے کہا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ فرزند جو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا، گاڑی سے باہر آ گیا۔ ملک حیات ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور اس کا ایک باڈی گارڈ اور منشی پیچھے بیٹھ گئے۔

''میں ابا جی کو گھر چھوڑ آؤں۔'' صفدر نے کہا۔

''تیرا باپ دودھ پیتا بچہ نہیں ہے کہ گھر کا راستہ بھول جائے گا۔ خود ہی چلا جائے گا۔ بیٹھو تم، پہلے ہی دیر ہوگئی ہے۔'' صفدر کی بات سن کر ملک حیات نے قہر آلود لہجے میں کہا۔ صفدر کا دل چاہا وہ ملک حیات کو گریبان سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا حویلی سے باہر لے جائے جو انسان کو انسان ہی نہیں سمجھتا ہے اور اسے پورے گاؤں کے سامنے ایسا سبق سکھائے کہ ملک حیات کی عقل اس بات کو تسلیم کرلے کہ انسان اور کیڑوں مکوڑوں میں فرق ہوتا ہے۔ لیکن صفدر کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ وہ اسے اپنی گولی کا نشانہ بنا دیتے تو اس کے بوڑھے ماں باپ ساری زندگی رونے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

''چچا، ابا کو گھر چھوڑ آنا۔'' صفدر نے ناچاری سے عنایت کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اوئے عنایت...... ابھی جا اور دیکھ کے آ کہ کیا صورتِ حال ہے، ڈاکٹر کہتا تھا کہ آج وہ بچہ دے گی۔'' ملک حیات نے اسی وقت عنایت کو حکم دے دیا۔

''ابھی گیا چوہدری صاحب۔'' عنایت کہہ کر حویلی سے باہر چلا گیا۔ صفدر اپنے باپ کی طرف دیکھتا رہا۔ جو ایک طرف بمشکل کھڑا تھا۔ فرزند نے اسے اشارہ کیا کہ وہ چلا جائے وہ گھر پہنچ جائے گا۔

اس کے باوجود صفدر اپنے باپ کی طرف بڑھا تو ملک حیات نے دروازہ کھول کر ایک قدم باہر رکھا اور چلّا کر بولا۔

''تیرا باپ مر نہیں گیا...... زندہ ہے...... چل گاڑی چلا...... ورنہ تجھے اسی جگہ ڈھیر کر کے تیری لاش کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔''

صفدر کے قدم رک گئے اور فرزند نے پھر اشارہ کیا کہ وہ چلا جائے۔ حویلی کا چوکیدار بھی مجبور اور ناچار باپ بیٹے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجبوراً صفدر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور گاڑی حویلی سے نکال کر باہر لے گیا۔ جب تک وہ گاڑی اس جگہ سے نہیں گیا۔ وہ اپنے باپ کی طرف دیکھتا رہا تھا۔

☆☆☆

صفدر کی آنکھوں سے صرف آنسو نہیں نکلے تھے بلکہ اس کا دل بُری طرح سے رو رہا تھا۔ وہ ڈرائیونگ کر رہا تھا لیکن اس کا دھیان اپنے باپ کی طرف تھا۔ اسے بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ اس کا باپ گھر تک پہنچا بھی ہوگا کہ نہیں...... اس حویلی کے ظالم لوگوں سے تو ہمدردی کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

صفدر گاڑی چلا رہا تھا کہ آگے ایک آدمی اپنی کمر پر لکڑیاں لادے جا رہا تھا۔ اس کی چال وزن کی وجہ سے آہستہ تھی۔ صفدر نے گاڑی آہستہ کرلی اور ہارن بھی نہیں دیا، کچھ آگے سڑک چوڑی ہو جاتی تھی، صفدر کا خیال تھا کہ اس جگہ پہنچ کر وہ آدمی خود ہی ایک طرف ہو جائے گا۔

''اسے ہٹانے کے لیے تو ہارن کیوں نہیں دیتا؟'' ملک حیات نے کھا جانے والی نظروں سے صفدر کی طرف دیکھا۔

''اس نے وزن اُٹھایا ہوا ہے۔ آگے چوڑی سڑک ہے وہ خود ہی ہٹ جائے گا۔'' صفدر بولا۔

''اتنا ہمدرد نہ بن...... ہارن دے اُسے۔'' ملک حیات نے کہا اور خود ہی ہارن پر ہاتھ رکھ دیا۔ وزن اُٹھائے وہ آدمی بمشکل ایک طرف ہو کر رک گیا۔ اگر صفدر اس جگہ سے گاڑی نکالتا تو اس کی لکڑیاں گاڑی کے ساتھ لگ جاتیں اور گاڑی پر خراش آنے کا اندیشہ تھا۔ یہ بات ملک حیات نے دیکھ لی تھی۔ اس نے منشی کو حکم دیا۔

''منشی دیکھ یہ ہے کون؟''

منشی اسی وقت باہر نکلا اور لکڑیوں کا وزن اُٹھائے آدمی کا چہرہ دیکھ کر ملک حیات کو بلند آواز سے بتایا۔

''اپنے گاؤں کا چوکیدار ہے جی۔''

''اسے پرے دھکا دے...... ہمارا راستہ روکا ہوا ہے اس کم بخت نے۔'' ملک حیات دہاڑا اور منشی نے نہ آؤ دیکھا اور نہ تاؤ اسے ایسا دھکا دیا کہ بے چارہ اپنی لکڑیوں سمیت سڑک کی دوسری جانب جا پڑا کہ اسے چوٹیں بھی آگئیں۔ صفدر غیر ارادی طور پر گاڑی سے باہر نکلا اور پوچھا۔

''چچا لال تم ٹھیک ہو؟''

''تیرے اندر بڑی ہمدردی ہے۔ تیری آنکھیں نکال کر تیرے ہاتھ پر رکھ دوں تو تیری ساری ہمدردی ختم ہو جائے گی۔'' ملک حیات کو ایسا غصہ آیا کہ وہ دہاڑا۔ چوکیدار لال ان کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس نے ہاتھ کے اشارے سے صفدر کو بتایا کہ وہ ٹھیک ہے۔

ملک حیات کے کہنے پر صفدر اس پر افسوس کرتا ہوا گاڑی نکال کر وہاں سے لے گیا۔

جب ان کی گاڑی گاؤں سے باہر نکل گئی تو ملک حیات کے چہرے پر یکدم سے مسکراہٹ آگئی اور اس نے صفدر کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ صفدر اپنے دھیان میں

گاڑی چلاتا رہا۔ ملک حیات شیریں لہجے میں بولا۔
''تیرا باپ میرا پرانا ڈرائیور ہے۔ جب وہ گاڑی چلاتا ہے تو گاڑی کو بھی پتا نہیں چلتا کہ کوئی مجھے چلا رہا ہے۔ مجھے اس کی عادت پڑ گئی ہے۔ دوسری بات یہ کہ مجھے دیر ہو رہی تھی، غلہ منڈی میں حساب کتاب کرنا ہوتا ہے، مجھے اپنے پرانے دوست سے ملنا ہوتا ہے...... اس لیے مجھے دیر ہونے کی وجہ سے غصہ آ گیا تھا اور اس غصے میں جانے میرے منہ سے کیا کیا نکل گیا......'' ملک حیات کہہ کر چپ ہو گیا اور سامنے دیکھنے لگا۔
صفدر چپ چاپ گاڑی چلاتا رہا۔ اس کے اندر لاوا اُبل رہا تھا۔ اس کا دھیان اپنے باپ پر تھا۔
ملک حیات پھر بولا۔ ''گاڑی تم بھی اچھی چلاتے ہو......'' یہ کہہ کر وہ منشی سے مخاطب ہوا۔ ''منشی...... آج دیر ہو گئی ہے...... مجھے میرے دوست کے گھر چھوڑ کر صفدر تم سب کو منڈی لے جائے گا، وہاں اطمینان سے حساب کرنا اور پھر شام کو مجھے وہاں سے لے لینا۔''
''جی بہتر چوہدری صاحب۔'' منشی نے کہا۔
ملک حیات نے بڑے طریقے سے صفدر کو بتا دیا تھا کہ وہ اپنے دوست کے پاس رہے گا۔
گاڑی سڑک پر جس رفتار سے دوڑ رہی تھی اس سے زیادہ رفتار میں صفدر کے دل پر شعلے برس رہے تھے۔ اس کے پاس موبائل فون نہیں تھا ورنہ وہ کسی سے رابطہ کر کے اپنے باپ کے بارے میں دریافت کر لیتا کہ وہ گھر خیریت سے پہنچ گئے ہیں۔ ملک حیات کی انگلیوں میں اس کا موبائل فون رقص کر رہا تھا، وہ اسے آہستہ آہستہ گھما رہا تھا۔
گاڑی شہر میں داخل ہو گئی تھی۔ ملک حیات کے کہنے پر اسے ایک پوش علاقے کی کوٹھی کے سامنے اتار دیا تھا۔ پھر وہ گاڑی شہر کی غلہ منڈی کی طرف چلی گئی۔ منشی اور ملک حیات کا محافظ غلہ منڈی کے اندر چلے گئے جبکہ صفدر نے کار پارکنگ میں کھڑی کر دی اور وہ باہر نکل کر ٹیلی فون کرنے کے لیے کوئی جگہ تلاش کرنے لگا۔ چند دن قبل سیما نے ایک سستا سا موبائل فون لیا تھا اور اس نے اس کا نمبر صفدر کو دیا تھا۔ صفدر کے پاس موبائل فون نہیں تھا لیکن اس کا نمبر یاد تھا۔
صفدر کو کہیں بھی ٹیلی فون کرنے کی سہولت نہیں ملی۔ سب کے پاس موبائل فون آنے کی وجہ سے پی سی او شاذ ہی ملتے ہیں۔ یہاں اس کی کوئی واقفیت نہیں تھی کہ وہ کسی سے موبائل فون لے کر کال کر لیتا۔
صفدر واپس اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ سارا دن صفدر کے لیے وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔
سہ پہر کے وقت منشی اور محافظ گاڑی کی طرف آتے دکھائی دیے۔ منشی کے دانتوں میں ماچس کی تیلی دبی ہوئی تھی۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کھانا کھا کر آئے ہیں اور انہوں نے دوپہر کے کھانے میں صفدر کو شامل کرنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔
''چلو بھئی اسی کوٹھی کے سامنے چلو۔'' منشی نے اندر بیٹھتے ہی حکم دیا۔
صفدر نے گاڑی اس پوش علاقے کی طرف کر دی۔ جونہی گاڑی اس کوٹھی کے گیٹ کے پاس پہنچی صفدر نے ہارن دیا اور تھوڑی دیر کے بعد چھوٹا گیٹ کھلا اور ملک حیات نمودار ہوا۔ گاڑی اس جگہ کھڑی تھی کہ گیٹ کھلتے ہی صفدر کی نظر اندر چلی گئی تھی۔ صفدر نے دیکھا کہ اندر ایک خوبصورت اور فیشن ایبل خاتون کھڑی ہاتھ ہلا کر ملک حیات کو الوداع کر رہی تھی۔
جونہی ملک حیات باہر نکلا، اس نے گیٹ بند کر دیا۔ ملک حیات اپنی سیٹ پر بیٹھا اور صفدر نے اس کے کہنے سے بھی پہلے کار آگے بڑھا دی۔
صفدر برق رفتاری سے کار چلاتا گاؤں کی طرف رواں دواں تھا۔ ملک حیات اس عورت سے ملاقات کے سُرور میں گم تھا اور کئی بار وہ اونگھنے بھی لگا تھا، اس لیے اسے پتا بھی نہیں چلا کہ اندھیرا ہو گیا تھا اور گاؤں بھی آ گیا تھا۔
حویلی میں کار کھڑی کرنے کے بعد جونہی اجازت لے کر صفدر جانے لگا تو ملک حیات نے اسے روک لیا۔
''تھوڑی دیر رکو میں ابھی آتا ہوں۔'' ملک حیات کہہ کر اندر چلا گیا۔ مضطرب صفدر اسی جگہ رک گیا۔ اسے اپنے باپ کی فکر تھی کہ وہ خیریت سے ہے؟
گیٹ پر کھڑے چوکیدار سے صفدر نے دریافت کیا۔ ''اباجی چلے گئے تھے؟''
''یہاں سے تو چلے گئے تھے۔ بہت بیمار اور تکلیف میں تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں مجبور تھا ورنہ انہیں اُٹھا کر گھر چھوڑ آتا۔'' چوکیدار نے ہمدردی سے کہا۔
''گھر پتا نہیں کیسے پہنچے ہوں گے۔'' صفدر نے تشویش ظاہر کی۔
صفدر اسی بارے میں سوچتا ہوا ایک طرف بیٹھ گیا۔ ملک حیات نے اسے رکنے کے لیے کہا تھا جانے اسے کیا

بات کرنی تھی، اسے کیا کہنا تھا، اس لیے اب اس کا اس وقت تک جانا مشکل تھا جب تک ملک حیات آ کر اسے جانے کی اجازت نہ دے دیتا۔ بے چین، مضطرب صفدر ایک گھنٹے تک بیٹھا رہا لیکن ملک حیات واپس نہ آیا۔ صفدر کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ کبھی اُٹھ کر ٹہلنے لگتا اور کبھی بیٹھ جاتا۔ اسی طرح آدھا گھنٹا مزید گزر گیا۔

''چوہدری صاحب واپس نہیں آئے۔ مجھے گھر جانا ہے۔'' صفدر نے چوکیدار کے پاس جا کر کہا۔

چوکیدار نے بند دروازے کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔ ''باؤ صفدر...... میرا خیال ہے وہ سو گئے ہیں۔''

''اگر وہ سو گئے ہیں تو پھر میں اب میں کیا کروں؟'' صفدر نے بے چارگی سے اس سے دریافت کیا۔

چوکیدار نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔ ''اگر تم چلے گئے تو تمہارے لیے مشکل ہے اور یہاں انتظار کی جس سُولی پر تم لٹکے ہوئے ہو اس کی اذیت بھی ناقابلِ برداشت ہے۔''

''تم جا کر پتا تو کرو۔'' صفدر نے التجا کی۔

چوکیدار دل کا اچھا آدمی تھا اور ملک حیات کی غلامی میں اپنا روزگار چلا رہا تھا۔ اسے صفدر اور اس کے باپ سے ہمدردی تھی اس لیے وہ اُٹھ کر اندر چلا گیا۔ صفدر کھڑا انتظار کرتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ واپس آیا تو چوکیدار نے بتایا۔

''وہ تو سو گئے ہیں۔''

''میں پھر چلتا ہوں۔'' صفدر بولا۔

''چلے جاؤ پھر...... چوہدری صاحب اگر تمہارا پوچھیں گے تو میں بتا دوں گا کہ وہ انتظار کرنے کے بعد چلا گیا ہے بلکہ جس وقت بھی چوہدری صاحب تمہارا پوچھنے کے لیے آئے میں یہی جواب دوں گا کہ وہ ابھی ابھی انتظار کے بعد گیا ہے۔'' چوکیدار نے آخری بات دھیمے لہجے میں کہی۔

''تمہاری مہربانی......'' صفدر کہہ کر حویلی سے باہر چلا گیا۔

صفدر تیز تیز قدم اُٹھاتا اپنے گھر تک پہنچا تو دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس کی ماں دروازے میں کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جونہی ماں نے صفدر کو دیکھا جیسے اس کی سانس میں سانس آ گئی ہو۔

''آ گیا میرا لعل...... مجھے تیری بہت فکر ہو رہی تھی۔'' صفدر کی ماں نے جلدی سے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر اس کا ماتھا چوما۔

''ابا کیسے ہیں؟'' صفدر اندر چلا گیا۔

ماں نے دروازہ بند کیا اور اس کے پیچھے ہی چلتی ہوئی اس کمرے کی طرف بڑھی جہاں فرزند لیٹا ہوا تھا۔

''بخار کم ہوا ہے لیکن کمزوری بہت ہے۔'' صفدر کی ماں نے آہستہ سے بتایا۔

صفدر نے اپنے باپ کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھا۔ فرزند سو رہا تھا، صفدر کمرے سے باہر آ گیا۔

''تو منہ ہاتھ دھو لے میں کھانا لگاتی ہوں۔'' اس کی ماں نے کہا۔

''ابا گھر تک کیسے پہنچے تھے؟'' صفدر نے پوچھا۔

''حویلی سے نکلے تو ان سے چلنا مشکل تھا۔ کچھ ہی چلے تھے کہ وہ گر گئے۔ مراد انہیں اُٹھا کر لایا تھا اور وہی ڈاکٹر کو بھی لے کر آیا تھا۔'' ماں نے بتایا۔ مراد دوسری گلی میں رہتا تھا اور صفدر کے بچپن کا دوست تھا۔

''تم منہ ہاتھ دھو لو میں کھانا لگاتی ہوں۔'' ماں نے ایک بار پھر کہا اور باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

صفدر اسی جگہ کھڑا سوچتا رہا۔ ملک حیات کے رویّے نے اسے چوٹ پر چوٹ پہنچائی تھی۔ اس کا باپ چلتے ہوئے گر گیا تھا اور وہ شخص ملک حیات کی وجہ سے گرا تھا۔ صفدر کا خون کھول رہا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ ابھی وہ ملک حیات کا گلا دبا دے۔ ملک حیات اور اس کے بیٹے ملک شہباز اپنے پاس کام کرنے والے لوگوں کو ہی نہیں بلکہ ہر کمزور آدمی کو وہ اپنا غلام سمجھتے تھے۔ طرح طرح سے ان پر ظلم کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔ ان کو کسی کے جذبات اور مجبوری کی کوئی پروا نہیں تھی۔ پورا گاؤں ان کے ظلم کا شکار تھا لیکن چپ چاپ سب کچھ سہہ رہا تھا۔

''تم نے ابھی منہ ہاتھ نہیں دھویا؟'' اچانک اس کی ماں نے عقب سے پوچھا۔

صفدر چونکا۔ ''اماں...... ظلم کی رات کی کوئی صبح بھی ہوتی ہے؟''

صفدر کی ماں سمجھ گئی تھی کہ صفدر نے یہ سوال کیوں کیا ہے۔ اس نے متانت سے جواب دیا۔ ''ظلم کی رات بہت تھوڑے وقت کی ہوتی ہے۔ جو چیز رب کو پسند نہیں تو وہ رات لمبی کیسے ہو سکتی ہے۔''

صفدر اپنی ماں کا چہرہ دیکھنے لگا۔ پھر منہ ہاتھ دھونے کے لیے چلا گیا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد صفدر صحن میں بچھی چارپائی پر لیٹ گیا۔ نیند اس کی آنکھوں سے دور

تھی۔ اسے رہ رہ کر ملک حیات کا رویّہ یاد آرہا تھا۔ اس کے پاس اگر موبائل فون ہوتا تو وہ سیما کو فون کر کے اس سے اپنے دل کی باتیں کرتا۔ سوچتے سوچتے اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں اور نیند کا غلبہ حاوی ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

صبح کے سورج نے جونہی اپنی کرنیں بکھیریں، فرزند کے گھر کا دروازہ زور زور سے بجنے لگا۔ صفدر نے ابھی منہ ہاتھ دھویا ہی تھا اور وہ تولیا لیے کھڑا تھا۔ اس نے ایک نظر اپنی اماں کی طرف دیکھا جو باورچی خانے سے باہر نکل رہی تھیں۔ صفدر نے اماں کو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور خود اُٹھ کر دروازہ کھول دیا، سامنے عنایت کھڑا تھا۔ وہ صفدر کو دیکھتے ہی بولا۔

''چوہدری صاحب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

''وہ کیوں؟'' صفدر نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''مجھے کیا پتا..... میرے ساتھ چلو اور خود پوچھ لو۔'' عنایت نے اُکھڑے ہوئے لہجے کے ساتھ کہا۔

''تم چلو میں آتا ہوں۔'' صفدر بولا۔

''چوہدری صاحب نے کہا تھا کہ ساتھ لے کر آنا، اگر نہ آئے تو اسے اُٹھا کر لے آنا۔ اب تم فیصلہ کرلو کہ چل کر جانا چاہتے ہو یا پھر دوسرا طریقہ اپناؤں۔'' عنایت نے آنکھیں نکالیں۔ اس کا لہجہ بھی بلند ہوگیا تھا۔ ہمسایوں تک بھی اس کی آواز پہنچ گئی تھی۔

صفدر کے بس میں ہوتا تو وہ عنایت کو اسی جگہ گاڑ دیتا۔ عنایت کے پیچھے ملک حیات کی طاقت تھی اور وہ تنہا تھا۔ اس لیے وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے اندر جھانک کر اپنی ماں سے کہا۔

''اماں میں ابھی آیا۔'' صفدر کو یہ ڈر بھی تھا کہ عنایت کی آواز اس کے ابا کے کانوں تک نہ چلی جائے ورنہ وہ پھر چارپائی سے اُٹھ کر آجائے گا اور صفدر نہیں چاہتا تھا کہ اس کے باپ کی تذلیل ہو۔

صفدر نے دروازہ بند کیا اور عنایت کے ساتھ چل پڑا۔ جونہی صفدر نے حویلی کے اندر قدم رکھا، ملک حیات کی گونج دار آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

''جب تجھے میں نے کہا تھا کہ تو یہاں رک کر میرا انتظار کرتو پھر تیری جرأت کیسے ہوئی کہ میری اجازت کے بغیر اپنے گھر چلا جائے۔''

''آپ کا بہت انتظار کرنے کے بعد گیا تھا۔ آپ سو گئے تھے۔'' صفدر نے جبر کرتے ہوئے نرم لہجے میں جواب دیا۔

''تجھے یہاں انتظار کرنا تھا، کیونکہ یہ میرا حکم تھا۔'' ملک حیات دہاڑا۔ ''آئندہ اس بات کا خیال رکھنا۔ چل گاڑی نکال، مجھے لڑکیوں کے اسکول جانا ہے، مہمانِ خصوصی ہوں میں۔'' ملک حیات کہہ کر اندر چلا گیا۔ صفدر اسی جگہ کھڑا خار کھاتا رہا۔

حویلی کے چوکیدار نے صفدر کو اشارے سے اپنے پاس بلالیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''صفدر پُتر...... برداشت کرنا...... تجھے ان باتوں کی عادت نہیں ہے...... فرزند ٹھیک ہو جائے گا تو وہ واپس اس کام پر آجائے گا......وہ یہ سب سننے کا عادی ہے۔''

''ابا نے کبھی مجھے یہ نہیں بتایا کہ ان کے ساتھ ایسا سلوک ہوتا ہے۔'' صفدر کو تاسف ہوا۔

''ایک بار یہ دونوں باپ بیٹا باتیں کر رہے تھے۔ ان کے حلق سے یہ بات نیچے نہیں اتری کہ ان کے معمولی ڈرائیور کا بیٹا چودہ جماعتیں پڑھ گیا ہے۔ ملک حیات نے کہا تھا کہ جس دن فرزند کا پُتر اس کی داڑھ کے نیچے آگیا وہ چودہ جماعتوں کی ڈگری کو بتادے گا کہ تم چودہ جماعتیں پڑھ کر بھی ہمارے معمولی سے کمی کمین ہو۔'' چوکیدار نے بتایا۔

صفدر کو جیسے بات کی سمجھ آگئی تھی۔ ''اس لیے یہ میرے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں۔''

''ہاں...... بس تم برداشت کرنا اور ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالتے رہنا۔'' چوکیدار نے تاکید کی۔

ڈیڑھ گھنٹا انتظار کرانے کے بعد ملک حیات سر پر شملہ کھڑا کیے باہر آگیا۔ وہ سیدھا اپنی کار کی طرف بڑھا، اس کے ساتھ اس کا ایک محافظ تھا۔ صفدر نے جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی، عنایت بھی باہر سے آگیا اور گاڑی میں بیٹھ گیا، اور پھر وہ گاڑی گاؤں کے اس اسکول کی طرف لے گیا جو لڑکیوں کا تھا اور اسی اسکول میں سیما بھی اسکول ٹیچر تھی۔ چلتے ہوئے صفدر سوچ رہا تھا کہ اگر ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہی جانا تھا تو ملک حیات اسے ناشتا کرنے کی مہلت دے دیتا۔ صفدر نے ایک لقمہ بھی نہیں کھایا تھا اور بھوکا ہی ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

پھول کی پتیوں سے ملک حیات کا استقبال کیا گیا۔ صفدر بھی ساتھ ہی چل رہا تھا۔ جب ملک حیات کو مہمانِ

خصوصی نشست پر بٹھایا تو صفدر ایک طرف کھڑا ہوگیا۔
اسکول میں تقسیم انعامات کی تقریب تھی اور سیما میزبانی کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ صفدر اور سیما نے ایک دوسرے کو کئی بار دیکھا تھا۔ سیما کو حیرت تھی کہ صفدر کیوں ملک حیات کے ساتھ آیا ہے؟
تقریب ختم ہوئی تو وہ سب گاڑی میں بیٹھ کر حویلی کی طرف چل پڑے۔
''عنایت...... وہ لڑکی کون تھی جو مائیک پکڑے کھڑی تھی۔'' ملک حیات نے پوچھا۔
''وہ سیما ہے۔'' عنایت نے جواب دیا۔
''کون سیما......؟'' ملک حیات نے وضاحت چاہی۔
''ماسٹر کرم دین کی بیٹی ہے۔'' عنایت نے بتایا۔
''یہ ماسٹر کرم دین کی بیٹی ہے؟ اس اسکول میں پڑھاتی ہے؟'' ملک حیات کو سن کر حیرت ہوئی۔
''ہاں جی چوہدری صاحب یہ اس اسکول میں پڑھاتی ہے۔'' عنایت نے کہا۔
''بڑی خوبصورت لڑکی ہے، اتنا حُسن تو میں نے پہلے اس گاؤں میں دیکھا ہی نہیں ہے۔'' ملک حیات کے منہ سے اس کی تعریف کے الفاظ پھسلے تو صفدر کا چہرہ سرخ ہوگیا۔
''ہاں جی چوہدری صاحب بہت خوبصورت ہے۔'' عنایت نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔
''شادی ہوئی ہے اس کی؟'' ملک حیات نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر پوچھا۔
''ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی چوہدری صاحب۔'' عنایت معنی خیز انداز میں ہنسا۔
''کہیں رشتہ بھی طے نہیں ہوا؟'' ملک حیات کی آواز میں خمار سا آگیا تھا۔
''ماسٹر کرم دین اس کا رشتہ تلاش کر رہا ہے۔'' عنایت نے جواب دیا۔
ملک حیات چپ ہوگیا اور پھر بولا۔ ''عنایت......''
''جی چوہدری صاحب۔'' عنایت جلدی سے بولا۔
''سیما کو حویلی میں بلاؤ۔ اس کی ترقی کرا دیتا ہوں۔'' حریص اور غلیظ نیت کا مالک ملک حیات اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا بولا۔
''جو حکم چوہدری صاحب۔'' عنایت دھیرے سے مسکرایا۔

''سیما کو پرانی حویلی میں لے کر آنا۔ وہاں اُس سے بات کروں گا۔'' ملک حیات نے کہا اور صفدر نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔ ملک حیات نے سیما کو دیکھ لیا تھا اور وہ اس کی خوبصورتی میں ڈوب گیا تھا۔ صفدر جان گیا تھا کہ ملک حیات کی نیت میں کھوٹ آگیا ہے۔
اچانک ملک حیات نے صفدر کی طرف دیکھ کر کہا۔
''تیرا باپ بہرا ڈرائیور تھا۔ اس لیے تم بھی بہرے بن کے گاڑی چلایا کرو۔ خبردار جو کبھی تمہارے منہ سے ہماری کی ہوئی بات باہر کہیں نکلی۔''
صفدر چپ گاڑی چلاتا رہا لیکن اس کا خون کھولنے لگا تھا۔ اس نے گاڑی کا اسٹیئرنگ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔
ملک حیات نے درشت لہجے میں صفدر کو مخاطب کیا۔
''تم میری بات سن رہے ہو؟''
''جی......'' صفدر جبر کا پہاڑ اُٹھائے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔
ان کی کار حویلی میں پہنچ گئی تھی۔ کار سے باہر نکلتے ہی عنایت نے ملک حیات سے سرگوشی کی۔ ''چوہدری صاحب آپ نے سیما سے ملنا تھا تو مجھے الگ سے کہہ دیتے، صفدر کے سامنے یہ بات نہ کرتے۔''
''میں اس سے ڈرتا نہیں ہوں۔'' ملک حیات نے بے پروائی سے ہاتھ کو جھٹکا۔
''بات ڈرنے کی نہیں ہے، یہ فرزند نہیں ہے جو سب کچھ دیکھ اور سن کر سینے میں دفن کرتا جائے۔ جانے یہ کس سے بات کردے۔'' عنایت نے کہا۔
''یہ بات تو صحیح ہے کہ یہ فرزند نہیں ہے لیکن اس لڑکی کا حُسن ایسا ہے کہ اسے دیکھ کر میں بے چین ہوگیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ جب میں نے بات کی تھی تو میرے دماغ میں یہ بات ہی نہیں رہی کہ گاڑی فرزند چلا رہا ہے کہ اس کا پُتر...... بات کرنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ گاڑی تو اس کا پتر چلا رہا ہے اس لیے میں نے اُسے خبردار کردیا ہے۔ یہ ڈرے اور سہمے ہوئے لوگ ہیں، زبان نہیں کھولیں گے۔'' ملک حیات نے کہا۔
عنایت بولا۔ ''پھر میں چوہدری صاحب سیما کو پرانی حویلی میں لے کر آجاؤں؟''
''مجھے اس کام میں دیر نہیں چاہیے۔ ویسے تیرا کیا خیال ہے، اس کا باپ اسے تیرے ساتھ بھیج دے گا؟''
''سارا گاؤں جانتا ہے کہ آپ لوگوں کی شکایتیں پرانی حویلی میں سنتے ہیں اور اسی جگہ بیٹھ کر لوگوں کے مسئلے

حل کرتے ہیں، میں ماسٹر کرم دین کو ایسا ورغلاؤں گا کہ وہ سیما کو میرے ساتھ بھیج دے گا۔''

''دیکھ لینا...... آسانی سے کام بن گیا تو ٹھیک ہے ورنہ اسے سکول جاتے ہوئے اُٹھالیں گے۔'' ملک حیات بولا۔

''جو آپ کا حکم۔'' عنایت نے گردن ہلائی۔

''آج مجھے کہیں نہیں جانا۔ تھوڑی دیر بعد صفدر کو گھر بھیج دینا اور اسے کہنا کہ کہیں جائے مت...... ضرورت پڑی تو اسے بلالیں گے۔'' ملک حیات نے کہا۔

''چوہدری صاحب اسے یہیں رہنے دیں۔ سو کھتا رہے، ضرورت پڑی تو اسے لے جائیں گے۔'' عنایت بولا۔

''میرے منہ سے اچانک سیما کی بات نکل گئی تھی، اس لیے ضروری ہے کہ صفدر کے ساتھ کچھ نرم رویّہ برت لیں۔ سمجھا کر۔'' ملک حیات نے کہتے ہوئے اپنی ایک آنکھ دبائی اور پھر دائیں بائیں نظر گھما کر بولا۔ ''شہباز کو اس بات کا پتا نہ چلے۔''

''چوہدری صاحب، پہلے کبھی پتا چلنے دیا ہے۔'' عنایت نے بتیسی نکالی۔

''وہ تو مجھے پتا ہے، احتیاطاً کہہ رہا تھا۔'' یہ کہہ کر ملک حیات اندر چلا گیا۔

ملک حیات کی آنکھوں میں سیما کی صورت بسی ہوئی تھی۔ اسے حیرت بھی ہو رہی تھی کہ ماسٹر کرم دین کی بیٹی ایسی خوبصورت ہے۔ اگر وہ اسے پہلے کہیں دیکھ لیتا تو اب تک وہ اس کی حویلی میں آ بھی چکی ہوتی۔

سیما جیسی خوبصورت لڑکی پورے گاؤں میں نہیں ہے۔ کیوں نا میں اس کے ساتھ نکاح کر کے ہمیشہ کے لیے اسے اپنے پاس رکھ لوں؟ ملک حیات نے سوچا اور پھر اس نے خود ہی اثبات میں سر ہلا دیا جیسے وہ فیصلہ کر چکا ہو۔

صفدر گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ مضطرب سوچ رہا تھا کہ کسی طرح سے وہ سیما کو اس بات کی اطلاع کر دے۔ ملک حیات اور اس کے بیٹے اس گاؤں میں انسانی روپ میں بھیڑیئے تھے۔ جو جب انسانی شکار کے لیے نکلتے تھے تو پھر ان کی آنکھوں میں حیا نام کی کوئی چیز نہیں رہتی تھی۔ وہ صرف شکار کا سوچتے تھے اور اس کے لیے پاگل ہو جاتے تھے۔

صفدر کو اس بات کی فکر تھی کہ اب ملک حیات نے سیما کو دیکھ لیا تھا اور اس کے دل میں اس کے لیے میل بھی آ گیا تھا اب سیما ایک ہی صورت میں بچ سکتی تھی کہ وہ کسی طرح سے گھر میں بند رہے، یا پھر اکیلی اسکول نہ جائے۔ صفدر کے لیے بے حد ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اسے قبل از وقت اس خطرے سے آگاہ کر دے۔

عنایت باہر نکلا تو ایک طرف بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ وہ اطمینان سے سگریٹ پیتا رہا اور دھواں چھوڑتا رہا۔ سگریٹ کا آخری کش لینے کے بعد عنایت نے سگریٹ نیچے پھینک کر پاؤں سے اچھی طرح مسلا اور صفدر کے پاس آ کر بولا۔

''آج چوہدری صاحب نے کہیں نہیں جانا، تم گھر جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ لیکن کہیں دائیں بائیں مت جانا، چوہدری صاحب کو اگر اچانک تمہاری ضرورت پڑی تو تم کو بلالیں گے۔''

''میں گھر میں ہی ہوں۔'' صفدر کہہ کر گیٹ کی جانب بڑھا اور باہر نکلتے ہی وہ سیدھا مراد کے گھر چلا گیا۔ اس نے مراد کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ تھوڑی دیر بعد مراد باہر آ گیا۔

''خیر تو ہے صفدر؟ مراد نے اس کی طرف دیکھتے ہی پوچھا۔

''سب خیر ہے۔ دراصل مجھے ایک کال کرنی ہے۔ تم مجھے ایک منٹ کے لیے اپنا موبائل فون دو گے۔'' صفدر نے کہا۔

''ہاں کیوں نہیں...... یہ لو۔'' مراد نے کہتے ہی اپنا موبائل فون جیب سے نکالا اور صفدر کی طرف بڑھا دیا۔

صفدر نے ایک لمحے کے لیے سیما کا موبائل نمبر اپنے ذہن میں دہرایا اور پھر نمبر ملا کر موبائل فون کان سے لگا لیا۔

بیل جانے لگی لیکن سیما نے فون اٹینڈ نہیں کیا۔ وہ کسی اجنبی نمبر کو دیکھ کر کال اٹینڈ نہیں کرتی تھی۔ جب صفدر بار بار فون کرنے لگا تو سیما وہ کال کاٹنے لگی اور اس طرح سے اس کی بات صفدر سے نہیں ہو سکی۔

''وہ میری کال اٹینڈ نہیں کر رہی ہے۔'' صفدر بولا۔

''تم کسے کال کر رہے ہو؟'' مراد نے پوچھا۔

اس سوال پر صفدر نے مراد کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا کہ اس تعلق کے بارے میں کسی کو علم نہیں ہے، یہاں تک کہ اس نے مراد کو بھی کبھی نہیں بتایا تھا اور اب مراد کے سوال کا وہ کیا جواب دے؟

صفدر نے سوچا کہ مراد اس کا بچپن کا دوست ہے۔ وہ بولا۔ ''میں سیما کو فون کر رہا ہوں۔''

''کون سیما......؟''

''ماسٹر کرم دین کی بیٹی سیما۔'' صفدر نے بتایا۔

''اسے کیوں فون کر رہے ہو؟'' مراد کو حیرت ہوئی۔

صفدر کے لیے اپنے اس بھید کو بتانا ناگزیر ہو گیا تھا۔ اس نے اختصار سے اپنے اور سیما کے تعلق کے بارے میں بتا دیا لیکن یہ بات اس سے مخفی رکھی کہ وہ اسے ملک حیات کی بدنیتی اور ہوس کی وجہ سے فون کر کے آگاہ کرنا چاہتا ہے۔

''تم نے کبھی اپنے بچپن کے دوست کو اس بارے میں بتایا ہی نہیں۔'' مراد نے اسے چھیڑا۔

''میں نے سوچا تھا کہ جب بات شادی تک پہنچے گی تو سب سے پہلے تمہیں بتاؤں گا۔'' صفدر بھی مسکرایا۔

''تم ایسا کرو کہ سیما کو اس موبائل فون سے ایک میسج کرو۔ اور اسے بتاؤ کہ یہ تم ہو جو اسے کال کر رہے ہو، میرا خیال ہے کہ اجنبی نمبر دیکھ کر وہ کال سن نہیں رہی۔'' مراد نے سوچنے کے بعد کہا۔

صفدر نے میسج کیا اور پھر کچھ دیر کے بعد اسے کال کی۔ دوسری بیل پر سیما نے کال سن لی۔

''سیما، میں صفدر بول رہا ہوں۔'' صفدر کہتا ہوا مراد سے کچھ آگے چلا گیا جبکہ مراد اسی جگہ کھڑا رہا۔

''کیا تم نے موبائل فون لے لیا ہے۔'' دوسری طرف سے سیما نے پوچھا۔

''یہ مراد کا نمبر ہے۔ تم سے ضروری بات کرنی ہے۔'' صفدر نے کہا۔

''کیا بات کرنی ہے؟'' سیما بولی۔

''تم اکیلی گھر مت جانا، کسی کو ساتھ لے کر جانا اور جب تم اسکول جاؤ تو بھی کسی کے ساتھ جانا اور اگر عنایت کوئی بات کرے، تمہارے ابا کو کوئی لالچ دے، تمہاری نوکری کے لیے تو اپنے ابا کو سمجھا دینا کہ وہ عنایت کی باتوں میں نہ آئے۔'' صفدر نے کہا۔

''بات کیا ہے...... تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟'' سیما کو حیرت ہونے لگی۔

صفدر نے اختصار سے اسے بھی بتا دیا کہ ملک حیات نے اس کے بارے میں عنایت کو کیا کہا ہے۔

''میں بھی کہوں وہ مجھے اسکول میں گھور گھور کر کیوں دیکھ رہا ہے۔ ٹھیک ہے میں کسی کے ساتھ ہی اسکول آیا جایا کروں گی اور ابا کو بھی سمجھا دوں گی۔'' سیما بولی۔

''ابھی اپنے ابا سے کوئی بات نہ کرنا۔ جب وہ کوئی بات کریں تو پھر کسی ایسے طریقے سے بات کرنا، یا انکار کرنا کہ انہیں کسی بات کا شک نہ پڑے۔'' صفدر نے سمجھایا۔

''میں سنبھال لوں گی بات کو۔''

''کوئی بات ہو تو تم مراد کو فون کر کے پیغام دے دینا۔ مراد مجھ تک تمہارا پیغام پہنچا دے گا۔'' صفدر بولا۔

''یہ بتاؤ کہ تم ملک حیات کے ساتھ کیا کر رہے ہو؟'' سیما نے پوچھا۔

''ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور میں آج کل ابا کی جگہ ڈرائیور بنا ہوا ہوں۔'' صفدر نے بتایا۔ کچھ باتوں کے بعد صفدر نے کال منقطع کر دی اور موبائل فون مراد کو واپس کر دیا۔

''اس ظالم سے جانے کب اس گاؤں کی جان چھوٹے گی۔'' صفدر نے سوچا۔

''میں اب گھر جا رہا ہوں۔ اگر سیما فون کر کے کوئی پیغام دے تو مجھے بتا دینا۔'' صفدر نے کہا۔

''تم بےفکر رہو۔'' مراد مسکرایا۔

صفدر گھر پہنچا تو اس کے ابا کی طبیعت اور بھی خراب ہو رہی تھی۔ وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔

دوپہر تک اس کے ابا کی طبیعت میں بہتری آنا شروع ہوئی تو گھر والوں کو سکھ کی سانس آئی۔



جب اسکول سے چھٹی ہوئی، عنایت اس وقت اسکول کے باہر تھا۔ سیما اپنی دوست کے ساتھ باہر نکلی۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر اس کے ساتھ اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔

سیما کے گھر پہنچنے کے لیے ایک پگڈنڈی کو عبور کرنا پڑتا تھا۔ اس پگڈنڈی کے دائیں بائیں فصل کھڑی تھی اور یہ وہ راستہ تھا جہاں سے سیما کو آسانی سے اغوا کیا جا سکتا تھا۔ عنایت نے دیکھا کہ سیما اکیلی نہیں تھی۔ اس نے کچھ سوچا اور ملک حیات کے پاس چلا گیا۔

''چوہدری صاحب سیما اپنے گھر پگڈنڈی سے ہوتی ہوئی جاتی ہے۔ دائیں بائیں فصلیں ہیں۔ یہی راستہ ہے اس کے گھر تک جانے کا۔ دوسرا راستہ سڑک کی طرف ہے جس سے پیدل نہیں جایا جا سکتا۔ کیونکہ وہ دور پڑتا ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ ماسٹر کرم دین سے کوئی کہانی ڈالنے

کے بجائے سیما کو اسی جگہ سے اغوا کر لیتے ہیں اور پرانی حویلی میں پہنچا دیتے ہیں۔''

''سوچا تو تم نے ٹھیک ہے۔ اسے آج ہی اُٹھا لیتے۔'' ملک حیات نے جلدی سے کہا۔

''آج میں نے جائزہ لیا ہے۔ سیما کے ساتھ ایک اور لڑکی بھی تھی۔ کل کوئی منصوبہ بناتا ہوں۔''

''اب تم منصوبے ہی نہ بناتے رہنا، کل اسے اُٹھا کر حویلی پہنچا دینا۔'' ملک حیات بے چین ہو رہا تھا۔

''آپ بے فکر رہیں۔'' عنایت بولا۔

اس کمرے میں ملک حیات اور عنایت باتیں کر رہے تھے جبکہ اپنے کمرے میں ملک شہباز کرسی پر بیٹھا سیما کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ چند دن پہلے ملک شہباز نے سیما کو اپنے گھر کے دروازے پر اس وقت دیکھا تھا جب وہ ایک فقیر کو آٹا دے رہی تھی اور ملک شہباز اس گلی سے اپنے دوستوں کے ساتھ گزرا تھا۔ جب سے اس نے سیما کو دیکھا تھا، وہ اس کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ ملک شہباز بھی اس کی خوبصورتی کا دیوانہ ہو گیا تھا۔

ایک ہی حویلی میں باپ اور بیٹا ایک ہی لڑکی سیما کے بارے میں اپنی حریص طبیعت اور بدفطرتی کے ساتھ سوچ رہے تھے۔

ملک حیات نے عنایت کو بھیج دیا تھا اور وہ حویلی سے باہر چلا گیا تھا۔ اس وقت ملک حیات اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا اور اچانک اس کے قدم رک گئے۔ اس نے دیکھا کہ حویلی کے اندر عنایت کا بیٹا منور داخل ہوا ہے۔ ملک حیات کے لیے چونکنے کی بات یہ تھی کہ منور کبھی اس حویلی میں نہیں آیا تھا اور نہ ہی اسے کوئی اس حویلی میں آنے دیتا تھا۔

منور سیدھا اندر چلا گیا۔ اس کے ساتھ حویلی کا ایک ملازم تھا۔ جب وہ ملازم، منور کو چھوڑ کر باہر نکلا تو ملک حیات نے اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

''یہ منور حویلی میں کیا کرنے آیا ہے؟''

''چھوٹے ملک صاحب نے اسے بلایا ہے۔'' ملازم نے جواب دیا۔

اس کے جواب نے ملک حیات کو اور بھی حیران کر دیا۔ ملک حیات نے ملازم کی طرف دیکھا اور پھر اسے حکم دیا۔

''عنایت کا نمبر ملا کر موبائل فون مجھے دو اور تم کمرے سے باہر جاؤ۔''

ملازم نے تپائی سے ملک حیات کا موبائل فون اُٹھا کر عنایت کا نمبر ملایا اور جونہی دوسری طرف سے عنایت کی آواز آئی، ملازم نے فون ملک حیات کو دیا اور خود کمرے سے باہر نکل گیا۔

''تیرا بیٹا منور حویلی میں کیا کر رہا ہے؟'' ملک حیات نے پوچھا۔

''وہ حویلی میں ہے؟'' عنایت نے متحیّر لہجے میں پوچھا۔

''میں نے اپنے ملازم سے پوچھا تھا، اس نے بتایا ہے کہ اسے شہباز نے بلایا ہے، منور جونہی حویلی سے باہر نکلے اس سے پوچھو کہ شہباز نے اسے کیوں بلایا تھا؟'' ملک حیات نے کہا۔

''چوہدری صاحب کوئی چھوٹا موٹا کام ہوگا، اس میں پریشان ہونے والی کوئی بات ہے۔'' عنایت بے پروائی بولا۔

''تیری عقل میرے جتنی ہوتی تو تُو اس وقت میری جگہ پر ہوتا۔ سیما تیری ہی گلی میں رہتی ہے نا؟''

''جی وہ ہماری ہی گلی میں رہتی ہے۔'' عنایت کے دماغ کی فوراً گھنٹی بجی۔

''بس تیرے لیے اتنا ہی اشارہ بہت ہے۔ منور کے سینے کے اندر سے وہ بات نکال کر مجھے بتانا، سمجھے۔'' ملک حیات نے اسے زور دے کر کہا۔

''آپ بے فکر ہو جائیں چوہدری صاحب۔'' عنایت نے فون بند کیا اور حویلی کے اردگرد ہی گھومنے لگا۔

منور جب حویلی سے باہر نکلا تو اس کا منہ بنا ہوا تھا۔ منور تو خود سیما کو چاہتا تھا۔ اور اب اسے ملک شہباز نے کہہ دیا تھا کہ سیما کے آنے جانے کے وقت پر نظر رکھے اور اس کے بارے میں ہر خبر اسے دے۔

ملک شہباز نے بھی سوچ لیا تھا کہ سیما کو اُٹھا کر اس سے نکاح کرلے گا، جب تک اس کا دل چاہے گا، وہ اسے اپنی بیوی رکھے گا اور جب اس کا دل اس سے بھر جائے گا، وہ اسے چھوڑ دے گا۔

منور کی جیب میں اس وقت بہت سے نوٹ تھے لیکن اسے ان نوٹوں کی ذرا بھی خوشی نہیں تھی۔ منور سوچ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ ملک شہباز تو گدھ ہے جو زندہ کو نوچ کر لاش بنا دیتا ہے۔

منور سوچتا ہوا جا رہا تھا کہ اچانک ایک درخت کے پیچھے سے عنایت نے نکل کر اسے آواز دی۔ آواز سن کے

منور پلٹا اور باپ کی طرف دیکھنے لگا۔
''ابا تو یہاں کیا کر رہا ہے؟''
عنایت نے اس کا سوال نظر انداز کر کے پوچھا۔ ''تو حویلی میں کیا کرنے گیا تھا؟''
عنایت کا سوال سن کر منور ہچکچایا۔ ''ایسے ہی ملک شہباز نے بلایا تھا۔''
''کیوں بلایا تھا اُس نے؟'' عنایت اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔
''بس ایسے ہی وہ کہہ رہا تھا کہ اس بار شکار پر میں بھی اس کے ساتھ چلوں۔'' منور نے بات پلٹنے کی کوشش کی۔
عنایت نے اس کو گردن سے دبوچ لیا اور دانت پیس کر بولا۔ ''میں تیرا باپ ہوں...... بتا کیا کہہ رہا تھا وہ۔''
منور تو پہلے ہی اس کا کام کرنے کے لیے راضی نہیں تھا۔ اس نے سب کچھ سچ بتا دیا اور پھر بولا۔ ''ابا...... ملک شہباز کی بات سن کر مجھے غصہ آ گیا تھا۔''
''تجھے کیوں غصہ آ گیا تھا؟''
''وہ اس لیے کہ سیما سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' منور نے اپنے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہہ دیا۔
اس کی بات سن کر عنایت نے اسے گھورا اور بولا۔ ''تیری شکل ہے اُس سے شادی کرنے کی...... خبردار جو اس کے بارے میں سوچا...... اور کوئی ضرورت نہیں ہے سیما کی کوئی خبر اسے دینے کی...... اور کیا کہا تھا اس نے؟''
''میں نے اس سے پوچھا کہ اگر سیما کا کوئی اور عاشق ہوا تو پھر؟'' منور بولا۔
''پھر اس نے کیا جواب دیا؟'' عنایت نے جلدی سے پوچھا۔
''اس نے آنکھیں نکال کر میری طرف دیکھا اور بولا...... میرا کوئی سگا بھی اس کا عاشق نکلا میں ان سب کو آگ لگا دوں گا۔''
عنایت اس کی بات سن کر ڈر سا گیا اور اس نے بمشکل اپنا خشک ہوتا حلق تر کیا اور بولا۔ ''ہفتہ دس دن اپنے تایا کے گاؤں چلا جا...... شکل گم کر لے اپنی......''
''ابا مجھے کیوں بھیج رہا ہے؟'' منور نے کہا۔
''جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا کر...... سمجھا۔'' عنایت نے درشت لہجہ اپنایا۔

خدمت

ایک متمول شخص صحت یاب ہونے کے بعد اسپتال سے رخصت ہونے لگا تو وہاں کے خدمت گار سلام کرنے اور انعام پانے کے لیے اکٹھے ہو گئے۔ اس نے ہر ایک کو انعام دیا مگر چار ایسے آدمی تھے جو باقی رہ گئے۔ جنہیں اس نے دیکھا تک نہیں۔ اس نے کہا۔ ''آپ چاروں نے میری کوئی خدمت نہیں کی تو پھر انعام کیسا؟''
انہوں نے کہا۔ ''حضور نے موقع ہی نہیں دیا ہم ہر وقت حاضر تھے۔''
پوچھا۔ ''وہ کیونکر؟''
''حضور ہمارے ذمّے مرنے والوں کی لاشوں کو ٹھکانے لگانا ہے۔'' انہوں نے منہ بسورتے ہوئے جواب دیا۔

کوٹ غلام محمد سے ریاض احمد بشیر کا تعاون

منور منہ بنا کر جانے لگا تو عنایت نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر رقم نکالی اور اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ رقم ملک شہباز نے دی ہے؟''
''ہاں......''
''تیرا ہفتہ آسانی سے نکل جائے گا...... سیدھا لاری اڈے چلا جا اور اسے نظر مت آ......''
منور مجبوراً گھر جانے کے بجائے بڑی سڑک کی طرف چل پڑا۔ ایک بات تو اسے سمجھ میں آ گئی تھی کہ فی الحال اس گاؤں سے غائب ہونے میں ہی عافیت ہے لیکن چلتے چلتے اس کا ارادہ بدل گیا اور وہ اپنے آوارہ دوستوں کے ڈیرے کی طرف ہو لیا۔
عنایت مطمئن تھا کہ منور اب گاؤں سے جا رہا ہے۔ عنایت سیدھا حویلی میں پہنچا اور ملک حیات کو ساری بات بتا دی جسے سن کر ملک حیات کے دل پر چنگاریاں اُٹھنے لگیں۔
''اس سے پہلے کہ ملک شہباز اسے اُٹھا کر مجھ سے دور کر دے، تو اسے کل ہی اُٹھا کر پرانی حویلی میں پہنچا دینا۔ اگر یہ کام تجھ سے نہ ہوا تو کھوپڑی میں گولی مار دوں گا۔'' ملک حیات کا غصہ دیکھ کر عنایت بھی سہم گیا۔

☆☆☆

دوسرے دن سیما اسکول کے لیے نکلی تو اس کی دوست بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔ پہلے اس کی دوست الگ جاتی تھی کیونکہ وہ دوسری گلی میں رہتی تھی۔ سیما نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ بھی اس کے ساتھ ہی چلے۔

عنایت مستقل اس کے پیچھے ہی تھا۔ اس نے سیما کو چھٹی کے وقت اغوا کرنے کا پروگرام بنایا تھا کیونکہ اس وقت گاؤں میں خاموشی ہوتی ہے، لوگ اپنے کام کاج پر گئے ہوتے ہیں اور خواتین اپنے گھروں میں مصروف ہوتی ہیں جبکہ صبح ہر طرف چہل پہل ہوتی ہے۔ ملک حیات کی تاکید تھی کہ سیما کو اس وقت اغوا کرنا جب اس کے آس پاس کوئی نہ ہو، ملک حیات نہیں چاہتا تھا کہ سیما کے اغوا کا کوئی گواہ ہو۔

واپس حویلی میں آکر عنایت نے ملک حیات کو آگاہ کیا کہ آج چھٹی کے وقت وہ سیما کو اغوا کرکے پرانی حویلی میں پہنچا دے گا، اگر اس کی دوست بھی ساتھ ہوئی تو وہ اسے بھی اُٹھالیں گے تاکہ کوئی ثبوت نہ رہے۔

ملک حیات نے اثبات میں گردن ہلائی اور اسے حکم دیا کہ اگر فرزند کی صحت ٹھیک ہے تو وہ آئے، ورنہ صفدر آکر اس کی گاڑی چلائے اسے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ فرزند ابھی پوری طرح سے صحت یاب نہیں ہوا تھا اس لیے صفدر ہی کو آنا پڑا تھا۔

☆☆☆

سیما ابھی سکول میں بچیوں کو پڑھا ہی رہی تھی کہ اس کے موبائل فون پر اس کے باپ کی کال آگئی۔ دوسری طرف اس کی ماں بول رہی تھی۔

”سیما تم اسی وقت اسکول سے چھٹی لے کر گھر آجاؤ۔“

”کیوں امی خیریت ہے؟“ سیما نے پوچھا۔

”تمہارے ماموں اور مامی آئے ہیں۔“ اس کی امی نے خوش ہو کر بتایا۔

”کوئی بات نہیں امی میں ان سے چھٹی کے بعد مل لوں گی۔“ سیما نے کہا۔

”انہیں واپس بھی جانا ہے۔ تم ایسا کرو کہ ابھی آجاؤ۔“ اس کی امی بولیں۔

”ابھی آئے اور ابھی واپس بھی چلے جانا ہے؟ شام تک تو رکیں گے نا۔“ سیما نے کہا۔

”تم آجاؤ ساری تفصیل گھر آؤ گی تو بتاؤں گی۔“ اس کی ماں نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔

”امی بات کیا ہے؟ کھل کر بتائیں۔“

”وہ تمہارے ہاتھ میں شگن رکھنا چاہتے ہیں۔ تمہیں اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں۔ نعیم کے لیے مانگا ہے تمہیں۔“ اس کی امی نے بتایا تو سیما سوچ میں پڑ گئی۔

”وہ اچانک آگئے......؟“ سیما کے منہ سے نکلا۔

”مجھ سے تمہارے ماموں نے ہفتہ پہلے بات کی تھی۔ آج وہ آگئے ہیں۔“ امی نے بتایا۔

”امی میرا آنا مشکل ہے۔ اس وقت ٹیسٹ ہو رہے ہیں اور میری ڈیوٹی لگی ہوئی ہے۔“ سیما نے بہانہ کیا۔

”اچھا میں تمہارے ابا کو بھیجتی ہوں، وہ خود تمہیں لے آئیں گے۔“ امی نے کہہ کر فون بند کر دیا اور سیما سوچنے لگی کہ اب وہ کیا کرے۔ اس نے تو صفدر کے خواب دیکھے تھے۔ اسی کے بارے میں سوچا تھا۔ سیما یکدم ہی مضطرب ہوگئی۔

اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آرہی تھی پھر اس نے گھر فون کرکے بتادیا کہ وہ خود ہی آرہی ہے اس لیے ابا نہ آئیں۔

سیما نے پہلے تو مراد کا نمبر اپنے فون میں تلاش کرنے کی کوشش کی کیونکہ صفدر نے اس کے فون سے اسے کال کی تھی لیکن اس کا نمبر نہیں تھا۔ سیما نے سوچا کہ صفدر شاید اس وقت حویلی میں اپنے باپ کی جگہ ڈیوٹی دے رہا ہو چنانچہ اس نے گھر جانے سے قبل مراد کی طرف جانے کا فیصلہ کرلیا کہ وہ کسی طرح سے صفدر کو بلا لائے اور پھر کوئی فیصلہ کیا جائے کہ کیا کرنا ہے۔

چھٹی لے کر سیما اسکول سے نکلی اور مراد کے گھر کی طرف چل پڑی۔ سامنے اینٹوں کی بنی سڑک تھی اور سیما اس پر تیز تیز قدم اُٹھاتی جارہی تھی۔ اسی سڑک پر ملک حیات کی گاڑی آرہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر صفدر، اس کے ساتھ ملک حیات اور پیچھے عنایت کے ساتھ، محافظ بیٹھا تھا۔

”مجھے آج ایسا لگ رہا ہے جیسے دشمن میری تاک میں ہے۔“ اچانک ملک حیات نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آج شہباز نے مجھے کہا تھا کہ خبر ہے وہ ہم پر حملہ کر سکتے ہیں۔“

”آپ کا وہم ہے چوہدری صاحب، دشمن کی کیا جرأت کہ وہ آپ کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ سکے۔“ عنایت نے جلدی سے کہا۔

”میرا دل کہہ رہا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔“ ملک

حیات نے فصلوں کی طرف دیکھا اور اپنا پستول واسکٹ کی اندرونی جیب سے نکال کر اس کو دیکھا اور پھر اسی جیب میں رکھ لیا۔ ''شہباز کہہ رہا تھا کہ دونوں باڈی گارڈ ساتھ لے جائیں' میں نے اس کی بات نہیں مانی اور ایک کو ہی ساتھ لے کر چل پڑا۔''

اچانک ان چاروں کی نگاہ سامنے برقع پوش پر پڑی۔ عنایت کیونکہ اسے اس برقع میں کئی بار دیکھ چکا تھا اس لیے اس نے فوراً پہچان لیا کہ یہ سیما ہے۔

''چوہدری صاحب یہ تو سیما ہے۔'' عنایت نے اتنا کہا تھا کہ صفدر بھی چونک پڑا اور ملک حیات کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو گئیں۔

''گاڑی روکو......'' ملک حیات نے فوراً کہا۔ صفدر نے گاڑی روک دی پھر ملک حیات نے کہا۔ ''میرے ساتھ آؤ صفدر......''

ملک حیات یہ کہہ کر گاڑی سے باہر نکلا۔ صفدر سوچنے لگا کہ وہ اس موقع پر کیا کرے۔ جونہی صفدر گاڑی سے باہر نکلا، عنایت نے جلدی سے گاڑی کا اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ ملک حیات جلدی سے صفدر کی طرف بڑھا اور اس کا بازو پکڑ کر اسے ایک طرف لے جاتا ہوا بولا۔ ''تم سے مجھے ایک کام ہے......'' ملک حیات نے عنایت کو اشارہ کر دیا تھا۔

صفدر کو لگا جیسے اس کے دماغ کی سوچیں سلب ہو گئی ہیں۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ختم ہو گئی ہیں اور وہ کچھ بھی نہیں سوچ سکتا۔ ایک بار اس کا دل چاہا کہ وہ چیخ کر سیما سے کہے کہ وہ بھاگ جائے۔ ملک حیات نے اس کا بازو پکڑا ہوا تھا اور وہ اسے فصلوں میں لے گیا۔ اچانک اس نے سیما کے چیخنے کی آواز سنی۔

اسی لمحے صفدر نے پوری قوت سے ملک حیات کو ایک طرف دھکا دیا اور ملک حیات اونچی فصل میں کہیں گم ہو گیا۔ صفدر تیزی سے ان کی طرف بھاگا۔ ملک حیات کے محافظ نے سیما کو اُٹھایا ہوا تھا اور عنایت ڈرائیونگ سیٹ پر مستعد بیٹھا تھا۔ صفدر بھاگتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھا۔ اسی اثنا میں محافظ نے سیما کو گاڑی کے اندر پچھلی سیٹ پر پھینکا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ عنایت نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ سیما کو محافظ نے ایک ہاتھ سے دبوچ رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس رہا تھا۔ سیما گھٹی گھٹی آواز میں مزاحمت کر رہی تھی۔

صفدر گاڑی کے پیچھے بھاگنے لگا۔ عنایت نے بیک مرر سے صفدر کو بھاگتے ہوئے دیکھا تو اس نے ایک لمحے کے لیے ملک حیات کے بارے میں سوچا لیکن اس کا حکم تھا کہ سیما کو ہر حال میں پرانی حویلی پہنچانا ہے اس لیے اس نے گاڑی اور بھی تیز کر دی اور صفدر بھاگتا ہوا رک گیا۔

گاڑی نکل گئی تھی۔ صفدر واپس ملک حیات کی طرف بھاگا۔ ملک حیات ہاتھ میں اپنا پستول پکڑے فصلوں سے باہر نکل آیا تھا۔ جونہی اس نے صفدر کو اپنی طرف بھاگتا ہوا آتا دیکھا تو اس نے پستول کا رُخ اس کی طرف کر لیا اور اس سے پہلے کہ وہ گولی چلاتا، صفدر نے جست لگائی اور سیدھا ملک حیات کے اوپر جا پڑا اور اسے لیتا ہوا پھر فصل میں گم ہو گیا۔ اچانک گولی چلی اور ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد صفدر اپنی جگہ سے اُٹھا تو اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور ملک حیات زمین پر پڑا تھا۔ اس کے سینے سے خون نکل رہا تھا۔ صفدر نے خوفزدہ آنکھوں سے ملک حیات کے بے جان جسم کو دیکھا اور پھر اس کی نگاہ اپنے ہاتھ میں پکڑے پستول پر چلی گئی۔

ایک دم سے صفدر نے دائیں بائیں اور دور تک دیکھا۔ کہیں کوئی دکھائی نہیں دیا تھا۔ اچانک اسے فصل میں سرسراہٹ بھی سنائی دی۔ صفدر کے لیے اب بہت ضروری تھا کہ وہ اس جگہ سے بھاگ کر کہیں چلا جائے ورنہ ملک شہباز اس کا قیمہ کر دے گا۔ صفدر اس قتل کے بعد ایسا حواس باختہ ہوا تھا کہ اسے اپنی جان بچانے کی فکر ہو گئی تھی اور خوف ایسا مسلط ہوا تھا کہ وہ کچھ اور سوچ ہی نہیں سکا تھا۔ وہ اس جگہ سے بھاگا۔ بہت آگے جا کر اس نے ملک حیات کا پستول فصلوں میں پھینکا اور آہستہ قدموں سے چلنے لگا تا کہ اگر کوئی دیکھے تو اس پر کوئی شک نہ کرے۔

صفدر چلتا ہوا درختوں کے جھنڈ میں گم ہو گیا۔ سیما کو اغوا کر کے وہ پرانی حویلی میں لے گئے تھے، کم از کم صفدر کو اب یہ اطمینان ضرور تھا کہ ملک حیات جیسا بھیڑیا اسے ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔ موقع ملتے ہی وہ سیما کو وہاں سے آزاد کرا لے گا۔ صفدر اس ویران جگہ ایک چوڑے درخت کے پیچھے بیٹھ گیا۔

☆☆☆

عنایت اور ملک حیات کے محافظ نے سیما کو پرانی حویلی کے آدمیوں کے حوالے کیا اور طوفان کی طرح وہ اسی جگہ پہنچ گئے جہاں انہوں نے ملک حیات اور صفدر کو چھوڑا تھا۔ دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ اس وقت نجانے

صفدر کی لاش سڑک پر پڑی ہوگی اور چوہدری ملک حیات اس انتظار میں ہوگا کہ ہم آ کر اس کی لاش کو ٹھکانے لگا سکیں۔

دونوں گاڑی سے باہر نکلے اور متلاشی نگاہوں سے ملک حیات اور صفدر کو تلاش کرنے لگے۔ دونوں اس طرف چلے گئے جس طرف ملک حیات ہاتھ پکڑ کر صفدر کو لے کر گیا تھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد انہیں ملک حیات کی خون میں لت پت لاش مل گئی۔ دونوں کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔

دونوں نے ایک ساتھ دائیں بائیں اور سامنے دیکھا کہ کہیں صفدر نظر آ جائے۔

''یہ تو بہت برا ہو گیا...... صفدر ایسا کر دے گا، میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا۔'' عنایت نے پریشان ہو کر اپنا سر پکڑ لیا۔

''ملک شہباز ہماری جان کھینچ لے گا۔ اس نے جانے سے پہلے مجھے تاکید کی تھی کہ اگر اس کے باپ کو کچھ ہوا تو وہ مجھ سے کوئی سوال نہیں کرے گا بلکہ میرے سینے میں گولی مار دے گا۔'' ملک حیات کے محافظ کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

عنایت نے ایک لمحے میں سوچا کہ اگر ملک شہباز کو پتا چل گیا کہ انہوں نے ملک حیات کے کہنے پر سیما کو اغوا کیا ہے تو ہوسکتا ہے کہ وہ بغیر کسی حجت کے انہیں گولیوں سے بھون دے۔ کیونکہ ملک شہباز بھی سیما کا دیوانہ تھا۔ منور نے بتایا تھا کہ ملک شہباز اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ سب کچھ سننے کے بعد انہیں کچھ نہ کہے اور باپ کو دفنانے کے بعد وہ سیما کی طرف متوجہ ہو جائے۔ یہ بات بھی واضح تھی کہ ان کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا بہت مشکل تھا کیونکہ وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔

''اگر جان بچانی ہے تو ایک ہی حل ہے۔ ملک شہباز سے کہہ دیتے ہیں کہ دشمنوں نے حملہ کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنی بندوقوں کے زور پر ہمیں قابو کیا اور چوہدری صاحب کو گاڑی سے باہر نکال کر اس جگہ گولی مار دی۔'' عنایت کی سمجھ میں جو آیا اس نے کہہ دیا۔

''اگر ہم سچ بول دیتے ہیں تو پھر کیا حرج ہے؟'' ملک حیات کے محافظ نے پوچھا۔

''یہ بات تم نہیں جانتے کہ ملک شہباز بھی سیما پر نظر رکھتا ہے۔ وہ اس کا اتنا دیوانہ ہے کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اگر ہم نے حقیقت بتا دی تو ہوسکتا ہے کہ وہ ہمارا کام ہی تمام کر دے۔ اگر ملک حیات کے بعد ملک شہباز، سیما سے شادی کرتا ہے تو وہ ہمیں ضرور مروائے گا کیونکہ ہمارے مرنے سے یہ بات دفن ہوگی کہ سیما کا دیوانہ اس کا باپ بھی تھا۔ ہمارے زندہ رہنے سے اسے ڈر ہوگا کہ کہیں ہم گاؤں میں لوگوں سے یہ بات کر نہ دیں۔ اس حویلی میں ہمارا وجود صرف ملک حیات کی زندگی تک تھا، اب ہمارے لیے وہاں کچھ نہیں ہے۔ ہمارا مر جانا ہی ملک شہباز کے لیے اچھا ہے اس لیے وہ ہمیں مار دے گا۔'' عنایت نے اسے سمجھایا۔

اس وقت عنایت کو منور کی بتائی ہوئی بات بھی یاد آ گئی تھی کہ ملک شہباز نے کہا تھا کہ اگر اس کا کوئی سگا اور اس کا ساتھ دینے والے بھی اس کے علم میں آ گئے کہ وہ سیما پر نظر رکھتے تھے تو انہیں آگ لگا دے گا۔ عنایت ایک طویل عرصے سے اس حویلی کے لوگوں کے ساتھ تھا اس لیے وہ جانتا تھا وہ جو کہہ دیتے ہیں اسے پورا کر کے بھی دکھا دیتے ہیں۔ ملک شہباز نے ایک معمولی بات پر اپنے سگے چچا پر گولیاں چلا دی تھیں۔

محافظ نے کچھ دیر سوچا اور پھر کہا۔ ''پھر تم ایسا کرو کہ میری ٹانگ میں گولی مار دو۔ ہم صحیح سلامت جائیں گے تو چوہدری شہباز ہمیں شک کی نظر سے دیکھے گا۔'' محافظ نے اپنا ذاتی ریوالور نکال کر عنایت کی طرف بڑھایا۔

عنایت نے ریوالور پکڑ کر محافظ کی ٹانگ میں گولی ماردی۔ لیکن اس طرح کہ اس کی ہڈی بچ جائے۔ محافظ، ملک حیات کے پاس ہی گر گیا اور اس نے اپنی گن سے ایک ساتھ تین چار سامنے فائر کر دیے۔ عنایت نے بھی اپنا سر درخت سے ٹکرایا اور اسی جگہ گر گیا۔ اس کے سر سے خون بہنے لگا تھا۔ دونوں زخمی ہو گئے تھے اور انہوں نے زمین پر گر کر اپنے کپڑوں کو بھی خراب کر دیا تھا۔ عنایت نے جا کر گاڑی کے دروازے بھی کھول دیے تھے اور اسے سڑک کے درمیان آڑھی کھڑی کر کے ملک حیات کی لاش کے پاس چلا گیا تھا۔

پھر عنایت نے اپنے موبائل فون سے ملک شہباز کا نمبر ملایا۔

☆☆☆

ملک شہباز کا چہرہ غصے سے سرخ تھا اور اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور سے مسلسل گولیاں نکل رہی تھیں۔ وہ ہوائی فائر کر رہا تھا۔ جب آخری گولی ریوالور

سے نکل گئی تو اس نے گھور کر ملک حیات کے محافظ اور عنایت کی طرف دیکھا جو زخمی حالت میں اس کے سامنے پڑے ہوئے تھے۔

محافظ کی ٹانگ سے مسلسل خون بہنے کی وجہ سے اسے کمزوری محسوس ہونے لگی تھی اور ایک آدمی نے اس کی ٹانگ پر کپڑا باندھ دیا تھا۔ محافظ کو خوف تھا کہ اگر ملک شہباز نے اسے ڈاکٹر کے پاس جانے کی اجازت نہ دی تو کہیں مزید خون بہنے سے اس کی جان ہی نہ چلی جائے۔

''تم دونوں کی حالت دیکھ کر میں نے یہ گولیاں ہوا میں چلادی ہیں۔ کتنے آدمی تھے وہ؟'' ملک شہباز نے چیخ کر عنایت سے پوچھا۔

''وہ چار آدمی تھے۔'' عنایت نے بغیر محافظ کی طرف دیکھے جواب دیا۔ ملک شہباز کی بات سن کر دونوں کو اطمینان ہوا کہ انہوں نے ٹھیک فیصلہ کیا تھا ورنہ وہ انہیں مار دیتا۔

''میں روز اباجی سے کہتا تھا کہ سارے محافظ ساتھ لے کر جایا کریں لیکن وہ سنتے ہی نہیں تھے۔ اس ایک کو ساتھ لے گئے جیسے بڑا سورما ہو یہ۔'' ملک شہباز چیخا۔

''میں نے پوری کوشش کی تھی لیکن انہوں نے پہلے مجھے قابو کرلیا تھا۔'' محافظ نے اپنی نحیف آواز میں بتایا۔

''ہم ان لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔'' ملک شہباز کے چھوٹے بھائی ملک الیاس نے للکار کر کہا۔

''حوصلہ کرو۔ پہلے اباجی کو دفنا دیں پھر ان کو بھی دیکھ لیں گے۔'' ملک شہباز بولا۔

اسی وقت علاقے کا تھانیدار بھی آگیا۔ اس نے ضروری کارروائی کرلی تھی۔ ملک حیات کے ٹکڑوں پر پلنے والے تھانیدار کو جو کہا گیا تھا، اس نے ویسا ہی کیا تھا۔

''مجھے ملک صاحب کا بہت دکھ ہے۔ ابھی تھانے جانا ہے۔ میں تھوڑی دیر کے بعد حاضر ہوتا ہوں۔'' تھانیدار نے آہستہ آواز میں کہا۔

''تم کو وہاں جا کر کیا کرنا ہے؟ یہاں کی رپورٹ لکھ لی ہے؟'' ملک شہباز نے اس کی طرف دیکھا۔

''میں نے رپورٹ تیار کرلی ہے۔ تھانے میں بھی گاؤں کے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔''

''وہ کون لوگ ہیں۔'' ملک شہباز کو حیرت ہوئی۔

''اسی گاؤں کا کوئی ماسٹر ہے۔ آج دن کے وقت اس کی بیٹی غائب ہوگئی ہے۔'' تھانیدار نے بتایا تو ملک شہباز چونکا۔

''کیا نام ہے اس ماسٹر کا؟'' شہباز نے پوچھا۔

''پتا نہیں کیا بھلا سا نام بتایا تھا۔ میرے منشی کا فون آیا تھا۔'' تھانیدار سوچنے لگا۔

ملک شہباز سے اجازت لے کر تھانیدار چلا گیا لیکن ملک شہباز سوچتا رہا کہ کہیں اسی ماسٹر کی بیٹی تو غائب نہیں ہوگئی جس کا نام سیما ہے۔ ملک شہباز نے اپنا آدمی، منور کو بلانے کے لیے بھیج دیا۔ اس نے تھوڑی دیر کے بعد آکر اطلاع دی کہ منور گھر پر نہیں ہے اور اس آدمی نے یہ خبر بھی دے دی۔

''ملک صاحب...... منور کی گلی میں ماسٹر کرم دین رہتا ہے اس کی بیٹی آج غائب ہوگئی ہے۔''

''تم نے پتا کیا تھا؟''

''میں اس گلی میں گیا تو میرا ایک واقف مل گیا اس نے مجھے بتایا کہ وہ سکول سے گھر آرہی تھی اور گھر پہنچی ہی نہیں اب تو سارا اسکول بھی خالی ہوگیا ہے اور اس کا کوئی اتا پتا ہی نہیں ہے۔'' اس آدمی نے مزید بتایا۔

ملک شہباز اپنے باپ کی لاش کو بھول گیا اور اُسے سیما یاد آنے لگی۔ اس نے اسی وقت تھانیدار کو فون کیا اور ہدایت دی۔

''وہ لڑکی ماسٹر کرم دین کی ہے جو غائب ہوئی ہے...... جیسے بھی ہو تلاش کروائیے زمین آسمان ایک کردو لیکن اسے تلاش کر کے سیدھا میرے پاس لے کر آؤ۔''

ملک شہباز کی ہدایت ہوا اور پھر تھانیدار کو یہ لالچ...... ہو کہ اس کی تلاش پر ملک شہباز اسے خوش ضرور کرے گا۔ کیونکہ ملک حیات، یا ملک شہباز جب کسی پر اپنا ہاتھ رکھ کر زور دیتے تھے تو پھر اس کام کی کامیابی پر اسے انعام بھی ضرور دیتے تھے۔ تھانیدار اب یہ بات تو جان ہی گیا تھا کہ دونوں باپ بیٹا اپنے مفاد کے بغیر کام کے لیے اسے اتنا زور نہیں دیتے۔

☆☆☆

شام تک پورے گاؤں میں یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ اس گاؤں سے ماسٹر کرم دین کی بیٹی سیما اور فرزند کا بیٹا صفدر غائب ہوگئے ہیں۔ اب ہر کوئی اپنی عقل کے مطابق باتیں کررہا تھا۔ بہت سی خواتین کا خیال تھا کہ دونوں ایک ساتھ بھاگ گئے ہیں۔ یہ بات مردوں میں بھی پھیل گئی تھی۔ خود سیما اور صفدر کے گھر والوں کو بھی شک ہوگیا تھا کہ دونوں بھاگ گئے ہیں۔ کچھ نے تو یہ بھی کہہ دیا تھا کہ جب ملک حیات پر حملہ ہوا تو اس

چیز کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے صفدر وہاں سے بھاگا ہوگا اور سیما کے ساتھ اس کا سارا پروگرام پہلے ہی بن چکا ہوگا۔

سیما کے والدین آپس میں یہ بات کر رہے تھے کہ جب سیما کے ماموں اور مامی اس کا رشتہ مانگنے اور اس کے ہاتھ پر شگن رکھنے کے لیے آئے تو سیما اسکول سے تو چھٹی لے کر گھر کے لیے نکل چکی تھی لیکن گھر نہیں پہنچی تھی...... انہیں یقین ہوگیا تھا کہ سیما اور صفدر کے بیچ میں ایسا کچھ تھا کہ دونوں نے اس موقع پر بھاگنے کا فیصلہ کیا جبکہ سیما کے انتظار میں اس کا ماموں اور مامی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ سیما نے جب دیکھا کہ اس کا رشتہ ہو رہا ہے تو وہ صفدر کے ساتھ بھاگ گئی۔ انہیں اس شک کی تقویت اس بات سے بھی مل رہی تھی کہ سیما اکثر صفدر سے نوٹس لینے جاتی تھی اور اس دوران ان کے بیچ کچھ ہوا ہوگا جس کی انہیں بھنک نہیں لگ سکی تھی۔

فرزند اور اس کی بیوی کو اس بات پر یقین نہیں تھا کہ ان کا بیٹا ایسا ہے لیکن دونوں کی اچانک گمشدگی سب کو ابہام میں مبتلا کر رہی تھی۔

یہ بات جب ملک شہباز کے کانوں میں پڑی تو وہ اپنے باپ کی تعزیت کے لیے آئے ہوئے لوگوں کو چھوڑ کر سیدھا ماسٹر کرم دین کے گھر پہنچ گیا۔

ملک شہباز نے ہمدردی سے ماسٹر کرم دین اور اس کی بیوی سے کہا۔ ''مجھے جیسے ہی پتا چلا کہ میرے باپ کے ڈرائیور کا پُتر آپ کو بیٹی کو ورغلا کر کہیں لے گیا ہے تو میرے لیے بیٹھنا مشکل ہوگیا۔ یقیناً میرے باپ کی روح بھی بے چین ہوگی کہ اس بے غیرت نے آپ کی نہیں، ہماری عزت مٹی میں ملائی ہے۔''

''ہم تو آنکھیں اُٹھانے کے قابل نہیں رہے۔'' ماسٹر کرم دین نے جھکی ہوئی نگاہوں کے ساتھ بات کی۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ میں نے تھانیدار کو کہہ دیا ہے۔ وہ اسے ڈھونڈ لے گا۔ آپ کی بیٹی تو معصوم ہے وہ اس کے چکر میں آگئی ہوگی۔'' ملک شہباز نے کہا۔

''ہم اس گاؤں میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ اس کا سگا ماموں اس کے رشتے کے لیے آیا تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ سیما چلی گئی ہے تو وہ بھی بہانے سے چلے گئے۔'' سیما کی ماں رونے لگی۔

''آپ فکر نہ کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' ملک شہباز بولا۔ ''میں آپ کی عزت کو مٹی میں ملنے نہیں دوں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔ مجھے یہ بتائیں کہ صفدر کا سب سے قریبی دوست کون تھا؟''

''مراد اس کا سب سے گہرا دوست ہے۔'' سیما کے چھوٹے بھائی نے جھٹ سے جواب دیا۔

''یہ مراد کون ہے؟'' ملک شہباز نے ان کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''نتھو کمہار کا پُتر......'' ماسٹر کرم دین نے بتایا۔

ملک شہباز نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور اپنی مونچھوں کو تاؤ دینے کے بعد اپنے آدمی سے کہا کہ تھانیدار کو فون ملاؤ۔

تھانیدار کو ملک شہباز نے ہدایت دی اور اگلے بیس منٹ میں مراد کو پولیس اُٹھا کر تھانے لے گئی۔

☆☆☆

عنایت سب کچھ دیکھنے اور سننے کے ساتھ ساتھ حالات کا بھی جائزہ لے رہا تھا۔ جیسے ہی اسے موقع ملا، وہ اسپتال میں ملک حیات کے زخمی محافظ کے پاس چلا گیا۔ محافظ کی ٹانگ سے گولی نکال دی تھی۔ عنایت نے اس کی خیریت دریافت کرنے کے بعد دھیمے لہجے میں کہا۔

''میرا فیصلہ بالکل ٹھیک تھا۔ اگر ہم سچ بتا دیتے تو وہ ہمیں بھی الٹا لٹکا دیتا۔ جانتے ہو جب یہ بات ملک شہباز تک پہنچی تو اس نے سب سے پہلا کام کیا کیا؟''

''کیا کیا......؟'' ملک حیات کے محافظ نے پوچھا۔

''وہ باپ کی لاش کو بھول کر سیما کے گھر ہمدردی کے لیے چلا گیا، اس نے صفدر کے دوست مراد کو پکڑ کر اُلٹا لٹکا دیا ہے۔ اسے وہ مارا کہ اس نے اقرار کر لیا ہے کہ صفدر اور سیما کے درمیان پیار تھا۔ ایک بار صفدر نے اس کے موبائل فون سے سیما کو فون بھی کیا تھا۔'' عنایت بولا۔

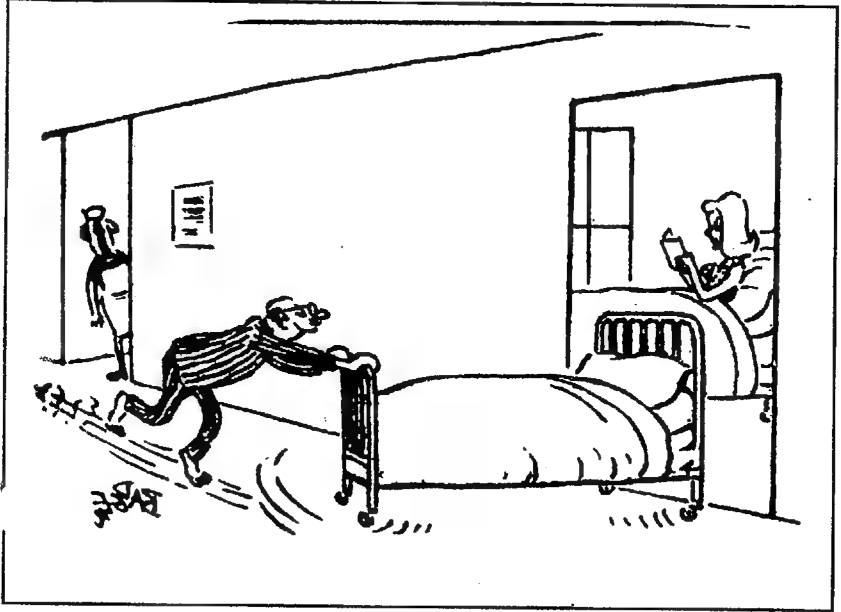
یہ سن کر محافظ کے جسم میں چیونٹیاں رینگنے لگی تھیں۔ عنایت نے دائیں بائیں دیکھ کر اپنا لہجہ بدستور دھیما رکھا۔

''میں نے سوچا ہے کہ آج رات سیما کو پرانی حویلی سے آزاد کر دوں۔''

''وہ کیوں......؟''

''تاکہ وہ گھر چلی جائے۔ ملک شہباز اگر پرانی حویلی میں چلا گیا اور اسے وہاں سیما مل گئی پھر ٹھیک نہیں ہو گا۔ وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔'' عنایت نے سرگوشی کی۔

''تم بے وقوف ہو...... اس حویلی میں سوائے ملک حیات کے کوئی نہیں جاتا تھا۔ وہاں جو دو آدمی ہیں، وہ ملک حیات کے رازدار ہیں۔ اگر تم سیما کو چھوڑو گے تو وہ



گھر جا کر بتا دے گی کہ اسے اغوا ہم نے کیا تھا۔'' محافظ نے اسے گھورتے ہوئے آگاہ کیا۔

محافظ کی بات سن کر عنایت کے جسم سے جیسے خون خشک ہو گیا۔ اس نے یہ بات تو سوچی ہی نہیں تھی۔

''یہ بات تو میں نے سوچی ہی نہیں تھی۔''

''شکر ہے تم نے مجھ سے بات کر لی، کہیں خود ہی فیصلہ کر کے سیما کو آزاد نہیں کر دیا۔'' محافظ بولا۔

''اب اس قصے کو کیسے ختم کریں؟'' عنایت کی پریشانی دوچند ہو گئی تھی۔

''بس ایک ہی حل ہے۔'' محافظ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پھنکارتی ہوئی آواز میں کہا۔

''وہ کیا۔'' عنایت فوراً اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''ایک دو دن صبر کر لو۔ چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں گا تو اسے رات کی تاریکی میں مار کر کہیں باہر پھینک دیں گے۔ تب ہی یہ راز، راز رہ سکے گا۔ ورنہ اگر بات کھل گئی تو ہم دونوں مارے جائیں گے۔'' محافظ نے کہا تو عنایت کی سمجھ میں بات آ گئی۔

''یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ جس طرح ملک شہباز پاگل بھیڑیے کی طرح بھاگا پھر رہا ہے کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔'' عنایت نے کہا۔

''بس ایک، دو دن کی بات ہے۔ اس کی لاش جب باہر کہیں ملے گی تو اس کا سارا الزام صفدر پر آئے گا ہم صاف بچ جائیں گے۔'' محافظ بولا۔ عنایت نے معنی خیز انداز میں اپنی گردن اثبات میں ہلا دی۔

☆☆☆

ملک شہباز اپنی حویلی کے برآمدے میں اپنی پشت پر ہاتھ باندھے ٹہل رہا تھا۔ رات ہو چکی تھی اور ملک حیات کی تدفین کر دی گئی تھی۔ ملک شہباز کے دماغ پر اب ایک ہی بات سوار تھی کہ کسی طرح سے صفدر اور سیما مل جائیں۔ اسے صفدر سے نفرت ہو رہی تھی کہ ایک کمی کمین کا بیٹا ہو کر وہ سیما کو لے کر بھاگ گیا۔ اس سیما کو جسے اس نے دیکھا اور وہ اسے اچھی لگنے لگی تھی۔ وہ سیما کے حسن کا دیوانہ ہو گیا تھا۔ اگر صفدر، ملک شہباز کے سامنے ہوتا تو وہ اس کے سر میں خود گولیاں مار کر اسے ہمیشہ کی نیند سلا دیتا۔

ملک شہباز کا آدمی، عنایت کو لینے گیا تھا۔ جب عنایت آ گیا تو وہ سہما ہوا تھا بالکل ایسے جیسے مرغی کا بچہ، بلی کے دانتوں میں ہو۔

''تیرا پتر منور کہاں ہے؟'' ملک شہباز نے اس کی

طرف دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں پوچھا۔
''آوارہ ہے...... اس کا کوئی پتا چلتا ہے کہ کہاں دفع ہوجاتا ہے۔'' عنایت نے جلدی سے جواب دیا۔
ملک شہباز اس کے قریب ہوکر بولا۔ ''تجھے پتا تھا کہ صفدر اور ماسٹر کی بیٹی میں کوئی چکر چل رہا ہے؟''
''میں تو ہر وقت چوہدری صاحب کے ساتھ ہوتا تھا۔ مجھے ان باتوں کا کیا پتا؟'' عنایت نے جواب دیا۔
''صفدر کا شہر میں کوئی رشتے دار ہے؟'' ملک شہباز نے پوچھا۔
عنایت سوچنے لگا اور پھر بولا۔ ''میرا نہیں خیال کہ ان کا کوئی رشتے دار شہر میں ہے۔ آس پاس کے گاؤں میں اس کے رشتے دار بیٹھے ہوئے ہیں، کچھ رشتے دار اس گاؤں میں بھی ہیں۔''
ملک شہباز نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور پھر اس کے قریب ہوکر پُراسرار لہجے میں بولا۔ ''عنایت ایک بات تو بتا......''
''پوچھیں چوہدری صاحب۔'' عنایت بولا۔ وہ ملک شہباز کا لب ولہجہ سن کر پریشان ہوگیا تھا۔
''صفدر کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ اتنا ہوشیار چالاک نہیں تھا۔ پڑھ لکھ کر وہ بزدل ہوگیا تھا۔ اباجی کی ڈانٹ سن کر وہ ڈر جاتا تھا۔ تیرا پُتر بڑا چالاک اور ہوشیار ہے۔ ڈرتا بھی نہیں ہے۔ ہم کہیں کچھ غلط تو نہیں سوچ رہے؟'' ملک شہباز نے آخری جملہ ادا کرنے کے بعد سوالیہ نگاہوں سے عنایت کی طرف دیکھنا شروع کردیا۔
''کچھ لوگ نظر ایسے آتے ہیں کہ جیسے وہ بڑے ڈرپوک اور بزدل ہوں لیکن اندر سے وہ بڑے چالاک ہوتے ہیں۔''
''ان باتوں کو چھوڑو...... یہ بتاؤ کہ کہیں ہم کچھ غلط تو نہیں سوچ رہے؟'' ملک شہباز کی نگاہیں بدستور اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔
''میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا چوہدری صاحب کہ ہم کیا غلط سوچ رہے ہیں؟'' عنایت کی سمجھ میں ملک شہباز کی بات نہیں آرہی تھی اور وہ اپنی سوچ کے گھوڑے دوڑا رہا تھا۔
کچھ توقف کے بعد ملک شہباز نے کہا۔ ''اگر سیما غائب ہے تو صفدر بھی گم ہے۔ ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ سیما کو صفدر بھگا کر لے گیا ہے۔ ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ تیرا پُتر بھی تو غائب ہے اور پھر وہ سیما کی گلی میں رہتا تھا۔ کہیں سیما کو تیرا پُتر تو نہیں لے گیا؟''
ملک شہباز کی اس بات نے جیسے عنایت کے جسم کا خون چوس لیا ہو، وہ جلدی سے بولا۔ ''میرا پُتر یہ کام نہیں کرسکتا۔''
''یہ بات تو اتنے اعتماد سے کیسے کہہ سکتا ہے؟''
''میں اپنے پُتر کو جانتا ہوں۔''
''اگر جانتا ہے تو پھر تجھے یہ بھی یاد ہوگا کہ وہ اس سے پہلے بھی ایک ایسی حرکت کرچکا ہے۔ بروقت پکڑا گیا تھا...... یاد ہے؟''
''وہ اس کی نادانی تھی۔ اب وہ ایسا نہیں ہے۔'' عنایت کا گلا خشک ہورہا تھا۔
''پھر ایک کام کر۔ صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے منور کو میری حویلی میں لے کر آجا۔'' ملک شہباز کا لہجہ ایک دم سے متانت میں ڈوب گیا۔
''چوہدری صاحب وہ آوارہ کئی کئی دن گھر سے غائب رہتا ہے۔ مجھے کیا معلوم کہ وہ کہاں ہوگا؟''
''مجھے نہیں پتا کہ وہ کہاں ہوگا۔ صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے اسے میرے پاس لے کر آجا۔ صبح اباجی کی تعزیت کے لیے بہت سے لوگ حویلی میں جمع ہوں گے۔ اتنے لوگوں میں، میں منور کو دیکھ لوں گا کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔ جب میں مہمانوں سے فارغ ہوجاؤں تو وہ مجھ سے ملنے میرے پاس آجائے۔'' ملک شہباز نے کہا۔
''چوہدری صاحب......'' عنایت نے کچھ کہنا چاہا۔
''اب تم جاؤ...... صبح بات کریں گے۔'' ملک شہباز نے کہا اور جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا اور پھر ایک دم رک کر اس نے عنایت کی طرف دیکھا اور درشت لہجے میں بولا۔ ''یاد رکھنا اگر تم اسے نہ لے کر آئے تو تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کرکے منور کی تلاش میں یہاں کی پولیس ہی نہیں میرے بندے بھی نکل پڑیں گے۔'' ملک شہباز کہہ کر چلا گیا۔
عنایت کے لیے نئی مصیبت کھڑی ہوگئی تھی۔ ملک شہباز کو...... منور کی طرف سے شک پڑ گیا تھا......
عنایت نے خود منور سے کہا تھا کہ وہ اپنے تایا کے گھر چلا جائے لیکن وہ منور کو اچھی طرح سے جانتا تھا کہ وہ اپنے تایا کے گھر جانے کے بجائے جانے کہاں چلا گیا ہوگا۔ اب یہ چانس ہی تھا کہ اگر منور اپنے تایا کے گھر ہوا تو عنایت کی سانس میں سانس آجائے گی۔ اگر وہ نہ ملا تو ملک شہباز اپنی کہی ہوئی بات ضرور پوری کرے گا۔ عنایت کو لگا جیسے

اس کی سانس ابھی سے رک رہی ہے اور وہ گر جائے گا۔

☆☆☆

عنایت نے اپنے بڑے بھائی سے رابطہ کر لیا تھا۔ اس نے عنایت کو اور بھی پریشان کر دیا تھا کہ منور ان کی طرف آیا ہی نہیں۔

منور کی تلاش عنایت کے لیے سوہانِ روح بن گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اسے کہاں تلاش کرے۔ چوہدری ملک حیات کی خوشنودی کے لیے دوسرے کی ایک لمحے میں پگڑی اچھال کر پھینک دینے والے عنایت کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر کوئی بھی کہہ سکتا تھا کہ شاید ہی اس پورے گاؤں میں عنایت جیسا کوئی مظلوم اور پریشان ہو۔ وہ منور کے آوارہ دوستوں کی طرف سے بھی ہو آیا تھا لیکن منور کے بارے میں کسی نے کچھ نہیں بتایا تھا۔

عنایت نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا تو رات کا ڈیڑھ بج چکا تھا۔ رات ختم ہونے میں چند گھنٹے رہ گئے تھے جو عنایت کے لیے ایسے ہی تھے جیسے اسے سزائے موت ہو چکی ہو اور اب اس کو لٹکانا باقی رہ گیا ہو۔

عنایت کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اپنے گھر چلا جائے۔ ایک بار اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ وہ گاؤں سے بھاگ جائے، لیکن یہاں اس کی بیوی اور دوسرے بچے بھی تھے۔ ملک شہباز کا کوئی بھروسا نہیں تھا وہ پاگل کتے کی طرح کچھ بھی کر سکتا تھا۔

عنایت اپنے گھر گیا تو سب سو رہے تھے۔ وہ اپنی چارپائی کی طرف بڑھا تو اسے ایک کمرے میں ہلکی روشنی نظر آئی۔ عنایت یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کمرے میں کون ہے، اس جانب بڑھا جونہی اس نے دروازہ کھولا وہ چونک گیا۔ سامنے چارپائی پر منور نیم دراز اپنے موبائل فون کی اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

''آ گئے ابا...... میں تیرا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' وہ کہتا ہوا چارپائی سے اُٹھا۔

''تو کہاں تھا؟''

''میں اسی گاؤں میں تھا، کہیں نہیں گیا تھا۔'' منور نے اطمینان سے بتایا۔

''تیری وجہ سے میری جان سُولی پر لٹکی ہوئی تھی۔'' عنایت بولا۔

''ابا یہ باتیں پھر کسی دن کر لیں گے۔ اس وقت وہ بات کرتے ہیں جو میں کرنے کے لیے یہاں بیٹھا ہوں۔'' منور نے کہا۔

''کیا بات کرنے کے لیے بیٹھا ہے؟'' عنایت نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

منور نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا اور عنایت کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ پہلے اس نے اپنا گلا صاف کیا اور پھر بولا۔ ''ابا میں جانتا ہوں کہ تم نے ملک حیات کے بندے کے ساتھ مل کر سیما کو اغوا کیا ہے۔''

یہ سنتے ہی عنایت نے اس کا منہ دبا دیا۔ ''خبردار جو تم نے اس بارے میں ایک لفظ بھی کہا......''

عنایت نے جونہی اس کا منہ چھوڑا وہ پھر بولا۔ ''میں یہ بھی جانتا ہوں کہ سیما اس وقت کہاں ہے اور چوہدری صاحب کو کس نے قتل کیا ہے۔''

''میں جانتا ہوں کہ اسے صفدر قتل کر کے بھاگا ہے اور ہم اس لیے زبان نہیں کھول رہے کہ ملک شہباز ہمیں اپنی گولیوں سے بھون دے گا۔ اس لیے ہم نے دشمنوں پر بات ڈالی ہوئی ہے۔'' عنایت دھیمے لہجے میں بول رہا تھا۔

''ابا...... میں سیما کو پسند کرتا ہوں۔ تم میرا اس سے نکاح کرا دو میں راتوں رات سیما کو لے کر یہاں سے دور چلا جاتا ہوں۔'' منور نے عنایت کی بات نظر انداز کر کے اپنے دل کی بات کہی۔

''تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تو خود تو مرے گا مجھے بھی مروائے گا۔ ملک شہباز کو تیرے غائب ہونے پر بھی شک ہے کہ سیما کو کہیں تو لے کر تو نہیں بھاگ گیا۔ اس لیے اس نے مجھے کہا ہے کہ کل اگر سورج نکلنے کے ساتھ تجھے میں حویلی میں لے کر نہ پہنچا تو وہ مجھے جان سے مار دے گا'' عنایت بولا۔

''ایک کام کرتے ہیں ابا...... میں کل تیرے ساتھ حویلی چلتا ہوں اور ملک شہباز سے مل لیتا ہوں۔ اس کے بعد میں تجھے بتاؤں گا کہ صفدر کہاں ہے۔'' منور نے انکشاف کیا۔

''تجھے پتا ہے کہ صفدر کہاں ہے؟'' عنایت ایک دم سے چونکا۔

''مجھے پتا ہے۔'' منور پُر یقین لہجے میں بولا۔

''کہاں ہے وہ؟'' عنایت نے پوچھا۔

''ایسے نہیں ابا...... پہلے ہم ملک شہباز سے ملیں گے، اس کا وہم دور کروں گا اور پھر تم میرا نکاح سیما سے کرو گے، میں اسے اس گاؤں سے لے جانے سے پہلے تمہیں بتاؤں گا کہ وہ کہاں ہے۔ تم ملک شہباز کو بتانا کہ

صفدر اس جگہ چھپا ہوا ہے۔ ملک شہباز اسے اس جگہ سے پکڑ لے گا۔ اب یہ بات صفدر بھی جانتا ہے کہ سیما کو کس نے اغوا کیا اور وہ کہاں ہے۔ صفدر تیرا اور اس محافظ کا نام لے گا۔ ملک شہباز جب اس حویلی میں جائے گا تو سیما وہاں نہیں ہوگی۔ کیونکہ اسے میں لے جاچکا ہوں گا۔ اس کے بعد تمہیں ایک ویڈیو دوں گا۔ اس میں صفدر، ملک حیات پر حملہ کررہا ہے۔ جب ملک شہباز کو پتا چلے گا کہ اس کے باپ کو صفدر نے مارا ہے تو وہ غصے کا تیز ہے، اسے اسی وقت ماردے گا اور قصہ ختم ہوجائے گا۔''

''تیرے پاس وہ ویڈیو ہے؟'' عنایت نے اشتیاق بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں اس وقت اسی جگہ موجود تھا جب وہ سب کچھ ہورہا تھا۔ میں نے اپنے موبائل فون پر اس کی ویڈیو بنالی تھی۔'' منور نے جواب دیا۔

''کہاں ہے وہ ویڈیو؟'' عنایت نے پوچھا۔

''وہ ایک کارڈ میں ہے اور وہ میں نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔'' منور بولا۔

''کونسے کارڈ میں؟'' عنایت نے سوالیہ نگاہیں اُس کے چہرے پر جمادیں۔

''ابا یہ تمہارے سمجھنے کی بات نہیں ہے۔ تم ویسا کرو جیسا میں نے کہا ہے۔'' منور نے کہا۔ عنایت سوچنے لگا۔ پھر وہ چارپائی سے اُٹھا اور سر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہوگیا۔

''ابا کیا سوچ رہے ہو؟''

''بہت گڑبڑ ہوجائے گی۔ یہ سب کچھ ملک شہباز کو بتایا تو وہ مجھے ماردے گا۔ ملک حیات کے باڈی گارڈ کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔'' عنایت کی پریشانی کم نہیں ہوئی تھی۔

''وہ کیوں......؟'' منور نے پوچھا۔

''کیونکہ ہم اپنی جان بچانے کے لیے ملک شہباز کو بتا چکے ہیں کہ ملک حیات کو دشمنوں نے مارا تھا اور وہ تعداد میں چار تھے۔ اب سب سامنے آئے گا تو ہمارے جھوٹ کا پول کھلے گا اور وہ پاگل ہم دونوں کو ماردے گا۔ ہم تمہاری بنائی ہوئی ویڈیو بھی نہیں دکھا سکتے۔'' قدرت نے عنایت کے ہاتھ اور منہ کو باندھ دیا تھا۔

عنایت کی بات سن کر منور بھی متحیر باپ کا منہ دیکھنے لگا تھا۔ وہ تو کچھ اور ہی سوچ کر آیا تھا اور اتنا مطمئن تھا کہ اسے پورا یقین تھا کہ اس ساری کہانی کو سن کر اس کا باپ اس کا نکاح سیما سے کرادے گا اور صفدر خود بخود اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔ لیکن اس کے باپ کے ہاتھ میں ایسی اُلجھی ہوئی ڈور تھی کہ جس کا سرا تلاش کرنا بڑا مشکل تھا۔ منور بھی منہ لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی ساری بات میں ایک بات جھوٹ کہی تھی کہ اس کے علم میں ہے کہ صفدر کہاں ہے، جبکہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ یہ جھوٹ اس نے اس لیے بولا تھا تاکہ اس کا باپ اس سارے چکر میں آکر اس کا نکاح سیما سے کرانے پر رضامند ہوجائے مگر یہاں تو معاملہ بہت اُلجھا ہوا تھا۔

کچھ دیر کے بعد عنایت نے اس سے کہا۔ ''اب تو سوجا...... صبح ملک شہباز کے پاس جائیں گے اور پھر اطمینان سے سوچیں گے کہ تیرا نکاح سیما سے کیسے ہوسکتا ہے۔'' منور نے اسے محض اس لیے حوصلہ دیا تاکہ وہ ایک بار اسے ملک شہباز کے سامنے پیش کرکے اپنی جان بچاسکے۔ منور اس کے سامنے جائے گا تو اس کا شک دور ہوجائے گا کہ سیما اس کے ساتھ نہیں گئی۔ منور نے باپ کی بات سن کر کوئی جواب نہیں دیا اور چپ بیٹھا رہا۔

☆☆☆

صفدر، چوہدری ملک حیات کو مارنے کے بعد اسی گاؤں میں آگے ویران درختوں کے جھنڈ میں چھپ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ اب کہاں جائے۔ بھوک اور پیاس سے بُرا حال ہوگیا تھا۔ دور تک پھیلے ہوئے اندھیرے میں یہ خوف بھی تھا کہ کوئی زہریلی چیز اسے کاٹ نہ لے۔ گاؤں کے اندر کے حالات کیسے تھے، اس سے وہ لاعلم تھا۔ سیما اس پرانی حویلی میں قید تھی یا آزاد ہوچکی تھی اس سے بھی وہ بےخبر تھا۔ ملک حیات کو قتل کرنے کی پاداش میں اس کے گھر والوں پر کیا بیتی ہوگی، یہ سوچ سوچ کر وہ اپنے ہی ناخنوں سے اپنا جسم نوچ رہا تھا۔ ملک حیات کی فرعونیت اور ہوس کو ختم کرنے کے لیے اس نے اسے جان سے مار تو دیا تھا لیکن اب اسے بہت کچھ یاد آرہا تھا اور وہ بہت بےاقرار تھا۔

صفدر نے فیصلہ کیا، کچھ بھی ہو، وہ واپس گاؤں چلا جائے گا۔ اس کے بوڑھے والدین اس وقت تھانے میں جانے کس حال میں ہوں گے۔ کیونکہ یہاں کی پولیس اصل مجرم کو پکڑنے کے لیے اس کے بےقصور گھر والوں کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ اگر مجرم کسی پہنچ والے گھرانے سے تعلق رکھتا ہو تو پولیس اس گھر کی دہلیز تک بھی نہیں جاتی۔

صفدر اپنی جگہ سے اُٹھا اور گاؤں کی طرف چل پڑا۔ دور تک اندھیرا تھا اور گاؤں کی فصلیں سنسان تھیں۔ صفدر

چھپتا ہوا گلیوں میں پہنچ گیا جو خالی اور سکوت میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ صفدر اس گلی میں داخل ہو گیا تھا جس گلی میں اس کا گھر تھا۔ اچانک ایک طرف سے چوکیدار ہاتھ میں کلہاڑی لیے سامنے آ گیا۔ جونہی اس کی نظر صفدر کے چہرے پر پڑی، وہ حیرت سے بولا۔

''صفدر باؤ...... تم......؟''

صفدر نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے شور نہ مچانے کا اشارہ کیا اور پھر سرگوشی میں بولا۔ ''مجھے گھر تک جانے دو اور کسی کو مت بتانا......''

''میں کیوں شور مچاؤں گا؟ تم نے میرے ساتھ نیکی کی تھی۔ میں تمہیں خود تمہارے گھر تک چھوڑ کے آتا ہوں، تم فکر نہیں کرو لیکن تم سیما کو کہاں لے گئے ہو...... اس کے گھر والے بہت پریشان ہیں۔'' چوکیدار نے کہا۔

''میں سیما کو کہیں نہیں لے کر گیا۔'' صفدر نے چوکیدار کو اندھیرے میں کھڑا کر لیا۔

''سارا گاؤں یہ کہتا ہے کہ تم سیما کو بھگا کر لے گئے ہو۔ تم دونوں ایک ساتھ غائب ہوئے ہو، ملک شہباز بھی ماسٹر کرم دین کے گھر گیا تھا۔''

صفدر کے لیے یہ حیران کن بات تھی۔ وہ متحیر چوکیدار کی طرف دیکھتا رہا اور پھر پوچھا۔ ''میرے بارے میں اور کیا کہتے ہیں گاؤں کے لوگ؟''

''بس یہی کہتے ہیں لوگ، صفدر اور سیما بھاگ گئے ہیں۔'' چوکیدار نے بتایا۔

''ملک شہباز اپنے باپ کے قاتل کے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔'' صفدر نے جاننے کی کوشش کی۔

''وہ کہتے ہیں اگر دشمنوں نے ان کے باپ کو مارا ہے تو وہ بھی اس کا جلدی بدلہ لیں گے۔ ملک شہباز کا چھوٹا بھائی للکارتا پھرتا ہے۔'' چوکیدار نے جواب دیا۔ ''گاؤں والے کہتے ہیں اچھا ہے کہ ملک حیات سے جان چھوٹی، وہ تو کہتے ہیں کہ جن کے ساتھ ان کی دشمنی ہے وہ ملک شہباز کو بھی اسی طرح مار دیں۔''

صفدر کے لیے چوکیدار کے منہ سے وہ باتیں سن کر حیرت ہو رہی تھی۔ اس کی دانست میں تو یہ تھا کہ عنایت نے ملک شہباز کو بتا دیا ہو گا اور ملک شہباز اس سے بدلہ لینے کے لیے پاگل ہو گیا ہو گا۔

''چوہدری حیات کو اس کے دشمنوں نے مارا ہے۔'' صفدر نے یہ بات کچھ اس انداز میں کی جس سے چوکیدار کو اندازہ نہ ہو کہ صفدر بتا رہا ہے یا پوچھ رہا ہے۔

''تم بھی تو ساتھ ہی ہو گے جب اُسے مارا تھا۔ تم کو وہ ساتھ لے گئے تھے، یا تم بھاگ گئے تھے، یا پھر ایسا تھا کہ تم اور سیما پہلے ہی غائب ہو گئے تھے۔'' چوکیدار اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''وہ مجھے بھی مار دیتے اس لیے میں بھاگ کر چھپ گیا تھا۔'' صفدر نے بتایا۔ ''عنایت بھی ملا ہے تم سے؟''

''یہیں نظر آتا رہتا ہے۔''

''اچھا کسی کو مت بتانا کہ میں اپنے گھر آ گیا ہوں۔ تمہارا احسان ہو گا مجھ پر۔'' صفدر نے استدعا کی۔

''میں کسی کو نہیں بتاؤں گا لیکن تم سے ایک درخواست ہے۔ ماسٹر کرم دین کی بیٹی کو واپس کر دو۔ وہ اُن کی عزت ہے۔''

''میرا یقین کرو کہ میں اُسے لے کر کہیں نہیں گیا۔ اس وقت اگر میں اپنی صفائی پیش کرنا چاہوں گا تو کوئی نہیں مانے گا۔ ملک شہباز بھی ماسٹر کرم دین کے ساتھ ہے...... اس لیے مجھے سوچنا پڑے گا کہ مجھ پر لگا یہ الزام کیسے ختم ہو سکتا ہے۔'' صفدر بولا۔

''کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''میرا یقین کرو میں سچ کہہ رہا ہوں......'' صفدر بولا۔ چوکیدار نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

صفدر اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے سوچا کہ اگر اس نے دروازہ کھٹکھٹایا تو اس سکوت میں آواز کئی گھروں تک چلی جائے گی اور شاید کوئی اُٹھ کر باہر بھی دیکھ لے۔ اس لیے اس نے ایک نظر چوکیدار کی طرف دیکھا جو اسی جگہ کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ صفدر نے ایک جست لگائی اور دیوار پر چڑھ گیا اور پھر اندر کود گیا۔ اس وقت ان کے گھر سے کچھ آگے فضل کی بیوی سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ اچانک اس کی نظر دیوار کودتے کسی آدمی پر پڑی اور اس کے پیر اسی جگہ جم گئے۔ وہ چور سمجھ کر پھر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلی گئی، تاکہ وہ اپنے شوہر فضل کو اس کے بارے میں آگاہ کر سکے۔

صفدر کو اس کے والدین اچانک دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ان کا بھی یہی سوال تھا کہ وہ سیما کو کہاں لے کر گیا ہے؟ صفدر نے ان کے سوال کا جواب دینے سے پہلے باتوں باتوں میں یہ پوچھ لیا تھا کہ ملک حیات کے قتل کا الزام اس پر تو نہیں ہے۔ فرزند نے بتایا کہ عنایت اور ملک حیات کے محافظ کے بقول، دشمن دار لوگوں نے ملک حیات پر حملہ کر دیا تھا اور انہوں نے ملک حیات کو مار دیا

تھا۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ صفدر پر ملک حیات کے قتل کا الزام نہیں ہے لیکن صفدر کو اس بات پر حیرت تھی کہ عنایت اور ملک حیات کے محافظ نے حقیقت کو مخفی کیوں رکھا تھا؟

پھر صفدر نے بتایا۔ ''میں سیما کو کہیں نہیں لے کر گیا۔ اور نہ میں ایسا سوچ سکتا ہوں۔''

''پھر سیما کہاں ہے اور تم بھی غائب تھے؟'' فرزند نے پوچھا۔

اسی اثنا میں صفدر کو لگا کہ ان کے گھر کے صحن میں کچھ ہلچل سی ہے۔ دراصل فضل کی بیوی نے فوراً فضل کو جگایا اور اسے آگاہ کیا کہ فرزند کے گھر میں چور دیوار سے کودا ہے۔ ان ہمسایوں کے فرزند کے ساتھ اچھے مراسم تھے۔ فضل اسی وقت باہر نکلا اور گلی میں ابھی چوکیدار موجود تھا، اس نے چوکیدار کو بتایا۔ چوکیدار تو جانتا تھا کہ اس گھر میں کوئی چور نہیں گیا۔ چنانچہ چوکیدار نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اسی گلی میں ہے اس نے کسی کو فرزند کے گھر جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ لیکن فضل نہیں مانا اور اس نے ہمسایوں کے دروازے بجانے شروع کر دیے۔ تین چار ہمسائے جمع ہو گئے، ان میں ایک سیما کا پھوپھا بھی تھا۔

چنانچہ فضل دیوار پھاند کر فرزند کے گھر کود گیا اور دروازہ کھول کر دوسرے لوگوں کو بھی اندر بلا لیا ان میں چوکیدار بھی شامل تھا۔ جونہی صفدر نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر دیکھا، وہ چونک گیا۔

چوکیدار نے سرگوشی کی۔ ''تم لوگوں کا وہم ہے کہ کوئی دیوار کودا ہے۔ میں اسی گلی میں کھڑا تھا، کوئی بھی نہیں ہے۔''

صفدر سارا ماجرا سمجھ گیا تھا۔ ایک ہمسائے نے چور کو للکارا تو صفدر دروازے کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور فرزند کو اشارہ کیا کہ وہ اس کے بارے میں کسی کو نہ بتائے۔ فرزند نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

''کیا بات ہے......؟''

''میری بیوی نے دیوار سے چور کو اندر جاتے دیکھا ہے......'' فضل بولا۔

''کوئی بھی نہیں ہے فضل...... میں جاگ رہا تھا۔'' فرزند نے کہا۔

''ایک بار گھر کی تلاشی لے لیں۔'' سیما کے پھوپھا نے کہا اور وہ سب دوسرے کمرے میں چلے گئے، پھر انہوں نے سارے گھر کی تلاشی لی۔

''کوئی بھی نہیں ہے۔'' فضل بولا۔

''میں نے کہا تھا کہ آپ لوگوں کا وہم ہے، میں اس گلی میں ہی کھڑا تھا۔ آؤ اب چلتے ہیں۔'' چوکیدار بولا اور سب جانے کے لیے مڑے تو سیما کا پھوپھا رک گیا۔

''ایک منٹ...... کہیں صفدر تو نہیں آیا اس گھر میں اور وہ اس کمرے میں موجود ہو جو کمرا ہم نے دیکھا ہی نہیں ہے۔''

''صفدر کو دیوار سے کود کر اندر جانے کی کیا ضرورت تھی؟'' چوکیدار نے جلدی سے کہا۔

''ہم لوگوں کو یہ کمرا بھی دیکھنا چاہیے۔'' سیما کا پھوپھا بولا۔

دوسرے ہمسایوں کو سیما کے پھوپھا کی بات سے اتفاق نہیں تھا، اس لیے کسی نے بھی اس کی بات کی تائید نہیں کی لیکن سیما کے پھوپھا کے دماغ میں جانے کیا بات سمائی تھی کہ وہ بضد ہو گیا اور مجبوراً فرزند کو اپنا دروازہ چھوڑنا پڑا۔ جونہی وہ کمرے میں گئے صفدر دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ سب حیرت سے چونک گئے۔ سیما کے پھوپھا نے شور مچا دیا۔

☆☆☆

فجر کی نماز کے بعد ملک حیات کے لیے دعا کا اہتمام تھا۔ سارا گاؤں ملک حیات کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن پھر بھی وہ حویلی کے اندر اور باہر موجود تھے۔ کسی نے دعا کی تھی کہ نہیں یہ الگ بات تھی لیکن ملک شہباز اور اس کے بھائیوں کو منہ دکھانے کے لیے سب موجود تھے، گاؤں والے ان لوگوں کی ان کے شر کی وجہ سے عزت کرتے تھے اور یہی ملک حیات کے لیے سب سے بڑی بدبختی تھی۔

دعا سے فارغ ہوئے تو ملک شہباز کو کان میں بتایا گیا کہ صفدر رات کو چوری چھپے اپنے گھر میں داخل ہوا تھا، سیما کے پھوپھا نے اسے پکڑ لیا ہے۔

ملک شہباز کے دل میں جلترنگ سی ہوئی کہ صفدر پکڑا گیا ہے تو اب سیما کا بھی پتا چل جائے گا۔ ملک شہباز نے حکم دیا کہ صفدر کو اس کے ڈیرے پر لایا جائے۔

☆☆☆

سیما کے والدین، رشتے دار اور گاؤں کے لوگ ملک شہباز کے ڈیرے پر موجود تھے جبکہ صفدر اپنے والدین کے ساتھ کھڑا تھا۔ عنایت بھی وہاں آ گیا تھا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور وہ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ مضطرب کبھی دائیں چلا جاتا تھا اور کبھی بائیں...... ایسا لگتا تھا جیسے اس کا دل چاہ رہا ہو کہ وہ اس جگہ سے بھاگ جائے۔

ملک شہباز کے پاس بہت سے مہمان آئے ہوئے تھے۔ وہ ان سے جان چھڑا کر جلدی اپنے ڈیرے پر پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی ملک الیاس بھی منہ اندھیرے سے ہی غائب تھا۔ پھر جیسے مہمانوں کا سلسلہ کم ہوا وہ سیدھا ڈیرے جا پہنچا۔

اس نے قہر آلود نگاہوں سے صفدر کی طرف دیکھا۔ اسے غصہ اس بات کا تھا کہ وہ سیما کو بھگا کر لے گیا تھا۔

''چوہدری صاحب اس سے پوچھیں ہماری بیٹی کہاں ہے...... یہ چوروں کی طرح رات کو اپنے گھر میں آیا تھا۔'' سیما کا پھوپھا بولا۔

''تجھے شرم نہیں آئی گاؤں کی بیٹی کو بھگا کر لے گیا...... تیری اوقات کیا ہے؟'' ملک شہباز غصے سے بولا۔

''میں سیما کو کہیں نہیں لے کر گیا۔''

''جھوٹ بولتا ہے یہ۔'' سیما کا پھوپھا بولا۔

''بکواس بند کرو اور بتاؤ کہاں رکھا ہے سیما کو۔'' اس بار کھا جانے والے لہجے میں ملک شہباز نے کہا۔ ''تم تو ابا جی کے ساتھ گئے تھے۔ ان کی گاڑی چلا رہے تھے اور جب ان پر حملہ ہوا تو تم اس وقت کیسے غائب ہو گئے تھے؟ تم نے منصوبہ کیا بنایا تھا؟''

صفدر نے ایک نظر عنایت کی طرف دیکھا اور عنایت کا دل چاہا کہ جس جگہ وہ کھڑا ہے وہاں سے زمین کھلے اور وہ اس میں سما جائے۔

''سیما کو میں نے نہیں، عنایت نے اغوا کیا تھا۔''

صفدر کے اس انکشاف پر ایک ساتھ سب کی نظریں عنایت کی طرف چلی گئیں۔ اس انکشاف نے ملک شہباز کے باقی سوالوں کو دبا دیا تھا۔

''جھوٹ بول رہا ہے یہ۔'' عنایت نے اپنا جھوٹ چھپانے کی کوشش کی۔

''اس نے اپنے ساتھی کے ساتھ سیما کو اغوا کیا تھا۔ سیما کو یہ پرانی حویلی لے کر گئے تھے اور انہوں نے مجھے بھی پکڑ کر قید کر دیا تھا۔ میں وہاں سے بمشکل رات کو گھر پہنچا تھا۔'' صفدر نے بھی کہہ دیا کیونکہ وہ اب یہ تو جان چکا تھا کہ عنایت خود اپنے منہ سے اقرار کر چکا ہے کہ ملک حیات کو دشمن کے آدمیوں نے قتل کیا تھا۔

''بکواس کر رہا ہے۔ ہم نے اسے کہیں قید نہیں کیا تھا بلکہ اس نے چوہدری صاحب کو قتل کیا تھا اور یہ بھاگ گیا تھا۔'' عنایت بھی بولا۔

''میں چوہدری صاحب کو کیوں قتل کروں گا؟ میری ایسی اوقات ہے کہ میں ان کو قتل کر سکوں۔ میری ایسی ہمت ہے کہ میں ایسا کر سکوں؟'' صفدر نے سب کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''تم تو کہہ رہے تھے کہ ان کو دشمنوں کے آدمیوں نے مارا ہے۔'' ملک شہباز نے اسے گھورا۔

اب عنایت سوچنے لگا کہ وہ اس بات کا کیا جواب دے۔ یہ بتا دے کہ اس نے جھوٹ بولا تھا پھر سوال ہوگا کہ کیوں بولا تھا اور اس کے بعد باتوں کی پٹاری کھلتی چلی جائے گی اور اس کے گلے میں پھندا تنگ ہوتا چلا جائے گا اور وہ اپنے ہی تیار کیے ہوئے پھندے کے ساتھ جھول جائے گا۔

''اب بولتا کیوں نہیں ہے؟'' ملک شہباز نے چیخ کر کہا۔

''دشمنوں کے آدمیوں نے مارا ہے چوہدری صاحب کو، اس نے مجھ پر اغوا کا الزام لگایا تو میں نے بھی قتل کا الزام اس پر لگا دیا۔'' عنایت کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اپنے پہلے بیان پر قائم رہتا۔ اب اس نے یہ بات سب کے سامنے کہہ دی تھی، صفدر دل ہی دل میں مسکرایا کہ وہ ملک حیات کے قتل سے بری ہو گیا ہے۔

ملک شہباز اب صفدر کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تم نے ابھی کہا کہ سیما کو اغوا عنایت نے کیا تھا...... اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔ اور اسے پرانی حویلی میں کیوں رکھا ہے؟''

''ملک صاحب اگر سچ بولنے کی اجازت دیں تو سچ بولوں؟'' صفدر نے ایک نظر ملک شہباز کی طرف دیکھ کر کہا۔

''سچ بتاؤ۔'' ملک شہباز بولا۔

''سیما کو ملک حیات صاحب نے اغوا کرایا تھا۔''

صفدر نے جیسے ہی حقیقت بیان کی ایک بار پھر پورے مجمع میں چہ میگوئیاں... شروع ہو گئیں اور حیرت سے وہ سب ایک دوسرے کا منہ... دیکھنے لگے۔

''تم جانتے ہو کہ کیا کہہ رہے ہو؟'' ملک شہباز کے لیے اپنا غصہ قابو کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

''عنایت سے پوچھ لیں۔ یہ خود بتائے گا۔'' صفدر نے ایک بار پھر گیند عنایت کی طرف اچھال دی۔

''کیوں عنایت...... بولو۔'' ملک شہباز نے قہر برساتی نظروں اور آگ اُگلتے لہجے میں پوچھا۔

''جی یہ سچ کہہ رہا ہے۔'' عنایت پوری طرح سے گھر چکا تھا اس لیے اسے سچ بولنا ہی پڑا۔

''سیما اس وقت پرانی حویلی میں ہے؟'' ملک شہباز

نے اگلا سوال کیا۔

''ہاں جی۔'' عنایت کا سر جھکا ہوا تھا۔ ملک شہباز کو پہلی بار سب کے سامنے باپ کی وجہ سے ندامت ہوئی تھی۔

ملک شہباز نے اسی وقت اپنے آدمی پرانی حویلی میں بھیج دیے۔ تب تک وہاں مختلف باتیں ہوتی رہیں۔ جب ملک شہباز کے آدمی آئے تو انہوں نے بتایا۔

''پرانی حویلی کے دونوں ملازم وہاں بندھے ہوئے تھے انہوں نے بتایا کہ منور اپنے دوستوں کے ساتھ آیا تھا اور انہیں باندھ کر سیما کو اپنے ساتھ لے گیا ہے۔''

عنایت یہ سنتے ہی دم بخود رہ گیا۔ صبح جب وہ سو کر اُٹھا تھا تو منور کمرے سے غائب تھا۔ تب سے ہی عنایت پریشان اور رنجیدہ تھا کہ اب وہ ملک شہباز کو کیا جواب دے گا۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر سیما کو اس حویلی سے کہیں لے جائے گا، یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

ملک شہباز جو پہلے ہی پورے گاؤں والوں کے سامنے اپنے باپ کی وجہ سے ندامت اُٹھا چکا تھا اور اوپر سے منور، سیما کو لے گیا تھا، اس غصے میں وہ اُٹھا اور اس نے عنایت کو گریبان سے پکڑ کر پوری قوت سے اُٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ عنایت کا سر اس طرح سے دیوار میں لگا کہ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ اسی جگہ ڈھیر ہو گیا۔ پورے مجمع میں سراسیمگی پھیل گئی۔ ملک شہباز غصے سے جانے کیا کیا بولنے لگا۔ اس غصے میں اس نے گاؤں والوں کو بھی بُرا بھلا کہہ دیا۔ اسی وقت اس کے چھوٹے بھائی کا آدمی ہاتھ میں بندوق لیے بھاگتا ہوا آ گیا اور آتے ہی بولا۔

''ملک صاحب...... ہم نے ان کے دو آدمیوں کو مار دیا ہے۔ اور چھوٹے ملک صاحب کو گولیاں لگ گئی ہیں اور وہ اس وقت اسپتال میں ہے۔''

''میں نے منع بھی کیا تھا کہ ابھی کچھ نہیں کرنا، اس کے باوجود وہ مجھے بتائے بغیر چلا گیا۔'' ملک شہباز یہ سنتے ہی اُلجھن کا شکار ہو گیا اور چیخا۔

''اور دوسری بات یہ کہ ہم رات گھات میں بیٹھے ہوئے تھے کہ عنایت کا لڑکا اور اس کے دوست گاؤں کی کسی لڑکی کو ہاتھ منہ باندھ کر لے جا رہے تھے، وہ ہم نے پکڑ لیے ہیں اور وہ اس وقت زمینوں والے کمرے میں قید ہیں۔ لڑکی بھی دوسرے کمرے میں موجود ہے۔''

یہ سنتے ہی سیما کے والدین اور رشتے دار اس طرف بھاگ نکلے اور ملک شہباز کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ سیما کو اپنی حویلی میں پہنچائے، یا بھائی کے لیے اسپتال چلا جائے۔

آخر کار وہ اپنے بھائی کے پاس اسپتال چلا گیا۔

☆☆☆

سیما اپنے گھر والوں کو مل گئی تھی۔ انہوں نے پہلے تو منور کی خوب پٹائی کی اور ملک حیات کا غصہ بھی اسی پر نکالا اور اس پٹائی میں اس کا موبائل فون نیچے گرا اور کئی پیروں کے نیچے آ کر ٹوٹ پھوٹ گیا اور کسی کی ٹھوکر سے وہ نالی میں جا گرا۔ پھر منور اور اس کے دوستوں پر اغوا کا پرچہ کٹوا کر انہیں گرفتار کرا دیا۔ اب سیما نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ صفدر سے شادی کرے گی اور صفدر نے گاؤں والوں اور عنایت کے گھر والوں کو ایک جگہ جمع کیا۔

شام کے سائے ڈھل رہے تھے جب ملک شہباز اپنے بھائی کی لاش لے کر واپس آ رہا تھا کہ راستے میں ہی پولیس کی بھاری نفری نے ملک شہباز کو گرفتار کر لیا تو وہ تھانیدار پر چیخا۔

''ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والے کُتّے...... مجھ پر ہی بھونکنے لگے ہو۔''

''چوہدری صاحب مجبور ہوں۔ صفدر کے جگانے پر سارا گاؤں جاگ گیا ہے اور سب نے ظلم کے خلاف آواز بلند کر دی ہے اور عنایت کے قتل کی ایف آئی آر ہمیں کاٹنی پڑی۔ بہتر ہے کہ اب آپ گرفتاری دے دیں۔''

ملک شہباز نے دیکھا کہ پورا گاؤں سڑک روک کر کھڑا تھا۔ سب سے آگے صفدر تھا۔ اس نے پورے گاؤں والوں کو یہ بات سمجھا دی تھی کہ جب تک تم لوگ آواز بلند نہیں کرو گے اور اپنے اوپر ہونے والے ظلم کو ظلم نہیں کہو گے تب تک ایسے ظالم لوگ اپنے سے نچلے لوگوں کو غلام سمجھ کر چوٹ مارتے رہیں گے اور جبر ہوتا رہے گا۔ اس سلسلے کو ختم کرنا ہوگا اپنی آواز سے۔

سارے گاؤں والوں نے آواز بلند کر دی تھی اور ملک شہباز گرفتار ہو گیا تھا۔

سارے گاؤں میں امن ہو گیا تھا۔ اب اُن پر رعب ڈالنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔ ملک حیات کی حویلی کے بڑے مرد مر گئے تھے اور ملک شہباز جیل میں تھا اور اس حویلی کی خواتین عبرت کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔

کچھ ہفتوں بعد صفدر اور سیما کی شادی تھی اور پورا گاؤں اس شادی میں شریک تھا۔

❖❖❖